



میری کہانیاں آپ یہاں ایک جگہ پڑھیں

PakDigest

WWW.

.COM

فروری 2011

Free PDF Books

& Novels

Online Library

پاک ڈائجسٹ
ٹاؤل

PakDigest

Novels

.COM

PakDigest

Novels

.COM

یہ تعلیم دانی اس مسلمان شہر کی حالات و سبب جس نے عالمی پیرے پر فخر قبول کر دی
انعام صفت اسے شہر کر نصیب تھی لیکن اپنی محنت سے اس نے شہرت کا تاج حاصل کر لیا
یہ عورت: کیا ہنس کر بات کرنے والی ہر عورت ہر عورتی ہے ایک دلچسپ جہ بیانی

پہلی سچ بیانی	معاشرت
190	154
بری عورت	ناسور
ندیم احمد	ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

ایک معصوم نو جوان کی خوب رنگ و لہو گرما دینے والی داستان
ہر وہ عورت بری نہیں ہوتی جو جس کربا ت کرے

چوتھی سچ بیانی	تیسری سچ بیانی	دوسری سچ بیانی
215	209	203
دیالی	پسند کی شادی	گناہ
سید سخاوت	عاطر شاہین	وردہ خان

نادانی میں وہ ایسا کا اکر
یہ شادی کرنا جرم ہے؟
گلگت و بلتستان کا
ایک محفلِ عقول و افتخار

ساتویں سچ بیانی	چھٹی سچ بیانی	پانچویں سچ بیانی
257	245	241
فہرین	سبتی	نراست
تہمینہ درانی	غلام رضا جعفری	افتخار حسین اعوان

موبائل فون کس طرح گت ہوں
کے قریب لے جا رہا ہے
وہ یورپ کی تھی مگر شعائر
اسلامی کے اے پیار بھتا

سوغات	نویں سچ بیانی	آٹھویں سچ بیانی
***	271	265
پاپے	خار شیب	کاش
قارئین / ادارہ	اعجاز احمد راحیل	نیلمابٹ

دل و دماغ پر پورے جھجھج
جانے والی سچ بیانی
کشمیر کے ایک
بہادر بیٹی کی سرگزشت

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیثِ نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق برحرمتی سے محفوظ رکھیں۔

گفت و شنید	سرگزشت
08	07
شہر خیال	ملاح دار
مدیر اعلیٰ	ادارہ

ایک صفحہ میں مکمل، مختصر، مختصر
ایک نادر روزگار کا تعارف
آپ کی باتیں آپ کے خیال آپ
کے شوق اور آپ کے سوال

یادیں	خراجِ تحسین	شخصیت
57	39	16
شہرِ نامہ	شعلہ صفت	معاشقہ
ڈاکٹر اقبال ہاشمانی	عبد اللہ احمد حسن	ڈاکٹر ساجد امجد

پرائے نظموں کو یکسر
تبدیل کر دینے والے کی سوانح
وہاں سے شکر یا تو اس
نے اپنی قسمت خود بنالی

دلہن و عجب	نہ بگری	نذکرہ
103	87	69
بینک	سپر رائٹر	باغی
ابوالفرح ہمایوں	انور فرہاد	زویا اعجاز

پاکستانی سینما پر سیر حاصل
تحریر دینے والے کی داستان
معشر سے در آمد ایک
عجیب و غریب واقعہ

معلومات	غیر ملکی ادب	اسرارِ کہانی
147	135	111
بائیسکل	شاعر	شہرستانِ ٹونڈو
شکیل صدیقی	سلمیٰ اعوان	ندیم اقبال

جسم و حیاں کو تو
کرنے والی سواری
برخیز کا پہلا شاعر جس
نے نوبل انعام حاصل کیا

جہاں ان کا شہرہ ایک
آگ آواز کی داستان

ماہنامہ سرگزشت میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے ہر حق و باطل نقل و متن ادارہ محفوظ ہیں کسی بھی فرد یا ادارے کے لئے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی پارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔
* تمام اشتہارات یکسے ہی کی بنیاد پر شائع کئے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح سے دارنہ ہوگا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قارئین کرام!
السلام علیکم

جلد 28 شمارہ 01 فروری 2018ء

ماہنامہ
بازار

مزاح نگار

24 دسمبر 1892ء میں یوپی کے ایک گاؤں مریاہو میں اس نے جنم لیا۔ اس وقت رواج یہ تھا کہ بچوں کو ابتدائی تعلیم گھر میں دی جاتی تھی سوائے بھی پڑھنے کے لیے قاعدہ دے دیا گیا۔ ابھی وہ سن شعور پر پہنچا بھی نہ تھا کہ والد جون پور منتقل ہو گئے۔ جون پور شہر میں علم و ادب کو خوب پذیرائی حاصل تھی۔ شاہان شرقی نے اس شہر کو علم و ادب کا گہوارا بنا دیا تھا۔ اس زمانے کے مسلمان گھرانوں کا دستور تھا معلم کو گھر بلا یا جائے۔ اسے بھی پڑھانے کو ایک مولوی صاحب آتے تھے جو اسے قاعدہ بغدادی پڑھاتے، کلام پاک کی تعلیم دیتے، محنتی لکھواتے تھے۔ قاعدہ بغدادی ختم ہوا تو ایک دوسرے مولوی صاحب آئے گئے۔ وہ اسے فارسی پڑھاتے۔ ان کے بعد ایک اور مولوی صاحب کی خدمت حاصل کی گئی جو اسے عربی پڑھاتے دراصل یہ طریقہ اس لیے اپنایا جاتا تھا کہ مولوی صاحبان کی پرورش ہوتی رہے۔ اردو، عربی، فارسی کے بعد اسے حساب سیکھنے بٹھایا گیا۔ تھوڑی بہت حساب آتی تو اسے اسکول بھیجا جانے لگا۔ اسکول میں ہندو اساتذہ کی تعداد زیادہ تھی۔ ان میں ایک کٹر برہمن بھی تھے جو اردو پڑھایا کرتے۔ وہ اتنی عجیب فطرت کے تھے کہ کبھی کسی بچے کی کتاب یا کالی کو ہاتھ نہ لگاتے۔ چھوٹ چھوٹ کے تخت پابند تھے۔ جس چیز سے کسی بچے کی سرزنش کرتے اس چیز کی گویا ہر چٹیک دیتے کہ اسے دوبارہ ہاتھ نہ لگانا پڑے۔ ایسے استاد سے تعلیم کیسی ملے گی اس کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے مگر وہ تعلیم حاصل کرتا رہا۔ بچپن سے ہی وہ کمزور تھا آئے دن بیمار رہا کرتا اور انہی ماسٹر صاحب کے بھیکٹ میں زیادہ نمبر لیتا رہا۔ اس کے گھر والے اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاتا مگر کچھ نہ سمجھتے۔ جیسے ہی وہ بیمار ہوتا اس کے گھر خاتون، مولویوں کی قطار لگ جاتی۔ جھاڑ پھونک کا بازار گرم ہو جاتا اور بیماری و صحت یابی کی دوڑ لگ جاتی۔ دو دن اسکول جاتا تو چار دن ناٹھ کرتا اسی طرح وقت گزارتا ہوا اپنی اسکول پاس کر گیا۔ میٹرک کے بعد اس نے دیوانی عدالت میں کلرکی کر لی۔ اس دور میں کلرکی کو عزت و وقار کا باعث سمجھا جاتا تھا لیکن اس وقار کا جو جھوٹا زیادہ دن اٹھانے کا اس نے کلرکی کے نقد کو طالب علمی کے احوال پر ترجیح دے دی اور ملی گڑھ کا لُج میں داخلہ لے لیا۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے کالج کے محاذ علی گڑھ منتقلی میں لکھنا بھی شروع کر دیا۔ لکھنے کے لیے اس نے مزاح کے انداز کو اپنایا تھا۔ اس کا یہ انداز خاص پسند کیا گیا۔ ان دنوں ملی گڑھ کالج برصغیر کے مسلمانوں کا مرکز تھا۔ دور دراز کے مسلمان بھی اپنے بچوں کو ملی گڑھ بھیجتا تھا سمجھتے، سیکھی وہ بھی کر ملی گڑھ مختلف انداز کی اردو کا گڑھ بن گیا تھا۔ عجیب عجیب لب و لہجے میں اردو بولی جاتی تھی، وہ ان کی اردو کو اپنے کرداروں کی زبان سے ادا کرتا تو پڑھنے والے لوٹ بوٹ ہو جاتے۔ وہ خود پر فخر کرتا کہ وہ اہل زبان ہے اس لیے اس کی تحریر سند ہے لیکن جب وہ علامہ اقبال سے ملے اور پہنچا تو ان کا تلفظ سن کر وہ دنگ رہ گیا۔ اسے اپنی سوچ کلیتہً غلط کی کہ تلفظ لب و لہجہ اور چیز ہے، فن پر دسترس اور ہے۔ اس دن سے اس نے تلفظ کی نقل سے توبہ کر لی۔ اب شاذ و نادر وہ اپنی تحریر میں کس علاقے کے تلفظ کو بطور استعجال کرتا لیکن رگن ظرافت تو پھر کبھی بھی اس لیے وہ اپنے مضامین میں الفاظ کے الٹ بھیرے مزاح پیدا کرنے لگا۔ وہ مستند مزاح نگار مانا جاتا تھا اس وجہ سے لوگ اس کی تحریر کو بہت دیتے۔ جب اس کے مضامین کا مجموعہ ”مضامین رشید“ بازار میں آیا تو اسے خوب پذیرائی ملی تھی۔ یہی نہیں ”غالب کی شخصیت اور شاعری“ ”کندن“ اور ”آشفقت بیانی میری“ کو بھی بہت پسند کیا گیا۔ مزاح کے اس شہسوار کو ہم پروفیسر رشید احمد صدیقی کے نام سے پہچانتے ہیں جو 15 جنوری 1977ء کو اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

☆☆☆

[7]

فروری 2018ء

ملینا مسرگوشٹ

PakDigestNovels.Com

آج مجھے ایک نئی کہانی شدت سے یاد آ رہی ہے۔ وہ کہانی کچھ اس طرح ہے۔ مسلمان روز شام کو دفتر سے آنے کے بعد ٹاک شوفر و دیکھتا تھا۔ اس نے جیسے ہی ٹی وی کھولا ایک عجیب برنڈر شور سے بحث چل رہی تھی کہ شہر میں آوارہ گھوڑوں کے کانٹے سے دل لوگ ڈر رہے ہیں۔ ایک حکومتی اہلکار جو لب میں کھڑا تھا کہ اس کی واحد وجہ ہے کہ لوگ لب تلوں کو جھوٹا کھلاتے نہیں ہیں وہ جھوک کی وجہ سے ڈنٹی تو انون کھو رہے ہیں۔ اگر کتوں کو کھانا ملتا رہے تو وہ کسی حرکتیں کیوں کریں گے۔ میں جلد ان کے لیے اماؤٹ گرائٹ کرنے کی سفارش کرنے والا ہوں۔ مسلمان چپقل بدلتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا کہ اپنے لیے رات سپنا کر رہا ہے بد معاش کہیں کا۔ دوسرے چپقل سے رپورٹر زور زور سے چیخ رہا تھا چار ڈاکوؤں کو پولیس نے مقابلے کے بعد مار گرایا۔ ان کے پاس سے بھاری اسلحہ گولا بارود برآمد جبکہ کھلے والوں کا کہنا ہے کہ یہ چاروں اسی کھلے کے لڑکے تھے۔ شہر میں برہمنی ہوئی وارداتوں کے سبب پہرے داری کی نیت سے یہ لوگ رات گئے تک گلی کے کنارے بیٹھ کر لوڈو کھیلتے تھے۔ مسلمان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان دونوں خبروں میں یکسانیت کیوں لگ رہی ہے۔ پھر وہ بڑبڑایا کہ اصل مجرم یہ ٹی وی والے ہیں جنہوں نے دونوں خبروں کو ایک وقت میں نشر کیا۔

اس کہانی میں یکسانیت ہے یا نہیں اس پر بحث نہیں میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ معاشرے میں انصاف کا کل ہوگا تو ڈاکوؤں کی تعداد بڑھتی ہی رہے گی۔ حکمران وہ بھی تھے جو کہتے تھے کہ فرات کنارے ایک کتا بھی بھوکا رہے گا تو مجرم میں نہیں رہے گا۔ اور ایک حکمران آج کے ہیں اور ایسا صرف اس لیے کہ ہم اسلامی طرز حکومت سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ ہمارے اسلاف حکومتی کام ختم کر کے چراغ تک بجھا دیا کرتے تھے کہ یہ بیت المال کے تیل سے جل رہا ہے اور ہم اپنے بچوں کے ٹھکانے اور اہل خانہ کی تفریح و خریداریوں کے لیے بھی سرکاری گاڑی استعمال کرتے ہیں تو پھر معاشرہ ایسا ہی ہوگا نا؟

معراج رسول

مدیر اعلیٰ: عذرارسل

مدیر: پرویز بلگرامی

نائب مدیر: نبیلہ ظہر

◆◆◆

نیچراشتہارات

محمد شہزاد خان

0333-2256789

◆◆◆

سرکیشن منیجر

سید منیر حسین

0333-3285269

◆◆◆

قیمت ٹی پی: 70 روپے، زوسالانہ 900 روپے



پبلشر و پریپر انٹر: عذرارسل

مقام اشاعت: C-63، فیروز II ایکسٹینشن

ڈیفنس کراچی ایم این کوئی روڈ

کلیں 75500

جیل سن

پرنٹر:

ایچ جی پرنٹنگ پریس

مطبوعہ:

ہائی اسٹڈیم کراچی

خلا کتابت کا پتہ: پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone: 35804200
E-mail: jdggroup@hotmail.com



8

ماہنامہ سرگزشت

جس نے زہانت افشار کا تجویز پر بیہودہ تحصیل فتح بک سے "مرگ" کا کہاں ان نمبر ہر سال کا پاپا اقتصاد پر لحاظ سے معیاری نمبر ہے۔ ڈاکٹر ساجد احمد ماسر
یاضی دان فیما عورت کے حالات زندگی پر بہت ہی زبردست تحریر لائے۔ "مرگ" درویش "اور" ڈاکٹر ساجد احمد "دو" ناول ناقد دو رنگا فقیہین کے حالات زندگی کا
عاطفہ کیونے تھیں۔ ڈوڈا اچانک نے پروین شاکر پر بہت ہی زبردست کتاب پروین شاکر کو اتنی غلاب و لہجہ کی بہت خوب صورت شاعرہ تھیں۔ "جاسوس" میں
خوشن دوینو نے اپنی پڑائی بھاری کی لاج رکھی اور ٹھیکوں پر واضح کیا کہ تم کسی سے کہیں۔ "جواں مرگ" مختصر اہم نے انکشاف اور اردو ادب کے نامور کالم

ماہنامہ سرگزشت 9 فروری 2018ء

PakDigestNovels.Com

طور پر کوئی نکتہ دہم پالے رکھتا ہے، کسی کو دہم ہوتا ہے کہ وہ فوڈ انجوائے کرتا ہے جب کہ درحقیقت وہ صرف اپنے آپ کو فوڈ کرتا ہے، کسی کو میڈیکل چیک کا گمان، یا تو کسی کو شاعری کی کچھ لہجہ کا ناگاہک، یا طرح پر کچھ لوگوں کا خیال ہوتا ہے کہ وہ محبت کرتے ہیں لیکن صاحب یہ ہر کسی کا نام نہیں، یہ جاوید سب کے دل پر گزرتا ہے۔ احساس، شفقت، نرمی، تعجب، غلط فہمی اور جانے کون کون سے لطیف جذبات ایک خاص تناسب کے ساتھ دل و دماغ میں کھجواں تو محبت کا پورا دھرم پاتا ہے، لیکن غم صاحب یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے محبت کی ہے، اپنی زندگی کے ساتھ بیوی بچوں کے ساتھ سرین کے ساتھ اور سہ کے ساتھ سبیلے سرین کا اپنے من و دماغ میں پاتر تار تار ہوتا ہے کہ وہ غم گہرے سے گہرے سرین کا خاص اعزاز سے تیار ہو جاوے اور کہنا کہ تیار ہونے کی جگہ کے یہاں آنے سے قبل وہ انہیں جلی جاؤں گی۔ اتنا کمال کر دیا غم اقبال بھائی دلی چھوٹا "شیشال سے ٹوڑو" نے۔ بہت کچھ یاد دلایا۔ سدا خوش رہیں۔"

☆ امیر شمس کا سندری سے تجویز۔ "مرگ نہ گمان" "مرگ نہ گمان" کب سے انتشار تھا۔ انتشار کی گڑیاں بائیں دیکر خوش ہوئیں اور ڈائجسٹ ہاتھ میں آیا۔ یک ہی سرگزشت فروغ فرخ زاد کی تھی۔ باندھوں میں بکڑی اس دلیر خاتون نے مختصر زندگی میں اپنے خواب بے اور امر ہو گئی۔ "مرگ درویش" میں مجید مجید کے حالات زندگی، تہذیب اور موت کے متعلق معلومات ملیں۔ ناکام گلوکار کی جدوجہد بڑھتے ہوئے چاند گہرے کی یادوں میں قدم رکھا۔ پروین شاکر کی شاعری کے قلم حارح سے ہی ان کی شخصیت زندگی اور جدوجہد کے دل میں ان کے لیے عزت کی گناہ بواہی۔ پروین شاکر کی موت کوٹ جنت تعجب فرمائے۔ جاسوس، جہاں مرگ، خود کشی سے سزا تھی۔ "قاتل باؤنسر" میں کبیر عباسی نے قلب ہیرو سے حصار فرمایا۔ "مرگ مل" اور مصدوم نے مختصر قصے لکھ کر اڑھیں۔ "مٹی کی" میں زیادہ تر خوشی اخیری انشور کے سوالات پر لیکن زارہ ہو گیا پس۔ نزع غم نے بھی معلومات میں اچھا اضافہ کیا۔ سلطان راعی کے بارے میں پڑھ کر اچھا لگا۔ جی جیائوں میں "مرگ برگ" باب پر دہی روٹھے کفر سے کر دینے والی حیرت تھی۔ اس بہترین شاعرہ کے لیے مدبر اور تمام رائلز کو ذمہ دار مہارک باد۔"

☆ احمد خان کو حیدری نے راولپنڈی سے تبصرہ کیا ہے۔ "مرگ نہ گمان" کا پہلے ہی سے انتشار تھا۔ ترقی کی اسٹال کا چاروں مک میں شام چکر لگنے کے باوجود نماز، 23 دیکر کو ایہ فریخ کر کے صدر سے لایا۔ سردیوں کی طویل راتیں جیسے آٹھ بجے تک چلی کر منا شروع کر دیا۔ مدبر و حصار حصار رسول آپ کچھ پھر کر بات کرتے ہیں۔ دس روپے اضافہ کوئی قیامت ہے۔ دس روپے میں کیا ملتا ہے؟ انتہائی غم سے بکھر کر گزرتے ہیں "ناسود" نہ ہو۔ تو بھر ہے۔ "مٹی خالی" میں چھٹا لگا لگا۔ ناصر عطر طویل تبصرے کے ساتھ کچھ صدارت پر مہارناں سی۔ مٹی عزیز نے کا طویل تبصرہ سال بھر شہریت والوں کی حاضری لگنے پر شکر یہ۔ رانا شاہد، انجائز شاعر مدبر ناگوری، امتیاز بخاری، زہرت افشار تبصرے اور محمد کربل تھے۔ بھائی مٹی عزیز نے لڈن و ہاڑی کے سوا سب بھول گئے، یہ زمانے کا چلن ہے۔ "مرگ نہ گمان" ہنر کی تمام کہانیاں اچھی ہیں۔"

☆ امیر حمزہ اشرف نے کوٹ نواب دھان سے لکھا ہے۔ "دوستوں سرگزشت 24 دیکر کو لا۔ کسی صدارت پر ہمارا ریکارڈوں کی شہدائی ناصر حسین دیکر ہوا۔ ابرار خان آیا۔ دیکم یک جناب، بھائی ناگہم شاہد آپ کے دکھ کچھ سکتے ہیں۔ میں صرف نو سال کا تھا جب میرے والد صاحب 2008ء کی ایک سرد شام کو لڈن کو پیارے ہو گئے۔ ماں نے بھی بھی والد صاحب کی کی محسوس نہیں ہونے لگی لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ 12 اپریل 2015ء کو میری والدہ بھی خالق حقیق سے جہاں۔ سالانہ تجویز پر قلم مٹی عزیز نے محنت و جانفشانی کا ثبوت ثبوت تھا۔ ویڈیو جناب۔ "چاند گہرے" پروین شاکر کی شخصیت سازی میں عسکری صاحب اور والدین کا کردار اہم رہا۔ شاعر کے حالات زندگی جان کر اچھا لگا۔ جی جیائوں میں زین قرہ کے مراسلات نے معلومات میں اضافہ کیا۔ "مصدق" وہ مصدوم خواہشات دیکھنے والی بیوی کی لڑکی اتنی فریک واقفی مصدوم تھی۔ "مٹی گڑبہ" بے شک اس حقیقت سے انکار نہیں کہ گروت اور گیتا نے خود اپنی جانی و بڑائی کا سب سے سبک دیا، مٹی خالی، خوش اور جاسوسی اچھی تحریریں ہیں۔"

☆ محرم رضا احمد اعوان کا تجویز بکھرے۔ "طالع نقی پر راحت و فلاحیت کی "مرگ مل" خاسے کی چیز تھی۔ 25 سال کی مختصر زندگی میں لازوال کامیابی حاصل کی۔ طویل دورانیہ کے مکمل "زندگی بھنگی" اور "کامیاب سیریل" وارث" میں لاجواب اداکاری کر کے انٹرنیشنل چھوڑے۔ انور فریاد کے معنوں "مرگ فدا" میں عاقبت کا ٹکس لکھنا اور ادا کا فدا اور دہرے کے بارے میں پڑھ کر دل اور دماغ ہو گیا۔ حیدر مراد کے متعلق تو ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ ان کی موت ہمارا حال تھا۔ طالع نقی بھنگی کی اس پر دے کے پیچھے جتنا حق کو جاننے کی کوئی عیبہ و کوشش نہیں کی تھی اس بات پر یقین باؤنڈ "شیشال" میں (خاص شمارے میں نہیں دی جاتی) معروف شاعر پروین شاکر پر زور اچھا لگا۔ "مصدق" "چاند گہرے" "بھنگی" اور "مٹی خالی" بہترین سمر تھے۔ جی جیائوں میں عالی کی "چھوٹی جانی" اسحق قری کی "بھری گویا" اور "سکندر عباسی کی" "مٹی گڑبہ" کا ترتیب پہلے دوسرے اور تیسرے نمبر پر ہیں۔ رانا محمد شاہد نصیر اللہ خان اور زہرت افشار کے تبصرے دلچسپ اور خوب تھے۔

☆ انجائز حسین شہار پور پر قلم کا تبصرہ۔ "بے سال کے پہلے شمارے کا ٹکس لکھنا دیکر خاص نمبر کا پل ر ہا ہے۔ اتنی جہاں ہما معلومات، آپ بیتیاں اور جی جیائوں پڑھ لینے سے جو مزہ حاصل ہوتا ہے کھلا اس کے سامنے دس روپے کی کیا اہمیت ہے۔ ہمارا دل و دماغ ہم نے قبول کر لیا۔ مٹی عزیز نے بے پورے سال کا ریکارڈ محنت اور بات سے ترتیب دیا۔ شکر قبول کیجیے۔ میرے عزیز بھائی میں نے پورے بارہ دیکھ کر دیکھ کر ڈاک کی بے پروائی کی تھوڑے ہو گئے۔ "مرگ درویش" میں مجید مجید کی کامیابی اور ہمارا باندے کا احوال پڑھ کر دلی دہی دیکھنے والا غم غمراہ ہوا۔ انسان کے منصوبے کی دوائیں تک کے ہوتے ہیں لیکن

شاعروں کا بہت ہی خوب صورت اعزاز میں ذکر کیا۔ جان بیکس کی بعض نقیوں میں نے پڑھی ہیں خصوصاً بیکس کی آخری عمر کی شاعری بہت خوب صورت ہے۔ انعام اللہ یقین مرزا منظر مہمان کے عہد کے بہت ہی زود گوشتار تھے لیکن حیرت ہے کہ مولانا محمد حسین آزاد نے "آپ حیات" میں ان کے حوالے سے کوئی مفصل معلومات نہیں دیں۔ گلیب جلائی نے اس وقت اپنے آپ کو موت کے حوالے کیا جب وہ اپنی شاعرانہ ملاجیوں کے مروجہ تھے۔ اس طرح اسرار الحق مجاز کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ اگر مجاز بہت عرصہ موت کا شکار نہ ہوتا تو وہ اقبال کے ہم پار ہوتا۔ جوش ملیح آبادی نے اپنی سوانح حیات میں مجاز کے بارے میں تفصیل لکھا ہے۔ مصطفیٰ زیدی 1950ء کی دہائی کے بعد سب سے اچھا لکھنے والوں میں سے تھے۔ مصطفیٰ زیدی کو جوش صاحب کا قریبی ہونے کی وجہ سے اکثر اہل مقبولوں نے نظر انداز کیا جس کا اظہار انہوں نے اپنے مجموعہ "گودا" کے دو باب میں بھی کیا۔ فیض اور ناصر کاظمی کے بعد بلاشبہ مصطفیٰ زیدی غزل کے نامور شاعر تسلیم کیے گئے۔ نامور نفاذ کے منصوبے بھی گویا کم عمری کی لیکن انفاذ کے تاریخی منصوبے کے بغیر باکمل رہے۔ کی۔ منظر مجاز میں میں باہر مل ہوا تھا لیکن ایسے حقیقی لوگ نصابی تعلیم کے تحت نہیں ہوتے جیسا کہ احسان دانش صرف چار ہفتے میں پاس تھے۔ خطہ جاندہری صرف سات، مولانا مودودی صرف سترک اور ناصر کاظمی بھی ایف اے تھے مگر آج ان لوگوں کی کتابیں ہمارے نصاب تعلیم کا حصہ ہیں۔ "مصدق" میں ایک ڈین لڑکی کا کہنا ہے کہ مجاز کو ہونا داس کر گیا۔ "شیشال سے ٹوڑو" جوں جوں آگے بڑھ رہی ہے بہت دلچسپ ہوئی جاری ہے اور ساتھ ہی فرنگی معاشرے کے عکس بہت خوب صورتی سے عیاں کر رہی ہے۔ آخر میں کہنا چاہوں گا کہ "مرگ نہ گمان" "مرگ نہ گمان" ناصر کاظمی (1925-1972) ڈاکٹر عبد الرحمن بخاری (1885-1918) اور سلیم بیگ کا ذکر نہیں تھا حالانکہ ان کا شمار بھی کم عمر شاعر میں ہوتا ہے (ناصر کاظمی پر مفصل سرگزشت آچکی ہے)۔"

☆ سید ذیشان حیدر کاظمی نارووال سے قطر آ رہے ہیں۔ "جاسوسی ڈائجسٹ سے تو میرا شہر بہت پرانا ہے لیکن سرگزشت ڈائجسٹ لینے اور پڑھنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ کچھ عرصہ سے مرگ نہ گمان ہنر کا ذکر کرتا رہا تھا اس لیے پڑھنے کا ارادہ کر لیا۔ "مٹی خالی" کے باندھوں میں گمان جاتا تو نہیں لیکن عزیز نے اور ناصر صاحب کی محبت نے اتنا ترش کیا کہ یوں کہہ سکتے ہیں کہ جیسے میں نے بھی سارے سال کے شمارے پڑھ لیے ہیں۔ فہرست میں ان کی جگہ پچھانے اور بہتر ملاحظہ کر کے "چاند گہرے" سے کیا۔ پروین شاکر کے بارے میں صرف اتنا معلوم تھا کہ وہ بہت اچھی شاعر اور اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ ان کی زندگی میں اتنے آثار چڑھاؤ اور مصیبت و آزمائشیں تھیں اس کا اندازہ کر پڑھ کر ہوا۔ دس کم بن اشرف صاحب کی "خوشی" دیکھی۔ مصطلب پر لکھی مٹی اچھی کہانی تھی۔ جیسے جیسے دیکھتا ہوں کون بھول سکتا ہے۔ ان کی دردناک موت ہم سب کے دلوں پر لگا ایک ڈھم ہے۔ مرکزی پہلوؤں کا احاطہ کرنا یہ تحریر بھی پیدائی۔ ڈاکٹر صاحب مجھے نے اپنا غور سے حصار فرمایا۔ منظر کا کثیف شخصیات کے متعلق حصار فرمایا۔ کبیر عباسی کے "قاتل باؤنسر" کا انداز بیان بھلا لگا۔ "مٹی خالی" میں اربع کریم کی زندگی کا احاطہ کیا گیا لیکن تحریر پر پوری نہیں اڑتی۔ "مصدق" ایک مختصر تحریر تھی لیکن اس کا تاثر بہت گہرا تھا۔ جی جیائوں میں "مرگ برگ" نے کچھ لوگوں کے لیے بالکل نیا عالم کھلا دیا اور آخر کار کئی پختہ اور صحیح بہت اہم ہو گیا تھا۔"

☆ قیصر خان کا تبصرہ ہے۔ "ادارہ میں بہت قیامت کے اضافہ پر دلائل بہت مضبوط تھے۔ بہت بڑی شاعر کے بارے میں ایک مٹلے میں پڑھا۔ کرسی صدارت پر ناصر حسین رتے۔ بہت مہارک باد۔ مٹی صاحب سالانہ تجویز کے ساتھ حاضر تھے بہت خوب صورت تبصرہ تھا، پڑھ کر حیرانی ہوئی۔ تجویز بہت باریک بینی سے کیا گیا تھا۔ پہلا مضمون ڈاکٹر ساجد امجد کا تھا کہ شاعر تھا۔ فیما غور مٹی خالی دان کے بارے میں پڑھ کر خوش ہوا کہ اس نے بڑے فلاح سزا کا یہ حال ہوا۔ "مرگ درویش" ایک خوب صورت اور مہر گلوکار کے بارے میں بہت خوب صورت مضمون تھا۔ "ناکام گلوکار" ایک منظر تحریر تھی۔ "چاند گہرے" میں اس مشہور شاعر کے بارے میں بہت سنا کہ وہ کسی کو پسند کرتی ہیں لیکن کوئی خاص ثبوت نہیں ملا (آپ "چاند گہرے" اور "خوشی" کو لگا کر پڑھیں)۔ "جاسوس" ایک بہادر لڑکی کی داستان جو کزور اعصابی طاقت کی وجہ سے ان فحش تھی لیکن اللہ کے حکم سے اور بڑا تر سے اس نے وہ کر دکھایا کہ آج بھی تاریخ میں سورج کی طرح روشن ہے۔ "خوشی" اتنے بڑے شاعر کا یہ حال ہوا پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ اس طور داس آفس مین کے ساتھ بھی خوشی و دلدادہ تھے جیسے اللہ ان کی محفرت کرے۔"

☆ مختصر غم و ہرہ کا تبصرہ حیدر ابتر سرگزشت کا خاص نمبر "مرگ نہ گمان" کی صورت میں سامنے آیا۔ بڑی دلچسپی اور توجہ سے پڑھا۔ آپ نے درست فرمایا کہ یہ بچہ عام سا پرچہ نہیں ہے بلکہ معلومات کا خزانہ ہے۔ آدمی کے ظاہر و باطن کی طرح رسالے کے ظاہر و باطن میں اگر کوئی بڑی بڑی نظر نہ تو قوی خوش ہوتا ہے۔ میں آپ کو سرگزشت کے ظاہری حسن اجرام اور محسوس حسن ترتیب دونوں پر مبارکباد دیتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ آپ اسے خوب سے خوب تر بنائے میں کوئی دقیقہ نگراشت نہیں کریں گے۔ پروین شاکر کی شاعری اور مٹی زیدی کے متعلق آرائش "چاند گہرے" پڑھ کر انسان اور دنیا کی بے مثال بی پرواہی۔ ڈاکٹر نصیر کے مختصر مضمونوں کی غلط فہمی پر ان کی زندگی میں تھکنا بھول دیں۔ جس سے وہ مجبور ہو گئی تھیں تاسر تاریخیاتوں اور ان تصانیفوں کے باوجود ان کا رویہ قابل تحسین رہا۔ راحت وفا کی کہانی "مرگ مل" اس لیے اچھی لگی کہ انہوں نے ڈسکہ کی مٹی کو کھائی ہے اور کہانی میں سمجھا ہے۔ یہ پوری کہانی ایک خوب صورت غزل کی مانند ہے جس میں وزن و بحر اعلیٰ میں ہے اور حقیقت بھی کہانی کا بہاؤ ایسا ہے کہ پڑھنے والا بے اختیار ڈوب جاتا ہے۔ جی تو ہے کہ اگر لکھنے والے کی باریک بینی اور شاہدہ کھرا ہے تو اس کی ہمارے خود بخود دھار کر سامنے آ جاتی ہے۔ ظاہر و باطنی بلاشبہ ایک نامور اور رسالہ ادا کارہ تھیں۔ "مرگ برگ" کے متعلق بھی کہا جاسکتا ہے کہ خود کردار اعلیٰ ہے۔"

☆ محرم انور جوتانی نے لکھا ہے۔ "محبت خاص کو عام کر دیتی ہے، آدمی کو انسان بنا دیتی ہے، عام سا قاری لکھاری بن جاتا ہے۔ انسان عام

کبیر مہاشی بھی اس یادگاہ تیرے کی زینت ہے۔ لیکن، ڈیویلیک، فرسٹ کلاس اور کیرئیر کے ریکارڈز سے ہوتے ہوئے فلپ ہیوز کی ذہنی کے آخری لحاظ اس اعزاز میں بیان کیے گویا وہ ماضی کی فلم کی صورت آئینوں کے سامنے چل رہی ہیں۔ ہیوز کی موت کا عارضہ واقعی الزائما تھا۔ عظیم اقبال کے تصور کی لچے میں ”شمال سے نوروز“ بہت اچھا جا رہا ہے۔ اعزاز تحریر کے ساتھ ساتھ بقدرت نگاری اور سحر کشی بہت عمدہ ہے۔ ”ناسور“ مگر گرج کے ساتھ ایک بڑھ رہا ہے۔ کرداروں کی بہت زیادہ بہتاس ہو گئی ہے۔ ٹولی ایک بار گھر میں ٹھک رہی ہے لیکن پریشانی کی ایک بات نہیں ہو رہی کہ کچھ نہیں ہوتا۔ ”مرگ برگ“ پہلی جگہ جانی جس نے بہت کچھ سوچے پر مجبور کر دیا۔ ایلیس واقعی فرسٹ کے بعد زیادہ پڑا کر ہے چاہا ہے لیکن انسان ایک نوجوان بھول جاتا ہے۔ جلد حیدر بگانی اور ڈور ورائسن کو بھرتی کی اتفاق گہرائی میں چمیک دیتا ہے۔ ”بجائے“ نے آہ بچہ کر دیا۔ ”بھوٹی جی جان“ حیران کن آپ جی ہے۔ ”ڈوے دار“ سبق آموز روفا جی۔ ون دیگ نے ٹی گھر اجاڑ دیے۔ حکام کو اس کے بارے میں سخت قانون ساز کی کرنی چاہیے۔ ”غاسم جیبر“ میں لحاظ سے ایک شاعر غبار میں اسے جلد کر کے رکھوں گا۔ پوری فیم اور ادارے کو بہت مبارکباد۔“

☆ شہینہ گل کا غلوں نامہ راولپنڈی سے۔ "مرگہ رویش" از انور ریاض، مضمون کے طرز میں لکھی گئی تحریر جو مجید جیشہ سے متعلق تھی اس میں میوزک کی ریکڑ کے حوالے سے کافی تفصیلات شامل ہیں لیکن انتخاب اور اس کے بعد کے تاقابل میں تقریبی جید جیشہ کے تعلق سے جماعت سے وابستہ ہونے کے بعد میوزک چھوڑا تھا لیکن ایک بار مجید میوزک کی دنیا میں واپس سمیٹ لیے گئے تھے اور مولانا طارق فہیم نے پھر ان کی ہمت کر کے انہیں واپس نکالا اس باب کی کوئی تفصیل نہیں بلکہ یہ بہت اہم قدم تھا۔ "ناکام گھوکاز" از شاد لطیف اظہار قاضی کے حوالے سے تحریر عمر بھری آگئی، نگہانی موت کے احوال نے دل دلا دیا۔ "چاند مرگن" یونین شاکر کا احوال جو دیا گیا کاناز نے بعد خوبصورت افسانے کی طرح لفظ لفظ موت پر پروکھسا۔ یہ انعام داغی بہت پیسہ ہے۔ علی کا جیشہ میں بیرون شاکر پر مبنی کلام دیکھیے ہوں۔ انکا ایک ایک دو کاک ایک خوش محسوس کرسی ہوں۔ اس میں ان تحریر میں ایسی کھلی کوفت کرنے کا احساس مل گیا۔ ڈھانے آگئی زندگی کے ایک ایک اہم باب کو مکمل تفصیل سے لکھا میں رینگ کر دل تو اس تحریر کو ناپ رہی ہوں کی۔ "جواں مرگ" از امیر امام نے چیدہ چیدہ شور و خفیات کی ذلت کا احوال آگئی جواں مرگ کے سارے سمیت لکھا۔ "مرگہ گل" از راحت و فاما نجات طاہرہ نقوی کا مختصر سا احوال اچھا لگا۔ "مرگہ نکاز" از انور ریاض ہیں۔ علی اداکاروں کی اسوات کا احوال بتایا ہے مرگہ نکاز کے بجائے مرگہ جبرت کا عنوان دینا زیادہ موزوں ہوگا۔ "مضمونی" کی از زرین قراری، کریم زہرا عادی کی مضمونی زندگی کا احوال۔ دیا اچاز کے ساتھ ساتھ میں ان تحریر کو بھی دل دیر دوں گی۔ اس قدر پیارے اعزاز میں زرین قراری نے لکھا کہ اس کے ہاتھ چوم لیے کو دل کرنا ہے۔ اس باری آتی ہے کچھ چائوں کی۔ "مرگہ برگ" از بشری شوکت۔ میرے حب سے سب سے بہتر کچھ بیانی دل لگا اور پھر درجہ برت آگئے اور اس ترین۔ واقعی انسان کا فخر اور اسے تادہ کرنے کے لیے کافی ہیں۔ "نہارہ" از نعیم الحسن ہے کچھ بیانی کچھ انجمنی۔ قابل ذکر اور قابل تحریف و مروت کا خوب لاطعانی تعظیم کی جڑ کا سنا ہے۔ "چھوٹی سی جان" از عالیہ انکان میر اپنی تمام پہنچ تو اس اتنا کہ جس کی مضمون بچہ کی موت پر مبر کرنے سے لٹھ کا اس ماں کے لیے جنت میں ایک گھر بنوا دیتے ہیں جس کا نام ہے بیت اللہ۔ "نوسے دار" از حاضر شاہن ابھانی اہم مجلس شریں ہمیشہ کوشش ہوں جب مرگ پر پہنچوں تو دل ہلنا کرتے دیکھتی ہوں۔ "مرگہ ناگہاں" کے طور پر فزونیہ جعفر عرف قدیل بلوچ کا کادہ کرہ عاشقین میں پڑھا۔ کو کہ وہ پاکستان کیلئے قابل توجہ تھی جس کی منکر بھرت علی اس کی اپنی بھی تفصیل سے لکھا جا چاہیے تھا۔

[illegible]

آٹھویں جماعت کی یا سنی سے مسلسل پڑھتا اور سنتا چلا آیا آج ان کے بارے میں مکمل جاننے کا موقع ملا۔ انسانیات، جملہ و کمرانی سے کتنی تکلیف اور قربانیاں ان کے لئے آئی ہے اس کا اندازہ یہ آکر نکل پڑے جو بخیر ہو جاتا ہے۔ ”چاندی کو دوشی اس کی اپنی نہیں بلکہ یہ سورج کی منعکس روشنی ہے۔“ اس حقیقت کے درامی شاید ہی جانتے ہوں کہ بظہر یہ سب سے پہلے فیما غورس نے پیش کیا جس کے ہاتھ میں اسے چھو کا پیسا رہا وہ چاندی ہے۔ آجھ وہ سنے پڑے۔ یہی ایک آکر نکل پڑے کہ ہمارا ہیبت وصول ہو گئی تھی۔ ”جاسوسہ“ میں معص نے جنگ عظیم کے ایک کام نام کو زندہ کر دکھایا۔ یہ چاندی کے خلاف بظاہری جاسوسی کا ایک کھیل تھا۔ ایکٹ فور کی دہری اور لی بی بی جیسے براڈ کاسٹنگ ادارے کے ذریعے چاندی بظاہر کی ترسیل نے حریت زدہ مار کر دیا۔ کہ کبھی جاسوسی کی جیت اور جیسے کام سپاہیوں کی لازوال قربانیوں سے ہی نکلی ہوئی ہے۔ یہ ”مضمون بھی بہترین رہا۔“ جیال سرگ ”میں مہتر امام صاحب نے اُسب سے شک بلکی و فخر علی اور جیال کا ذکر کیا۔“ ”فصل باؤنڈر“ میں سیر کیم جی نے آسٹریلیائی پینٹین قلم پورڈ کی دل میں موت کو اپنا موضوع بنایا اور ابتدا سے لے کر انتہا تک پوری یادداشتیں یہ مضمون کے لوازمات پورے کر دیئے۔ ”مرگ فکار“ میں پہلی بار پاکستان فلم انڈسٹری کے چند ہر اسرار نامی اُموات کے بارے میں پڑھنے کا موقع ملا لیکن مضمون میں حقیقی رنگ کی بجائے ذہنی تھرے کی زیادہ جھلک دکھائی دی۔ سلطان راہی صاحب کی موت کی تاریخ نہ پڑ کر لکھی رہ کر رہی۔ آخر میں ذکر خاص نمبر کی وہ خاص الفاص خدیوؤں کا ذریعہ قلم رباعی تحریر تھی مگر اس کی ایک ایک لائن نے دل و دماغ ساکت کر دیئے۔ ارفع کریم کی نامگاہ موت نے صرف پاکستان ہی نہیں دنیا بھر کے آئی بی اہرین کو کشتہ کر دیا تھا۔ ان سے عالمی ماہرین کو بہت توقعات تھیں۔ وہ ہمارے ملک و قوم کا ستارہ کے کی طرح چکا بختی را آئیں کچھ قریں میں طریتیں۔ قمر صلیب کا موضوع انتخاب اور طرزِ تحریر و دونوں نے انھیں ”مگدور“ کی ”مرگ نامگاہ“ کی یاد و حذر تھی جس نے دبیز اندر کی طاری کر دی۔ اس کے بعد ذکر شاعرے کی سب سے خاص تحریر (میری نظر میں) کا چاند کریم بن شد و اپنا اعجاز کا طرز و ذخیرہ الفاظ، مضمون کا اسلوب اور سب سے بڑھ کر ہر یون شا کر صلیب جیسی ہر لفظ پر شاعر کا انتخاب۔ سب کچھ دل کو چھو لینے والا تھا۔ جاسوسی ڈائجسٹ میں ذرا اعجاز کی کتابوں میں رطب، اطران ہوتے ہوتے کبھی نہیں سوچا تھا کہ ان کا لکھا کوئی اثر آکر نکل پڑے کہ رطب ایسے جاسوس کے لئے تو صرف وہی صلیب کی زبان ہی تنگ ہو کر رہ جائے گی۔ ہر یون صلیب کی زندگی کا مکمل احاطہ اور موقع کی مناسبت سے ان کے کلام سے استفادہ مضمون کو بالکل نئی جیت دے رہا تھا۔ چنانچا اب ابھی تک ہر مطالعہ میں ان کے بنیادی عناصر اور مضمون بھی خاص نمبر کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں۔ ہانس گنڈر ہما جی نے رسم پر مبنی جوانی کا فزکس پر لکھا جس کی زندگی اس آکر کی خصوصیت زندگی کی بازی رہا جاتے ہیں۔ آخر میں ایک بار پھر یون ہیتم کو پتہ دل سے سہار کاوا بنایا جاوے گا۔ نئی زمانہ ڈائجسٹ کتابوں اور دیگر پرنٹ میڈیا کے حوالے سے پڑھنے کی شہر شہر ذیلوں حالی کی دکھار ہے ایسے میں آپ جیسے صاحبِ ذوق احباب بچے بچے پڑھنے کے شائقین کے لیے اپنی توانائیاں صرف کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خیریت و استحکام عطا فرمائے۔

[illegible]

اس بار تاخیر سے موصول خطوط کی تعداد اتنی ہے کہ صرف نام بھی دیا جائے تو ایک صفحہ بھر جائے۔ اس لیے معذرت خواہ ہیں۔

معاشی

ڈاکٹر ساجد امجد

علم کی چاہ میں وہ دیار دیار پھرا مگر جب اس نے اپنی علمیت کا مظاہرہ کیا تو ایک عالم چونک اٹھا۔ اس نے نظریات کی اس طرح وضاحت کی۔ ایسی اصطلاحیں واضح کیں کہ دنیا حیران رہ گئی۔ عالم مقال اور مادی کائنات کو سمجھنے کے لیے اس نے کلیہ سمجھایا۔ وہ نہ صرف علم و افکار کا معلم تھا، موسیقی پر بھی کمال رکھتا تھا۔ ایک ہی لکڑی کے آلہ سے وہ ایسی موسیقی پیدا کرتا کہ لوگ زار زار روتے اور پھر اسی آلہ میں ہلکی سی رڈوبدل کر کے موسیقی بجاتا کہ لوگ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے پھر وہ اسی آلہ میں رڈوبدل کر کے بجاتا تو لوگ سو جاتے۔

بے نظیر ویکٹا منکر کہ وہ علم و فن کے معراج پر تھا

کتابیں پڑھنے لگا ہے پھر کیوں مشق کرتا ہے۔
”جس ایک ہی کتاب نہیں پڑھتا۔ بدل بدل کر پڑھتا ہوں۔ یہ دیکھیے یہ افلاطون کے فلسفے پر ایک کتاب ہے اس نے تو میری آنکھیں ہی کھول دی ہیں۔“
”عظلی میری ہی تھی۔ میں نے تجھے گاؤں کے کتب میں بٹھا دیا۔ وہاں کے مولوی نے تیرا دماغ خراب کر دیا۔ تیرے ہاتھ سے نکوار چھین کر کتاب چھادی۔“
”آپ اپنے قلعے سے باہر نکلیں تو دیکھیں۔ ان کتابوں نے اسلامی دنیا کی کسی خدمت کی ہے۔ تاریخ میں بادشاہوں کے سوا کسی کا نام محفوظ نہیں لیکن ایک ایک عالم کا نام زندہ ہے۔ ہمارے صوبہ قاراب ہی میں کیسے کیسے عالم موجود ہیں اور بخارا تو علوم و فنون کا مرکز ہے۔ مجھے کوئی بتا رہا تھا کہ وہاں تین سو سے زائد مدارس ہیں جہاں فلسفہ، سائنس، ریاضی، منطق اور خدا جانے کیا کیا پڑھایا جاتا ہے۔ بازار سے گزرتو تو گاؤں کا ہر کم عالم زیادہ نظر آتے ہیں اور ایک بخارا پر ہی کیا مختصر عراق، بغداد، شام، مصر، غنشا پور کتنے ہی علمی مراکز ہیں۔ ابا جان کیا سب نکواریں لیے کھوم

طرخان کی روز بعد گھر آیا تھا اور اسی طرح گرجتا پڑتا گھر میں داخل ہوا تھا جس طرح وہ ہمیشہ آتا تھا۔ اس گمن گرج میں اس وقت مزید اضافہ ہو گیا جب اس کی نظر اپنے بیٹے ابوالنصر پر پڑی جس کے ہاتھ میں اس وقت بھی ایک کتاب تھی جس طرح ہمیشہ ہوتی تھی۔ اس نے ابوالنصر کی چوڑی اپنی چھری سے نوچ ڈالی اور برسنے لگا۔

”تیرے ہاتھ میں نکوار کی بجائے کتاب دیکھ کر میرا خون کھولے لگتا ہے۔ تو طرخان کا بیٹا ہے سپاہی زادہ ہے۔ تیرا باپ ترکستان کے ایک قلعے کا کمان دار ہے اور تو ہے کہ عورتوں کی طرح کتاب ہاتھ میں لیے بیٹھا رہتا ہے۔ کیا تجھے ابوالنصر نکوار کے ہاتھ سکھانے نہیں آتے تھے۔“

”آتے تھے اور ابھی ابھی رخصت ہوئے ہیں۔“
”ان کے جانے کے بعد تو تجھے یہ چاہے تھا کہ تیرا کمان ہاتھ میں لیتا اور نشانہ لگانے کی مشق کرتا۔“

”میرا نشانہ پکا ہو چکا ہے۔ اب مشق کی زیادہ ضرورت نہیں رہی۔ آپ کہتے ہیں تو وہ بھی کر لوں گا۔“
”اس طرح تو تجھے عربی کی مشق بھی خوب ہو چکی۔“

رہے ہیں؟ کچھ ہاتھوں میں کتابیں بھی ہیں۔ میرے ہاتھ میں کتاب رہنے دیں۔“

”جو عالم ہیں ان کا باپ بھی عالم ہوگا تو سہاٹی کا بیٹا ہے تجھے سہاٹی بننا ہے۔“ ابو نصر ایک کوئی جواب نہ دے سکا کیونکہ اس کی ماں درمیان میں آگئی تھی۔

”تم تو ہمیشہ کانٹوں کی جھاڑیاں ساتھ لے کر گھر میں داخل ہوتے ہو۔ آتے ہی میرے بیٹے کے پیچھے پڑ گئے۔“

”اس کی عادتیں تم ہی نے خراب کی ہیں۔“

”میں نے تو اس کو ایسا بنایا ہے کہ پورا قصبہ اس کی تعریف کرتا ہے۔ گھر سے باہر تک تو لکھا نہیں ہے، رات کو بھی چراغ کی روشنی میں پڑھتا رہتا ہے، مجھے تو اس سے کوئی شکایت نہیں۔“

”شکایت تو ابو نصر کو ہے۔ وہ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ یہ گنوار بازی میں ذرا بھی دلچسپی نہیں لیتا۔ کبھی بھی تو سر درد کا بہانہ کر کے انہیں رخصت کر دیتا ہے۔ اس کی عمر کے دوسرے لڑکے فن سپہ گری کے تمام اصول سیکھ چکے اور یہ ہے کتاب میں تم سے کیا کہوں۔“

”کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ بچے کو وہ بننا چاہیے جس میں اس کا دماغ خوب چلتا ہو۔ میرے پاس فاراب کے جید عالم، ابو نصر کی تعریف کی غرض سے آئے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے ابو نصر کا دماغ فلسفہ اور منطق میں خوب چلتا ہے۔ اگر اسے علم فن کی راہ پر ڈالا گیا تو یہ ارسطو اور افلاطون کے پائے کا عالم بنے گا۔“

”بن چکا عالم، میں اسے سہاٹی بناؤں گا۔“

”تم میرے بیٹے کو میرے ہاتھ سے نکال دو گے۔ اسے فاراب میں ہی رہنے دو۔ اگر یہ تہیاری سختی سے گھر سے بھاگ گیا تو میں ویران ہو جاؤں گی۔“

”تم سے زیادہ مجھے اس کا مستقبل عزیز ہے۔ بس چپ کر کے بیٹھ جاؤ۔“

ابو نصر کی ماں واقعی چپ ہو گئی۔ طرخان نے بھی اس وقت خاموش رہنے میں عافیت جانی۔ کچھ دیر گھر میں رہنے کے بعد اپنا غصہ اتارنے کے لیے دوستوں سے ملنے چلا گیا۔ دوستوں سے مل کر آج اسے خوشی ہو رہی تھی۔ وہ جس سے مل رہا تھا اپنے بیٹے کی تعریف سن رہا تھا۔ پورا قصبہ جیسے ابو نصر کے کن کا رہا ہو۔ وہ رات گئے گئے گھر کی طرف لوٹا تو اسے پھر ابو نصر کا خیال آ گیا۔ اتنا اچھا لڑکا ہے اگر یہ سپہ گری میں ملحق ہو جائے تو میرا کتنا نام روشن کرے گا۔ گھر میں داخل

ہوا تو اس کا غصہ ایک مرتبہ پھر اس کی خوشی پر حاوی ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ ابو نصر چراغ کی مدد میں روشنی میں ایک کتاب پر جھکا ہوا ہے۔ ساتھ ساتھ کچھ لکھتا بھی جاتا ہے۔

”اتنی رات ہوئی تم ابھی تک سوئے نہیں۔“

”آپ سو جائیں۔ میں یہ کتاب ختم کر کے سو جاؤں گا۔“

”کتاب بند کر دو اور سونے کے لیے لیٹ جاؤ۔“

”جی لیا جان۔“ ابو نصر نے کوئی مزاحمت نہیں کی اور اپنے بستر پر چلا گیا۔

اس کے باپ نے تاروں کی جھاڑوں میں اسے اٹھا دیا۔ ”میں جب تک یہاں ہوں تم میرے ساتھ گنوار بازی کی مشق کیا کرو گے۔ جلدی افکار اور تیار ہو جاؤ۔“

اس نے اس وقت بھی کوئی مزاحمت نہیں کی۔ دونوں باپ بیٹے مکان کے اس حصے میں چلے گئے جو گنوار بازی اور تیر اندازی کے لیے مخصوص تھا۔

دونوں نے جنگی لباس پہنا تا کہ کوئی ایک دوسرے کو زخمی نہ کر دے۔ گنوار میں ہاتھ میں لیں اور ایک منصوبی مقابلے پر آمادہ ہو گئے۔

طرخان کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا جب اس نے ابو نصر کو کسی ماہر جنگجو کی طرح وار کرتے اور وار دے دیکھا۔ کئی مرتبہ تو طرخان کو یہ احساس ہونے لگا جیسے وہ بوڑھا ہو گیا ہے۔

”تم تو بہت کچھ سیکھ چکے ہو۔“ طرخان نے اپنے ماتھے سے پسینا پونچھتے ہوئے کہا۔

”ابو نصر نے مجھے تمام گر کھاد دیے ہیں۔“

”اب تم مکمل فوجی بن سکتے ہو۔“

”میں اس فن کو بطور پیشہ اختیار کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔“

”میں نہیں چاہوں گا کہ تم کتابی کیڑے بن کر رہ جاؤ۔“

یہ بحث ایک مرتبہ پھر اچھی خاصی تکی پر ختم ہوئی۔ وہ گھر آیا تو اس کی ماں ناشتا تیار کر چکی تھی۔ وہ نہایت سادہ زندگی گزارنے کا عادی تھا۔ غذا بھی بطور دوا استعمال کرتا تھا۔ اس وقت بھی اس نے الٹا سیدھا ناشتا کیا اور باپ کو بتائے بغیر گھر سے نکل گیا۔ باہر گھوڑا تیار کھڑا تھا۔ وہ بیچن میں ہی ماہر گھڑ سوار بن گیا تھا۔ اس نے گھوڑا بھگایا اور ابوہر ایہم کے دولت کدے پر پہنچ گیا۔ اب وہ

اپنے استاد کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس کا استاد سے بتا رہا تھا۔ ”عقل محض اور فطرتی علم ایک ہی چیز ہیں۔ وحدت ہی علم اور حکمت ہے جو کہ ہر طرح کی کثافت سے پاک اور فطرتی ہے۔ یہ علم، حکمت اور عقل کا اعلیٰ ترین درجہ ہے۔ یہ درجہ انجہانی پاکیزہ اور سادہ ترین ہے۔ یہ درجہ علم، عقل اور حکمت کا طاقتور ترین درجہ ہے۔ اس کو صرف نیک اور پاکیزہ ذہن کے ساتھ ہی سوچا جاسکتا ہے۔“

جب انسان اس کو پاکیزہ روح اور پاکیزہ ذہن کے ساتھ سوچتا ہے تو یہ اس کی حکمت، علم اور عقل کا دوسرا درجہ ہے۔ اس درجہ پر انسان حقیقت اولیٰ اور اپنی ذات کے متعلق سوچتا ہے۔ اس کی یہ سوچ پہلے اور دوسرے درجے کے درمیان ہوتی ہے۔

اس خالص سوچ سے وہ کثافتوں کو دور کر دیتا اور حقیقت ثانیہ کو حاصل کر لیتا ہے۔

جس قدر انسان علم کا حامل ہوگا اسی قدر وہ نیک، دیانت دار اور فعال ہوگا۔ یہاں سے اٹھ کر وہ ایک دوسرے استاد کی خدمت میں پہنچ گیا۔

وہ استاد سے بتا رہا تھا۔

انسان کی فہم و فراست، دیانت اور بصیرت ہی اسے حیوان سے اعلیٰ تر بناتی ہے۔ عقل و فکر کا عنصر ایک ایسی طاقت ہے جو دوسروں کو بہت سے فوائد دے سکتا ہے اور خود بھی عقل سلیمہ کا حامل شخص اپنے لیے بہت سی آسانیاں پیدا کر سکتا ہے۔

وہ اسی طرح دوسرے کئی علماء کی صحبت میں بیٹھ کر شام کے وقت گھر کی طرف لوٹ رہا تھا تو وہ ایک انوکھی گفتگو میں مبتلا تھا۔ اس سے پہلے اس کی یہ حالت بھی نہیں ہوئی تھی۔

کچھ دیر سوچنے کے بعد اسے اپنے سوال کا خود ہی جواب مل گیا۔ اس گفتگو کا جواب میرا باپ ہے جو مجھے فوجی بنانا چاہتا ہے۔ اس کے کانوں میں استاد کے کہے ہوئے الفاظ گونجنے لگے۔ ”جس قدر انسان علم کا حامل ہوگا اسی قدر وہ نیک دیانت دار اور فعال ہوگا۔“

مجھے دو پیشوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔ مجھے کسی حال میں فوجی نہیں بننا۔ مجھے فاراب میں موجود علماء سے بڑا عالم بننا ہے۔ ارسطو اور افلاطون کے نظریات بھی میری سمجھ میں نہیں آتے لیکن مجھے انہیں سمجھنا ہے۔ تو کیا مجھے فاراب سے باہر جانا ہوگا؟ اگر جانا پڑا تو جاؤں گا لیکن میں ماں کو چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔ حصول علم کے لیے بھی نہیں؟ جب

وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا ابھی تو گھر چلوں۔ اس کی عمر اس وقت پندرہ سال تھی اور وہ انتہائی سوچ سکتا تھا۔

سوچنے والا یہ لڑکا ابو نصر فارابی تھا جسے دنیائے اسلام کا مشہور فطرتی بننا تھا اور ابو نصر فارابی کے نام سے تاریخ محفوظ ہو گئی۔

☆.....☆

ابو نصر فارابی 872ء بمطابق 259ھ میں ترکستان کے ایک صوبے ”فاراب“ کے ایک قصبے ”واج“ میں پیدا ہوا اس کے والد ترکستان کے ایک چھوٹے سے قلعے کی فوج کے کمان دار تھے۔ روسی ترکستان میں ”طرخان“ عموماً اس معزز شخص کو کہا جاتا تھا جس کو حکومت کی طرف سے طرہ والی پگڑی کسی منصب کے لیے عطا کی گئی ہو۔

فاراب موجودہ ملک قازقستان میں واقع ہے۔ ابو نصر فارابی ایرانی النسل تھا۔ اس کے آباؤ اجداد خراسان سے ہجرت کر کے ترکستان چلے گئے تھے۔ وہیں فاراب کے ایک قصبے ”واج“ میں پیدا ہوا۔ فاراب کی مناسبت سے اسے الفارابی کہا جانے لگا۔

اسے اپنے آباؤی پیشہ سپاہ گری سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے برعکس وہ علوم و فنون کی طرف مائل تھا۔ اس نے تمام علوم پر نو جوانی میں ہی مہارت حاصل کر لی تھی۔ اس نے پچاس سے زیادہ زبانیں سیکھی تھیں۔ وہ غیر معمولی ذہن کا مالک تھا۔

جب الفارابی پیدا ہوا اس وقت وسطی ایشیا میں عربی زبان کی عمر دو سال ہو چکی تھی۔ فاراب کے باشندے عربی زبان اچھی طرح سمجھتے اور بولتے تھے۔ ترک بادشاہ عربی زبان کو اپنا بیکھے تھے۔ الفارابی کو بھی عربی زبان میں وہی قدرت حاصل تھی جو کسی اہل زبان کو ہوتی ہے۔ اس نے زندگی بھر فارس یا ترکی کی زبان میں کچھ بھی نہیں لکھا۔ جو کچھ لکھا وہ عربی زبان میں لکھا۔

اس نے اپنی طویل عمر کا فائدہ اٹھاتے ہوئے خود کو کثیر التصانیف ثابت کیا۔ بعض مفکرین نے اس کی تصانیف کی تعداد تین سو تک بتائی ہے۔

وہ بہت سے علوم پر دسترس رکھتا تھا۔ خاص طور پر فلسفہ، منطق، طب، عمرانیات، ریاضی، طبیعیات، الہیات، اخلاقیات، سیاسیات، سائنس، نفسیات اور موسیقی پر اس کی تصانیف سند کا درجہ رکھتی تھیں لیکن اب اس کی چند کتابیں اور

ان کے کچھ حصے بھی دست بردار ماندہ سے محفوظ رہ سکے ہیں جن کے اصل محفوظ ایران، استنبول، بیروت، جرمنی، فرانس اور برطانیہ کے عجائب خانوں میں محفوظ ہیں۔

وہ شاعر بھی تھا۔ اس کے اشعار کا مجموعہ عربی میں ہے۔ علامہ ابن خلدون نے اس کے کچھ شعروں کا تفسیر عربی میں ترجمہ کیا ہے جس کی اردو شکل یہ ہے۔

اے وہ ذات جو تمام اشیاء کی علت ہے اور جس سے چشمہ فیض جاری ہے

اے درود آسمانوں اور ان کے درمیان جو زمین و سمندر ہیں ان کے مالک

میں تجھے تیری پناہ طلب کرنے والے کی حیثیت سے پکارتا ہوں

تو مجھ کو پکار کر خطائیں معاف کر دے اپنے فیض و رحمت سے میری طبیعت کا خم دور کر دے

طرح خان اس کی تعلیم کا مخالف نہیں تھا۔ اسے اپنے وقت کے بہترین اساتذہ سے تعلیم دلوانی تھی۔ اس کے ذہن رسائے جو کچھ پڑھا تھا اسے اپنی انتہائی پہنچا بھی دیا تھا لیکن طرح خان اسے معلم یا مدرس نہیں بلکہ فوجی بنانا چاہتا تھا۔ اسی بحث و محصل میں تین سال مزید گزر گئے۔ اب وہ

اٹھارہ سال کا ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے کئی نظریات کو تحریری شکل دے کر محفوظ بھی کر لیا تھا۔ وہ شدت سے محسوس کر رہا تھا کہ اس وقت کے دستور کے مطابق فاراب سے نکلے اور دور

دراز کے علاقوں کا سفر کرے اور مروجہ علوم کی بنیادی تعلیم بہترین اساتذہ سے حاصل کرے لیکن اسے معلوم تھا کہ اس کا باپ اس کی مخالفت کرے گا۔ اس کی ماں بھی اسے آنکھوں سے دور نہیں ہونے دے گی۔ اب وہ اٹھارہ کا ہو

چکا تھا۔ طرح خان کا اصرار بڑھنے لگا تھا کہ قدرت نے اس کی مدد کی۔ اس کی ماں کی بیماری کا شکار ہو گئی۔ وسائل کی کمی نہیں تھی۔ بہترین طبیب اس کے علاج کے لیے مقرر ہو گئے۔ ابوصہر نے بھی قدرت گزاری میں کوئی کسر نہ رکھی۔

رات رات بھر جاگ کر ماں کی تیمارداری کرتا رہا لیکن اس کی ماں اس کا ساتھ چھوڑ گئی۔ اسے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ تمام علوم حاصل کرنے کے باوجود اس نے طب کی تعلیم حاصل نہیں کی اگر اس نے طب کی تعلیم حاصل کی ہوتی تو وہ اپنی ماں کو بچا سکتا تھا۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ طب کی تعلیم ضرور حاصل کرے گا کہ انسانیت کی خدمت کر سکے۔

وہ کچھ دن بعد اس صدمہ سے نکلنا تو اسے اپنا مشن پورا کرنے کا خیال آیا۔ سوال یہ تھا کہ فاراب سے نکل کر کہاں جائے۔ اسے بخارا کی یاد آئی۔ اس وقت بخارا علوم و فنون کا مرکز تھا اور پوری دنیا سے علوم کے شائق بخارا کا رخ کیا کرتے تھے۔ اس وقت بخارا میں تین سو سے زیادہ اعلیٰ تعلیم کے مدارس تھے۔ بخارا دولت مند بخارا بنا ہوا تھا۔ اہل حرفہ و حکمت دور دور سے کھینچے جلتے آ رہے تھے۔ وہ بھی کسی ایسے قافلے کی تلاش میں مشغول ہو گیا جو اسے بخارا تک پہنچا دے۔ اس کی خوش قسمتی اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔

اسے معلوم ہوا کہ دو دن بعد بخ سے بخارا جانے والا ایک قافلہ یہاں سے گزرے گا اور وہ چاہے تو اس قافلے کے ساتھ بخارا جا سکتا ہے۔ یہ بھی اس کی خوش قسمتی تھی کہ طرح خان اس وقت گھر نہیں تھا اور اگلے ایک ہفتے تک اس کے آنے کا کوئی امکان بھی نہیں تھا۔ ابوصہر نے ضروری تیاری کی۔

روانگی کی رات اس نے کتابوں کی ایک کھڑی اٹھائی اور قافلے کے سربراہ سے ملاقات کی اور قافلے میں شامل ہو گیا۔ اس نے بخارا جانے کی وجہ تو کس کی تلاش بتایا۔

وہ خبردار سے خبری کے عالم میں قافلے کے ساتھ سفر کرتا ہوا بخارا تک پہنچ گیا۔

یہ رات کا وقت تھا۔ شہر کے دروازے بند ہو چکے تھے۔ قافلے والوں نے اسے شہر سے باہر چھوڑا اور قافلہ آگے بڑھ گیا۔ اس کے ساتھ دو چار تاجر پیشہ اشخاص اور بھی قافلے سے جدا ہوئے تھے۔ وہ بھی اس کی طرح پریشان تھے کہ اب کہاں جائیں۔ پہرے داروں کی بہت خوشامدی لیکن دروازہ نہیں کھلا۔ اس نے کتابوں کی کھڑی سرہانے رکھی اور کھلے میدان میں لیٹ گیا۔ اس کی دیکھا دیکھی باقی لوگوں نے بھی یہی کیا۔

رات رہی کتنی ہی تھی۔ ابھی سورج نے جھانکا ہی تھا کہ دروازہ کھل گیا۔ اس نے کتابوں کی کھڑی اٹھائی اور شہر میں داخل ہو گیا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ پورا شہر بچے ہونے سے پہلے ہی جاگ گیا تھا۔ دکائیں محل گئی تھیں۔ خریداروں کے ہجوم بھی تھے۔ اللہ! کیا یہ لوگ سوئے نہیں ہیں، اگر سوئے تھے تو اتنی جلد جاگ کیسے گئے۔ اسے ان بازاروں سے کیا لیتا تھا فی الحال تو کسی سرانے کو تلاش کرنا تھا جہاں وہ صبح کے اتار سکے اور پھر کسی درگاہ کی تلاش میں نکلے۔ اسے تلاش کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ ایک شخص قریب آیا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس شخص

نے اس کے چلیے اور گھبراہٹ سے پہچان لیا تھا کہ وہ ابوصہر بھی ہے اور مسافر بھی۔ اسے بھینسا کسی سرانے کی تلاش ہو گی۔

”آپ کہیں تو میں یہ سامان اٹھا لوں۔“ اس شخص نے اس کی کھڑی کی طرف اشارہ کیا۔

”آپ زحمت نہ کریں۔ اتنا وزن تو میں خود اٹھا سکتا ہوں۔“

”کیا آپ کو کسی سے ٹھکانے کی تلاش نہیں؟“

”بالکل ہے۔“

”تو پھر آئیے میرے ساتھ۔ یہ کھڑی مجھے دیکھیے اور میرے ساتھ چلیے۔“

”میں تمہارے ساتھ چلوں گا ضرور لیکن یہ کھڑی تمہیں نہیں دے سکتا۔“

”کیا اس میں بہت قیمتی سامان ہے؟“

”ہاں بہت قیمتی، اتنا قیمتی کہ اگر اس کے عوض بخارا بھی مجھے دو بیٹ بھی نہ خرید سکو۔“

اس شخص نے بھینسا اسے کوئی خطی لوجھان سمجھا ہو گا اس لیے اس نے اپنے کندھے اچکائے اور اسے ساتھ لے کر چلنے لگا۔

”تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو۔“

”کیا تم واقعی کوئی نہیں سمجھتے۔“

”نہیں۔“

”میں تمہیں ایک سرانے میں لے جا رہا ہوں۔ پسند آئے تو شہر جانا نہیں تو آگے بڑھ جانا، کوئی زبردستی تھوڑی ہے۔“

ابوصہر سمجھ گیا کہ وہ شخص کون ہے لہذا خاموش ہو گیا۔ اب دونوں طرف خاموشی تھی۔ اس شخص نے پھر کچھ جانا چاہا۔

”یہ تو تادم تم یہاں کس سلسلے میں آئے ہو۔ تاجر ہو، روزگار کی تلاش میں آئے ہو یا یونہی کھوٹے پھرنے چلے آئے ہو۔“

”یہاں میں طالب علم ہوں۔ طلب علم کی کشتی مجھے بخارا لے آئی ہے۔“ ابوصہر نے اس خیال سے حق بات بتا دی کہ شاید یہ شخص کسی درس گاہ کا پتا بتا دے۔

”اگر تم طالب علم ہو تو مجھو تمہارا کام بن گیا۔“

”کیا مطلب؟“

”سراے کا مالک طالب علموں کی بہت قدر کرتا

ہے۔ جب وہ سنے گا کہ تم طالب علم ہو تو وہ تم سے کرایہ بھی نہیں لے گا اور رات کو چلانے کے لیے تل بھی دے گا تاکہ تمہیں دیر گئے تک بڑھنے میں آسانی ہو اور ہاں مجھے انگ سے انعام دے گا کہ میں اس کی سرانے میں ایک طالب علم کو لے کر آیا۔

ابوصہر حیران تھا کہ یہ کیا علم پرورد شہر ہے۔ جب ایک سرانے کا مالک اتنا مہربان ہے تو بانی لوگ بھی علم پرورد ہوں گے۔

”یہاں تو سینکڑوں طالب علم آتے ہوں گے۔ تمہارا مالک کس کس کو کھنہرا ہو گا۔“

”بیشتر طالب علم تو ساجد میں ٹھہرتے ہیں۔ ایسے اساتذہ بھی ہیں جو بڑے بڑے محلات میں رہتے ہیں۔ من پسند اور قائل طالب علموں کو اپنے محلات میں جگہ دے دیتے ہیں اگر تم اپنا اعتبار قائم کر سکو تو تمہیں بھی کسی محل میں جگہ مل سکتی ہے۔“

شاہد ابھی کچھ اور باتیں ہوئیں لیکن سرانے کا دروازہ آگیا۔ اس شخص نے ابوصہر کو سرانے کے مالک کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا۔

”قاضی صاحب! میں ایک طالب علم کو لے کر آیا ہوں۔“

”کہاں سے آ رہے ہو؟“ قاضی صاحب نے پوچھا۔

”میں ترکستان کے ضلع فاراب سے یہاں پہنچا ہوں۔“

”یہاں تمہاری کسی سے جان پہچان ہے؟“

”میں اس شہر کے لیے بالکل اجنبی ہوں۔“

”اس سرانے کو قیام گاہ سمجھو اور جب تک جی چاہے رہو۔“

قاضی نے اپنے آدمی کو حکم دیا۔ وہ اسے لے کر ایک ایسے کمرے میں پہنچ گیا جہاں دو طالب علم پہلے سے ٹھہرے ہوئے تھے۔ ابوصہر نے اپنی کتابیں ایک طرف رکھ دیں اور ان دو طالب علموں سے اپنا تعارف کر لیا۔ وہ طالب علم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کے سامنے مستقبل کا عظیم ترین مفکر بیٹھا ہے۔

وہ ایک قصبے سے یہاں آیا تھا۔ اس شہر کی رونق کو دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ یہ سب کچھ اس کے لیے کسی غماش گاہ سے کم نہیں تھا۔ اسے قدم قدم پر ساجد و مدارس نظر آئے۔

اب اسے صرف یہ معلوم کرنا تھا کہ تکمیل علوم کے لیے اسے کس مدرسے اور کس استاد کے پاس جانا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ مدارس کے دروازے کسی پر بند نہیں ہیں جس کا جی چاہے درس میں شریک ہو سکتا ہے۔ استاد پھر دیتا ہے اور طلبہ اسے لکھتے جاتے ہیں پھر جو طلبہ یا صلاحیت ہوتے ہیں وہ ان نتائج سے نئے نتائج حاصل کر لیتے ہیں۔ استاد سے اتفاق کرتے ہیں یا اختلاف۔ بیشتر درس مسجدوں کے کھلے محفلوں میں ہوتے ہیں۔ ان دروس میں شرکت کا کوئی معاوضہ نہیں لیا جاتا۔

رہنے کا مفت ٹھکانا مل گیا تھا اب اسے کسی درس میں شامل ہونا تھا۔

وہ ایک مسجد کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ عصر کی اذان ہو گئی۔ وہ نماز کے لیے مسجد کے اندر چلا گیا۔ نماز سے فارغ ہو کر وہ محفل میں آیا تو اس نے کچھ لوگوں کو حلقہ بنائے بیٹھے دیکھا۔ معلوم ہوا شہر کے مشہور استاد ہیں جو یہاں درس دیتے ہیں۔ وہ بھی ایک طرف بیٹھ گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے مجمع بڑھنے لگا اور محفل بھر گیا۔ درس شروع ہوا تو معلوم ہوا علم منطق پڑھایا جا رہا ہے۔ وہ غور سے سنتا رہا۔ ایک جگہ اسے احساس ہوا کہ ایک علمی کوسموری صاحب صحیح طرح سمجھا نہیں سکے ہیں۔ وہ اس وقت تو خاموش رہا کہ درمیان میں نوکنا بے ادبی ہوتا لیکن جب درس ختم ہوا تو وہ استاد کے پاس پہنچ گیا اور ان کی توجہ اس طرف مبذول کی اور اپنی داستان میں سمجھا بھی دیا کہ آپ نے کیا بتایا اور کیا ہونا چاہیے تھا۔ استاد حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے۔

”تم استاد ہو یا طالب علم؟“

”میں ایک ادنیٰ سا طالب علم ہوں۔ فاراب سے یہاں حصول علم کے لیے حاضر ہوا ہوں۔“

”تم نے علم منطق کی تعلیم کہاں سے حاصل کی؟“

”میں نے اس موضوع پر کئی کتب پڑھی ہیں۔“

”میں تمہارے ذہن رسائی داد دیتا ہوں۔ جب تم کتابوں سے اتنا کچھ سیکھ سکتے ہو تو کسی ایسے استاد کی صحبت تمہیں اس علم کی انتہا تک پہنچا سکتی ہے۔“

”اسی لیے تو آپ کے درس میں شریک ہوا ہوں۔“

”یہ تمہاری منزل نہیں۔ میں تمہیں اپنے استاد کے پاس بھیج رہا ہوں۔ وہ علم کا سمندر ہیں۔ ان کا ثانی دور دور تک نہیں۔ وہ تمہیں مقبل کر دیں گے۔“

وہ دیکھتے ہوئے پتے پر جا کر اس نئے استاد سے ملا اور

منطق کی تعلیم حاصل کرنے لگا۔ یہ نیا استاد بھی اس کی ذہانت و فکر کو حیران رہ گیا۔ ایسا دقیق مضمون وہ نہایت تیزی سے مکمل کر رہا تھا۔ اس نئے استاد کی معرفت اسے فلسفے کے نکات سمجھنے کے لیے ایک اور استاد کے سپرد کر دیا گیا۔ اس طرح وہ مختلف علوم کی تعلیم کے لیے مختلف اساتذہ کے پاس جاتا رہا۔ ایک استاد تو اس پر اتنا مہربان ہوا کہ اسے سرائے سے بلا کر اپنے شاندار محل میں جگہ دے دی۔ اس کے قریب سے اس کی رسائی شاہی کتب خانے تک ہو گئی۔

اس کتب خانے کے بلند اور عظیم دروازے میں قدم رکھتے ہی اس کی غور کرنے لگی کہ اس کی آنکھیں جھپکے لگیں۔ وہ سونے کے چند گھنٹوں کو پھر نوکر دن رات مطالعے میں مصروف ہو گیا۔ یہاں اسے ایسی کتابیں ملیں جن کا نام بھی کبھی اس نے نہیں سنا تھا۔

وہ کسی حریف طالب علم کی طرح ان کتابوں میں مستغرق تھا اور یہ سوچ کر خوش بھی تھا کہ عام طالب علموں کو ان کتابوں کی ہوا بھی نہیں لگ سکی ہوگی۔

ان کتابوں کی وجہ سے اس کا مطالعہ کسی ایک علم تک محدود نہ رہا۔ جتنے علوم پر پوری کتابیں یہاں موجود تھیں اس نے سب پڑھ لیں۔

کتابوں کے درمیان بیٹھے ہوئے اس نوجوان کا قلم حرکت میں آیا۔ اس نے منطق اور فلسفے کو موضوع بنا کر ایک کتاب لکھنی شروع کر دی۔ وہ اس کتاب میں مشغول تھا۔ کتب خانے میں کتابوں کے درمیان رات کو درتیک بیٹھا رہتا۔ مختلف کتابوں سے استفادہ کرتا رہتا۔ اس کا قلم چلتا رہتا اور کتب خانے کے ملازمین نیند سے اوجھٹے رہتے کہ کب وہ قلم رکھے اور کب ہمیں آرام کا موقع ملے۔

اس نے کئی ہی راتیں اس کتب خانے میں گزار کر کئی کتب اور تراجم تصنیف و تالیف کر لیں۔

وہ کتابیں اتنی مشکل تھیں کہ جن کا سمجھنا بھی مشکل تھا۔

اس نے اتنا عام فہم ترجمہ کیا جو عام آدمی کی سمجھ میں بھی بہ آسانی آ سکتا تھا۔

اس کے یہ تراجم آنے والے وقت میں علمی دنیا میں

تہلکہ مچانے والے تھے۔

بخارا میں نہ مدارس کی کئی نہ اساتذہ کی۔ اس نے ان سب سے کسب فیض کیا۔ فلسفے میں نئی راہیں نکالیں۔

موسیقی میں مہارت حاصل کی۔ طب اور سائنس کی مبادیات سے واقف ہوا۔

اس نے ان تمام علوم کی تکمیل اس شان سے کی تھی کہ پورے بخارا میں اس کا نام احترام سے لیا جانے لگا۔ بعض لوگ تو اسے اسطرطانی کے لقب سے یاد کرنے لگے تھے۔ کوئی اسے صاحب المنطق کہتا تھا۔

بخارا میں رہتے ہوئے اس نے بے شمار علوم حاصل کر لیے تھے لیکن اس کی فکری ترقی کی بجائے والی نہیں تھی۔ وہ جب بخارا کے مدارس کو اچھی طرح چھوڑ چکا تو اس نے بغداد کا رخ کیا۔

وہ بڑی اُمیدوں سے بغداد آیا تھا لیکن اسے چند ہی روز میں اندازہ ہو گیا کہ وہ یہاں زیادہ دن نہیں رہ سکے گا۔ کئی روز کی جدوجہد کے بعد بھی اسے رہنے کا ٹھکانا میسر نہ آ سکا۔ یہاں کوئی اس کے نام تک سے واقف نہیں تھا۔ مقام و مرتبہ کا تعین تو بڑی بات۔ وہ گھبرا کر دمشق آ گیا۔

یہاں بھی مسئلہ وہی تھا جو بغداد میں پیش آیا تھا۔ کہاں قیام کرے اور پیٹ میں ایندھن کہاں سے ڈالے۔ لکھنے کا سامان اور کتابوں کی کٹری اس کے کندھے پر بڑی ہوئی تھی۔ وہ اسی عالم میں نہانہ کی دکان پر پہنچ گیا۔ پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور پھر آگے بڑھ گیا۔ وہ ایک باغ کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلا جا رہا تھا۔ باغ کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس کی طبیعت لچک لگی۔ اس کی شاعرانہ طبیعت نے تقاضا کیا کہ وہ

اس باغ کے اندر جائے اور اس کے نظارے سے اپنی آنکھیں ششدر کرے۔ اتفاقات اس کا چچا کر رہے تھے۔ دروازے پر کھڑے چوکیدار نے اسے دیکھتے ہی خوش آمدید کہا۔ ”آؤ میرے دوست کیا نام ہے تمہارا؟“

”ابولہر۔“ اس نے القاری جان بوجھ کر نہیں بتایا کہ کہیں پہچان نہ لیا جائے۔

”بہت اچھا نام ہے۔ آؤ میں تمہاری کونٹری تمہیں دکھا دوں جہاں تمہیں دن کے وقت سونا ہوگا۔ تم اپنی یہ کونٹری بھی دیکھ رکھو۔ پھر مزید باتیں ہوں گی۔“

ابولہر حیران ہو رہا تھا کہ اس کی اتنی آؤ بھگت کیوں ہو رہی ہے۔ یہ شخص اسے کیا بھڑا ہے۔ یہ راز بھی جلد ظاہر ہو گیا۔

”بھائی ابولہر، اچھا ہوا تم آگے درندہ مجھے تو کبھی چھٹی نہ ملی۔“

”میرے آجانے سے تمہاری چھٹی کا کیا تعلق

بھائی۔“

”مالک نے تمہیں کچھ نہیں بتایا؟“

”کون مالک؟ میری تو کسی سے ملاقات نہیں ہوئی، نہ مجھے کسی نے کچھ بتایا۔“

”کیوں مذاق کرتے ہو۔ جب تمہیں کسی نے بھیجا نہیں تو تم یہاں آئے کیسے۔“

”میں اس شہر میں آج ہی آیا ہوں۔“ ابولہر نے کہا۔ ”مکھوتے مکھوتے اس باغ میں آیا اور سوچا اس باغ کو اندر سے دیکھ لوں۔ آیا یہی تھا کہ تم سے ملاقات ہو گئی۔ تم نے یہ سمجھ لیا کہ مجھے کسی نے بھیجا ہے۔“

”کہیں تو تمہارے ہوئے ہو گئے۔“

”میرا کوئی ٹھکانا نہیں۔“

”اور نوکری؟“

”میں نے کہا کہ اس شہر میں آج ہی آیا ہوں۔“

”بس تو پھر سمجھو تمہارا کام بن گیا۔ نوکری کرو گے؟“

”پائلکل کروں گا۔“

”میں یہ چوکیداری چھوڑ رہا ہوں۔ تم میری جگہ چوکیداری کرلو۔“

”تمہارا مالک مجھے رکھ لے گا۔ وہ تو مجھے جانتا تک نہیں ہوگا۔“

”میں اس سے کہوں گا تم میرے رشتے دار ہو۔ میری ضمانت پر وہ تمہیں رکھ لے گا۔“

”تم میری ضمانت کیسے لے سکتے ہو۔“

”تم مجھے اچھے اور سچے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ میں تم پر اعتماد کر سکتا ہوں۔“

”تمہارا مالک کب آئے گا۔“

”جب بھی آئے گا۔ اب تمہیں کیا فکر ہے تم میرے ساتھ رہو۔“

وہ اس کی کونٹری میں پاؤں پھیلانے کے لیے لیٹ گیا۔

باغ کا مالک اس دن نوٹیں آیا لیکن دوسرے دن صبح ہی صبح آدھکا۔ چوکیدار نے اسے آتے ہی بتا دیا کہ اس نے اپنی جگہ اپنے ایک رشتے دار کو رکھ لیا ہے۔ ابولہر کو مالک کے سامنے پیش کیا گیا۔ باغ کا مالک اس کی گفتگوں کو بہت متاثر ہوا۔

”تم عربی تو بہت اچھی بولتے ہو۔ پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہو۔“

”ایسی قسمت کہاں۔ بس اچھے لوگوں کی صحبت میں بیٹھا ہوں۔ زبان صاف ہو گئی ہے۔“

”تم مجھے ایچھے آدمی لگتے ہو۔ تم پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔“

اسے اس باغ میں چکر لگا کر رکھ لیا گیا۔

وہ رئیس کے باغ کے خوش نما اور خوش آواز طیور کی چچھاہٹ میں مگن رہتا اور اپنے فلسفی ذہن سے خوب صورت نکات سوچتا، باغ کے خوش رنگ اور خوشبو دار پھولوں کی مہک اس کے ذہن کو معطر رکھتی اور وہ پُر شور دنیا سے دور اپنی دنیا میں مگن رہتا۔ تنخواہ اتنی کم تھی کہ مشکل ہی سے گزارہ ہوتا تھا لیکن اسے اس کی پروا نہیں تھی۔ اسے تو یہ خوشی تھی کہ یہاں اسے مکمل تنہائی مل رہی تھی اور وہ پوری یکسوئی سے مطالعہ و تصنیف میں مشغول تھا۔

اس نے اس باغ میں رہتے ہوئے کئی کتابیں تصنیف کیں لیکن اس نے کسی پر یہ عیاں نہ ہونے دیا کہ وہ پڑھا لکھا ہے۔ انتخاب پڑھا لکھا کہ کتابیں تصنیف کر سکتا ہے۔ اسے یہاں بظاہر کوئی تکلیف نہیں تھی لیکن اس کا علی سزورک گیا تھا۔ یہاں کوئی قابل ذکر استاد نہیں تھا جس سے وہ کچھ سیکھ سکتا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر بغداد جانے کا ارادہ کر لیا۔ اسے معلوم تھا کہ باغ کا مالک اسے اتنی آسانی سے جانے کی اجازت نہیں دے گا۔

وہ ایک دن چپکے سے وہاں سے نکلنا اور دوبارہ بغداد آگیا۔ خوش قسمتی سے اس مرتبہ بغداد میں اسے ایک بہترین قابل اور مخلص استاد کی رفاقت مل گئی۔ یہ ابو بشیر تہی بن یونس تھا۔ ابو بشیر یونانی فلسفے کے مترجم اور شراح کی حیثیت سے مشہور تھا۔ اس نے یونانی فلاسفر خاص طور پر افلاطون اور ارسطو کی کتابوں کے عربی زبان میں تراجم کیے تھے اور ان پر سیر حاصل شرحیں بھی لکھی تھیں۔

الفارابی ایک عرصہ تک ابو بشیر کے حلقہ درس میں شامل رہا اور اس سے نحو، فلسفہ، منطق، ریاضی اور کئی سائنسی علوم حاصل کیے۔ یہاں اس نے ارسطو کی تمام کتابیں پڑھیں اور ان کو سمجھا۔

اس کے بعد وہ ایک اور استاد ابو بکر بن السراج کی خدمت میں پہنچا۔ اس سے اس نے علم فلکیات اور علم نجوم کی تعلیم حاصل کی۔

ایک روز عجیب واقعہ ہوا۔ استاد شاگرد بن گیا۔ ابو بصر کی علم منطق میں رسائی دیکھتے ہوئے اس نے درخواست کی کہ وہ اسے منطق پڑھا کرے۔

اب اس کی شہرت اتنی ہو گئی تھی کہ اساتذہ وقت خود

اس سے ملاقات کے متمنی رہتے تھے۔ وہ خود بھی ایسا حریص علم تھا کہ اساتذہ فن کی تلاش میں رہتا تھا۔ انہی دنوں اس کی ملاقات یوحنا بن حیلان سے ہوئی۔ یوحنا بن حیلان فلسفہ اور حکمت کا بہت بڑا عالم تھا۔ اس کے حلقہ درس میں بغداد کے بڑے بڑے روئے روسا کے بیٹے شامل ہوتے تھے۔

یوحنا بن حیلان بغداد میں وہ پہلا شخص تھا جس نے ارسطو اور افلاطون کی کتابوں کے عربی میں تراجم کیے اور فلسفی کی تعلیم عام کر دی۔

بغداد میں الفارابی کو بہترین اساتذہ، رفقا اور خلفاءہ میسر تھے۔ وہ ارسطو اور افلاطون کی کتابوں پر جامع اور مفصل شرحیں لکھ رہا تھا اور منطق، فلسفہ، ریاضی اور موسیقی پر بہترین کتابیں تصنیف کر رہا تھا۔ اس کے حلقہ درس میں امراء اور شرفاء کے بیٹے شامل ہوتے تھے۔ یہ دور اس کی مالی آسودگی کا دور تھا۔ وہ افلاطون کی کتابوں پر جامع اور مفصل شرحیں لکھ رہا تھا اور منطق، فلسفہ، ریاضی اور موسیقی پر بہترین کتابیں تصنیف کر رہا تھا۔ وہ بہترین ترقی لباس پہن کر بغداد کے باغوں کی سیر کیا کرتا تھا۔ اس کی ضروریات بہت محدود تھیں۔ اب اس کا علم و فضل کمال کو پہنچا ہوا تھا۔ وہ زیادہ تر وقت مطالعہ و تحریر میں صرف کرتا۔

ایک دن وہ کسی باغ میں چہل قدمی کر رہا تھا۔ اس کے دو شاگرد وہاں بائیں چل رہے تھے کہ ایک ایک شخص باغ میں داخل ہوا۔ اس کی صورت بتا رہی تھی کہ وہ بغداد کا رہنے والا نہیں۔ اس کا لباس بھی اجنبی تھا۔ اس نے آتے ہی پوچھا تھا، آپ میں سے ابو بصر الفارابی کون ہے۔ تعارف ہونے کے بعد اس نے ایک خط ابو بصر کے حوالے کیا۔

”آپ کو ”رے“ شہر کے حکمران العاصب بن عباد نے بعد اچھا پہنچا ہے وہاں میں طلب کیا ہے۔ ذرا دور کے لیے رقم بھی روانہ کی ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ حکمران کے اشتیاق کو شرف ملاقات بخشیں گے۔“

الفارابی نے رقم لینے سے انکار کر دیا۔

”العاصب بن عباد سے میری جانب سے معذرت کرنا۔ ان سے عرض کرنا کہ میری مصروفیات ابھی مجھے بغداد سے باہر جانے کی اجازت نہیں دیتیں، اگر کسی وقت ضرورت پیش آئی تو آپ کے دروازے پر ضرور دستک دوں گا۔ فی الحال معذرت۔“

اس کے شاگردوں نے اصرار بھی کیا کہ وہ اس سنہری

موقع کو ضائع نہ کرے لیکن وہ بغداد چھوڑنے پر تیار نہ ہوا اور قاصد کو واپس لوٹا دیا۔

اسے نہیں معلوم تھا کہ حالات اچانک اس کے مخالف ہو جائیں گے۔ سسکتی ہوئی آگ شعلہ بن گئی۔ بغداد فتنوں اور ہنگاموں کا مرکز بن گیا۔ یہ سب سیاسی اور مذہبی جھگڑوں کا نتیجہ تھا۔ ایک حادثہ ختم نہ ہوتا تھا کہ دوسرا دوغما ہو جاتا تھا۔ یہ جھگڑے سیاسی بھی تھے اور مذہبی بھی۔

اس پر آشوب دور میں بھی ابو بصر الفارابی کا قلم تھکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ رات گزر جاتی تھی اور اس کے گھر میں جلنے والے چراغ کی کوثر قرآن کے نام نہیں لیتی تھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ جلد سے جلد اپنا کام مکمل کر کے دنیا سے رخصت ہونے کی تیاری کر رہا ہو۔ اسلامی فلسفہ جس منزل تک پہنچ چکا تھا اسے وہ مزید آگے لے جانے کا خواہاں ہو۔ اس کے پس منظر میں اسلامی فلسفے کی شاندار تاریخ تھی۔ کیسے کیسے نام اس کی آنکھوں کے سامنے آتے تھے اور گزر جاتے تھے۔

☆.....☆

ظہور اسلام کو ابھی نصف صدی بھی نہیں گزری تھی کہ دین اسلام کی برکات مشرق اوسط اور شمالی افریقہ تک پہنچ گئیں اور اندلس سے لے کر وادی سندھ تک مسلمانوں کا تسلط ہو گیا۔

یہ تسلط ختم ہونے کے بعد بھی یعنی چھ سو برس بعد تک مسلمانوں کے نکل جانے کے بعد بھی ہر وہ ملک جہاں اسلام پہنچا تھا اسلامی رنگ میں رنگ گیا۔ بہت سے ملک تو عربی قالب میں مکمل و حل گئے۔

مسلمانوں کے ہاتھوں عمل میں آنے والے اس سر بلع پھیلاؤ اور وسیع علاقے کی تعمیر کو ایک عرصہ درکار تھا جس کی بنا پر محروم مملکت کے باشندوں کو اسلامی طرز کی سوسائٹی کے اسلوب میں ڈھالا جاسکتا۔ اس وقت ایسے امور سے نمٹنا پڑ رہا تھا جن سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور حیات میں مسلمان عربوں کی جمیعت کو بھی بالا نہیں اٹھا۔ ان میں انتظامی ضوابط اور حکومتی قواعد کی جستجو بھی تھی جو ایک شدید ضرورت تھی۔ اس کی بھی ضرورت پیش آرہی تھی کہ قرآنی احکام اور سنت رسول کو نئے حالات پر منطبق کیا جائے۔ خلفائے راشدین اور ان کے بعد دوسرے خلفائے اسلام نے فوری توجہ کے طالب مسائل کو حل کرنے میں اپنی کادشوں کا بیشتر حصہ صرف کیا۔ قرأت، تفسیر اور روایات

سے علوم کو سہارا دیا۔ عربی زبان کے مطالعے کے لیے قواعد وضع کیے۔ یہ ضرورت اس لیے ضروری تھی کہ قرآن وحدیث کی زبان عربی تھی اور جس سے غیر عرب نو مسلم ناواقف تھے۔

ان مسائل نے امویوں کو یوں الجھائے رکھا کہ وہ اس وسیع میراث کی جانب متوجہ ہی نہ ہو سکے جو مقتدر نے مسلمانوں کی دسترس میں رکھ دی تھی۔ اس عہد میں یونانی اور سریانی زبان سے شاذ و نادر ہی کوئی کتاب عربی میں منتقل ہوئی ہوا البتہ دینی علوم اور احادیث کو خوب استحکام نصیب ہوا۔

کوفہ اور بصرے میں نحوی مکاتب کے وجود میں آنے اور شاعروں کے ظہور پندیر ہونے کی بدولت عربی زبان نے خوب ترقی کی۔

وقت انتظار کر رہا تھا کہ مسلمان قبل از اسلام کے اس خزانے کی جانب متوجہ ہوں جو حصار اسلام کی حدود میں جمع کر دیا گیا تھا۔

ظہور اسلام سے قبل سکندر نے بہت سے اساتذہ کی تحریریں مثالی زبان میں ترجمہ ہوئیں۔ وہاں سے اطلالیہ پہنچیں اور وہاں سے مزید مشرق کی سمت، سکندر نے اس دور میں یونانی، یہودی، بابلی اور مصری تہذیبوں کا مقام انصاف تھا۔ گیسلاؤں کی تقریبی تہذیبوں کو بھجور کیا کہ وہ اپنے لیے جدا مدرسے اور تعلیمی ادارے استوار کریں اور اپنی زبان یعنی سریانی کو ترقی دینا پڑی تاکہ وہ سکندر بابلی کی سیادت سے آزاد ہو سکیں جن سے وہ علیحدہ ہو چکے تھے۔ ایرانی بادشاہوں نے جو قدر تا بازنطینیوں کے مخالف تھے ان لوگوں کی طرف داری کی اس لیے کہ یہ ان کے دشمنوں کے مخالف تھے۔ اس حوصلہ افزائی کے باعث نسطوری سلطنت ایران کی حدود کے اندر دور تک سرایت کر گئی۔ یہ طاقت اتنی بڑھی کہ وسطی ایشیا میں کلیسا بھی استوار ہو گئے۔ جہاں کہیں بھی یہ کلیسا پھیلے یونانی فلسفہ کو بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ ایرانی بادشاہوں نے بازنطینی علی مراکز کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک مکتب قائم کیا جہاں ہندی، سنی اور یہودی اہل فلسفہ و علوم تعلیم و تعلم کے لیے لا کر رکھے گئے۔ اسی مرکز میں ہندی و یونانی طب بھی مکمل مل گئے۔ یہیں ہندی نجوم نے بھی ترقی کی۔ یونانی و بابلی کے علاوہ ہندی اور ایرانی علوم بھی محفوظ ہو گئے۔ ایران میں اسلامی سلطنت کے قیام کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔

اگر دور بار میں ہوتا تو جب بھی لباس کے بارے میں رسوم و قواعد کی پروا نہ کرتا۔

”الفارابی کے فلسفے میں تمام رنگ موجود ہیں۔ وہ ایک بہت بڑا فلسفی بھی تھا، ایک بڑا حکیم بھی تھا اور علمی صوفی بھی۔ جس طرح فلسفے میں اس نے اپنی ایک خاص راہ نکالی تھی اسی طرح کلام میں ایک اور جدا تھا۔ یہ کہا جائے تو بے جا نہیں ہوگا کہ الفارابی وہ شخص تھا جس نے فلسفے کے وسیلے سے دین کو سمجھا اور اس کی معرفت حاصل کی۔ وہ دین کو فلسفہ اور فلسفہ کو دین سمجھتا تھا۔“

”الفارابی کا فلسفہ بالید الطبیعیات، اقلاتون اور اسطو کی، بعد الطبیعیات سے ہی اخذ شدہ ہے لیکن اس نے اس فلسفے کو اسلامی نقطہ نظر کے ساتھ پیش کیا۔ وہ اس کائنات کو ’احد‘ کہتا ہے کہ کائنات کے تمام مظاہر اسی احد یا عقل محض سے ظہور میں آئے۔ دنیا کی تمام اشیاء اسی احد یا عقل محض کی پرچھائیاں ہیں۔

فکلیات کے حوالے سے الفارابی کے دو رسالے معروف ہیں۔ ان دونوں رسالوں میں اس نے کائنات اور اجرام فلکی اور ان اجرام فلکی کے درمیان پائی جانے والی قوت کو بیان کیا ہے۔

یہ بھی اس کے کارناموں میں سے ایک کارنامہ ہے کہ اس نے ستار، نمود اور باب ایجاد کیے جو آج بھی استعمال ہوتے ہیں۔

وہ اپنی ایجادات اور نظریات کی تشکیل میں مشغول تھا۔ اسے بغداد میں رہتے ہوئے چالیس سال ہو گئے تھے کہ اچانک بغداد کے حالات خراب ہونا شروع ہو گئے۔ مذہبی اور سیاسی قوتیں متصادم ہونے لگیں۔ یہ فتنہ انگیزیاں کچھ کم نہیں تھیں کہ ”قرطط“ کا فتنہ اٹھ کھڑا ہوا۔ انہوں نے اپنے فتنے کی اعلانیہ دعوت شروع کر دی۔ اس فتنے نے اسلامی شریعت کو مذاق بنا کر رکھ دیا اور اپنی جماعت کو منظم کر کے حصار، قطیف اور بحرین پر قبضہ کر لیا۔ انہوں نے بصری اور کوفہ پر بھی حملے کیے۔ مکہ پر بھی حملہ کیا۔

مرکز خلافت نے بس اور کمزور تھا اس لیے پوری خلافت میں فتنے مٹانے لگے۔

حضرت حسین بن منصور حلاج کو اسی دور میں گرفتار کر لیا گیا اور ایک طویل مقدمے کے بعد انہیں قتل کر دیا گیا۔ یہ ایسا سانحہ تھا کہ بغداد و اہل ممالک سیاہ چادر میں چھپ گیا۔ بغداد میں ہنگامے شروع ہو گئے۔

گیا۔ ان برکتوں سے فیض یاب ہو کر جب الفارابی سامنے آیا اور اس کے کمال کا چرچا ہوا اور اس فلسفہ و منطق کو مرجع پر پہنچا دیا تو اسطو کا جانشین کہلائے گا۔ علمائے وقت نے اس کے کمال کی گواہیاں فراہم کیں۔

”ابو نصر الفارابی مسلمان فلسفیوں میں پہلا فلسفی تھا جس کے پائے کا دوسرا فلسفی نہیں تھا۔“

”وہ مسلمان فلسفیوں میں حقیقی فلسفی تھے۔“

”منطقی اور با بعد الطبعی مسائل جن کی تمہید الکندی وغیرہ نے اٹھائی تھی اس کو ابو نصر الفارابی نے نقطہ کمال تک پہنچایا۔

”الفارابی علم منطق و فلسفہ میں تمام مسلمانوں سے بڑھ گیا تھا اور اس نے سب سے زیادہ ان مسائل میں داد تحقیق دی۔ اس نے اس علم کے غرائض کو شرح کے طور پر بیان کیا ہے۔ اس کے اسرار و رموز کو لکھ کر اس کی تعلیم کو آسان بنا دیا۔ اس نے علم منطق کے بارے میں ان تمام چیزوں کو جمع کر دیا جن سے علم منطق اور فلسفہ ہر کوئی سمجھ سکتا ہے۔“

”الفارابی کو اسطو کا ایک بہت بڑا شارح اور مقلد سمجھا جاتا ہے۔ اس نے اسطو کی کتابوں کی شرحیں لکھیں۔ یہ شرحیں اس کے بعد آنے والے اہل علم کے لیے مشکل راہ ثابت ہوئیں۔ اس نے ایسی کتابیں بھی تصنیف کیں جو فلسفہ کو اسلامی فلسفہ بنانے میں معاون ہوئیں۔

اسے اسلامی فلسفہ سیاست کا بانی سمجھا جاسے۔ اس مسئلے پر اس نے اکثر اقلاتون کے نظریات کا اجماع کیا ہے وہ امام فلسفہ قرار دیتا تھا۔ اس نے اپنی ہی کتابوں میں اس فلسفہ سیاست کو قلم بند کیا۔

”اس کو خصوصی شہرت موسیقی کے باعث حاصل ہوئی۔ وہ موسیقی کا نظری علم ہی نہیں رکھتا تھا بلکہ ایک اعلیٰ درجے کا تو اگرم بھی تھا۔ اس موضوع پر وہ ایک ایسی تصنیف چھوڑ گیا جو قرون وسطیٰ کی موسیقی کے باب میں اہم ترین ہے یعنی ”کتاب موسیقی الکبیر“۔

الفارابی کی اختراع کردہ دھنیں مشرق میں ہر جگہ پھیل گئیں خاص طور پر صوفیہ میں خوب مقبول ہوئیں۔

تصوف کے ساتھ اس کا یہ ربط محض اتفاقی نہیں تھا بلکہ وہ صوفیانہ طرز زندگی اور صوفیانہ دروح کا مالک تھا۔ وہ شاعرت باث کی زندگی کو نفرت سے دیکھتا تھا۔ وہ اکثر وسطی ایشیا کا لباس، پوشین کی ایک بڑی ٹوپی سمیت زیب تن کیا کرتا تھا۔

ان کے مضمون سے واقفیت ہوئی اور اس طرح مسلمانوں میں فلسفہ و منطق کی کتابیں حاصل کرنے کے لیے شوق بڑھا۔ ابو جعفر خود بھی فلسفہ اور علم و نجوم میں کمال رکھتا تھا لہذا علمائے سرپرستی اس سے بعید نہیں چنانچہ منطق میں سب سے پہلا شخص جو تصنیف و تالیف کے لیے مشہور ہوا وہ عبداللہ بن متیج تھا جو مشہور ایرانی خلیفہ اور ابو جعفر منصور کا کاتب تھا۔ خلیفہ منصور نے سائنس اور فلسفہ کے علاوہ دیگر فنون کی کتابوں کو دربار میں جمع کیا اور ایک چھوٹی سی لائبریری قائم کی۔

خلیفہ ہارون الرشید کے دور اقتدار میں علوم و فنون کو بہت زیادہ ترقی حاصل ہوئی۔ اس نے اہم عہدوں پر اہل علم اور علمائے کونینات کیا۔ اس نے بلا تخیل مذہب قابل اور ذہین لوگوں کو دربار میں جگہ دی۔ اسی نے وسطی ایشیا کی سرپرستی کی جنہوں نے یونانی اور سریانی زبان سے عربی میں منطق، فلسفہ، طب اور دیگر علوم کی کتب کے ترجمے کیے۔

ہارون الرشید اور رومیوں کے درمیان ایک جنگ کے دوران انقرہ اور عموں سے بہت سی یونانی کتابیں ہاتھ لگیں۔ اس نے ان کتابوں کا ترجمہ کر کے شاہی لائبریری میں رکھوایا جہاں تک اس کے درباری علماء کی رسائی تھی۔ اس علم پر ور خلیفہ کی بدولت بغداد فلسفہ اور منطق کا مرکز بن گیا۔

ہامون الرشید کے عہد میں تو یہ علمی سفر بہت بلند ہوا تک پہنچ گیا۔ اس نے علم کی تلاش و جستجو میں خوب توجہ دی۔ اس نے روم کے بادشاہوں سے خط و کتابت کی اور انہیں پیش قیمت تحفے بھیجے اور ان کے بدلے میں فلسفہ و سائنس کی کتابیں منگوائیں۔ روم کے بادشاہوں نے اقلاتون، اسطو، بقرطط، جالینوس، اقلیدس اور بطلیموس جیسے فلسفہ کی کتابیں المامون کو بھیجیں۔ ہامون نے ان کتابوں کے تراجم کے لیے ماہر علماء کو منتخب کیا۔ اس طرح اس کے زمانے میں سائنس اور فلسفہ ہر گز نہیں مشہور و مقبول ہو گیا۔ ایسے لوگوں کو امیر و موزر مقرر کیا جنہوں نے اپنے علاقوں میں علماء کی سرپرستی کی اور فلسفہ و منطق پر کتابیں تصنیف کرائیں۔

ان خلفاء کی کوششوں سے بغداد اپنے زمانے کا سب سے بڑا علمی مرکز بن گیا۔

☆.....☆

خلفاء کی کوششوں، علماء کی کاوشوں اور طلبہ کے شوق نے بے شمار اہل کمال پیدا کیے اور بغداد اہل کمال کا مرکز بن

جب ایک بار مسلمانوں نے علوم قبل از اسلام کی طرف ہاتھ بڑھائے تو ایسے افراد تلاش کیے جو ان مصادر کو عربی میں منتقل کر سکتے تھے۔ ان مراکز میں جو اسلامی دنیا کے اندر واقع تھے ایسے اصحاب داخل موجود تھے جن کی اکثریت عیسائیوں اور یہودیوں پر مشتمل تھی۔ بعض ایرانی بھی تھے جو بلند پایہ عالم تھے اور جو یونانی، سریانی، پہلوی اور سنسکرت کے علاوہ عربی زبان بھی جانتے تھے لہذا وہ بہ سہولت تراجم کر سکتے تھے۔ ایک وقت وہ بھی آیا جب بغداد کے اندر جو خلافت کا صدر مقام تھا ماہر مترجمین بہ آسانی مل گئے۔ کتاب کی بھی زبان میں ہونے پر ترجمہ ہو سکتی تھی۔ ابھی دو صدیاں گزری تھیں کہ فلسفیانہ اور سائنسی کتابوں کا ایک عظیم مجموعہ تصانیف یونانی، سریانی، پہلوی اور سنسکرت سے عربی میں منتقل ہو گیا۔

خلفائے اسلام نے ان تراجم کے لیے بڑے بڑے ادارے تعمیر کرائے۔ اس کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ غیر مسلموں خصوصاً یہودی مذہب کے علماء سے میل ملاپ شروع ہو چکا تھا۔ ان پر اسلامی عقائد کی حقانیت ثابت کرنا مشکل ہو رہا تھا کیونکہ قرآن و حدیث کے دلائل ان پر اثر انداز نہیں ہو سکتے تھے اور وہ اسلامی عقائد کو جملہ آور ہوتے وقت منطق اور فلسفیانہ دلیلوں سے کام لیتے تھے جن سے مسلمان ناواقف تھے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ دین اسلام کو بھی ویسے ہی عقلی سمجھا دیوں سے رخ کیا جائے لہذا خلفاء خصوصاً ہامون الرشید نے فلسفہ و علوم کی کتب کو عربی میں ترجمہ کرانے پر بہت زور دیا۔

یونانیوں، ایرانیوں اور ہندیوں کے علوم کے بہت سے حصے اور فلسفے کے دستاویز ہو جانے سے مسلمانوں نے ایسے رنگ رنگ علمی تاثر تخلیق کیے جو اسلام کے افق پر چھاتے چلے گئے۔

اموی حکومت کے بعد جب عباسی حکومت قائم ہوئی تو یہ حکمران خاندان کی جدیدی زندگی بلکہ ایک ثقافتی انقلاب بھی تھا۔ ابو جعفر منصور کے عہد حکومت میں باقاعدہ علوم و فنون کا آغاز ہوا اور تصنیف و تالیف ہونے لگی۔ حدیث، فقہ اور تفسیر مرتب ہوئی اس کے علاوہ لغت، تاریخ اور عام لوگوں کے لیے کتابیں لکھی جانے لگیں۔

ابو جعفر منصور نے قصر روم کو ریاضی کی کتابیں ترجمہ کروا کے سمجھنے کے لیے لکھا تو اس نے اصول اقلیدس اور طبیعیات کی کچھ کتابیں سمجھیں جنہیں مسلمانوں نے پڑھا اور

ماہنامہ سرگزشت

خلیفہ مقتدر باللہ کے بعد خلیفہ راضی باللہ اور خلیفہ ملکی باللہ منہ خلافت پر بیٹھے مگر ضرورتاً جیت ہوئے۔
بعد ازاں اینٹ سے اینٹ بن گئی۔

الفارابی نے اسی بغداد میں چالیس سال گزارے تھے۔ چھ خلفاء کا زمانہ دیکھا تھا۔ اپنے علم و فلسفہ کے حوالے سے شہرت حاصل کی لیکن اب اس پر یہ زمین تنگ ہو گئی۔ اسے یاد آیا کہ ”رے“ شہر کے حکمران الصاحب بن عباد نے اسے تحائف اور زوارہ بھیج کر اسے اپنے دربار میں طلب کیا تھا اور اس نے انکار کر دیا تھا لیکن اب کی بات اور تھی۔ بغداد کی فتنا انگیزیاں اس کی گوشہ گیر طبیعت کے منافی تھیں۔ وہ تو بحث و مباحث کے لیے بھی شہر کے پتھلوں سے دور کسی ویرانے یا دریا کا کنارہ منتخب کرتا تھا لیکن اب کوئی جگہ محفوظ نہیں تھی۔ جان کا خطرہ لگا ہوا تھا۔ وہ کوئی گمنام آدمی نہیں تھا کہ خاموش پر اترتا۔ وہ اتنا مشہور ہو چکا تھا کہ کوئی بھی مسلمان دشمن نہ تو اس کی زندگی کا خاتمہ کر سکتی تھی۔ کوئی ایسا سرپرست بھی نہیں تھا جو اس کی سانسوں کو بحال رکھ سکتا۔ بڑے بڑے تاجروں اور محرمز لوگ بغداد چھوڑ کر جا رہے تھے۔ اسے بھی اس گھبراہٹ میں ”رے“ شہر یاد آیا۔ اس نے ایک رات بغداد کی گلیوں کو چھوڑا اور بے سروسامانی کی حالت میں ایک قافلے کے ہمراہ ”رے“ پہنچ گیا۔

وہ جب الصاحب بن عباد کی مجلس میں پہنچا جو اس وقت ایک باغ میں بیٹھا تھا۔ وہ اس حال میں پہنچا کہ اس کی پکڑی اور عبا نہایت خستہ ہو رہی تھی۔ داڑھی کے بال اچھے ہوئے تھے۔ دور سے دیکھنے میں کوئی نیم پاگل یا بدلتا لگ رہا تھا۔ الصاحب اس وقت اپنے ندیموں اور مخدوموں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ شراب کا دور پل رہا تھا۔ مخدوم اپنی حرکتوں سے الصاحب کو ہنسنے پر مجبور کر رہے تھے۔ وہ جیسے ہی باغ میں داخل ہوا اور ایک مخدوم کے نظر اس پر پڑی تو اس نے آواز دہرایا۔

”اے بوڑھے پاگل! منہ تو تیرا گرد آلود ہے نظری نہیں آ رہا۔ کچھ ہے جو اٹھائے چلا آ رہا ہے۔ کیا تیرے کپڑے تم ہو گئے ہیں جنہیں ڈھونڈتا ہوا تو یہاں چلا آیا ہے۔“

”کہیں گھاس میں منہ ڈال کر آیا ہے۔ داڑھی وہیں چھوڑ آیا، گھاس ساتھ لے آیا۔“

”اے چلا جا ورنہ ہمارے گھوڑے تیرا منہ چالیں گے۔ ایسی گھاس انہیں کہاں ملی ہوگی۔“

الصاحب نے یہ آوازیں سنیں تو وہ اپنے ندیموں پر برس پڑا۔

”اب میری مجلس ایسی بے وقعت ہو گئی کہ اس جیسا بے حیثیت آدمی بھی داخل مجلس ہو گیا۔ اسے کس نے یہاں آنے کی دعوت دی ہے۔“

”مخدوم کوئی خط الحواس ہے۔“

”فقیر معلوم ہوتا ہے۔“

”بہرہ دینا ہے۔“

الصاحب کے قریب بیٹھے ہوئے لوگ طرح طرح سے اس کا مذاق اڑاتے گئے۔ الفارابی سب کی باتیں خاموشی سے سن رہا تھا۔ اس نے ابھر اُٹھ کر دیکھا۔ ایک کونے میں اسے ایک بڑا بڑا نظر آیا۔ اس نے وہ بڑبڑاٹھا۔ اس نے بڑبڑ کے تاروں کو اپنی انگلیوں سے پھینکا۔ شکر ہے کہ اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ بڑبڑ کے تاروں سے مدھوش کا لہجہ چھوٹنے لگا۔ سننے والوں کا حال یہ ہو گیا جسے وہ پتھر کے ہو گئے ہوں۔ پھر ان کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ ہونے لگیں تھوڑی ہی دیر میں تمام شرکاء گہری نیند سو گئے۔

الفارابی نے قلم سے بڑبڑ پر لکھا۔ ”تھہرے پاس الفارابی آیا تھا۔ تم لوگوں نے اس کا استقبال مذاق اور مسخرہ اڑا کر کیا لیکن الفارابی نے تمہیں اپنے بڑبڑ کی مدھوش موتی سے گہری نیند سلا دیا اور رخصت ہو گیا۔“

☆.....☆

اس کے چلے جانے کے بعد الصاحب بن عباد اور اس کے معاصب گہری نیند سے جاگے تو ایک دوسرے کی طرف حیرت سے دیکھنے لگے اور پھر ہنسی کے فوارے چھوٹنے لگے۔ ایک دوسرے کو دیکھتے تھے اور ہنستے تھے۔

”گھوڑے تو سب بندھے ہوئے ہیں ہم کیا بچ کر سوئے تھے۔“

”یہ نہ تھا یا نیند ہم سو کیے گئے۔“

”ہم سو گئے تھے یا بے ہوش ہو گئے تھے۔“

”کچھ بھی تھا اب تو جاگ گئے۔“

”ارے وہ بوڑھا کہاں چلا گیا۔“

”اپنی اپنی جینیں دیکھو۔ بھینا کچھ چرا کر بھاگ گیا ہوگا۔“

ان میں سے ایک کی نظر بڑبڑ پر لکھی تحریر پر پڑی اور پوری بات سمجھ میں آ گئی۔

”جسے ہم پاگل سمجھ رہے تھے وہ مشہور فلسفی ابونصر

الفارابی تھا۔ اسی کے چمپڑے ہوئے مدھوشی کے نئے کی وجہ سے ہم سو گئے تھے۔ کیا باکمال ہے وہ۔“

”کیا کیا تم لوگوں نے۔ الفارابی تھا وہ۔ وہی الفارابی جسے ہم نے بڑی مدتوں سے اپنے دربار میں بلایا تھا۔“

”ہاں شاید وہی تھا۔“

”وہ جس کیسے معلوم ہوا۔“

”یہ دیکھیے اس بڑبڑ پر کیا لکھا ہے۔“

الصاحب نے تحریر پڑھی۔

”وہ یہاں آیا اور تم لوگوں نے اسے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ جلدی جاؤ اور اسے تلاش کرو۔ ابھی زیادہ دور نہیں گیا ہوگا۔“

اس کے معاصیوں نے بہت تلاش کیا لیکن وہ کسی کو نہیں ملا۔ ملا بھی کہاں سے۔ وہ تو ایک قافلے کے ساتھ ”حران“ کی طرف جا رہا تھا۔

عراق کے شمالی حصے میں حران ایک قدیم شہر تھا۔ سکندر اعظم نے اسے یونانیوں کی ایک نوآبادی قرار دیا تھا جس کی وجہ سے یونان کے بہت سے لوگ اس میں آباد ہو گئے تھے۔ چوتھی صدی عیسوی میں جب رومی سلطنت کا سرکاری مذہب عیسائیت قرار پایا اور یورپ کے لوگ جوق در جوق عیسائی ہونے لگے تو جو یونانی اپنے قدیم مذہب پر قائم رہے ان کی بڑی تعداد ترک وطن کر کے حران میں آباد ہو گئی۔ اسلامی دور کے آغاز میں عربوں اور ایرانیوں کی طرح حران کے یہ یونانی بھی مشرقیہ اسلام ہو گئے مگر ان میں سے جو لوگ اپنے قدیم مذہب پر قائم رہے انہوں نے صابی کا لقب اختیار کیا تا کہ ان کا شمار بھی اہل کتاب میں ہونے لگے کیونکہ یہود اور نصاریٰ کے ساتھ ساتھ صابیوں کا ذکر بھی قرآن پاک میں آیا ہے۔

صابیوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ مطالعہ افلاک کے بڑے شائق تھے اور اس لیے ستارہ پرست کہلاتے تھے۔ یہ خصوصیت کلدانیوں اور حرانیوں دونوں میں مشترک تھی۔

حران کو یونانی علوم بالخصوص فلسفہ، ریاضی اور ہیئت کے ایک علمی مرکز کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ یہ صورت حال مسلمانوں کے زمانے میں بھی قائم رہی جس کے باعث اسلامی دور میں بھی حران میں متعدد اہل دانش و دانش فرورخ پایا اور حران ایک بڑا علمی مرکز بن گیا۔ ثابت بن قرہ حرانی،

جابر حرانی اور محمد بن جابر تہائی جیسے دانش ور پیدا ہوئے اور یہ سب کے سب کم و بیش الفارابی کے ہم عصر تھے۔

ثابت بن قرہ الفارابی سے کم و بیش بیس سال پہلے پیدا ہوا اور الفارابی کے دور شباب تک زندہ رہا۔ اس نے اپنی گزر اوقات کے لیے صرائی کا پیشہ اختیار کر لیا تھا لیکن ریاضی اور ہیئت سے اسے بہت دلچسپی تھی اور فرصت کے لمحات میں وہ ان مضامین کا مطالعہ کرتا رہتا تھا۔

ایک مرتبہ بغداد کے عمامہ بن سلطنت میں سے ایک شخص محمد بن موسیٰ حران آیا تو اس کی ملاقات ثابت بن قرہ سے ہوئی وہ اس کی لیاقت علمی سے بہت متاثر ہوا۔ وہ اسے اپنے ساتھ بغداد لے گیا۔

محمد بن موسیٰ علم و فضل میں سب سے بڑھ چڑھ کر تھا۔ وہ ہیئت اور ریاضی میں بہت ماہر تھا۔ علاوہ ازیں وہ حکومت میں فوجی خدمات بھی انجام دیتا تھا۔ سائنس سے گہرا شغف رکھنے کے باعث وہ اپنی دولت کا ایک کثیر حصہ علمی کاموں میں صرف کرتا تھا چنانچہ حبش بن اسحاق سے اس نے متعدد یونانی کتابوں کا ترجمہ کروایا تھا اور معاوضہ اپنی جیب سے ادا کیا تھا۔

ثابت بن قرہ عربی زبانوں پر عبور رکھنے کے ساتھ ساتھ سائنسی علوم میں بھی کامل دست گاہ رکھتا تھا۔ محمد بن موسیٰ نے اس کی قدر افزائی کرتے ہوئے مترجمین کے ایک بورڈ کا صدر بنادیا۔ یہاں رہتے ہوئے اس نے ارسطو، اقلیدس، بطلیموس اور جالینوس کی متعدد کتابوں کے ترجمے کیے لیکن اس کی اصل شہرت ترجموں سے زیادہ اس کی سائنسی تحقیقات سے ہوئی۔

ریاضی میں اس نے جیومیٹری کی بعض اشکال سے متعلق ایسے مسائل دریافت کیے جو اس سے پہلے معلوم نہ تھے۔

حران کی طرف جاتے ہوئے اسے ایک اور ماہر ہیئت محمد بن جابر التہائی کا خیال آیا۔ یہی اس کا ہم عصر تھا۔ وہ 858ء میں حران میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم اپنے باپ سے حران میں پائی مگر جوان ہونے پر وہ رتہ میں جو درپائے فرات کے کنارے ایک شہر آباد ہو گیا۔ اس کی زندگی کا ایک بڑا حصہ اسی شہر میں گزرا۔ پچاس سال کی عمر میں وہ بغداد کے قریب سامرا میں اٹھ آیا اور آخری عمر تک یہیں رہا اور انہیں اس کی وفات ہوئی۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے سال ہا سال کے مشاہدوں کے

بعد ہیئت کے نقشہ نہایت محنت کے ساتھ مرتب کیے۔
 ہیئت کے ان مشاہدات میں محمد بن جابر نے زاویوں
 کی جو پیمائشیں کیں وہ ہر طرح کامل اور صحیح تھیں۔ اس سے
 اندازہ ہو سکتا ہے کہ علمی ہیئت میں اس کی مہارت کس قدر
 بڑھی ہوئی تھی اور جو آلات اس کے استعمال میں آئے وہ
 کتنے اعلیٰ درجے کے تھے۔
 اسی سفر کے دوران اس نے بغداد کی تاریخ پر بھی غور
 کیا۔

بغداد کی تعمیر عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور کے عہد اور اس
 کے حکم پر ہوئی۔ یہ منصور کے عہد کا ایک اہم واقعہ ہے۔
 عباسیوں نے چونکہ اہل عجم کی مدد سے امویوں کا تختہ الٹا تھا
 اس لیے وہ سیاسی مصالحت کی بناء پر اپنا دار الخلافہ ایسے مقام
 میں رکھنا چاہتے تھے جو عجم میں ہو مگر عرب کی سرحد سے بھی
 بہت دور نہ ہو۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے بغداد کا
 انتخاب کیا۔ یہ شہریں تو قدیم زمانے سے مشہور تھا چنانچہ
 ایک روایت کے مطابق اس کی بناء ایران کے بادشاہ
 نوشیروان نے رکھی تھی اور اسے باغ وادیں عدل و انصاف
 کے باغ کا نام دیا تھا جو لب و لہجے کے اختلاف سے زبانوں
 پر بغداد مشہور ہو گیا لیکن یہ اس وقت ایک چھوٹا سا شہر تھا جس
 میں ایک عظیم اسلامی سلطنت کے دار الخلافہ کا بار اٹھانے کی
 طاقت نہ تھی۔ اس وجہ سے خلیفہ منصور نے بغداد کے قدیم شہر
 سے ملحق ایک نیا شہر بنانے کا منصوبہ بنایا۔ ایک ایرانی شخص نو
 بخت نے اس نئے شہر کا نقشہ بنایا جس پر عظیم بغداد کی تعمیر عمل
 میں آئی چونکہ آئندہ کئی صدیوں تک بغداد کو عروس البلاد کی
 حیثیت حاصل رہی اور مشرق و مغرب سے سیاح یہاں آتے
 رہے۔

منصور کے عہد کا ایک اور سائنس دان "ماشاء اللہ" تھا
 جس نے بغداد کی تعمیر میں حصہ لیا تھا۔ یہ شخص پہلے یہودی
 مذہب رکھتا تھا اور اس کا نام "شیبا" تھا۔ وہ جب مشرف بہ
 اسلام ہوا تو اس کے پہلے نام شیبا کی رعایت سے اس کا
 اسلامی نام ماشاء اللہ رکھا گیا۔ جب خلیفہ منصور نے بغداد کے
 نئے شہر کے لیے زمین کا سروے کرنے پر نو بخت کو مقرر کیا تھا
 تو ماشاء اللہ کو اس کے معاون کی حیثیت سے اس کے ساتھ
 تعینات کر دیا تھا۔

ان دونوں انجینئروں نے بغداد کے نئے شہر کا جو نقشہ
 بنایا وہ دائرہ نما تھا۔ اس کے وسط میں خلیفہ منصور کا محل تھا۔ جو
 قصر الخلد کے نام سے موسوم تھا۔ یہ محل اپنی خوب صورتی اور

شان و شوکت کے لحاظ سے اس زمانے کی بہترین عمارتوں
 میں شمار ہوتا تھا۔ قصر الخلد کے گرد حکومت کے دفاتر کی
 عمارتیں تھیں۔ ان عمارتوں سے کچھ فاصلے پر اراکین سلطنت
 اور اہرام کے محلات تھے اور ان کے گرد عام آدمی کے
 مکانات، بازار اور باغات تھے۔ پورے شہر کے گرد قریباً
 ایک سو فٹ چوڑی فصیل تھی جو پتھر کی بنی ہوئی تھی۔ اس میں
 آمد و رفت کے لیے چار بڑے بڑے پھاٹک لگے ہوئے
 تھے۔ پھاٹک کے اوپر اونچے اونچے برج بنے ہوئے تھے۔
 شہر کی آبادی میں ہر قبیلے اور ہر طبقے کے الگ الگ
 محلے اور مختلف چیزوں کے لیے علیحدہ علیحدہ بازار تھے۔ تمام
 بازار، سڑکیں اور عمارتیں اپنے اپنے ناموں سے مشہور تھیں اور
 وجہ سے بہت سی شہر کی کٹ کٹ کر شہر میں لائی گئی تھیں۔
 جب آبادی بڑھی تو اصل شہر سے ملحقہ دو اضافی قصبے
 تعمیر کیے گئے جن میں سے ایک کا نام "کرخ" اور دوسرے
 کا نام "رصافہ" تھا۔
 شہر کے مغرب میں فوج کے لیے بالکل الگ آبادی
 تھی۔

ایک مرتبہ خلیفہ منصور سخت بیمار پڑا اور جب بغداد کے
 اطباء اس کا علاج کرنے میں ناکام رہے تو چندے شاہ اور
 سے جزمین نامی طبیب کو طلب کیا گیا۔
 چندے شاہ پور کا محل وقوع ایران کے جنوب مغربی
 صوبے خوزستان کے قریب تھا۔ اس شہر کو ساسانی بادشاہ شاہ
 پور اول نے بسایا تھا۔

جزمین کے علاج سے خلیفہ نے شفائی۔ خلیفہ منصور
 نے اسے اپنا شاہی طبیب بنالیا۔ وہ چار سال تک بارگاہ
 خلافت میں رہا اور عباسی خلیفہ کی داد و بخش سے فیض یاب
 ہوتا رہا۔ اس کے بعد وہ رخصت لے کر چندے شاہ پور چلا
 گیا۔

منصور ہی کے زمانے میں اسلامی علوم و فنون کی اس
 تحریک کا آغاز ہوا جس نے اس کے نامور پوتے ہارون
 الرشید کے عہد میں وسعت پائی۔ منصور اپنی انتظامی خوبیوں
 کے علاوہ سائنس کا بھی سرپرست تھا۔ اس زمانے میں
 سائنس کی مشہور شاخیں ریاضی، ہیئت، کیمیا، طب اور
 حیاتیات تھیں جن میں سے ریاضی، ہیئت اور طب کو خاص
 اہمیت حاصل تھی اس لیے پورے اسلامی دور میں جن
 سائنس دانوں نے علم کے دربار میں نام پایا ان کی اکثریت
 ریاضی، ہیئت اور طب ہی سے منسلک تھی۔

منصور کے عہد کا ایک علمی واقعہ اس کے دربار میں
 ایک ہندو عالم اور ہیئت دان پانک کی آمد ہے جس کا نام
 عرب مؤرخ منکہ لکھتے ہیں۔ یہ شخص سندھ کے راجا کاسطیر
 بن کرد پر بدخلافت میں آیا تھا اور کئی سال تک یہیں رہا۔
 دیگر بہت سے تحائف کے ساتھ وہ اپنے ملک سے ایک
 منسکرت کی کتاب بھی لایا تھا جس کا نام سدھانت تھا۔ یہ
 ریاضی اور ہیئت کی ایک معیاری تصنیف تھی۔ خلیفہ منصور نے
 اس کتاب کا عربی ترجمہ کروانے کی خواہش ظاہر کی اور اس
 کام پر محمد بن ابراہیم فرازی کو مامور کیا۔ اس نے منکہ کی مدد
 سے پانچ سال کی محنت شاقہ کے بعد اس کا ترجمہ
 "سندھت الکبیر" کے نام سے مکمل کیا۔

منصور کے بعد جب ہارون الرشید تخت پر بیٹھا تو اس
 نے ابراہیم فرازی کو اپنے درباریوں میں شامل کر لیا۔
 یعقوب بن طارق کے آقا و اجداد ایران کے رہنے
 والے تھے اور ایران ہی میں اس کی ولادت ہوئی۔ اس نے
 ریاضی اور ہیئت کی اعلیٰ تعلیم اپنے وطن ہی میں حاصل کی پھر
 وہ بغداد آیا اور منصور کے ہیئت دانوں کی صف میں شامل ہو
 گیا یہاں اس نے اپنے علم و فضل کے باعث بہت جلد اپنے
 لیے ایک اعلیٰ مقام حاصل کر لیا۔

علمی ترقی کا وہ دور جو ہارون رشید کے زمانہ سلطنت
 میں شروع ہوا اس کے نامور فرزند اور جانشین مامون الرشید
 کے عہد میں اپنے کمال کو پہنچ گیا۔
 مامون الرشید نہ صرف اہل علم کی سرپرستی کرتا تھا بلکہ
 ریاضی اور علم ہیئت کا خود بھی عالم تھا۔ اس کا سب سے عظیم
 کارنامہ "ہیئت الکھت" کا قیام تھا۔ یہ ایک قسم کی علمی اکیڈمی
 تھی جس کے تین شعبے تھے۔ ایک تجربے کا شعبہ تھا۔ دوسرا
 شعبہ تصنیف و تالیف کا تھا اور تیسرا شعبہ شہر کی تمام
 کے ماتحت فلکیات کے علمی مشاہدے کیے جاتے تھے اور اس
 مقصد کے لیے ایک شاندار رصد گاہ قائم کی گئی تھی۔
 دارالکھت کے ساتھ ایک بڑا کتب خانہ تھا۔

ہیئت الکھت میں جو فضلاء غیر ملکی کتابوں کو عربی میں
 ترجمہ کرنے پر مامور تھے۔ ان میں سب سے مشہور مترجم
 حنین بن اسحاق تھا۔ وہ اگرچہ ہیئت الکھت میں سب سے
 آخر میں داخل ہوا مگر اپنے علم و فضل کی بدولت دوسرے
 مترجموں سے سبقت لے گیا۔ اس نے یونانی عالموں کی
 بہت سی معیاری کتب کو عربی کے قالب میں ڈھالا۔
 اس نے نوے سے زیادہ کتابوں کے ترجمے کیے جس

چانچ مسجد کی قریب ایک قبوہ خانے میں کچھ شاعر
 بنو دہلوی اور ساہل دہلوی کا ذکر کر رہے تھے۔ ایک شاعر
 نے ایک شعر سنایا جس میں ان دونوں استادوں کے نام نظم
 ہوئے تھے۔ شاعر میں حیدر دہلوی بھی موجود تھے۔ شاعر نے
 کہنے لگے۔ "اس شعر میں بنو دہلوی اور ساہل کے الفاظ صرف
 نامعلوم ہوتے ہیں۔ کمال تو یہ تھا کہ شعر میں دونوں کے نام ہی
 نظم ہوتے اور اس کے باوجود شخص نامعلوم نہ ہوتے۔"
 "کیسے ممکن ہے؟" اور اتنا کہہ کر حیدر دہلوی نے چٹکھوں
 اس طرح ٹپکنے لگے۔ "اور اتنا کہہ کر حیدر دہلوی نے چٹکھوں
 کے تال کے بعد یہ شعر موزوں کر دیا
 بڑا ہوں نہ کہدے کے در پر اس انداز سے حیدر
 کوئی سمجھا کہ سے غور ہے کوئی سمجھا کہ ساہل ہے!
 (سرمد: ریاض بیٹ: حسن ابدال)

سے علمائے اہل بغداد نے فائدے حاصل کیے۔ ابو
 نصر فارابی بھی اس سے فائدے اٹھانے والوں میں شامل
 ہے۔

عہد عباسیہ کا ایک نامور سائنس دان یعقوب کندی تھا
 جو پھرے میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ اگرچہ طبقہ اہرام میں تھا
 اور حکومت میں اعلیٰ مراتب پر فائز رہا لیکن یعقوب کندی
 نے کوئی سیاسی منصب پسند نہیں کیا بلکہ وہ صرف عالم کی
 حیثیت سے دوبار خلافت سے منسلک رہا۔

یعقوب کندی ایک ہمہ گیر شخصیت کا مالک تھا اس لیے
 اس کی تحقیق کا دائرہ بہت وسیع تھا اور ریاضی، طبیعیات،
 فلسفہ، ہیئت، طب اور جغرافیہ جیسے علوم پر اس نے اعلیٰ پایے
 کی کتابیں لکھیں۔

ابو نصر فارابی نے اس کی کتابوں سے استفادہ کیا اور
 اس کی صحبت میں بیٹھ کر بہت کچھ سیکھا البتہ اسے اس کی
 شاکر گردی کا اعزاز حاصل نہ ہوا۔

ابو نصر فارابی اب حران کے قریب پہنچ چکا تھا کہ اسے
 محمد بن ذکر یارازی کا خیال آیا کہ وہ بھی اس شہر میں پیدا ہوا
 تھا جس شہر کو الفارابی چھوڑ کر آ رہا تھا۔ اس سے زیادہ افسوس
 کی بات یہ تھی کہ جس وقت الفارابی نے رے چھوڑا رازی
 وہاں موجود تھا اور فارابی اس سے مل نہ سکا۔

میں سوچتا ہوا وہ حران میں داخل ہو گیا۔ حران اس
 وقت بھی علوم و فنون کا مرکز بنا ہوا تھا۔ یہاں اس نے مختلف

اساتذہ سے فلسفہ و منطق کے بعض اسباق پڑھے۔

اس کے اساتذہ پر تارخ نے پردے ڈال دیے۔ اس کی مضطرب طبیعت نے اسے حزان میں زیادہ دن نہیں رہنے دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہاں جائے۔ وہ کسی اپنے سرپرست کی تلاش میں تھا جس کی چھاؤں میں بیٹھ کر اپنے نظریات کو قریطاس و قلم کے سپرد کر سکے۔ اب وہ بوڑھا ہو گیا تھا اور سوچنے لگا تھا کہ اگر وہ اسی طرح شہر و شہر کھو جاتا تو اس کے خیالات ہوا میں تحلیل ہو جائیں گے۔ اس سے پہلے کہ اس کی آنکھیں بند ہوں وہ اپنا علمی کام آنے والی نسلاں کے سپرد کر دے۔ اس نے اس مرتبہ شام کا رخ کیا۔

اس وقت شمال مغربی عراق کا حکمران سیف الدولہ تھا۔ اس کا پایہ تخت ”حلب“ تھا۔ سیف الدولہ علوم و فنون سے محبت کرتا تھا اور وہ بہت سے علماء کا سرپرست تھا۔ اس کے دربار میں فضلاء کی ایک بڑی تعداد موجود رہتی تھی۔ ابوصہر کو دولت کا لالچ نہیں تھا۔ عملاً ایک صوفی تھا اور نہایت سادہ زندگی گزارتا تھا۔ وہ قوبس یہ چاہتا تھا کہ اسے سکون سے زندگی گزارنے کا موقع مل جائے۔ روزمرہ کے اخراجات پورے ہوں اور وہ دنیا کی طرف سے آنکھیں بند کر کے تصنیف و تالیف میں مشغول ہو جائے۔ وہ اسی آرزو کا مشکوٰۃ لیے شام بچھ گیا۔

ایک دن ایک عجیب و غریب شخص کا شخص ترکی لباس پہنے سیف الدولہ کے دربار میں داخل ہوا اور بادشاہ کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے جسم پر ترکی لباس تھا لیکن چہرے پر عجیب سی روشنی تھی۔ سیف الدولہ اس شخص کو دیکھ کر مرعوب سا ہو گیا۔

”آپ کھڑے کیوں ہیں۔ بیٹھ جائیں۔“ سیف الدولہ نے کہا۔

”کہاں بیٹھ جاؤں۔“ اجنبی نے پوچھا۔ ”اپنی حیثیت کے مطابق یا تمہاری حیثیت کے مطابق بیٹھوں۔“

”آپ اپنی حیثیت کا تعین کر کے بیٹھ جائیں۔“ وہ شخص آگے بڑھا اور سیف الدولہ کے تخت تک جا پہنچا اور سیف الدولہ کو اس کے کندھے سے پکڑ کر وہاں سے بیٹانا چاہتا کہ اسے ہٹا کر خود بیٹھے۔ ظاہر ہے یہ ایسی حرکت تھی جسے کوئی بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ سیف الدولہ کو بھی ناگوار گزرا۔ اس نے اس شخص کا ہاتھ جھٹک دیا اور اپنے ایک غلام سے کسی نامائوس زبان میں کہا۔ ”اس بوڑھے نے میری بے ادبی کی ہے۔“

”اگر حکم ہو تو ابھی اس کا سر اس کے تن سے جدا کر دوں؟“

”نہیں ابھی اس کی ضرورت نہیں۔ میں اس سے چند سوالات کروں گا اگر یہ درست جواب نہ دے سکا تو پھر میں اس کے نواہرین کی اسے سزا دوں گا۔“ وہ شخص اس نامائوس زبان کو فوراً سمجھ گیا اور بادشاہ سے مخاطب ہوا۔

”اے بادشاہ مہر کر! مجھے سزا دینے میں جلدی نہ کر جب کہ تو مجھے جانتا نہیں۔“

”کیا تم اس زبان کو جانتے ہو جس زبان میں، میں نے بات کی؟“ سیف الدولہ نے حیرانی سے پوچھا۔

”میں سترے زیادہ زبانیں جانتا ہوں۔“

”اس کے باوجود میرے دربار کے فضلاء تجھ سے سوالات ضرور کریں گے تاکہ تیرے مقام کا تعین ہو۔“

”میں حاضر ہوں۔“ سیف الدولہ نے اشارہ کیا اور دوبارہ حکماء اور فضلاء نے اس سے بہت سے علمی سوالات کیے۔ ہر سوال ایک الگ علم سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے ہر سوال کا مکمل جواب دے کر ثابت کیا کہ وہ بہت سے علوم پر حاوی ہے۔

”آپ بہت سے علوم کے عالم ہو۔“ سیف الدولہ نے کہا۔ ”اب اپنا تعارف کرائیے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ وہ نہیں ہیں جو نظر آ رہے ہیں۔“

”میرا نام ابوصہر الفارابی ہے۔“

”آپ کا نام میرے لیے اجنبی نہیں۔“

”میری صورت بہت سوں کو دھوکا دیتی ہے۔“

”اب فرمائیے کیسے آتا ہوا۔“

”میں نے سنا ہے آپ علم والوں کی قدر کرتے ہیں اس لیے میں بغداد سے ہجرت کر کے آپ کے پاس آ گیا ہوں۔ میں بے سرد سامان ہوں۔ مجھے کسی قسم کی دولت و درکار نہیں۔ میں قوبس یہ چاہتا ہوں کہ میں نے جو کچھ سیکھا ہے اس کو فاعام کر دوں۔“

”میں آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ بغداد کی رونق میرے دربار میں آگئی ہے اس سے بڑی بات کیا ہو سکتی ہے۔ آپ میرے مہمان ہیں۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ آپ سفر سے آ رہے ہیں کچھ تناول فرمائیں اس کے بعد باتیں ہوں گی۔“

”مجھے کچھ کھانے کی حاجت نہیں البتہ اگر آپ مجھے

اچھی سی موسیقی سنوادیں تو میری تھکاوٹ دور ہو جائے۔“

سیف الدولہ نے اپنے دربار کے بہترین مغنیوں کا ملائفہ طلب کیا۔ وہ تادیر گاتے بجاتے رہے لیکن الفارابی ذرا بھی سنا نہ ہوا۔

الفارابی نے اپنی جیب سے لکڑی کا عجیب و غریب ساز نکالا اور بجانا شروع کیا۔ اس نے اس ساز پر ایسا لہجہ چھیڑا کہ سیف الدولہ اور اس کے درباری مسحور ہو کر رہ گئے۔ جب وہ خوب اچھی طرح اپنا چادو چکا چکا تو اس نے اس ساز کی لکڑیوں کو اداں بدل کیا اور اس ساز سے طربیعہ موسیقی چھیڑ دی۔ اس طربیعہ موسیقی نے ایسی تھی کہ مجلس کا ہر فرد ہلنے لگا۔ ہر شخص اپنی جی پڑا قوباس کی کوشش کرنے لگا لیکن ناکام رہا۔ یہاں تک کہ سب کے سب ہتے ہتے زمین پر لوٹنے لگے۔

الفارابی کو ان پر دم آ گیا مگر یہ کیا۔ اس نے اس ساز کی لکڑیوں کو پھر ایک مرتبہ ایک اور ترتیب سے جوڑا اور بجانا شروع کیا۔ اب اس ساز سے ایک ایسا الہیہ لہجہ نکلنے لگا کہ مجلس کے تمام لوگ ڈارو قنار روٹنے لگے۔ اس کے بعد اس نے اس ساز کو ایک ایسی ترتیب سے جوڑا اور بجانا شروع کیا کہ مجلس کے تمام لوگوں پر غنودی طاری ہونے لگی۔ نوبت یہ آئی کہ سیف الدولہ نے آگے بڑھ کر الفارابی کو روک دیا۔

”اے عظیم فلسفی ہم نے سنا تو تھا کہ تو نے موسیقی کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا ہے لیکن آج دیکھ بھی لیا۔“

”میرے آقا، میں نے تو نہایت افلاطون کی تعلیمات سے لیا تھا کہ موسیقی روح میں بالیدگی پیدا کرتی ہے اس لیے روح کی غذا ہے۔ میں نے بھی موسیقی کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اسے اپنا لیا لیکن اس میں جدت یہ پیدا کی کہ اس کے سر اور تال کو ریاضی کے خطوط پر ترتیب دیا۔ اب میں یہ چاہتا ہوں کہ اگر آپ مجھے قربت دیں تو علم موسیقی پر ایک ایسی کتاب چھوڑ جاؤں جو رہتی دنیا تک قائم رہے۔“

”دوستو! اس کا پورا موضوع دیا جائے گا مگر میں تمہارے علم سے ایک اور فائدہ بھی اٹھانا چاہتا ہوں۔“

”وہ کیا؟“

”میرے دربار میں عہدہ قضا تمہارا انتظار کر رہا ہے۔“

”مجھے انکار نہیں لیکن مجھے تصنیف و تالیف کے لیے فرصت درکار ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ عہدہ قضا کی ذمہ داریاں مجھ سے میری فرصت نہ چھین لے۔“

”میں کوشش کروں گا کہ آپ پر مقدمات کا بار زیادہ نہ پڑے۔“

”میری ایک شرط اور ہے۔“

”بیان کیجیے۔“

”میں تجھ کو نام پر آپ سے چار درہم روزانہ لوں گا۔“

”یہ تو میری غیرت کے منافی ہو گا کہ میں اپنے کسی قاضی کو اتنی کم تنخواہ پر ملازم رکھوں۔“

”میں آپ کی عنایت سے کسی داد و بخش کا حق دار بننا نہیں چاہتا۔ محض پسندی ذہن کو مفلوج کر دیتی ہے اور میں ابھی مفلوج ہونا نہیں چاہتا۔ یہ چار درہم میرے روزمرہ کے لیے بہت ہوں گے۔“

”میرے دیئے گئے تحائف کو قبول فرمائیں گے؟“

”صرف وہ تحفے جو ایک فقیر دوسرے فقیر کو دیتا ہے۔“

سیف الدولہ مسکرا کر چپ ہو گیا اور الفارابی عہدہ قضا پر متعین ہو گیا۔

اس کا دور قضا بھی خوب تھا سائیں کے آنے کے لیے نہ کوئی وقت مقرر تھا نہ داخلے پر پابندی۔ دروازے پر کوئی حاجب بھی مقرر نہیں تھا۔ سائل کسی بھی درجے اور مرتبے کا ہو ہر وقت اس کے پاس آ سکتا تھا۔ وہیں اس کی کتابیں طلی پڑی رہتی تھیں۔ بھی مطالعے میں مصروف رہتا بھی کچھ لکھنے بیٹھ جاتا۔ کوئی سائل آتا تو کتابیں ایک طرف رکھ کر اس کی بات سننے لگتا۔

عوام پر اس کی درویشی کا حال ظاہر ہوا تو ایسے لوگ بھی آنے لگے جو محض اس کی باتیں سننے آتے تھے۔ اس کے پاس لوگوں کی بھیڑ جمع رہنے لگی۔

سیف الدولہ بھی اس سے ایسا مانوس ہوا کہ ایک ہل کے لیے آگے سے اوچھل نہ ہونے دیتا۔ جوڑی توڑی ویر بعد اپنے پاس طلب کرتا۔ کچھ وقت گزارتا اور رخصت کر دیتا۔ سلطنت کے کاموں سے فراغت کے بعد جب اسے فرصت ملتی اور اسے ندیوں کے پاس بیٹھتا تو الفارابی کو بھی بلا لیتا۔ یہ تحفے رات گئے تک جاری رہیں اور فارابی کو مجبوراً سیف الدولہ کا مساحدہ دینا پڑا۔

وہ اس صورت حال سے شک آپکا تھا لیکن واپسی کا راستہ بھی کوئی نہیں تھا۔ بغداد اب بھی غمگینوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ شامی مشرقی عراق کے دیگر شہر بھی مذہبی اور سیاسی

شورشوں کے گڑھ بنے ہوئے تھے۔ شمالی مغربی عراق ہی وہ صوبہ تھا جہاں اسن قائم تھا اور حلب تو مسکراتے ہوئے پھول کی طرح تر و تازہ تھا۔ فارابی یہاں معروف ضرور تھا لیکن پرسکون تھا۔ بغداد کی شورشوں کو وہاں اس کے اختیار میں نہیں تھا لیکن حلب کی مصروفیات کو تو وہ فرح کر سکتا تھا۔ اس نے ایک روز سیف الدولہ کے مزاج کو اپنے حق میں دیکھتے ہوئے اس کے سامنے عہدہ قضا کو چھوڑنے کا فیصلہ ظاہر کر دیا۔

سیف الدولہ کو تو اس کی ہم نشینی درکار تھی۔ اس نے فارابی کو قضا کا عہدہ اس لیے دیا تھا کہ وہ اس عہدے کے لیے دربار میں رکھا رہے گا۔ اس وقت بھی اس نے فارابی سے یہی سوال کیا تھا کہ وہ حلب سے باہر جانے کا ارادہ تو نہیں کر رہا ہے لیکن جب فارابی نے یہ اصرار کیا کہ وہ کوئی ایسا ارادہ نہیں رکھتا۔ وہ اس عہدے کے باوجود بھی اس کے دربار سے وابستہ رہے گا تو سیف الدولہ نے یہ عہدہ اس سے واپس لے لیا۔

وہ اس رات سونے کے لیے بستر پر گیا تو بہت پرسکون تھا۔ اسے وہ بہت سے کام یاد آ رہے تھے جو احوال رہ گئے تھے جنہیں اب مکمل کرتا تھا۔ اسے اپنی ذہنی ہوتی عمر کا احساس تھا۔ وہ جلد سے جلد اپنے نظریات کو ضابطہ تحریر میں لانا چاہتا تھا۔ اب اسے اپنی فطری گوشہ نشینی پر عمل کرنا تھا۔ اپنے نظریہ تعلیم، نظریہ علم، نظریہ سیاست، نظریہ اشتراکیت وغیرہ کو وضاحت سے بیان کرنا تھا۔ علم موسیقی پر کتاب تحریر کرنی تھی۔ فلسفہ منطق کو عام فہم بنانا تھا۔ وہ صبح سوکر اٹھا اور اپنے کمرے میں بند ہو کر لکھنے بیٹھ گیا۔ اپنے نظریہ تعلیم کو بیان کرنا شروع کیا۔

”علم حاصل کرنا بھی ایک روحانی عمل ہے۔ علم اور فلسفہ کا فائدہ روحانی اور مادی طور پر خوشی حاصل کر کے اپنی ذات اور اس دنیا کے افراد کو خوشی سے مامور کرنا ہے۔ ہم اپنی تعلیم کو فلسفے کے ذریعے ہی مکمل کر سکتے ہیں۔ جب تک کوئی فرد فلسفے اور منطق میں درک حاصل نہیں کرتا اس وقت تک وہ باعقل الطبیعیات اور الہیات جو کہ اس کائنات میں جاری و ساری ہے کو نہیں سمجھ سکتا۔

اس کائنات کو سمجھنے کا سب سے بڑا ذریعہ قرآن ہے اور قرآن میں سے ہی سائنس کو تلاش کیا جاسکتا ہے۔ انسان اگر کائنات کو اور اس کے فطری اصولوں کو جان لے تو اس علم سے وہ اپنی زندگی کے مقاصد کو جان کر حاصل کر سکتا ہے۔ یہ

ہی علم اس کو یہ مقاصد حاصل کرنے میں مدد دے گا کیونکہ اس طریق سے انسان بلا واسطہ طور پر عقل محض یا جوہر کائنات جو کہ عقل و علم کا منبع ہے سے منسلک ہو سکتا ہے۔ یہی طریقہ عقل محض یا اعلیٰ ترین عقل تک پہنچنے کا ہے۔ فلسفہ مذہب کی تشریح کر کے اس کی سچائی کے ثبوت فراہم کرتا ہے اس لیے فلسفہ مذہب میں کوئی تضاد نہیں۔ تعلیم معاشرے کے افراد کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ اس لیے ابتدائی عمر میں ہی انسان کو اپنی روح سے تعلیم حاصل کرنا شروع کر دینی چاہیے تاکہ وہ معاشرے کا ایک فعال فرد بن سکے۔

اخلاقی خوبیاں بہت بڑی نعمت ہے۔ تعلیم انہی خوبیوں کو پیدا کرتی ہے۔ یہی وہ شے ہے جو معاشرے کے افراد کے رویوں کو مثبت بناتی ہے۔

تعلیم کا ایک مقصد معاشرے کے لیے سیاسی لیڈر شپ تخلیق کرنا ہے کیونکہ جہاں معاشرے کے لیے انتہائی خطرناک ہے۔ تعلیم سے نابالغ لوگ صرف زحہ رہنے کے لیے سوچتے ہیں۔ تعلیم ان تمام عناصر کا مجموعہ ہے جو فرد کو تمام اچھی خوبیاں پیدا کرتا ہے۔ ریاست کے ہر فرد کو تعلیم حاصل کرنے کے مواقع ہونے چاہئیں۔ عام لوگ ابتدائی تعلیم حاصل کرتے ہیں جب کہ سنجیدہ لوگ اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔“

تعلیم کی وضاحت کے بعد اسے یہ بھی بتانا تھا کہ خود علم کیا ہے۔ یہی وہ خیالات تھے جو نظریہ علم کہلائے۔ اس نے فلسفے کو اسلامی فلسفہ بناتے ہوئے وہ اصطلاحیں تبدیل کر دیں جو افلاطون اور ارسطو نے استعمال کی تھیں۔ اس کا کہنا تھا میرے نظریہ علم کو سمجھنے کے لیے عالم مثال اور مادی کائنات کو سمجھنا ضروری ہے۔

مادے اور روح پر بحث کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ مادی دنیا سے نجات پانے کا نام علم ہے۔ جب وہ مادی دنیا سے نجات پالینا ہے اور عقل محض کی دنیا میں داخل ہوتا ہے تو وہ عالم ہے جو افراد معاشرے میں اپنے علم کے اعلیٰ درجوں پر ہوں اور وہ کائناتی ذہانت سے منسلک ہوں اور خوبیوں اور نیکیوں کا اظہار اپنے علم سے کرتے ہوں تو ایسے لوگ ہی فلسفی کہلا سکیں گے۔“

اس کا سیاسی نظریہ بھی بے حد مقبول ہوا۔ وہ اپنے ارد گرد جو سیاسی ماحول دیکھ رہا تھا اس نے اسے مجبور کیا کہ وہ سیاست کے مقاصد کو بیان کرے۔

اس نے اپنے اس نظریے کو بھی اسلامی تہذیب کے حوالے سے بیان کیا۔ افلاطون اور ارسطو سے مدد ضروری لیکن اسے اسلامی تصور کا لباس پہنانا۔

”انسان کے علم کا مقصد خدا کے بارے میں اور اس کی صفات کے بارے میں علم حاصل کرنا ہے۔ یہ علم انسانی اخلاقیات اور کردار پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اسی علم و فہم سے معاشرے کے افراد میں اتحاد پیدا ہوتا ہے اور پورا معاشرہ پورے شہر اور پورے ملک سے اتحاد کی قوت میں منسلک ہو جاتا ہے۔ افراد کی یہی ذہانت بصیرت، علم اور مذہبی روایات سیاسی حکومت کو بنیادیں فراہم کرتے ہیں۔

اس کا کہنا تھا۔ ”کسی حکمران کا کسی ملک پر حکومت کرنے کا اصل مقصد یہ ہونا چاہیے کہ اس ملک کے افراد خود اپنے لیے حکمران کا انتخاب کریں۔ حکومت کے استحکام کے لیے تمام افراد ایک فرد کو تمام اختیارات دے کر حکمران بنا دیں۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب انسان میں عقل فعال موجود ہو ورنہ فطری طور پر انسان اور حیوان میں کچھ فرق نہیں۔ انسان کی فہم و فراست، ذہانت اور بصیرت ہی اسے حیوان سے اعلیٰ تر بناتی ہے۔ انسان مادی الطبع نہیں بلکہ انسان کا مادی الطبع ہونا اس کی مجبوری ہے۔ انسان اکیلے طور پر رہنے کا عادی نہیں جب انسانی معاشرے میں رہتا ہے تو وہ بہت سے افراد سے مدد لیتا ہے۔

معاشرے میں جب کوئی خاص انسان دوسروں کی مدد کا محتاج نہیں رہتا تو وہ دوسروں کو اپنے معاملات میں دخل دینے کی اجازت نہیں دیتا اور نہ ہی دوسروں کی مدد کرتا ہے جب تک کہ وہ دوسروں کی مدد کے لیے مجبور نہ ہو جائے۔ ایسے انسان معاشرے کے لیے زیادہ سودمند نہیں ہوتے۔“ اس کا کہنا تھا کہ تمام دنیا کے باشندے ایک بڑے اجتماع کے مانند ہیں۔ اس طرح ایک شہر کے افراد بھی ایک چھوٹے اجتماع کے مانند ہیں۔ اس کے علاوہ کلی گلوں کے چھوٹے چھوٹے اجتماع بھی چھوٹے اجتماعوں کی طرح ہیں۔ اس نے ان اجتماع کو دو حصوں میں تقسیم کیا اجتماع عام اور اجتماع خاص۔

انسانی معاشروں کی تقسیم کر کے اس نے عمرانیات اور سیاسیات میں نئے نظریات کا اضافہ کیا۔

الفارابی جس وقت ”سیاست“ پر قلم اٹھا رہا تھا۔ عباسی حکومت کی شان و شوکت رخصت ہو چکی تھی اور رقبے کے لحاظ سے سمٹ چکی تھی۔ خلافت کے بہت سے صوبے

علیحدہ ہو کر خود مختار ہو چکے تھے۔ افراد اور ریاست میں تناؤ تھا۔ ایک طرف یہ حال تھا دوسری طرف علوم و فنون کی سرپرستی کی جارہی تھی۔ گویا معاشرہ دو عملی کا شکار تھا۔ فارابی بایہ تخت سے دور ”حلب“ میں تھا لیکن بغداد اور اس کے ارد گرد کی خود مختار ریاستوں کا گہری نظر سے مشاہدہ کر رہا تھا۔ یہی وہ دن تھے جب وہ یونانی فلسفہ کا گہری نظر سے مطالعہ کر رہا تھا اور تشریحات کر رہا تھا۔ اس کی نظر سے افلاطون کی جمہوریہ بھی گزری ہوگی۔ اسی لیے وہ بادشاہت (جس کی خرابیوں کا وہ مشاہدہ کر رہا تھا) سے زیادہ جمہوریت کا قائل نظر آتا ہے اسی لیے اس کے قلم سے نکلا ”کسی ملک پر حکومت کرنے کا اصل مقصد یہ ہونا چاہیے کہ اس ملک کے افراد خود اپنے لیے حکمران کا انتخاب کریں۔“

اس میں شک نہیں کہ فارابی، ارسطو اور افلاطون کے نظریات سے متاثر تھا لیکن جب وہ ان کے نظریات پر بحث کرنے لگا تو اس نے قدیم ایجنٹر کو نظر انداز کر کے مدینۃ النبی کو آئیڈیل ریاست قرار دیا۔ اس کے خیال میں یونان اور روم کی ریاستیں مکمل طور پر جمہوری نہیں تھیں۔

”جب اسلامی دنیا کی پہلی ریاست مدینۃ النبی میں قائم ہوئی تو وہ ایک مثالی ریاست تھی کیونکہ اس کی انتظامیہ اور سربراہ مملکت اعلیٰ ترین انسانی خوبیوں اور علوم تامہ سے مزین تھے۔ اگر حکمران اب بھی ایسی مثالی ریاست قائم کرنا چاہیں تو ریاست کی انتظامیہ اور مقتدر اعلیٰ کو علوم تامہ اور اعلیٰ ترین خوبیوں کا حامل ہونا ہوگا۔“

الفارابی نے اپنے نظریہ سیاست میں ریاست کی تعریف کرتے ہوئے ایک مثال دی ہے کہ ریاست ایک انسانی جسم کی طرح ہوتی ہے۔ جسم کے تمام اعضاء مل کر جسم کے نظام کو چلاتے ہیں اور جب جسم کے کسی حصے کو تکلیف پہنچتی ہے تو پورا جسم متاثر ہوتا ہے۔ اس طرح ریاست بھی ایک جسم کی طرح ہے جس کو اعلیٰ ترین انسانی فہم کی ضرورت ہوتی ہے۔ ریاست کے تمام افراد ریاست کے وہ اعضاء ہیں جن کی بدولت ریاست اپنا وجود قائم رکھتی ہے۔

ریاست ایک جہاز ہے جس طرح کوئی جہاز اپنے کپتان کے بغیر نہیں چل سکتا اسی طرح ریاست بھی مقتدر اعلیٰ کے بغیر نہیں چل سکتی مگر یہ کپتان اعلیٰ تعلیم یافتہ فلسفی لیڈر کی صورت میں ہو جو ایسی پالیسیاں مرتب کرے جن سے ریاست کے افراد اپنے اعمال کو بہتر بنا سکیں اور اپنے معاشی حالات کو مضبوط کر سکیں۔

ریاست کا سیاسی رہنما ایک ڈاکٹر کی طرح بھی ہوتا ہے جو اپنی سیاسی بصیرت سے ریاست کے افراد کی بد اعمالیوں کا علاج کرتا ہے۔

کسی پرسکون شہر کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ اس شہر کے افراد میں اخلاقی توازن انتہائی بہتر ہے۔ ایسا سکون ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ رہنما ہی پیدا کر سکتا ہے جس کی روح خود ہر طرح سے پرسکون ہو۔ جب کسی ریاست کے شہریوں کے اخلاق بگڑے ہوئے ہوں تو اس کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ شہر کے حاکم بھی بگڑے ہوئے ہیں۔ اچھائی یا نیکی انسانی ذہن ہی میں پیدا ہوتی ہے۔ اس کو عمل میں لانے کے لیے رہنما کی ضرورت ہوتی ہے۔ ریاست کا رہنما اگر خود اعلیٰ خوبیوں کا مالک ہوگا تو ریاست کے شہری بھی ان خوبیوں کے مالک ہوں گے۔“

الفارابی نے صرف افلاطون اور ارسطو کا ہی مطالعہ نہیں کیا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے بہت سے یونانی اور رومی مفکروں کے نظریات کو پڑھا تھا۔ ان کے تراجم کیے تھے۔ ان سے اختلاف کیا تھا۔ ان سے اتفاق کیا تھا۔ بہت سے مماثلت کے سفر کر کے وہاں کے نظام حکومت کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ سیاسی حالات و واقعات کا مشاہدہ کیا تھا۔ اس کے بعد اس نے اپنی مشہور زمانہ کتاب ”سیاست مدینہ“ لکھی۔ یہ ایسی شاندار کتاب ہے جس نے اہل یورپ کو بھی متاثر کیا۔ اس کتاب میں اس نے ریاستی شہروں کی اقسام بیان کی ہیں۔

اس کے خیال میں مختلف معاشروں کے لوگ مختلف نظریات اور مختلف مقاصد کے لیے زندگی بسر کرتے ہیں۔ الفارابی ایسے معاشرے کے افراد کے اجتماع کو شہری ریاست تسلیم کرتا ہے اور ان شہری ریاستوں کی مندرجہ ذیل اقسام بیان کرتا ہے۔

☆ جس ریاست کے افراد غیر معیاری طرز زندگی رکھتے ہیں وہ ایسی ریاستوں کو جاہلوں کی ریاست کا نام دیتا ہے۔ ایسی ریاستوں میں اخلاقی معیار پست ہوتا ہے۔ جاہلانہ ریاست کے قیام کی وجوہات یہ ہوتی ہیں۔

☆ کسی خطے پر افراد کا ایسا اجتماع جو سیاسی طور پر بہت زیادہ طاقت حاصل کر لیتا ہے وہ معاشرے کے کمزور افراد کی مدافعت کی پروا کے بغیر حکمران بن جاتا ہے۔

☆ لسانی اشتراک کی قوت: ایسی ریاست کے افراد ایک ہی قبیلہ، قوم یا زبان رکھنے کی وجہ سے سیاسی قوت

حاصل کر لیتے ہیں اور ریاست کی بنیاد رکھتے ہیں۔ ایسی ریاست کے کوئی خاص مقاصد نہیں ہوتے۔

☆ غیر منجمد لوگ: کبھی خطے کے وہ لوگ جو غیر منجمد لوگوں کے ساتھ وابستگی رکھتے ہیں وہ آپس میں اتحاد کر لیتے ہیں جو جوتی ہوتا ہے۔ اس اتحاد کے تحت حکومت قائم کر لیتے ہیں۔ ایسی حکومت میں وہ عوام کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

☆ بدقماش لوگ: الفارابی کا کہنا ہے جب کسی سلطنت کا شیرازہ بکھرتا ہے تو ایسے بعض بدقماش لوگ جو اپنے ہی جیسے بدقماش لوگوں کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں وہ سلطنت کے کسی کمزور حصے پر قبضہ کر کے اپنی حکومت قائم کر لیتے ہیں ایسی حکومت ریاستی مفاد کے لیے نہیں اپنے مفاد کے لیے کام کرتی ہے۔

☆ غیر منظم لوگ: غیر منظم لوگ معاشرے کے کمزور افراد پر حکومت قائم تو کر لیتے ہیں لیکن ان کے کوئی مقاصد نہیں ہوتے اور ایسی حکومت بھی چند روزہ ہوتی ہے۔

☆ جابر لوگ: ایسے لوگ لالچی اور خود پسند ہوتے ہیں۔ اپنے جبر سے حکومت قائم کر کے عوام پر بھاری ٹیکس عائد کرتے ہیں اور ان کا استحصال کرتے ہیں۔ ایسی حکومتیں لمبی عمر نہیں پاتیں۔

☆ آزاد لوگ: ایسے لوگ خود کسی حکومت کے ماتحت رہنا پسند نہیں کرتے۔ ان کی حکومت منتشر اور بد حال ہوتی ہے۔ ایسی حکومت کے حکمران بے پروا اور قلم و نطق سے عاری ہوتے ہیں۔

☆ حقیر: ایسے لوگ (حکمران) کچھ نہ کچھ علوم و فنون تو رکھتے ہیں لیکن ان کی زندگی کا اصل مقصد مال و دولت اکٹھا کرنا ہے۔ وہ اپنے مال و دولت کو بڑھاتے ہی رہتے ہیں اور خرچ نہیں کرتے۔ ایسی ریاستوں کے افراد میں بھی کوئی قلم و نطق نہیں ہوتا اور اخلاقی معیار پست ہوتا ہے۔ ایسی ریاستوں کے لوگ اور حکمران صرف حصول دولت کی ہوس میں مبتلا ہوتے ہیں۔

اس نے ایک مثالی ریاست کو مدینۃ الفاضلیہ کے نام سے یاد کیا ہے۔ اس کے برعکس کمزور ریاست کو مدینۃ الجالیہ کے نام سے یاد کرتا ہے۔

معاہدہ عمرانی جسے انگریزی میں سوشل کنٹریکٹ کہتے ہیں کا خالق الفارابی ہے۔ وہ پہلا فلسفی ہے جس نے اس اصطلاح کو ”العہد“ کے نام سے پیش کیا۔ العہد کے معنی ریاست اور افراد کے درمیان بین الانسانی عقد قائم کرنا ہے

جو خاموشی کی زبان میں ہے۔

اس کا کہنا ہے کہ جب ریاست وجود میں نہیں آئی تھی تو انسان گروہوں کی صورت میں منتشر تھے طاقتور لوگ کمزوروں پر ظلم کرتے تھے۔ اس مسلسل جنگ و جدال سے انسان تنگ آگئے تھے۔ اب وہ اطمینان سے مل جل کر رہنا چاہتے تھے تا کہ ظلم و ستم کے بغیر زندگی گزاری جائے۔ جب انہوں نے اپنی مرضی سے ایک سردار کا انتخاب کر لیا جو ان کے حقوق کی حفاظت کر سکتا تھا۔ یہی پرسکون معاشرہ طاقتور سردار کی قیادت و فراست سے تقویت پا کر ایک ریاست کے طور پر ابھرا۔ ایسی ریاست میں افراد کے بنیادی فطری حقوق ظالم و جابر لوگوں سے محفوظ ہو گئے۔

الفارابی نے معاہدہ عمرانی کا یہ نظریہ نویں صدی عیسوی میں دیا تھا جب کہ یورپ میں اس وقت فلسفہ و منطق کو پڑھنا اور سیکھنا مذہب کے خلاف قرار دیا تھا۔ یہ دور یورپ کا سیاہ دور تھا۔ یورپ کی نشاۃ ثانیہ چودھویں اور پندرہویں صدی عیسوی میں ہوئی۔ اٹھارہویں صدی میں برطانیہ اور فرانس میں الفارابی کے نظریہ معاہدہ عمرانی کو بہت زیادہ پذیرائی حاصل ہوئی۔

یورپی مفکرین نے اس کا سہرا اپنے سر باندھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کا خالق ابوالعز الفارابی تھا۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ جدید مفکرین نے اس میں تھوڑی بہت تبدیلی بھی کر دی۔ ان مفکرین کے نظریہ معاہدہ عمرانی میں جدید ریاست کے حوالے سے تفصیلات زیادہ ہیں لیکن بنیادی نکتہ وہی جو الفارابی نے پیش کیا تھا۔

ریاست کے ساتھ ساتھ الفارابی نے نوآبادیوں کا نظریہ بھی پیش کیا۔ وہ لکھتا ہے انسان فطری طور پر پرسکون ماحول میں رہنا چاہتا ہے۔ اگر انسان کو اس کی ضرورت پوری نہ ہو تو ایسے ماحول میں اس کی زندگی تنگ ہو جاتی ہے۔

جب وہ ذہنی، روحانی اور فطری سکون کو اپنے ماحول کی وجہ سے محسوس کرتا ہے تو ترک سکونت کر کے نئے خطوں کی تلاش میں نکل جاتا ہے۔ پھر وہ کوئی پرسکون اور معاشی خوش حالی کی جگہ تلاش کر کے وہاں اپنی رہائش کرتا ہے اس طرح وہ جس نئی جگہ پر بسیرا کرے گا تو اس طرح کے دیگر افراد بھی وہاں بسنا شروع ہو جائیں گے اور اس طرح نئی بستیوں بسنا شروع ہو جائیں گی۔ ایسی نئی بستی ہی کو نوآبادی کہا جائے گا۔

الفارابی نوآبادیوں کے وجود میں آنے کی تین بنیادی وجوہات بیان کرتا ہے۔ معاشی حالات، جان لیوا وباں،

کسی طاقتور ریاست کا کمزور ریاست پر حملہ۔

کسی شہر یا ریاست میں رہتے ہوئے انسان جب معاشی بد حالی کا شکار ہو جائیں اور ان کے لیے رزق کا حصول مشکل ہو جائے تو ایسے حالات میں وہ اپنے معاشی حالات کو بہتر کرنے کے لیے نئے شہروں یا نئی بستیوں کا رخ کرتے ہیں۔ یہی حال قتل زدہ لوگوں کا ہے۔

جب کسی خطہ زمین پر رہنے والے انسان جان لیوا وباؤں کی لپیٹ میں آجائیں تو اس صورت میں نقل مکانی کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ دور وسطیٰ میں طاعون اور متعدی امراض عام تھے۔ لوگ جان بچانے کے لیے نئی آبادیوں کا رخ کرتے تھے۔

اسی طرح نوآبادیاں اس وقت وجود میں آتی ہیں جب لوگ حملہ آوروں کے خوف سے پناہ کی تلاش میں نئی آبادیوں کا رخ کرتے ہیں۔ یہ مثالیں بھی دور وسطیٰ میں عام تھیں۔ پڑوسی ریاستیں ایک دوسرے سے سرسبز پکار رہتی تھیں اور ان ریاستوں کے پراسن لوگ پناہ کی تلاش میں نئی بستیاں بسا لیتے تھے۔ الفارابی کا دور ایسی ہی افراتفری کا دور تھا۔

اس نے اپنی کتاب ”مدینۃ الفاضلیہ“ میں ایک مثالی ریاست کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے اس کے سربراہ کے لیے بھی کچھ شرائط لکھ دی ہیں۔

”مدینۃ الفاضلیہ“ کو ایک ایسے رئیس اول (سربراہ مملکت) کی ضرورت ہے جو اس ریاست کے عوام کو اپنی صلاحیتوں سے اعلیٰ اخلاق، انصاف، باہمی اتحاد اور ترقی و بہبود سے مزین کر سکے۔ جو علم و فن، اخلاق و اقتدار، شجاعت و بہادری، سخاوت اور ذکاوت کی صفات رکھتا ہو۔

کسی ریاست فاضلیہ کا رئیس اول ذہنی اور فکری لحاظ سے اعلیٰ صلاحیتوں کا مالک ہوگا تو وہ امور سلطنت اور سیاسی و سماجی حالات کو سمجھ کر ان کا مناسب حل تلاش کرے گا۔

رئیس اول کی یہ خوبی ہوگی کہ وہ عوام میں یکساں عدل و انصاف کا بول بالا کرے گا۔ عدل و انصاف کے لیے حکمران کا تعصب سے پاک ہونا ضروری ہے اگر وہ اقربا پروری اور جانب داری سے کام لے گا تو پورے ملک کا نظم و نسق بگڑ جائے گا۔

مدینۃ الفاضلیہ کا رئیس اول اپنی ذات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے مفاد عامہ کے لیے ہر طرح کے اقدامات کرے گا۔ اگر وہ حرص و لالچ میں مبتلا ہوگا تو ملک کا نظام



شعلہ صفت

عبد اللہ احمد حسن

زندگی آگ کا دریا تھی اور اسے ڈوب کے جانا تھا۔ وہ مسلسل سعی میں مصروف رہا۔ ہر دروازہ پر دستک دیتا رہا کہ شاید یہی قسمت کا دروازہ ثابت ہو جائے لیکن ہالی ووڈ تو بے رحم فلم نگری ہے۔ اتنی آسانی سے کب کسی سے رام ہوئی ہے۔ اسے ناامیدی کے گھپ اندھیرے میں دھکیلا جانے لگا۔ تب اس کے ایک ہمدرد نے اسے ایک ایسا مشورہ دیا کہ کامیابی اس کے قدموں تلے کھنچ آئی۔ وہی لوگ جو اس کے سایہ سے بھی دور بھاگتے تھے۔ اس کے آگے دامن پھیلائے لگے۔

ایک عالمی شہرت یافتہ اداکار کے مدد پر کامیاب

آس پاس مجمع نعرے لگا رہا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو گھور رہے تھے۔ ایک طرف کلین شیو چینی جوان تھا، جس نے کنگفو کا لباس پہنا ہوا تھا۔ کالی ٹراؤڈر، سفید اپر اور کنگفو شوز۔ کمر پر کوئی بیٹ یا شال نہیں بندھی تھی۔ سامنے مخالف باریش امریکی گورا تھا۔ اس نے گی (Gi) پہنی ہوئی تھی (وہ لباس جو کراٹیکا زینپتے ہیں) کمر پر کالی بیٹ باندھی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک برائا ڈرم کا لباس سا نشان تھا جو بائیں آنکھ کے اوپر سے شروع ہو کر نیچے آدھے گال تک آ رہا

فروری 2018ء

[39]

ماہنامہ سرگزشت

حافظ کہا اور سوار ہو گئے۔
چلتے وقت یہ کسی نے نہیں سوچا تھا کہ راہ میں رہزن ہیں اور رات ہی میں رات بھی ہو جائے گی۔ آپادی سے نکل کر وہ ایک ویرانے میں داخل ہوئے۔ ابھی کچھ ہی دور گئے کہ کھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز نے انہیں چونکا دیا۔
”بھائی جنگ کا زمانہ ہے۔ کوئی لشکر ادھر سے گزر رہا ہوگا۔“
”یہ آوازیں ہزاروں کھوڑوں کی نہیں چند کھوڑوں کی ہیں۔“

”تم کہتا کیا چاہتے ہو؟“
”یہ علاقہ رہزنیوں کے لیے مشہور ہے کہیں.....“
”ابھی اس کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ آٹھ سے دس افراد ایک ٹیلے کے پیچھے سے نمودار ہوئے اور اسے اس کے ساتھیوں کو گھیر لیا۔ اب کوئی شک نہیں رہا تھا کہ یہ کوئی لشکر نہیں رہزنیوں کا گروہ ہے۔“
”تم لوگوں کے پاس جو کچھ ہے ہمارے مردار کے قدموں میں رکھ دو۔“
”کہاں ہے تمہارا سردار؟“
”اے بڑھے ان سب کا سردار میں ہوں۔“
”شاید تم اندھیرے میں پہچان نہ کر سکو۔ میں ابوضر الفارابی لکھی ہوں۔“
”تم کوئی بھی ہو میں مال چاہیے۔“
”ایک وعدہ کرو۔ ہمارے پاس قیمتی کھوڑے اور بیش قیمت کپڑے ہیں۔ یہ سب لے لو مگر میرے ساتھیوں کو کوئی گزند نہ پہنچاتا۔“
”ٹھیک ہے۔“

مال و متاع سردار کے قدموں میں رکھ دیا گیا لیکن اس کے باوجود اسے قتل کرنے کے لیے آگے بڑھے۔ اس نے بھی تلوار نکال لی اور مقابلہ کیا لیکن اپنے رقتا سمیت رہزنیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔

کتنا قیمتی اچھا تھا جو رہزنیوں نے لوٹ لیا۔
معلم جانی کو 339ھ بمطابق 950ء کو بہ عمر 80 سال قتل کر دیا گیا۔
دشمن کی مٹی اس کی آخری آرام گاہ بنی۔

ماخذات:

ابونصر الفارابی۔ ملک اشفاق
نامور مسلم سائنس دان، حمید عسکری

فروری 2018ء

[38]

ماہنامہ سرگزشت

معیشت بگڑ جائے گا۔ رئیس اول کی ذمہ داری ہے کہ وہ افراد کو انفرادی طور پر وہ تمام سہولیات فراہم کرے جو ان کا بنیادی حق ہے۔
رئیس اول پر یہ ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے کہ وہ ریاست کو اندرونی خلفشار اور بیرونی حملوں سے محفوظ رکھے۔ ایسا اس وقت ہی ہو سکتا ہے جب رئیس اول عوام میں یکساں طور پر مقبول ہو۔ یہ مقبولیت اسے اپنی صلاحیتوں (اگر اس میں ہیں) کو مفاد عامہ کے لیے استعمال کرے اور انہیں خوش حال زندگی دے ورنہ کسی بھی بیرونی حملے کی صورت میں اس کے عوام اسے چھوڑ جائیں گے اسی لیے الفارابی نے کہا تھا رئیس اول ہی ہوتا ہے اس کی سخاوت سے عوام کو مادی اور معاشی فوائد حاصل ہو سکیں۔

☆☆☆☆

الفارابی نے فلسفہ منطق میں بے پناہ کارنامے انجام دیے۔ اس کا یہ تمام کام ارسطو اور افلاطون کے نظریات سے ماخوذ ہے۔ اس نے ان فلاسفر کے نظریات کی تشریح کی اور انہیں عام فہم بنایا اور جہاں جہاں اختلاف کر سکتا تھا اختلاف کیا اسی لیے اسے ”معلم جانی“ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

اس کے یہ سب کارنامے اپنی جگہ لیکن اس کی اصل عظمت اس میں ہے کہ اس نے ارسطو اور افلاطون کے نظریات کو اسلامی پھر سے ہم آہنگ کر کے پیش کیا۔
معلم اول ارسطو تھا اور معلم جانی ابونصر الفارابی۔
الفارابی کے فلسفہ و منطق نے اس کے بعد آنے والے فلاسفر پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ ان میں خاص طور پر بوعلی سینا، ابن رشد، ابن خلدون، جلال الدین رومی اور امام غزالی جیسے مفکرین متاثر ہوئے۔ دراصل الفارابی اسلامی فلسفہ و منطق کا بانی تھا۔

☆☆☆☆

اس کی عمر اسی سال سے تجاوز کر چکی تھی لیکن وہ نہ خود تھا کہ تھا نہ اس کے قلم نے ہار مانی تھی۔ ایک مرتبہ وہ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ دمشق روانہ ہوا۔ کتاب کی تلاش دوستوں سے ملاقات کا بہانہ بھی بن گئی۔ شب و روز جوانی کی یادوں اور موجودہ حالات کے موازنے میں گزرنے لگے۔ خوب محفلیں جمیں، علمی بحثیں اور گپ شب میں کئی دن کٹ گئے۔ پھر اس نے رخت سفر باندھا۔ کھوڑے تیار کھڑے تھے۔ اس نے اور اس کے ساتھیوں نے اہل دمشق کو خدا

جسے دو ٹوکھا جاتا ہے میں بھی کئی اسٹائل ہیں۔
اس وضاحت کے بعد پھر آتے ہیں اپنی کہانی کی طرف۔
اس وقت بروں کی ذہنی طور پر خاصا منتشر تھا وہ کئی مقابلے ہار چکا تھا اور خود کو ایک ناکام قاتل تصور کر رہا تھا۔ ایسے میں سیپ مان نے اسے کئی دی اور تربیت دینے کا بیڑا اٹھایا۔ سیپ مان کے کئی شاگرد تھے جنہیں وہ لڑنے کے علاوہ اچھے اخلاق بھی سکھاتا تھا۔ اس کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ اس کے شاگرد خواہ میں گھبوں کے غنڈوں کی طرح اٹنی سیدی لڑائیاں لڑ کر اپنی توانائیاں ضائع کرنے کے بجائے منظم طریقے سے لڑنے کا فن سیکھیں اور اسے صرف شدید ضرورت کے وقت اپنی یا کسی کی جان و مال کی حفاظت کے لیے استعمال کریں۔

اب بروں کی کو ماسٹر سیپ مان کے پاس تربیت لیتے ایک سال بیت چکا تھا۔ اس دوران اسے کچھ مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ جب سیپ مان کے دیگر شاگردوں کو پتہ چلا کہ بروں کی خالص نہیں بلکہ مخلوط نسل چینی ہے تو ان کے رویے میں فرق آ گیا۔ حالانکہ اس کا باپ خالص چینی تھا مگر ماں کے مخلوط نسل ہونے کی بنا پر اسے بھی ایسا ہی سمجھا جاتا تھا۔ وہ اس کے ساتھ پریشانی کرنے سے کھڑے نہ گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس دور میں چینی کسی غیر کو اپنے فنون حرب سکھانے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ تو صرف چینیوں کا حق ہے۔ سیپ مان نے بھی اپنے پورے دور میں مشکل چھ ایسے لوگوں کو تربیت دی تھی جو غیر چینی تھے یا مخلوط نسل تھے۔ بروں کی کو اس فن سے غیر معمولی دلچسپی پیدا ہوئی تھی، اب اسے جنون سا ہو گیا تھا کہ وہ دیکھ چکے تھے کہ اس فن میں مہارت حاصل کرے۔

سیپ مان نے اپنے ایک ہونہار شاگرد دو ونگ شن کو (جس نے بعد میں مارشل آرٹسٹ کے طور پر خاصا نام پیدا کیا تھا) بروں کی کو تربیت دینے اور مشق کروانے کی ذمہ داری سونپی۔ دو ونگ کے ایک اور شاگردوان کام لیونگ (Wan Kam Leung) نے جو انجمنی دنوں اس کے پاس تربیت حاصل کر رہا تھا، بیان کیا ہے کہ ”میں نے بروں کی کو ماسٹر دو ونگ کے ساتھ لڑائی کی مشق کرتے دیکھا تو میں حیران رہ گیا، بروں کی کے ہاتھ اور پاؤں کسی تیز رفتار مشین کی طرح حرکت کر رہے تھے۔ یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ کوئی انسان اتنی رفتار سے کئے اور لائنیں چلا سکتا ہے۔ اور یہ سب اندھا دھند نہیں تھا بلکہ جلد نشانے پر تھا۔ بروں کے اندر قوت برداشت بھی بے پناہ تھی۔ وہ بہت ہی زیادہ طاقتور بھی تھا۔“

وطن کی یاد تازہ رہتی تھی اس لیے ان کے خاندان نے رخت سفر ہاندھا اور ہانگ کانگ بھیجے گئے۔ تین ماہ کا ننھا بروں کی ان کے ساتھ تھا۔ بد قسمتی سے جب وہ ہانگ کانگ پہنچے تو انجمنی دنوں چانپان نے حملہ کر کے ہانگ کانگ پر قبضہ کر لیا۔ جو ساڑھے تین سال تک جاری رہا۔ جنگ کے خاتمے کے بعد ہانگ کانگ کی تعمیر نو اور ترقی شروع ہوئی۔ حالات معمول پر آتے ہی نے اپنا کام بھرے شروع کر دیا اور پہلے سے بھی مقبول اداکار کے طور پر ابھرے۔

اب ہانگ کانگ پر برطانیہ کا قبضہ الہار ہا تھا۔ لی کی بیوی گرئس ہو ہانگ کانگ کے ایک متحول خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ دونوں میاں بیوی مالی طور پر خاصے مستحکم تھے اس لیے انہوں نے بچوں کی پرورش بہت اچھے انداز سے کی تھی۔ مگر انجمنی دنوں چین میں اشتراکی نظام نافذ کر دیا گیا جس کے بعد مہاجرین کا ایک سیلاب ہانگ کانگ پر ٹوٹ پڑا۔ ان میں ہر طرح کے لوگ تھے۔ اچھے لوگوں کے ساتھ کئی مجرمانہ ذہنیت کے لوگ بھی آ گئے تھے۔

بروں کی کو اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ وہ مزاج کا ڈراما تھا اس لیے عام طور پر آوارہ لڑکوں سے اس کا بھڑکا ہوا جانا تھا، جس میں اکثر وہ پٹ کر آتا تھا کی مرتبہ وہ دنگی بھی ہوا۔ تب اس کے والد نے فیصلہ کیا کہ اس کو مارشل آرٹس سے روشناس کروایا جائے۔ چونکہ لی خود بھی دو ونگ کے اسٹائل تائی چی چوان سے واقفیت رکھتے تھے اس لیے ابتدائی تربیت انہوں نے خود دی اور بروں کو بنیادی اصول سکھائے۔ اس کے بعد اس کی تربیت جاری رہی مگر اس کی زندگی میں ایک انقلاب تب آیا جب اسے ماسٹر Yip Maan کے پاس بھیجا گیا۔ اس وقت وہ سولہ سال کا تھا۔ ماسٹر سیپ مان دو ونگ کے دنگ جن اسٹائل کے ماہر تھے۔

یہاں جو قارئین مارشل آرٹس سے ناواقف ہیں ان کے لیے مختصر تفصیل پیش کرنا چاہوں گا کہ وہ ان باریکوں کو سمجھ سکیں۔ عام لوگ جو ڈو کرانے کے نام سے واقف ہیں اور یہ دونوں نام ساتھ ساتھ لیتے ہیں جیسے فلاں جو ڈو کرانے کے لیے یاد ہاں جو ڈو کرانے کا مظاہرہ ہوا، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ جو ڈو ایک الگ آرٹ ہے اور کرانے ایک الگ آرٹ ہے اسی طرح مارشل آرٹس کی کئی قسمیں ہیں جیسے ایکڈو، تائیگوانڈو، گنگ یوٹنگ، سیپ کیڈو، جیو جتو، وغیرہ وغیرہ۔ پھر ان میں بھی اسٹائلز ہیں جیسے کرانے میں شوٹو کان، بانڈو، کیوٹشن کائی وغیرہ ہیں اسی طرح کنگفو

Daktari وغیرہ کو بھول سکتا ہے۔

ان میں جب دی ایو جی آئی تو اس میں ڈیٹا مارگ نے ایمپائل کا کردار نبھایا تھا۔ ایسا ہیرو تھی اور مارشل آرٹ کی ماہر تھی۔ اس میں اس نے مارشل آرٹس کا مظاہرہ کیا جسے دیکھ کر پاکستان میں عام لوگ حیران رہ گئے کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ عورت ہو کر کھڑی تھی مگر اس کی مارکر آدمیوں کو گرا دیتی ہے۔ اس وقت تک پاکستان میں عام لوگ مارشل آرٹس سے واقف نہیں تھے۔ پاکستان میں مارشل آرٹس گریڈ ماسٹر محمد اشرف طائی نے 1970 میں صحافت کر دیا تھا جب انہوں نے اپنا پہلا Dojo ڈوبھولا تھا۔

اس موضوع پر مشرق بعید میں بھی محدود فلمیں بنی تھیں۔ مگر جب بروں کی کی فلموں نے دھوم مچائی تو پوری دنیا میں مارشل آرٹس جنون کی طرح پھیل گیا۔ Hong Kong ان فلموں کا مرکز بن گیا اور ایک ایسا وقت بھی آیا کہ فلموں کی تعداد میں ہانگ کانگ جو ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے، بڑی دوڑ سے آگے نکل گیا تھا۔ اس کا مابانی کامسٹریکٹس کی سر جاتا ہے جس نے اپنی فلموں سے مارشل آرٹس کو پوری دنیا سے متعارف کر دیا۔

لی ہوئی چیون کا تعلق چین کے بان خاندان سے تھا۔ وہ سان فرانسسکو کے چانکا ناؤن میں رہائش پذیر تھے۔ ان کی بیوی گرئس ہو مخلوط نسل چینی تھی (چینی اور کاکیشیائی نسل) ان کے تین بچے تھے یعقوب لی، ایلینس لی اور پیٹری۔ 27 نومبر 1940 کو سان فرانسسکو کے چانکا ناؤن میں واقع چائیز اسپتال میں ان کے ہاں چوتھے بچے کی پیدائش ہوئی جس کا چینی نام لی جن فان رکھا گیا۔ یہ چینی تقویم کے اعتبار سے ڈرینن کا سال تھا۔ اس لیے نرس نے اس کو لی ڈیولنگ یعنی چھوٹا ڈرینن کہہ کر مخاطب کیا۔ چین میں ڈرینن کے سال میں پیدا ہونے والوں کو بہت مضبوط طاقتور اور خوش قسمت سمجھا جاتا ہے۔ اسپتال کی ڈاکٹر میری گلوور (Mary Glover) جس نے لیڈوری کروائی تھی اس کو بروں کا نام دیا۔ یہی نام تھا جو آج کل کے چل کر اس کی پہچان بنا۔ بروں کی کے بعد اس کا ایک اور بھائی ہانگ کانگ میں پیدا ہوا تھا جسے رو برٹ لی کا نام دیا گیا تھا۔

لی ہوئی چیون ٹھیکڑ کے ایک کامیاب اداکار تھے۔ ان کے ساتھ کے کئی لوگ امریکا میں رک گئے تھے مگر لی کو اپنے

تھا۔ تاہم اس وقت اس کی حالت بہت بری ہو رہی تھی۔ اس کا چہرہ تازہ زخموں سے رستے خون میں سنا ہوا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں شے کے تیز دھار کٹوے تھے جو اس نے ابھی ابھی دو ہاتھوں کو توڑ کر حاصل کیے تھے۔ اس کی آنکھوں سے وحشت اور نفرت ٹپک رہی تھی۔ صدر مجلس نے اسے آواز دی ”ادھارا“۔ مگر وہ کسی کی نہیں سن رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر ا ہوا تھا۔ چینی اس کی طرف بڑھا تو اس نے شیشوں سے حملہ کیا مگر چینی نے اپنی دائیں ہانگ سے سائیڈ کک (side kick) مارے ہوئے اس کے ہاتھوں سے ٹکڑے کر دیے۔ امریکی نے اپنی دائیں کک مار لی چاہی مگر چینی نے صفائی سے اسے اپنے ہاتھوں سے روکتے ہوئے اس کی گردن پر ڈاؤن ہاؤس کک (routhouse kick) ماری جس سے وہ نیچے گر کر جت ہو گیا۔ چینی نے مخصوص آواز نکالنے ہوئے ہوائیں اچھل کر امریکی کے سینے پر دونوں پاؤں مار کر زور دیا۔ اس وقت اس کے چہرے سے دم، غصہ اور نفرت کا اظہار بیک وقت ہو رہا تھا کیوں کہ وہ امریکی اس کی بہن کا قاتل تھا۔

یہ منظر فلم Enter the Dragon، انٹرو ڈرینن کا ہے۔ اور اس میں جس چینی جوان کا ذکر ہے اس کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں، وہ نامور مارشل آرٹسٹ (Martial Artist) اور اداکار بروں کی (Bruce Lee) ہے۔

پاکستان میں ٹیلی وژن ساتھ کی دہائی میں آیا۔ اس وقت بلیک اینڈ وائٹ کی وی ہوتا تھا جو بمشکل پانچ گھنٹے کی نشریات دیتا تھا جبکہ برکری کی وی کی چھٹی ہوتی تھی۔ اس دن نشریات نہیں ہوتی تھیں۔ وہ لی کی وی کا سنہری دور تھا۔ اس قدر کم نشریات کے باوجود اس زمانے میں جو مقامی ڈرامے، فلمیں، ٹاک شو وغیرہ دکھائے جاتے تھے، انہیں دیکھنے والے آج بھی انہیں بھلا نہیں پاتے ہیں۔ ٹی وی مقامی پروگرامز کے علاوہ انگریزی پروگرام بھی دیتا تھا جن میں ہفتہ واری فلم کے علاوہ روزانہ کارٹون اور ڈراما سیریز دکھائی جاتی تھیں۔ اس وقت انگریزی کی وی سیریز بھی جس اعلیٰ معیار کی بنی تھیں آج کی سیریز معیار میں اس کا عشرِ عشر بھی نہیں ہیں۔ کون ہے جو The Danger Man، The Fury، The Avengers، Saint Man اور The Fugitive from UNCLE

بروس لی کے خاندان کی رہائش 218 تھن روڈ، کوولون میں تھی۔ اس کا داخلہ گھر سے کچھ ہی فاصلے پر واقع تاک سن اسکول میں کروایا گیا تھا۔ اس کے بعد بارہ سال کی عمر میں اسے لاسالے کالج میں داخل کروایا گیا۔ ٹیکس اس وقت تک وہ ایک اچھا طالب علم نہیں تھا اس لیے اسے ایک دوسرے ادارے سینٹ فرانسز زاویئر کالج (یہ ایک ہائی اسکول تھا) میں بھیج دیا گیا۔ یہ ایک مشہور اسکول تھا۔ یہاں اس کی ملاقات برادر ایڈورڈ (Brother Edward) سے ہوئی۔ وہ اسکول میں پڑھاتے بھی تھے اور اسکول کی باکسنگ ٹیم کے کوچ بھی تھے۔

انہوں نے بروس لی کے دل میں تعلیم کا شوق پیدا کیا۔ بروس لی نے ان سے باکسنگ کے اصول اور تکنیک بھی سیکھی۔ 1958 بروس لی کے لیے ایک یادگار اور حوصلہ افزا سال تھا۔ اس نے اس سال ہونے والے ہنگ کانگ اسکولز باکسنگ ٹورنامنٹ میں حصہ لیا، اور فائنل راونڈ میں سابق چیمپئن کو ناک آؤٹ کر کے ٹائٹل اپنے نام کر لیا۔

بروس لی کے والد چونکہ ایک اداکار تھے اس لیے اسے بھی فلموں سے دلچسپی تھی۔ وہ چھ سال کی عمر میں ہی چچا اداکار (چائلڈ آرٹسٹ) کے طور پر کیمرے کے سامنے آیا۔ اس کی پہلی فلم کا نام ”گولڈن گیٹ گرل“ تھا۔ وہ سولہ سال کی عمر کو پہنچنے تک چائلڈ آرٹسٹ کے طور پر بیس فلموں میں کام کر چکا تھا۔ اسے ڈانس سے بھی دلچسپی تھی وہ چاچا چا کا دیوانہ تھا۔ 1955 میں اس نے ایک چاچا چا ڈانس مقابلے میں حصہ لیا اور پہلی پوزیشن حاصل کی۔

1959 میں جب وہ 19 سال کا تھا تو آئے دن گلی کے غنڈوں سے اس کے جھگڑے ہونے لگے۔ ایک دن اس کا ایک بڑا جھگڑا ہو گیا۔ بروس لی اب وہ پہلے والا بروس لی نہیں تھا، اب وہ کنگفو کا ماہر تھا۔ ہنگ کانگ اسکول باکسنگ چیمپئن تھا۔ اس نے مد مقابل کو بہت بری طرح چپا۔ معاملہ بڑھا تو پولیس آگئی۔ اس کا مد مقابل ایک مجرمانہ پس منظر رکھنے والے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ پولیس کو یہ خطرہ تھا کہ کہیں وہ لوگ اسے کوئی جانی نقصان نہ پہنچا دیں۔ اس کے والد نے پولیس کو یقین دلایا کہ وہ اسے متح کر دیں گے، اب وہ ایسی حرکت نہیں کرے گا۔ ایک پولیس آفیسر نے اس کے والد سے کہا کہ ”آپ کا بیٹا اسکول میں اور سڑکوں پر آئے دن جھگڑے کرتا رہتا ہے۔ میں آپ کی ضمانت پر آخری بار اسے چھوڑ رہا ہوں۔ اب اگر اس نے کسی سے لڑائی کی تو میں اسے جیل بھیجے گا۔“

پر مجبور ہوں گا۔“
”نہیں میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اب وہ کسی سے نہیں لڑے گا۔“

”یہی اس کے حق میں بہتر ہوگا۔ دوسرے اسے کچھ دن تک باہر نہ نکلنے دیں وہ بڑے والا کا ایک ٹینگ لیڈر کا بیٹا ہے، کہیں وہ لوگ اسے نقصان نہ پہنچا دیں۔“

اس کے والد نے صورت حال کا جائزہ لیا تو انہیں بھی محسوس ہوا کہ اب جن لوگوں سے بروس لی نے جھگڑا مول لیا ہے وہ بہت خطرناک ہیں اور وہ اسے کسی بھی وقت نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ اس نے گریس ہوسے بات کی۔ ”گریس اس بار معاملہ خاصا سنگین ہے وہ لوگ بہت خطرناک ہیں۔“

گریس نے نشوونما سے کہا۔ ”مجھ آپ نے کیا سوچا ہے کیا کرنا چاہیے؟“

”میرے خیال سے بروس کو امریکا اس کی بہن انیس کے پاس بھیج دیں۔ وہاں وہ محفوظ رہے گا اور تعلیم بھی حاصل کرے گا۔ وہاں اس کا مستقبل سنور جائے گا۔ امریکا میں رہا تو یہی حرکتیں کرتا رہے گا اور زیادہ بگڑ جائے گا۔ کیا چاہیے اسے کوئی جانی نقصان پہنچ جائے۔“

”ٹھیک ہے جیسا آپ بہتر سمجھیں۔“
اس کی بہن انیس کی سان فرانسسکو میں چند خاندانی دوستوں کے ہمراہ رہتی تھی۔

بروس لی 1959 میں سان فرانسسکو پہنچا۔ چند ماہ اس نے اپنی بہن کے ساتھ گزرارے پھر سیائل چلا گیا۔ یہاں اس نے کینیڈا میں واقع ایڈیسن ٹیکنیکل اسکول میں داخلے کرنا اپنی تعلیم کا سلسلہ پھر سے جوڑ لیا اور فارغ اوقات میں برونی چاؤ کے ریستوراں پر کام کرنے لگا۔ برونی کا شوہر بروس لی کے والد کا دوست تھا اور ایک زمانے میں انہوں نے ساتھ کام بھی کیا تھا۔

بروس کے بھائی پیٹری کی کوئی سونا کے کالج میں داخلہ مل گیا تو وہ وہاں جانے سے پہلے سیائل آیا۔ انہوں نے چند دن ساتھ گزارے۔ پھر پیٹری سونا چلا گیا۔ 1960 میں بروس لی نے ہائی اسکول پاس کر لیا اسے ڈیپلوما مل گیا۔

بروس لی نے 1959 میں سیائل میں ایک مارشل آرٹس انسٹیٹیوٹ کھولا۔ جس کا نام اس نے جن فان کنگفو رکھا۔ وہ وہاں ونگ چن اسٹائل سکھاتا تھا۔ اس نے پہلے پہل اپنے دوستوں کو سکھانا شروع کیا، پھر اس کو شاگرد بننے چلے گئے۔ جیسی گھور جو جوڈو کا ماہر تھا اس نے بھی بروس لی کی شاگردی

اختیار کی۔ تا کی کیو اس کا قریبی چہیتا شاگرد تھا جسے بروس لی کا پہلا اسٹنٹ ہونے کا شرف بھی حاصل ہوا اور بروس لی کی بے وقت موت کے بعد اسی نے انسٹیٹیوٹ کو چلایا۔ بروس لی مختلف اسکولوں میں جا کر کنگفو اور فلسفے کے موضوع پر لیکچر بھی دیا کرتا تھا اور اپنے فن کا مظاہرہ بھی کرتا تھا۔ اسی سلسلے میں ایک بار وہ گارفیلڈ ہائی اسکول گیا۔ وہاں سے بھی کچھ طلباء و طالبات نے اس سے متاثر ہو کر اس کے ادارے میں داخلہ لے لیا ان میں خوبصورت سنہری بالوں والی آنکھوں والی امریکی دو چرخہ لیزا ایمر سے بھی تھی۔ لیزا ایک آئرش انگریز خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔

مارچ 1961 میں اس کو یونیورسٹی آف واشنگٹن میں داخلہ مل گیا۔ اس نے اداکاری کے علاوہ فلاسفی سائیکولوجی اور چند دیگر مضامین کی تعلیم بھی حاصل کی۔ کچھ عرصے بعد لیزا بھی اسی یونیورسٹی میں آگئی، وہ شعبہ تعلیم میں تھی۔ یوں ان کا وقت ساتھ گزرنے لگا۔ یونیورسٹی اور کنگفو کی کلاسیں ان دونوں کو قریب لانے کا سبب بن گئیں۔ بات بڑھ کر دو تکی تک پہنچی اور پھر وہ لمحہ بھی آ گیا جب کیو پڑنے اپنا تیر چلا دیا۔ جلد ہی انہیں محسوس ہوا کہ وہ ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ آخر ایک دن بروس لی حرف مدعا زبان پر لے آیا۔ ”لیزا آج میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“

”ہاں ہاں کہو کیا بات ہے؟“

”وہ بات یہ ہے لیزا کہ میں تم سے پیار کرتا ہوں۔“
اس نے جھپکے جھپکے بالآخر کہہ دی۔

لیزا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر شہیڈ کی طاری ہوئی تھی۔ ”کیا کہا تم نے؟“

لیزا کے تاثرات دیکھ کر بروس لی کے ارا مانوں پر پانی پھر گیا۔ ”دیکھو اگر تمہیں برا لگا ہے تو میں معذرت چاہتا ہوں۔“

اس بار لیزا کی آنکھوں میں شرارت کی چمک تھی۔ ”برا تو لگے گا ہی نا، آج اتنے عرصے بعد تم بات کہہ رہے ہو جو تمہیں پہلے ہی کہہ دینی چاہیے تھی۔“

بروس لی چونک اٹھا، اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ ”کیا کہا تم نے، تم واقعی، کیا تم بھی۔“ خوشی کے مارے اس کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔

لیزا نے آنکھیں میچ کر مٹکراتے ہوئے کہا۔ ”اگر تم سمجھتے ہو کہ میں بھی تم سے پیار کرتی ہوں“ کچھ وقف کے بعد۔ ”تو تم بالکل ٹھیک سمجھتے ہو۔“ اس کے ساتھ ہی وہ کھٹکھٹا

بروس لی کی دو نظمیں

مرتا ہوا سورج

مرتا ہوا سورج دور افق میں اداس ہے۔

خزاں کی ہوائیں بے جرجی سے چل رہی ہیں۔

پہلے پتے پہاڑ کی چوٹی سے گر رہے ہیں

دو چشمے نہ چاہتے ہوئے بھی درجوں میں بیٹ گئے ہیں۔

ایک مشرق میں اور ایک مغرب میں۔

سورج مجھ پر ٹپکے گا پتے موسم بہار میں پھر بہر ہو جائیں گے۔

مگر کیا ہم بھی ان پہاڑی چشموں کی طرح

ہوں گے جو پھر کبھی نہیں مل سکیں گے۔

☆☆☆

واشنگٹن جیل کے ساتھ اکیلے چلنا

کنارے پر پہلے سے ہی اہلی اور غلطی ہوا چل رہی ہے

دور آسمان اور جیل کا لمبا یوں لگتا ہے

جیسے غروب آفتاب کی سرخی پھیل رہی ہے

جیل کی گہری خاموشی مجھ سے ہر طرح کی

بے چینی دور کر دیتی ہے۔

اکیلے کنارے کے ساتھ میں

دھمے قدموں سے چل رہا ہوں۔

اکیلے بچپن مینڈک پریشانی کے عالم میں

تیز تیز بھاگ رہے ہیں

یہاں اور وہاں گھر ہیں

ان میں سے روشنیوں کے ٹھنڈے

موتیوں کے سے جھٹکے نکل رہے ہیں

ایک شاعر چاہتا ہے آسمان کی تنہا گہرائیوں

میں چمک رہا ہے

چاند کی روشنی میں، میں آہستگی سے

کنگفو کے اعزاز میں حرکت کر رہا ہوں

روح اور جسم مل کر ایک ہو رہے ہیں

کر فیس پڑی۔

اب بروں لی نے اپنی جیب سے ایک ڈیبا نکال کر پوچھا۔ ”اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں؟“

لنڈا نے شاہانہ انداز میں اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ آگ دووں طرف برابری ہوئی تھی۔ لنڈا نے بھی خوش دلی سے اقرار محبت کر لیا تھا۔ بروں لی نے اس کو انگوٹھی پہنا دی۔ سترہ اگست 1964 کو انہوں نے شادی کر لی۔

1964 میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد بروں لی نے اوکلیڈ جانے کا ارادہ کیا۔ اوکلیڈ میں وہ جنس ہم لی کے پاس گیا۔ جنس ایک مشہور چینی مارشل آرٹس تھا۔ وہ بروں لی سے تیس برس بڑا تھا۔ انہوں نے مل کر جن فائن مارشل آرٹس کی دوسری شاخ اوکلیڈ میں سکھائی۔ جنس نے بروں کو امریکن مارشل آرٹس ایڈ بارکر سے ملایا۔ ایڈ ایک آرگنائزر تھا۔ وہ لوگ سچ انٹرنیشنل کرائے جنہیں شب منعقد کروانا تھا۔ اس سال ایڈ نے جنہیں شب منعقد کروائی تو بروں لی کو بھی دعوت بھیجی۔

اس نے دعوت قبول کی اور جنہیں شب میں حصہ لینے پہنچ گیا۔ اب اس کا نام خاصا مشہور ہو چکا تھا۔ شکار اسے دیکھنے کے متعلق تھے مگر جب وہ اسٹیج پر آیا تو حاضرین کو اس کی شخصیت متاثر نہ کر سکی۔ اس کی جسامت پر بھی پہچانی گئی لیکن جب اس نے فن کا مظاہرہ شروع کیا تو ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ لوگ سانس روک کر اس کے فن کو دیکھنے لگے۔ یہ ایک ناقابل یقین مظاہرہ تھا۔ بروں لی نے ایک ہاتھ کے انگوٹھے اور انگشت شہادت پریشاں کرنے کا مظاہرہ کیا۔

حاضرین ابھی حیرت کے اس جھگکے سے سنبھلے ہی نہ تھے کہ بروں لی نے ایک اور مظاہرہ کیا اس کے سامنے ایک مضبوط فائبر جو بلیک ہیٹ تھا، جم کر کھڑا ہو گیا۔ بروں لی اس کے سامنے پہنچا اور اس طرح کھڑا ہوا کہ اس کا دایاں ہاتھ آگے تھا گھٹنے ہلکے سے مڑے ہوئے تھے۔ اسی پوزیشن میں اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ ٹھکی بندھی، ہاتھ کے کی شکل میں تھا مگر اس نے مارنے کی بجائے آہستہ سے آگے بڑھا کر اپنے ہاتھ کو مد مقابل کے سینے سے ایک انچ دور روک لیا۔ اب اس کا ہاتھ کھلا تھا کہنی میں معمولی سا خم تھا اور انگوٹھیں حریف کے سینے کو چھو رہی تھیں۔ اس کی کمرے حرکت کی اور ہاتھ نے ایک جھگکے سے حرکت کی کہنی سیدھی ہوئی اور حاضرین نے ایک ناقابل یقین منظر دیکھا کہ صرف ایک انچ کے فاصلے سے مارا

ہوا وہ مکاس قدر طاقتور تھا کہ سامنے کھڑا ایک ہیٹ اڑ کر پیچھے رکھی کر سی پر گر کر جواسی مقصد سے رکھی گئی تھی کہ اسے چوٹ نہ لگے، اور وہ کرسی سمیت تقریباً پانچ میٹر تک پھسل چلا گیا۔ یہ ایک ناممکن عمل تھا مگر وہ بروں لی تھا جو ناممکن کو ممکن کر دکھانے کا ہنر جانتا تھا۔ اس کا حریف یوب بیکر تھا۔ ایک مانا ہوا فائٹر۔ بعد میں اس نے بیان دیا ”میں نے بروں لی کو فتح کیا ہے کہ میرے مہربانی آجیدہ ایسے مظاہرے نہ کیا کرو“ اور کہا ”اس دن بروں لی نے ایک انچ کے فاصلے سے جب مکا مارا تو میرے وہم و گمان میں ہی نہیں تھا کہ وہ مکا اس قدر طاقت رکھتا ہوگا۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی جٹان میرے سینے سے آگرائی ہو میرا دماغ پکڑا گیا اور میں تو ازن کھوکھری پر جا کر اس کے بعد میں کی دن کام پر بھی نہیں جاسکا کیونکہ میرے سینے میں شدید درد تھا۔“

اس کے علاوہ اس نے چھ انچ کے فاصلے سے بھی ایسا ہی مکا مارنے کا مظاہرہ کیا تھا۔ اسی جنہیں شب کے دوران بروں لی کی ملاقات تانیکو اوڈو کے ماہر جھون گوری سے ہوئی۔ ان کے درمیان جلد ہی بہت اچھی دوستی ہو گئی اور انہوں نے ایک دوسرے کو کچھ ٹیکس بھی سکھائیں۔

1965 کا سال اس کے لیے ایک طرف خوشی کی نوید لایا تو دوسری طرف آنسوؤں کا تھہر بھی لایا۔ یکم فروری 1965 کو ان کے ہاں بیٹے کی ولادت ہوئی۔ دونوں خوشی سے پھولے نہیں سارے تھے۔ انہوں نے اس کا نام براڈن لی رکھا۔ بروں لی نے کہا۔ ”یہ بڑا ہو کر میرا نام روشن کرے گا۔ میں اسے خود تربیت دوں گا۔ یہ مجھ سے بھی بڑا مارشل آرٹس بنے گا۔“

مگر جب وہ یہ سب کہہ رہا تھا تو نقد پر ایک جانب کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس خوشی کی خبر کے ٹھیک چھ دن بعد 7 فروری 1965 کو اسے یہ افسوسناک اطلاع ملی کہ اس کے والد لی ہوئی چیون کا انتقال ہو گیا ہے۔

1967 میں جب لوگ سچ انٹرنیشنل کرائے جنہیں شب کا انعقاد ہوا تو ایک بار پھر بروں لی وہاں کچھ نئے مظاہروں کے ساتھ موجود تھا۔ اس بار اس نے دعویٰ کیا کہ کوئی میرا مکا روک نہیں سکتا۔ اس نے کرائے کے عالمی چیمپئن روک مور کو چیلنج دیا۔ ”میں تمہارے منہ پر ایک سیدھا سا ماروں گا جسے تم روک کر دکھاؤ۔“

دک تیار ہو گیا۔ سامنے کھڑا ہو گیا کہ بروں لی چند قدم

پیچھے ہٹ گیا اور پیچوں پر اچھلتے ہوئے۔۔۔۔۔ اس نے آواز دی ”دک کیا تم تیار ہو؟“ ”دک نے کہا“ ہاں میں تیار ہوں تم حملہ کر سکتے ہو۔“ ”دک کی اجازت کے بعد وہ اچھلتے ہوئے دھیرے سے آگے بڑھا یہاں تک کہ وہ دونوں اسے قریب آگئے جہاں سے ایک دوسرے پر موثر حملہ کیا جا سکتا تھا۔ بروں نے اچانک دک کے چہرے پر ایک سیدھا مکا مارا مگر چہرے سے چند سینٹی میٹر دور روک کر واپس کھینچ لیا۔ ”دک اسے نہیں روک سکا تھا۔ بروں لی نے اسے ایک اور موقع دیا مگر اب بھی وہ ناکام رہا یہاں تک کہ آٹھ بار ایسا ہی ہوا مگر وہ مکا روکنے میں بالکل ناکام رہا۔“

اس دوران امریکا میں رہائش پذیر چیونیوں نے اس پر اعتراضات شروع کر دیے کہ وہ غیر چیونیوں کو اپنے انٹیلیوٹ میں کیوں داخلہ دیتا ہے اور انہیں کیوں نگفوسکھا رہا ہے۔ بات یہاں تک بڑھی کہ اسے لڑنے کا چیلنج دے دیا گیا۔ اس نے چیلنج قبول کر لیا۔ مقابلے کی شرط یہ تھی کہ اگر بروں لی ہارا تو اسے اپنے ادارے بند کرنے پڑیں گے اور اگر وہ جیت گیا تو مخالفین خاموش ہو جائیں گے۔ دو دن جیک مان اس کا مد مقابل تھا۔ ان کا مقابلہ شروع ہوا جس میں ابتدا ہی سے بروں لی کا بلہ بھاری تھا۔ یہ مقابلہ بمشکل تین منٹ تک جاری رہا جس کے بعد دو دن کر گیا۔ بروں لی نے اس سے پوچھا۔ ”کیا تم ہار مانتے ہو؟“

دو دن نے بھی ہوئی آواز میں کہا۔ ”ہاں میں ہار مانتا ہوں۔“ یوں بروں لی کے مخالفین خاموش ہو گئے اور وہ بلا تفریق رنگ و نسل سب کو نگفوسکی تربیت دیتا رہا۔

اسے یوکینگ سے بھی بہت دلچسپی تھی۔ اس میں وہ محمد علی کا پرستار تھا، وہ محمد علی کی مقابلوں کی فلمیں دیکھا کرتا تھا۔ ان سے اسے بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ اس نے عام مارشل آرٹس کی طرح ایک جگہ جم کر لڑنے کے بجائے ایک نیا انداز متعارف کروایا جو یوکینگ سے ملتا جلتا تھا۔ یہ بیروں کی حرکات تھیں جنہیں اصطلاحاً فٹ روک کہا جاتا ہے۔ بروں لی کو نگفوس کے اسٹائل دنگ جن کا ماہر تھا مگر اسے اس میں کچھ چیزوں پر اعتراض بھی تھا، یہ چیز اسے اس طرف سے تھی جس سے اس نے تاریخ رقم کر دی۔ اس کی خواہش تھی کہ ایک ایسا آرٹ ہو جو عام زندگی میں لڑنے میں بھی اتنا ہی موثر ہو جتنا نمائشی مقابلوں میں ہوتا ہے۔ کیونکہ نمائشی مقابلوں میں قوانین کی پابندی کرنی پڑتی ہے جبکہ عام زندگی میں لڑائی کا کوئی اصول نہیں ہوتا جسے عرف عام میں اسٹریٹ فائٹ کہا جاتا ہے۔ اس

نے مختلف مارشل آرٹس کا جائزہ لیا اور ان سے اچھی ٹیکنیکس اخذ کیں۔ ان کے ذریعے اس نے 1965 میں ود شو یا نگفوس میں ایک نیا اسٹائل متعارف کروایا جس کا نام جیت کونڈو رکھا۔ اس کے اصول تھے، سخت محنت اور مسلسل مشق کی جائے جس سے قابلیت، قوت، برداشت، رفتار اور جسمانی لچک میں اضافہ ہو۔ اس نے اس سلسلے میں یوکینگ، تانیکو اوڈو اور دیگر اسٹائلز سے بھی استفادہ کیا اور جو چیزیں بہتر لگیں ان سب کو اپنے اسٹائل میں شامل کیا۔ اسی لیے اس کا کہنا تھا کہ ہمارا اسٹائل کوئی مخصوص اسٹائل نہیں ہے۔ یہ ایک نیا انداز تھا۔ اس نے روایتی طریقوں سے ہٹ کر نئے طریقے متعارف کرائے جو عام روایتی حدود و قیود سے ماوراء تھے۔ اس نے دیکھا کہ اس وقت کے مارشل آرٹس اپنی روایتی مشقوں سے ہٹ کر کچھ کرنا پسند نہیں کرتے اس لیے اس نے اپنے اسٹائل میں تن سازی کا بھی اضافہ کیا۔ وہ ویٹ لفٹنگ کے ذریعے تن سازی پر بھی زور دیتا تھا جس سے بعض بٹھے جو عام مشقوں سے طاقتور نہیں بنتے وہ بھی مضبوط ہو جاتے۔ مگر وہ تن سازی کو ایک حد تک ہی استعمال کرتا تھا کیونکہ اگر اپنے کمرے زیادہ بڑے ہو جائیں جیسے پیشہ ور تن سازوں کے ہوتے ہیں تو رفتار اور لچک کو متاثر کرتے ہیں۔ آپ بروں لی کا جسم دیکھیں اس میں آپ کو سارے ہی پٹے نظر آئیں گے جیسے پیشہ ور تن سازوں کے ہوتے ہیں مگر وہ بڑے باہر نکلے ہوئے نہیں تھے۔ اس کے علاوہ مراعات پر بھی زور دیتا تھا جس سے فنی قوت اور ارتکاز میں اضافہ ہوتا ہے۔

بروں لی اپنی خوراک پر بہت توجہ دیتا تھا۔ وہ اضافی لحمیات (ہائی پروٹین) والے مشروبات، حیاتین (وٹامنز) معدنیات (میزلز) کا استعمال کرتا تھا۔ وہ ایسی خوراک سے پرہیز کرتا تھا جس میں چٹا رہ ہو مگر غذائیت نہ ہو جسے عرف عام میں چکن فوڈ کہا جاتا ہے اور جو آج ہم بہ افراط لے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ بروں لی جیسے ہوئے آئے اور تیکری کی کئی اشیاء سے بھی دور رہتا تھا۔ وہ چھٹی کھانوں کا شوقین تھا۔ اس کی غذا میں ہمیشہ سبز یاں چھلی چاول اور تازہ دودھ شامل ہوتے تھے۔ اس کا ماننا تھا کہ اسے ایسی خوراک لینا چاہیے جو اس کے بدن کو طاقت دے اور مضبوط کرے ورنہ ایسی خوراک کا کیا فائدہ ہوگا۔

اسے شروع سے ہی فلموں سے دلچسپی تھی مگر امریکا میں پانچ سال یعنی 1959-1964 اس کی توجہ اپنے فن پر مرکوز رہی اس لیے فلموں کا خیال تک نہیں آیا۔ 1964 میں جب

اس نے لوگ سچ میں اسے فن کا مظاہرہ کیا تو وہ ہم ڈویژناری ہدایتکار نے اسے دعوت دی کہ اس کے لیے وی شو "سٹرلنگ سن" میں کام کرے۔ اس نے ہائی ہیری اور اوڈیشن بھی دے دیا مگر بد قسمتی سے یہ شو نہیں بن سکا۔

اس کے بعد 1966 میں اسے ایک اور شو "دا گرین ہورنٹ" میں کام کرنے کی دعوت ملی۔ ٹمر اس میں مرکزی کردار وین ویز کا تھا بروڈی کی اس کے ماتحت کا تو کار کردار دیا گیا تھا۔ یہ شو ایک سیزن چلا اور چھبیس اقتصاد فائز ہوئیں۔

اسی دوران اس کی ملاقات کرائے ٹیچنگ میں چک نورس سے ہوئی۔ چک امریکن تھا اس کی تاریخ پیدائش 10 مارچ 1940 تھی۔ یعنی وہ بروڈی کا ہم عمر تھا۔ چک نورس کی طرح کے فنون حرب کا ماہر تھا جن میں کرائے، تانگیٹا اور جوجستو شامل تھے۔ وہ امریکی فوج میں بھرتی ہو گیا تھا اور اب فوج سے سبکدوش ہونے کے بعد ایک ادارہ بنا کر لوگوں کو کرائے سکھا رہا تھا۔ جب ان کی ملاقات ہوئی تو بروڈی کی گرین ہورنٹ کی فلم بندی میں مصروف تھا اور چک نورس وہاں ایک مقابلے میں حصہ لینے آیا تھا۔ ان کی ملاقات ہوئی، پہلے تو دونوں ذرا لیے دیئے رہے مگر تھوڑی دیر کی گفتگو کے بعد یوں لگ رہا تھا جیسے دونوں ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے ہوں۔ چک نورس اس دن کو یاد کرتے ہوئے کہتا ہے۔ ہم ایک ہی ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے، رات کو کھانے کے بعد ہم باہم گفتگو کرتے کرتے بارہ بجے لٹ سے نکل کر بروڈی کے کمرے میں آئے ہمارے درمیان مارشل آرٹس اور فلسفے کے موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی۔ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں رہا تھا، اچانک میں نے دیکھی کہ گھڑی کی طرف دیکھا تو سب کے سات بج رہے تھے اور مجھے دو گھنٹے بعد مقابلے کے لیے جانا تھا۔ رات کیسے گزری کچھ پتا ہی نہ چلا۔ رخصت ہوتے وقت بروڈی نے کہا "اب جب ہم ملیں گے تو ساتھ کام کریں گے"۔ اور وہ وقت تین چار سال بعد آیا۔

بروڈی نے وین ویز کے ساتھ بیٹ مین ٹی وی سیریز کی تین اقساط میں خصوصی کردار بھی ادا کیے۔ ان کے علاوہ بروڈی نے تین ڈراموں میں بطور ہیمان ادا کار کام کیا "آئرن سائڈ" 1967 "ہیئر کم دایر انڈ" 1969 اور "بلوٹری" 1969۔

1969 کا سال اس کے لیے ایک اور خوشی لایا۔ 19 مارچ 1969 کو ان کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی یوں ان کا خاندان مکمل ہو گیا۔ بیٹی کا نام انہوں نے شین لی رکھا۔

اس نے لوگ سچ میں اسے فن کا مظاہرہ کیا تو وہ ہم ڈویژناری ہدایتکار نے اسے دعوت دی کہ اس کے لیے وی شو "سٹرلنگ سن" میں کام کرے۔ اس نے ہائی ہیری اور اوڈیشن بھی دے دیا مگر بد قسمتی سے یہ شو نہیں بن سکا۔

اس کے بعد 1966 میں اسے ایک اور شو "دا گرین ہورنٹ" میں کام کرنے کی دعوت ملی۔ ٹمر اس میں مرکزی کردار وین ویز کا تھا بروڈی کی اس کے ماتحت کا تو کار کردار دیا گیا تھا۔ یہ شو ایک سیزن چلا اور چھبیس اقتصاد فائز ہوئیں۔

اسی دوران اس کی ملاقات کرائے ٹیچنگ میں چک نورس سے ہوئی۔ چک امریکن تھا اس کی تاریخ پیدائش 10 مارچ 1940 تھی۔ یعنی وہ بروڈی کا ہم عمر تھا۔ چک نورس کی طرح کے فنون حرب کا ماہر تھا جن میں کرائے، تانگیٹا اور جوجستو شامل تھے۔ وہ امریکی فوج میں بھرتی ہو گیا تھا اور اب فوج سے سبکدوش ہونے کے بعد ایک ادارہ بنا کر لوگوں کو کرائے سکھا رہا تھا۔ جب ان کی ملاقات ہوئی تو بروڈی کی گرین ہورنٹ کی فلم بندی میں مصروف تھا اور چک نورس وہاں ایک مقابلے میں حصہ لینے آیا تھا۔ ان کی ملاقات ہوئی، پہلے تو دونوں ذرا لیے دیئے رہے مگر تھوڑی دیر کی گفتگو کے بعد یوں لگ رہا تھا جیسے دونوں ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے ہوں۔ چک نورس اس دن کو یاد کرتے ہوئے کہتا ہے۔ ہم ایک ہی ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے، رات کو کھانے کے بعد ہم باہم گفتگو کرتے کرتے بارہ بجے لٹ سے نکل کر بروڈی کے کمرے میں آئے ہمارے درمیان مارشل آرٹس اور فلسفے کے موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی۔ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں رہا تھا، اچانک میں نے دیکھی کہ گھڑی کی طرف دیکھا تو سب کے سات بج رہے تھے اور مجھے دو گھنٹے بعد مقابلے کے لیے جانا تھا۔ رات کیسے گزری کچھ پتا ہی نہ چلا۔ رخصت ہوتے وقت بروڈی نے کہا "اب جب ہم ملیں گے تو ساتھ کام کریں گے"۔ اور وہ وقت تین چار سال بعد آیا۔

بروڈی نے وین ویز کے ساتھ بیٹ مین ٹی وی سیریز کی تین اقساط میں خصوصی کردار بھی ادا کیے۔ ان کے علاوہ بروڈی نے تین ڈراموں میں بطور ہیمان ادا کار کام کیا "آئرن سائڈ" 1967 "ہیئر کم دایر انڈ" 1969 اور "بلوٹری" 1969۔

1969 کا سال اس کے لیے ایک اور خوشی لایا۔ 19 مارچ 1969 کو ان کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی یوں ان کا خاندان مکمل ہو گیا۔ بیٹی کا نام انہوں نے شین لی رکھا۔

بروڈی کے دو مارشل آرٹس کے شاگرد اسٹرلنگ سیلیفٹ (Stirling Silliphant) اور جیس کوہرن ہو یوڈو میں کہانی کار (اسکرپٹ رائٹر) تھے۔ 1969 میں ان تینوں نے مل کر ایک فلم کی کہانی پر کام کیا جس کا نام انہوں نے "داسا پینک فلیوٹ" رکھا۔ ٹمر اس وقت یہ کہانی کسی کی سمجھ میں نہیں آئی اس لیے یہ ٹیل منڈ سے نہ چڑھ سکی، حالانکہ بعد ازاں 1976 میں اسی خیال پر ایک فلم "سٹرلنگ آف آئرن" کے نام سے بنی۔ 1969 میں ہی بروڈی نے اسٹرلنگ سیلیفٹ کی کہانی پر بنی فلم "مارلو" میں ایک چھوٹا سا کردار نبھایا۔ اسی سال اس نے ڈین مارش کی فلم "دار پینک کرو" میں لڑائی کے مناظر کی ہدایت کاری کی۔ 1970 میں اس نے ایک اور فلم "آؤک ان دا سپرنگ رین" میں کائنات ڈائریکٹری حیثیت سے کام کیا۔

13 اگست 1970 کا دن اس کے لیے ایک ڈرامے خواب کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس روز بروڈی نے ٹیلی ویژن کی سچ کی نشریات میں جسمانی ورزشیں دکھا رہا تھا۔ باوجود اس کے کہ وہ ایک پیشہ ور رکھلا ڈی تھا مگر اس دن اس سے ایک چوک ہو گئی۔ وزن اٹھانے یا سخت جسمانی مشق کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ مناسب حد تک بدن کو گرم کر لیا جائے اس کے لیے مخصوص ورزشیں ہوتی ہیں جو اس دن اس نے نہیں کیں اور ٹھنڈے بدن کے ساتھ وزن اٹھا لیا۔ اس وقت اس کا وزن ساٹھ کلو تھا اس نے ساتھ ہی کلو وزن اٹھ بار سے اونچا اٹھا کر نیچے رکھا یہ پہلا سیٹ تھا۔ جب وہ دوسرا سیٹ کر رہا تھا تو معاً اس نے اپنی کمر میں کچھ ٹوٹے پھٹی آواز سنیں اور اس کے ہاتھوں سے وزن چھوٹ گیا۔ اسے شدید تکلیف کا احساس ہو رہا تھا۔ آئندہ چند روز تک اس نے ماش اور درد کش دواؤں سے کام چلانے کی کوشش کی مگر درد بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی جب انڈا لائن ہو کر اسے اسپتال لے گئی جہاں ڈاکٹرز نے معائنے کے بعد کہا کہ "تمہاری ریزہ کی ہڈی میں چوٹ آئی ہے۔ پیڑ سے متعلق رگ کو شدید نقصان پہنچا ہے۔ اب آئندہ چھ مہینے نہیں بستر پر گزارنے ہوں گے۔"

"ڈاکٹر میں کھجک تو ہو جاؤ گا نا۔"

"اگر تم نے عمل آرام کیا تو ممکن ہے کافی حد تک ٹھیک ہو جاؤ اور چلنے پھرنے لگو۔"

"اور اپنی ورزشیں اور مشقیں کب سے شروع کر سکتا ہوں؟"

"بروڈی میں تم سے کچھ چھپانا نہیں چاہتا۔ مجھے افسوس

ہے کہ اب تم گفتگو سے دور رہو گے۔ تم کسی بھی قسم کی سخت ورزش یا مشق نہیں کر سکو گے بلکہ مجھے تو شک ہے کہ شاید تم ٹھیک سے چل بھی نہ سکو۔"

بروڈی کے لیے یہ سب منہا نیا تھا جیسے اسے سزائے موت سنائی گئی ہو۔ وہ مایوس ہو گیا اور شدید ڈیوٹی دباؤ کا شکار ہو گیا۔ ایسے میں انڈا نے بیوی ہونے کا حق ادا کر دیا۔ وہ ہر طرح کوشش کر کے اس کا دل بہلائی اس سے باتیں کرتی، اپنے آنسو اندری اندر پی کر اس کو ہنساتی رہتی۔ یوں چھ ماہ گزر گئے بروڈی نے زیادہ تر وقت ایک خاص بستر پر جو اس کے لیے بنوایا گیا تھا گزارا یا کچھ عرصے بعد جب ڈاکٹرز نے اجازت دی تو ایک آرام کرسی پر بیٹھ کر لائبریری میں گزارا۔ ان دنوں اس نے بہت مطالعہ کیا۔ چھ ماہ بعد اس کی فزیو تھراپی کا آغاز ہوا۔ جلد ہی اس نے اپنی جسمانی فٹنس دوبارہ حاصل کر لی۔ آہستہ آہستہ اس نے اپنی جسمانی صلاحیت میں اضافہ کیا اور ڈاکٹرز کی تمام پیشگوئیاں غلط ثابت کر دیں۔ وہ نہ صرف ٹھیک سے چلنے لگا بلکہ پوری طاقت سے ٹکس بھی استعمال کرنے لگا۔ اچھل کود کے علاوہ کمر کی چلک بھی حاصل کر لی۔ وہ سیدھا کھڑا ہو کر اپنا سر گھٹنوں سے لگا دیتا تھا اس حالت میں اس کا جسم دوہرا ہو کر راتوں سے چپکا ہوتا تھا۔ ڈاکٹرز اسے دیکھ کر حیران رہ گئے ان کا کہنا تھا کہ ایسا کیس اس سے پہلے بھی ان کے مشاہدے میں نہیں آیا۔

1971 میں بروڈی نے سیلیفٹ کی ایک ٹی وی سیریز "لوگ سٹریٹ" (Longstreet) کی چار اقساط میں کام کیا۔ اس میں اس نے مرکزی کردار ایک لوگ سٹریٹ کے استاد کا کردار ادا کیا تھا جو مانگ کو مارشل آرٹس سکھاتا ہے۔ اس نے اس میں ناظرین تک اپنا پیغام بھی پہنچایا کہ مارشل آرٹس کیا ہے اس کے فوائد اور اس کا فلسفہ کیا ہے۔ اس نے اس سیریز کے ذریعے جیت کوڈو کے بارے میں نام لے کر سمجھایا کہ یہ کیا ہے۔

بروڈی نے وارنر براڈرز سے ٹل کران کے سامنے ایک ٹی وی سیریز کا خیال پیش کیا جس کا نام اس نے "دا وریئر" سوجا تھا اور اس میں اسی کو مرکزی کردار ادا کرنا تھا۔ یہ ایک ایسے شخص کا کردار تھا جو سولہ چینی اور گفتگو کا ماہر ہوتا ہے مگر کاہوائے بننے کے شوق میں امریکا آتا ہے۔ وارنر براڈرز نے اس پر اعتراض کیا کہ کاہوائے کا موضوع اب پرانا ہو چکا ہے اس کو جدید انداز میں بنائیں گے۔ مگر بروڈی اپنی بات پر اڑا رہا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کا موضوع بنیادی طور پر مارشل

بروڈی کی ایک نظم
اپنی بیوی انڈا کے لیے

برف

تو جوان آدمی تمہارے وقت کی

ہر منٹ پر قبضہ کر لیتا ہے

دن تیزی سے گزر رہے ہیں

جلد تم بھی بڑی ہو جاؤ گی

اگر تم مجھ پر یقین نہیں کرتیں تو محن میں دیکھو

جو کھاس کبھی بڑھی اس پر کس طرح سے

سر سفید برف پر رگی سے چمک رہی ہے

کیا تم نہیں دیکھتے کہ تم اور میں

ایسے ہیں جیسے ایک ہی درخت کی شاخیں

تمہاری خوشی سے میری ہنسی ہے

تمہاری اداسی

میری آنکھوں میں آنسو بھر دیتی ہے

کیا زندگی تمہارے اور میرے پیار کے

علاوہ کچھ ہو سکتی ہے

وہ بہت ہی اہم شخصیت جس کا میں شکر ہے

ادا کرنا چاہوں گا

ایک معیاری انسان، سراپا عطا

پیار کرنے والی، وفادار

اس جانور بروڈی کی کو سمجھنے والی اور

اسے وہی رہنے دینے والی جو یہ اصل میں ہے۔

میری ساتھی جو ہمارے الگ مگر

متصل راستوں کی ہمراہی ہے

میری زندگی کا ایک مضحکم اور فادی پہلو

وہ غور سے مجھے پیار کرتا ہوں اور

جو میری خوش قسمتی ہے، وہ میری بیوی ہے

☆☆☆

آرٹس ہے۔ اس لیے کوئی فرقی نہیں پڑتا۔ مگر وارنر برادرز والے نہ مانے۔ یوں یہ معاملہ بھی ٹھپ ہو گیا۔ مگر بعد میں وارنر برادرز نے بروں کی کئی خیالیوں کو لے کر ایک نئی وی سیریز Kung Fu کے نام سے بنائی اس میں مرکزی کردار ڈیوڈ کیراؤٹن نے ادا کیا جو درحقیقت لنگٹونز کا جانشین تھا۔ وارنر برادرز نے اس میں کہیں بھی بروں کی کاس کا ٹریڈ نہیں دیا۔ 1973 میں اسی موضوع پر ایک فلم "فائنکس فٹنس آف شکھائی جو" بھی بنائی گئی تھی (یہ فلم پاکستان میں "فائنکس فٹنس" کے نام سے ریلیز ہوئی تھی) اس میں مرکزی کردار جن نے ادا کیا تھا۔

بروں کی اس ہالی ووڈ والوں کے متضاد رویے سے تنگ آچکا تھا جو اسے کبھی بھارتی ٹیلی ویژن کے لیے اس کے خواب اونچے تھے وہ ایک ہر اشارہ بننا چاہتا تھا۔ اسی لیے جب اس کے دوست فلساز فریڈ وینٹر شرب نے اسے مشورہ دیا کہ "تم بہت اچھے اداکار ہو تمہارے اندر بہت صلاحیت ہے مگر یہاں تمہیں ضائع کیا جا رہا ہے۔ تم ایسا کرو کہ ہانگ کانگ واپس جاؤ اور وہاں کی فلموں میں کام کرو۔ اور کوئی ایسی فلم بناؤ جس کی میں امریکا میں بھی نمائش کروا سکوں۔ اس کے بعد تم ایک کامیاب ہیرو کے طور پر واپس ہالی ووڈ آؤ۔" بروں کی کو یہ مشورہ بہت پسند آیا۔ اس نے کہا "فریڈ تم انتظار کرو، اور دیکھنا میں ایک دن دنیا کا سب سے بڑا چینی اشارہ بن کر دکھاؤں گا۔"

اس نے لنڈا سے بات کی اور بیوی بچوں کے ساتھ ہانگ کانگ کا رخ کیا۔

جب وہ ہانگ کانگ پہنچا تو وہاں ایک حیرت اس کی منتظر تھی اسے ایئر پورٹ پر ہی لوگوں نے پہچان کے کا تو انوکھے نمونے لگانے شروع کر دیے، وہ اس کے ساتھ کسی ہیرو کی طرح برتاؤ کر رہے تھے۔ اس کی حیرانی تب دور ہوئی جب اسے بتایا گیا کہ اس کی وی سیریز "ڈاگ رین ہورنٹ" یہاں بھی چلی گئی اور بہت کامیاب رہی تھی۔ یہاں کے لوگ انگریزی سیریز میں اپنے ایک ہم وطن کو دیکھ کر بہت خوش تھے۔

اس نے وہاں فلساز اداروں سے بات کی اور گولڈن ہارویٹ کے ساتھ دو فلموں کا معاہدہ کر لیا۔ اسے ان فلموں کا معاوضہ صرف پندرہ ہزار ڈالر فی فلم ملا۔ ان دونوں فلموں میں اس کا کردار ایک ناراض نوجوان کا تھا۔

اس سے پہلے ہانگ کانگ میں مارشل آرٹس کے

موضوع پر جو فلمیں بنی تھیں ان میں اصلی مارشل آرٹس کے علاوہ بھی کچھ ہوتا تھا۔ وہ لوگ بارہ سالے کی چاٹ بناتے تھے۔ عجیب و غریب جنگیں خیر الحول واقعات، ایک ایک آدی پوری پوری فوج سے اکیلے لڑ رہے۔ چھلانگ لگاتے تو پیرمین کی طرح اڑتا چلا جاتا ہے۔ فلمی واقعات وغیرہ۔ گولڈن ہارویٹ کے ریفرنڈم کا جو بروں نے بروں کی کاس کے سامنے بھی کچھ اسی قسم کی فلم کی تجویز دی تھی۔ مگر وہ اس کے لیے تیار نہ ہوا۔

"چاؤ میں یہاں اس لیے نہیں آیا کہ ایسی مسالا فلمیں بناؤں۔ میں لوگوں کو حقیقت دکھانا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں لوگ مارشل آرٹس کو سمجھیں کہ وہ کیا ہے۔ یوں سمجھو میری فلمیں ایک طرح سے مارشل آرٹس کی ترویج کے لیے ہیں۔ اس کو دنیا سے متعارف کروانے کے لیے ہیں۔ اس لیے تم ایسی کہانی لاؤ جو حقیقت سے قریب تر ہو اور اس میں مارشل آرٹس کے اصلی مناظر دکھائے جاسکیں۔"

چاؤ نے اس کی تجویز مان لی۔ مگر اس کے اصرار پر ان فلموں میں ایسے مناظر رکھنے پڑے جن میں ہیرو کوئی کئی لوگوں سے اکیلے لڑتے دکھایا گیا تھا۔ نہ چاہنے کے باوجود بروں کی اس کی اتنی بات مانتی پڑی۔ اس نے سوچا "یہ ابتداء ہے مجھے زیادہ بحث نہیں کرنی چاہیے جب میرے پیروں میں جیم جاکس کے ہار انہیں میری بات مانتی ہی پڑے گی۔" اب بروں کی نے نووی کے ساتھ مل کر اپنی پہلی فلم کی کہانی لکھی۔ اس کا نام "دا بگ بوس" رکھا گیا۔

بگ بوس کی کہانی کچھ یوں تھی کہ چانگ چاؤ آن چین کا رہنے والا ایک ایسا نوجوان ہے جو لنگٹونز کا رہنے والا بہت غصہ ور ہے۔ وہ کسی کی زیادتی برداشت نہیں کر سکتا، اس لیے اس کی ماں اسے اس کے رشتے کے بھائی کے پاس تھائی لینڈ بھیج دیتی ہے۔ جانے سے پہلے اس کے گلے میں ایک پتھر کا تعویذ ڈال دیتی اور اس سے قسم لیتی ہے کہ وہ وہاں کسی سے نہیں لڑے گا اور خود کو کسی مشکل میں نہیں ڈالے گا۔ یہ تعویذ اس قسم کی یاد دلاتا رہے گا۔ (یہاں تک کہ کہانی اس کی اصلی کہانی سے ملتی ہے۔ وہ بھی اپنی لڑائی مار لڑائی کی وجہ سے ہانگ کانگ سے امریکا بھیجا گیا تھا)۔ وہ تھائی لینڈ اپنے رشتے دار سوچن (جیس ٹین) کے پاس آ رہا تھا جو ایک برف کے کارخانے میں کام کرتا تھا۔ چانگ کو چھوڑنے اس کا ایک بزرگ ساتھ ہوتا ہے۔ تھائی لینڈ پہنچ کر وہ ایک اسٹال پر شربت پینے رک جاتے ہیں (شربت پیچھے والی کار کردار خود چینی اداکارہ نورا

مایا نے ادا کیا تھا جو آئندہ دو فلموں میں اس کے ساتھ ہیروئن آئی تھی)۔ وہاں شربت پینے ہوئے کچھ غنڈے آ جاتے ہیں اور نورا سے بدتمیزی کرنے لگتے ہیں چانگ غصے سے اٹھنے لگتا ہے تو بزرگ اسے تعویذ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنی قسم یاد دلاتا ہے تو وہ بھڑا بیٹھ جاتا ہے۔ اسے میں سوچن کا چھوٹا بھائی بھی وہاں آ جاتا ہے وہ غنڈے اس کا سامنا بھی کر دیتے ہیں اور مارنے لگتے ہیں۔ ابھی یہ سب چل رہا ہوتا ہے کہ سوچن وہاں آ جاتا ہے اور غنڈوں کو مار بھگاتا ہے۔ یہاں ان کی ملاقات ہوتی ہے وہ بزرگ چانگ کو سوچن کے حوالے کر کے واپس لوٹ جاتے ہیں۔ سوچن ایک بڑے سے گھر میں رہتا ہے جہاں اس کے ساتھ اس کا چھوٹا بھائی، بہن چاؤ کی (ماریائی) اور دیگر رشتہ دار رہتے ہیں جو اسی برف کے کارخانے میں کام کرتے ہیں۔ سوچن چانگ کو بھی وہیں کام دلوا دیتا ہے۔ پہلے ہی دن چانگ کی غلطی سے برف کی ایک سل گر کر لوٹ جاتی ہے۔ اس کے دور رشتہ دار جو ساتھ کام کر رہے تھے تو ہی ہوئی سل کے پاس جاتے ہیں تو یہ دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں کہ سل میں سے پلاسٹک کی تھیلیاں نکلی ہیں جن میں سفید پاؤڈر بھرا ہوا ہے۔ انہی وہ حیرت سے انہیں دیکھ رہے ہوتے ہیں کہ فوراً زمین آ کر تھیلیاں ان سے چھین لیتا ہے اور ڈانٹ کر کام پر جانے کو کہتا ہے۔ جب چھٹی ہوتی ہے تو فوراً زمین ان دونوں کو پتھر کا پیغام دیتا ہے کہ اس سے مل لیں۔ اصل میں یہ کارخانہ برف کی آڈ میں نشیات کی ترسیل کر رہا تھا۔ اس کا مالک سیڈی (ہان بیک پی) تھا جو بگ بوس کا بھلا تھا۔ منجھان دونوں کو برف کی آڈ میں نشیات کی ترسیل کے بارے میں بتاتے ہوئے تعاون کرنے کے لیے کہتا ہے اور بڑی رقم کی پیشکش کرتا ہے مگر وہ اس پر راضی نہیں ہوتے اور اٹھ کر جانے لگتے ہیں تو انہیں گل کے لاشیں غائب کر دی جاتی ہیں۔ جب وہ واپس نہیں پہنچتے تو سوچن کو تشویش ہوتی ہے۔ وہ ان کی تلاش میں ایک اور لڑکے کے ساتھ بگ بوس کے احاطے جا پہنچتا ہے۔ بگ بوس انکار کرتا ہے کہ اسے کچھ نہیں معلوم مگر سوچن کو شبہ ہو جاتا ہے وہ اسے دھمکی دیتا ہے کہ اگر ان کا پتا نہیں چلا تو وہ پولیس سے رابطہ کرے گا۔ بگ بوس اپنے آدمیوں کے ذریعے سوچن اور اس کے ساتھی کو بھی قتل کر دیتا ہے۔ یہاں جب سب کو پتا چلتا ہے کہ سوچن بھی لاپتا ہو گیا ہے تو وہ کارخانے میں کام بند کر کے احتجاج شروع کر دیتے ہیں ان کو بتائی سکھانے کے لیے بگ بوس غنڈے بھیجتا ہے وہ مزدوروں پر حملہ کر دیتے ہیں۔ چانگ الگ

کھڑا سب دیکھ رہا ہوتا ہے مگر قسم کی وجہ سے مجبور ہوتا ہے۔ لڑائی کے دوران اتفاق سے ایک شخص چانگ سے ٹکرا جاتا ہے جس سے اس کا تعویذ لوٹ جاتا ہے۔ یہ دیکھ کر چانگ ان پر ٹوٹ پڑتا ہے اور سب کو بھاگنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ بالآخر یہ مسئلہ نمٹنے کے لیے چانگ کو فوراً بین بنایا جاتا ہے تو مزدور خوش ہو جاتے ہیں مگر منیجر چانگ کو دعوت پر بلا کر شراب پلا دیتا ہے اور ایک طوائف سون کے حوالے کر دیتا ہے۔ صبح ہوش میں آ کر چانگ گھبرا کر وہاں سے نکلتا ہے تو چاؤ کی وہاں اسے دیکھ لیتی ہے۔ گھر میں سب چانگ سے ناراض ہو جاتے ہیں، وہ اسے طعنے دیتے ہیں کہ فوراً بین بن کر اس کا دماغ آسان پر چڑھ گیا ہے وہ سوچن کے لیے کچھ کرنے کے بجائے دشمنوں کے ساتھ عیاشی میں مصروف ہے۔ چانگ پریشان ہو کر طوائف سون کے پاس پہنچتا ہے، وہ ہمدردی میں اسے سمجھاتی ہے کہ بگ بوس کے ساتھ رہنے میں اس کی زندگی کو شدید خطرہ لاحق ہے، وہ غنڈے کا کام کرتا ہے۔ چانگ وہاں سے نکل جاتا ہے۔ چانگ کے جاتے ہی بگ بوس کا بیٹا چیون (ٹونی لیو) وہاں پہنچ کر سون کو قتل کر دیتا ہے اور اس کی لاش کو کارخانے میں برف میں چھپا دیتا ہے وہیں باقی کی چار لاشیں بھی موجود ہوتی ہیں۔ چانگ سون کی بات کی تصدیق کے لیے رات کے وقت کارخانے میں داخل ہو کر برف بجائے والے شعبے میں گھس جاتا ہے۔ وہاں اس کو سب لاشیں مل جاتی ہیں۔ اسی وقت چیون سیاہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہاں آ جاتا ہے۔ چانگ غصے میں پھرا ہوا ان سے ٹکرا جاتا ہے اور سب کو قتل کر دیتا ہے۔ اس کے بعد اسے گھر پہنچتا ہے تو وہاں تقریباً سارے ہی لوگوں کی لاشیں اس کی منتظر ہوتی ہیں جبکہ چاؤ کی غائب ہوتی ہے۔ وہ سیدھا بگ بوس کے احاطے پر پہنچتا ہے اور اس کے آدمیوں کو قتل کرتے ہوئے اس تک پہنچتا ہے۔ اس دوران بگ بوس کے قلم سے آسانی ہوئی ایک عورت چیاؤ کو آزاد کر دیتی ہے۔ چیاؤ سیدی پولیس تک پہنچ کر انہیں لے آتی ہے مگر اس دوران چانگ بگ بوس کو بھی ایک مشکل مقابلے کے بعد مار چکا ہوتا ہے۔ قلم کے آخری منظر میں وہ خود کو پولیس کے حوالے کر دیتا ہے۔

بروں کی خود بھی فلم کے افتتاحی شوش میں موجود تھا جب قلم کا آخری منظر ختم ہوا اور اختتام کے الفاظ نمودار ہوئے تو سینما میں اتنی خاموشی تھی کہ اگر کسی بھی گرتے تو آواز سنائی دے۔ بروں کی کے حواس کم ہونے لگے اس کا مطلب لوگوں کو قلم پسند نہیں آئی۔ چٹمنٹ یونی کڑے اچانک ایک جانب سے

تالیوں کی آواز شروع ہوئی اور پھر تو جیسے ہال میں طوفان سا آ گیا۔ تالیاں بیٹیاں نعرے اٹھا شور مچا کر کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ لوگوں نے فلم کو پسندیدگی کی سند پہلے ہی شو میں دے دی۔ جب سب باہر نکلے تو ان کی نظر بروں کی پر پردی جو ابھی تک وہاں موجود تھا پس پھر کیا تھا ہجوم ایک عالم دار خنکی میں آگے بڑھا اور انہوں نے بروں کی کونکھوں پر اٹھائے نعرے لگانا شروع کر دیئے۔ لہذا ابھی ایک جانب کھڑی یہ منظر دیکھ رہی تھی اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے آخر آج اس کے محبوب شوہر کی آرزو پوری ہوئی تھی، اور وہ ایک عام اداکار سے بلند ہو کر سپر اسٹار بن گیا تھا۔

فلم ”دا بگ باس“ 1971 میں منظر عام پر آئی جس نے اسے راتوں رات مقبول ترین ستارہ بنا دیا۔ اس میں اس نے نہ صرف مارشل آرٹس کے جوہر دکھائے تھے بلکہ یہ بھی ثابت کر دیا تھا کہ وہ بہت اچھا اداکار بھی ہے۔ ”دا بگ باس“ نے ہر جگہ کامیابیوں کے جھنڈے گاڑ دیے۔

لودی بروں کی کامیابیوں کا مقصد سمجھ چکا تھا کہ وہ کس قسم کی کہانی پسند کرتا ہے، اس لیے اگلی کہانی اس نے لکھ کر بروں کی سے مشاورت کی۔ بروں کو کہانی پسند آئی۔ اس کا نام ”سٹٹ آف فوری“ تجویز ہوا۔ اس فلم میں سابقہ فلم میں مختصر کردار ادا کرنے والی نور امیڈ کو میرون کا کردار دیا گیا۔ نور کا تعلق ہانگ کانگ سے تھا اور وہ گولڈن ہارویسٹ کی فلموں میں کام کرتی تھی۔ ٹوٹی لیو اور جیس تین کو بھی اہم کردار دیئے گئے۔ ان کے علاوہ اس میں بروں نے اپنے ایک دوست اور شاگرد روبرٹ بیکر کو بھی امریکا سے بلا کر ایک کردار دیا تھا۔ چونکہ فلم چینی زبان میں بن رہی تھی اس لیے بیکر کے مکالمے بروں نے اپنی آواز میں لہجہ بھری زبان میں ڈب کروائے۔

اس فلم کی کہانی بیسویں صدی کے اوائل کے دور پر لکھی گئی تھی جب چین کمزور تھا اور جاپان نے اس پر بے پناہ دباؤ رکھا تھا۔ یہ فلم 1972 میں نمائش پذیر ہوئی۔ اس نے یوکس آفس پر سابقہ فلم کا ریکارڈ بھی توڑ دیا۔ لوگ اب اس کے دیوانے ہو چکے تھے۔ اس کا سپر اسٹار بننے کا خواب شرمندہ تعبیر ہو چکا تھا۔ اب وہ کوئی عام اداکار نہیں تھا جو ثانوی کردار ادا کرتا۔ اب وہ سپر اسٹار تھا۔ لوگ اس کی ایک جھلک دیکھنے کو بے تاب رہتے تھے۔

اس فلم کے ساتھ ہی اس کا معاہدہ گولڈن ہارویسٹ کے ساتھ ختم ہو گیا۔ اب وہ اس حیثیت میں تھا کہ نیا معاہدہ اپنی منہ مانی شرائط پر کر سکے۔ مگر بروں نے نیا معاہدہ گولڈن

ہارویسٹ کے ساتھ کرنے کے بجائے اپنا فلساز ادارہ بنانے کا ارادہ ظاہر کیا تو گولڈن ہارویسٹ کے ریجنٹ جاکو نے اسے شراکت داری کی پیشکش کر دی۔ کچھ سوچنے کے بعد اس نے آمادگی کا اظہار کر دیا یوں وہ ایک بڑے فلساز ادارے کا شریک بن گیا جس کا نام ”کوگورڈ پروڈکشن انکورپوریٹڈ“ رکھا گیا اور اس کے ہیئر تھے فلم ”وے آف دا وریکن“ کا اعلان کر دیا گیا۔

یہ پہلی فلم تھی جو پوری طرح اس کے اختیار میں تھی۔ وہ اس فلم کا فلساز، ہدایت کار، کہانی کار، فائنٹ ڈائریکٹر اور ہیرو تھا۔ سچ محض میں اب اس کو موقع ملا تھا کہ اپنی مرضی کے مطابق فلم بنائے۔ اس فلم کی فلم بندی روم میں ہوتی تھی اور آخری خصوصی مقابلہ گولڈن میں ہونا تھا۔ یہ بہت اہم مقابلہ تھا اس لیے بروں نے اپنے دیرینہ دوست چک نورس کو یاد کیا۔ چک نورس کا کہنا ہے ”جاری طاقت کے قریب آٹھ سال بعد ایک دن مجھے ہانگ کانگ سے کال آئی۔“ ہائے چک میں بروں کی بول رہا ہوں۔“

”ہاں بروں کو کیسے ہوا دیکر کیا کر رہے ہو؟“

”مکرتا کیا ہے مجھے وہی فلموں میں اداکاری۔ یہاں میں نے دو بلاک مسٹر فلمیں بنائی ہیں اور اب تیسری فلم بنانے جا رہا ہوں جس کا نام وے آف دا وریکن ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس میں تمہارے ساتھ ایک ایسا فائنٹ سین کروں جو یادگار بن جائے۔“

”ضرور کیوں نہیں، اگر تم کہتے ہو تو میں تیار ہوں۔ اب تمہارے لیے تو وقت نکالنا ہی پڑے گا۔“

اور بلاشبہ یہ ایک ایسا مقابلہ تھا جسے ہر وہ شخص جس نے یہ فلم دیکھی ہو، آج اسے سال گزرنے پر بھی نہیں بھلا سکا۔ ایک انٹرویو میں چک نورس سے پوچھا گیا ”یہ فائنٹ کس نے ترتیب دی تھی آپ نے یا بروں کی؟“

”ہم ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف تھے اس لیے ہم نے جو سوچا ایک دوسرے کو بتا دیا، میں نے کہا میں یہ اور یہ کروں گا، بروں نے کہا تمہیک ہے میں ایسے اور ایسے کروں گا۔ ہم نے ایک طرح سے فری اسٹارنگ کی یعنی آزاد مقابلہ کیا۔“

یوں یہ مقابلہ فلم کی تاریخ کے چند یادگار ترین مقابلوں میں سے ایک بن گیا۔

چک نورس کے علاوہ اس کے سابقہ دو فلموں کے ساتھی اداکاروں میں ٹوٹی لیو اور نور امیڈ اس میں بھی تھے۔ ان کے

علاوہ کچھ فلم میں ترجمان کا کردار کرنے والے پول بھی وہی کو بھی ایک خاص کردار دیا گیا تھا، وہ باقی بوس کا خاص ماتحت ہوتا ہے۔ اس کے بات کا انداز اور حرکتیں خواہ سراسر اس کی سی ہوتی ہیں۔ اس فلم کے لیے بروں نے ہولی ووڈ سے چک نورس کے علاوہ روبرٹ وال کو بھی بلایا تھا۔ روبرٹ ایک کرائے کے چیمپئن تھا اس کا اپنا ادارہ تھا جسے بعد ازاں اس نے چک نورس کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ اس نے فلموں میں بھی کام شروع کر دیا تھا۔

بروں نے اس فلم کی کہانی روم کے پس منظر میں لکھی تھی۔ اس سے پہلے کی دونوں فلموں میں وہ ناراض نوجوان کا کردار کر چکا تھا، وہ جانتا تھا کہ اگر وہ ایسے ہی کردار کرتا رہا تو ان کے لیے یہی مخصوص ہو کر رہ جائے گا اس لیے اس بار اس نے اپنے لیے ایک ایسا کردار لکھا جو سابقہ کرداروں سے کافی مختلف تھا ایک سیدھا سادہ گاؤں کا رہنے والا، بڑھ کر طاقتور اور مایہ ناز لڑکا۔ اس میں اس نے مزاح کی چاشنی بھی رکھی اور اپنے ایسے مناظر فلمائے جو فلم بین کو بے اختیار ہنسنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

یہ فلم 1972 میں نمائش پذیر ہوئی اور جیسا کہ توقع تھی، اشتیاق کا سیلاب رہی۔ لوگوں نے اسے اس نئے انداز میں بھی بہت پسند کیا۔ اس فلم نے یادگار برس کیا اور بروں کی کا نام ایسا چمکا کہ ہالی ووڈ میں بھی اس کا تذکرہ ہونے لگا۔ وہی دور زر براورڈ چیمپئنوں نے ایک روز اسے مسٹر دکر دیا تھا اب اسے مرکزی کردار میں نے فلم بنانے کا منصوبہ بنانے لگے تھے۔

1972 کے اگست تا اکتوبر بروں کی اپنی نئی فلم کی فلم بندی میں مصروف رہا جس کا نام ”کیم آف ڈیٹھ“ رکھا گیا تھا۔ اس کی کہانی بھی بروں نے خود ہی لکھی تھی۔ اس نے اس فلم کے چند مناظر اور اختتامی لڑائی کے مناظر فلم بند کر لیے تھے۔ جس میں سٹافٹ دوایچے امریکی باسکٹ بول کھلاڑی کریم عبد الجبار کے ساتھ مقابلے کے مناظر بھی شامل تھے۔ کریم بھی اس کا شاگرد تھا۔ اس کے علاوہ اس کا دوسرا شاگرد ڈون اوساٹو جو اس کے بعد اس کے ادارے کو چلانے والوں میں اہم حیثیت کا حامل تھا اور 7 ڈان ہیپ کیڈو ماسٹر بان جانے جی کے ساتھ مقابلے کے مناظر بھی شامل تھے۔ اس میں اس کے ساتھی کی حیثیت سے جیس تین اور ایک اور اداکار شامل تھے۔

مگر اچانک نومبر 1972 میں امریکی ادارے دور زر براورڈ نے ایک فلم کا منصوبہ بنایا۔ اس کے لیے انہوں نے

گولڈن ہارویسٹ سے بات کی۔ ان کے درمیان مشترکہ فلسازی کا معاہدہ طے پا گیا۔ اس فلم کا نام ”انٹروا وریکن“ رکھا گیا۔ اس میں امریکی اداکار جم بکلی، جون سکسن اور روبرٹ وال بھی اہم کردار ادا کر رہے تھے۔ مثنیٰ یعنی وین کا کردار شیم کین نے ادا کیا تھا۔ جم بکلی ایک سیاہ فام امریکی تھا وہ ڈبل ویٹ کرائے کے چیمپئن رہ چکا تھا۔ اس کا اپنا ڈوجو تھا جہاں ہو یوڈو کے کئی لوگ اس سے کرائے کی تربیت لینے آتے تھے۔ جون سکسن ایک اطالوی نژاد امریکی تھا۔ اور کافی کم عمری سے فلموں میں کام کر رہا تھا (1978 میں جون نے ایک فلم شایلا میں کام کیا تھا یہ ہالی ووڈ اور بولی ووڈ کی مشترکہ فلم تھی۔ اس کا ہیرو دھرمیندر تھا)۔

اس دن بروں کی بہت خوش تھا۔ اس نے گھر پہنچ کر لڑنا کو ہاتھوں میں لے کر سمجھائے ہوئے منگنا شروع کر دیا۔ لڑنا بولی۔ ”کیا بات ہے آج اسے اتنے خوش نظر آ رہے ہو؟“

”ہاں آج میں بہت خوش ہوں بہت خوش۔“

”ایسا کیا ہو گیا۔“

”چیمپن یا دے جب ہم امریکا میں تھے تو میں نے دور زر براورڈ کو ایک سیریز بنانے کی پیشکش کی تھی؟“

”ہاں میں کیسے بھول سکتی ہوں تم اس دن بہت مایوس تھے اور غصے میں بھی تھے؟“

”جانتی ہو، آج وہی دور زر براورڈ ہانگ کانگ آئے ہیں میرے لیے۔ وہ مجھے فلم کی پیشکش کر رہے ہیں۔“

”سچ یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔“

”ہاں یہ میرا دیرینہ خواب تھا جواب پورا ہونے جا رہا ہے۔ یہ فلم مجھے دوبارہ امریکا کا پہنچا دے گی۔ میرے لیے ہالی ووڈ کے دروازے کھل گئے ہیں۔“

اس کی فلم بندی جنوری 1973 میں ہانگ کانگ میں شروع ہوئی۔ اس اہم منصوبے کی وجہ سے زیر تخیل فلم کیم آف ڈیٹھ کو اتوار میں ڈال دیا گیا۔

انٹروا وریکن کی کہانی مائیکل ایلین نے لکھی تھی۔ انٹروا وریکن کو تیزی سے عمل کیا گیا۔ اس فلم پر 1973 میں آٹھ لاکھ پچاس ہزار ڈالر کی لاگت آئی تھی جو آج کے حساب سے کئی ملین بنتے ہیں۔ اس فلم کی نمائش کے لیے 26 جولائی 1973 کا دن مقرر کیا گیا۔ مگر بروں کی کے پاس جیون کی نقدی ختم ہو چکی تھی۔

10 مئی 1973 کو وہ ہانگ کانگ میں انٹروا وریکن کی ڈیبٹ کر رہا تھا۔ آرام کے وقفے میں وہ ایک ریستوران

کے رد عمل سے واقع ہوئی تھی۔

قرآن مجید کا یقیناً سندھی ترجمہ

892ء میں ایک ہندو راجا نے جس کا نام مہروک تھا۔ عبداللہ بن عمر بہاری سے درخواست کی کہ سندھی زبان میں مذہب اسلام کی تعلیم لکھ کر بھیج دے، اس زمانے میں منصورہ میں عراق کا ایک عالم رہتا تھا، جس کی پرورش منصورہ میں ہوئی تھی، وہ بہت ذہین، سمجھ دار اور شاعر تھا اور یہاں کی مختلف زبانیں جانتا تھا، عبداللہ بن عمر بہاری نے راجا کی خواہش کا ذکر اس سے کیا، اس نے ان کی زبان میں ایک قصیدہ تیار کر کے راجا کو بھیج دیا۔ راجا نے اس قصیدے کو سنا تو بہت پسند کیا اور عبداللہ سے درخواست کی کہ اس شاعر کو اس کے دربار میں بھیج دیا جائے، چنانچہ عبداللہ نے اس کو بھجوادیا، وہ راجا کے دربار میں تین برس رہا اور اس کی خواہش سے اس عالم نے قرآن مجید کا ترجمہ سندھی زبان میں کیا، راجا جواد نے ترجمہ سنا تھا اور بے حد متاثر ہوا تھا۔ قرآن مجید کا یہ پہلا ترجمہ تھا جو سب سے پہلے سندھی زبان میں ہوا۔ اس عالم کا یہ بھی بیان ہے کہ راجا نے چھ سو سونے سے اسے تین دفعہ دیا۔

مرسلہ: سلطان اشرف، لاڈکانہ

بروس لی کے تابوت کو تیار کر کے ہانگ کاٹک میں دیکار عام کے لیے رکھ دیا گیا جہاں ہزاروں لوگوں نے قطار میں کھڑے ہو کر باری باری اپنے محبوب ہیرو کا آخری دیدار کیا۔ اس دن سارا ہانگ کاٹک بند تھا ہر شخص کا رخ بروس لی کی رہائش گاہ کی طرف چاہا تھا۔ اس کی بیوہ لٹزا اور بچے آٹھ سالہ برائنڈ اور چار سالہ سینٹین مخصوص لباس میں ملیں ایک طرف بیٹھے تھے۔ سڑکوں پر عوام کا اور آخری دیدار کے لیے آنے والوں کا بے پناہ جھوم تھا۔ سب کا یہ حال تھا کہ آنکھیں نم تھیں کچھ سسکیاں بھر رہے تھے، کچھ زار و قطار رو رہے تھے۔ اس دن پتا چلا کہ لوگ اسے کس قدر چاہتے ہیں مگر انہوں نے یہ مناظر دیکھنے کے لیے وہ خود موجود نہیں تھا۔ یہ آخری دیدار کے مناظر اس کی آخری فلم ٹیم اوف ڈیجھ میں بھی شامل کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد لٹزا بروس لی کی نش کو سیٹس لے گئی اور وہاں 25 جولائی 1973 کو ایک ویو قبرستان میں اس کی تدفین ہوئی۔ اس تدفین میں معروف فلمی - سماجی اور مارشل آرٹس سے متعلق شخصیات نے شرکت کی جن میں تاکی کیورا، سٹیو میک کون، جیمس کورن، چک نورس، جارج لیونجی، ڈان الونسانو، پیٹر چینز اور بروس لی کا بھائی ڈو برٹ لی بھی شامل تھے۔

انٹرا ڈورمین ریلیز ہوئی اور اس نے تاریخی کامیابی حاصل کی امریکا میں سینماؤں پر کمزوری توڑ دیا تھا۔ لوگ یہ فلم دیکھ کر ہوائے ہو گئے تھے ہر جگہ بروس لی کے چہرے تھے اس کا مارشل آرٹ اور اس کی لا جواب اداکاری دیکھنے والوں پر بحر طاری کر دیتی تھی۔ یہ امریکا میں ملنے والی وہ کامیابی تھی جس کے خواب بروس لی اپنی زندگی میں دیکھا کرتا تھا مگر انہوں نے جب اس کا خواب شرمندہ تعبیر ہوا تو وہ یہ تاریخی لمحات دیکھنے کے لیے اس دنیا میں نہیں تھا۔ اس فلم نے دنیا بھر سے دو سٹولن ڈالر سے زائد کمائے۔ اور دنیا بھر کو نون حرب کا دیوانہ بنا دیا۔ چھوٹے سے جزیرے ہانگ کاٹک کی فلمی صنعت نے اتنی ترقی کی کہ ایک وقت میں وہ ہالی ووڈ سے بھی آگے نکل گیا۔ اس ساری کامیابی کے پیچھے بروس لی اور انٹرا ڈورمین تھے جنہوں نے فلم جینوں کو سمور کر دیا تھا۔ ہانگ کاٹک میں اس کی اچانک موت کی وجہ سے اس فلم کی نمائش ایک ماہ کی تاخیر سے کی گئی تھی۔

اب گولڈن ہارویسٹ کی توجہ ٹیم اوف ڈیجھ کی طرف ہو گئی جس کی تقریباً سو منٹ کی شوٹنگ ہو چکی تھی۔ دسے اوف دا ڈورمین کی طرح ٹیم اوف ڈیجھ کا بھی سب کچھ بروس لی ہی

تھی۔ دوا کھا کر وہ آرام کرنے لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر میں ہی اس کی آنکھ لگ گئی۔ جب وہ وقت پر ریسٹورن میں پہنچا تو ریمینڈ جاؤ کو تشویش ہوئی اس نے بیٹی کو کون کیا تو بیٹی نے اسے صورت حال سے آگاہ کیا۔ ریمینڈ پریشانی کی حالت میں بیٹی کے گھر پہنچ گیا۔ انہوں نے بروس لی کو آواز دیں، اسے جھنجھوڑا مگر وہ نہیں جاگا تب انہیں گڑبڑ کا احساس ہوا۔ ریمینڈ نے فوراً ایک ڈاکٹر کو طلب کر لیا اس نے آکر بروس لی کا معائنہ کیا اور کہا ”مجھے لگتا ہے یہ مہر کی بے ہوشی یا کوما میں ہے اسے فوراً اسپتال پہنچا جائے۔“ جاؤ نے ایڈولنس طلب کر لی، ساتھ ہی اس نے لٹزا کو بھی فون پر آگاہ کر دیا۔ بے ہوش بروس لی کو اسٹریچر پر لا کر ایڈولنس میں ڈالا گیا اور کون الیگزینڈر اسپتال پہنچا گیا۔ جہاں ڈاکٹر نے معائنہ کے بعد بتایا یہ کوما میں ہے۔ پریشان حال لٹزا اسی اسپتال پہنچی۔ اسے بروس لی کی حالت سے آگاہ کیا گیا اور کہا کہ ڈاکٹر اس کی جان بچانے کی کوششیں کر رہے ہیں۔ مگر سب کوششیں بیکار رہیں۔ اسی کوما کی حالت میں کچھ دن بعد اس نے دم توڑ دیا۔ اس کی اچانک اور بڑا راسر موت کی وجہ سے ڈاکٹر نے اس کی لاش کا مکمل معائنہ کیا، تو اس کے جسم پر کوئی واضح زخم کا نشان نہیں تھا۔ پوسٹ مارٹم سے پتا چلا کہ اس کا دماغ دم کی وجہ سے تیرہ فیصد بڑا ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے جسمانی نظام پر ایکویسک کا اثر بھی ملا۔ 15 اکتوبر 2005 کو ریمینڈ جاؤ نے ایک انٹرویو میں کہا کہ بروس لی کو مسکن دوا کے الارجک رد عمل نے موت کے منہ میں پہنچا دیا تھا۔

وہ اپنی کامیاب ترین فلم کی نمائش سے صرف چھ دن قبل اچانک موت کا شکار ہو گیا۔ یہ خبر پھیلنے ہی پر طرف ایک کیرام ساچ گیا۔ کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سچ ہے۔ ہانگ کاٹک میں تو گویا ہر کسی پر سکتہ سا طاری ہو گیا تھا۔ ہر آنکھ انگھٹا رہی ہر لب پر ناٹے تھے۔ ہر طرف آدھوڑا کا شور تھا۔ پہلے پہل سب نے بیٹی تنگ کی کو موردا تراں مٹھایا کہ اس نے بروس لی کو قتل کیا ہے۔ بیٹی کے لیے باہر نکلتا مشکل ہو گیا تھا۔ اس کی اچانک موت نے کئی طرح کی افواہوں کو بھی جنم دیا، کچھ کا کہنا تھا کہ اس کے قتل میں ہالی ووڈ کے متعصب لوگوں کا ہاتھ ہے، کچھ کا کہنا تھا کہ جن لوگوں نے مختلف مقابلوں میں اس سے شکست کھائی ہے وہ اس کی موت میں ملوث ہیں۔ کچھ کا کہنا تھا اس کی بے پناہ قوت ہی اس کی دشمن ثابت ہوئی اس کا دماغ اس کو برداشت نہ کرنے کی وجہ سے کام چھوڑ گیا وغیرہ۔ مگر جیسا کہ اس کے گھر والوں کا ماننا ہے سچ یہی ہے کہ اس کی موت دوا

چلا گیا وہاں اچانک اس کے سر میں شدید درد اٹھا اور وہ غش غش کر کر پڑا۔ اسے فوری طور پر ہانگ کاٹک کے ہیپٹل اسپتال لے جایا گیا۔ وہ بے ہوش تھا، لٹزا اس کے ساتھ تھی۔ وہ روتے ہوئے اسے پکار رہی تھی۔ اسپتال میں ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کیا۔ مختلف ٹیسٹ اور ایکس ریز کیے جس کے بعد اسے دماغی ورم تجویز کیا۔ ڈاکٹر نے مینیکول کے ذریعے ورم کم کرنے کی کوشش کی۔ جس سے اسے افادہ محسوس ہوا۔ لٹزا نے ڈاکٹر سے پوچھا کہ یہ تکلیف کس وجہ سے ہوئی ہے تو وہ یہ بتانے سے قاصر رہے۔ ہوش میں آنے کے بعد اس نے لٹزا کو بتایا ”مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مجھ میں کسی مہرے کی کوئی کڑ تہہ میں ہوں۔ مجھے تمہاری آواز دور سے آتی ہوئی سائی دے رہی تھی مگر میں جواب دینے پر قادر نہیں تھا۔“

20 جولائی 1973 کو بروس لی ہانگ کاٹک میں تھا۔ اس رات اسے ریمینڈ جاؤ اور جارج لیونجی کے ساتھ ڈنکرنا تھا جہاں وہ فلم کے بارے میں تبادلہ خیال کرتے۔ جارج لیونجی دہی ہے جو پہلے ہانگ کاٹک کرتا تھا پھر فلموں کی طرف آیا اسے جیمس بانڈ کا کردار پیش کیا گیا۔ اس نے ایک فلم ”اون ہر میچو سیکرٹ سروس“ میں یہ کردار نبھایا، مگر اگلی فلم کے لیے محذرت کر لی۔ اس دن دو بجے دوپہر وہ ریمینڈ جاؤ کے گھر پہنچا، جہاں ان کے درمیان ادھوری فلم ٹیم اوف ڈیجھ سے متعلق گفتگو ہوئی کہ اب اسے مکمل کر لیتا چاہیے۔ وہ چار بجے تک وہاں رہے۔ اس کے بعد وہ دونوں بروس لی اور ریمینڈ جاؤ ہانگ کاٹک میں میٹیم تائیوان کی اداکارہ بیٹی تنگ لی کے ہاں پہنچے۔ وہاں تینوں ٹیم اوف ڈیجھ کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ اس فلم کی ہیروئن بیٹی تھی، مگر وہ ریپنک ہیروئن نہیں تھی بلکہ وہ بروس لی کی بہن کا کردار کر رہی تھی۔ ویسے بھی دیکھیں تو ان پانچ فلموں میں سے صرف ایک فلم فیسٹ آف فیوری ایسی تھی جس میں ٹھوڑا سا نم تھا۔ نورامیڈا اس کی ہیروئن تھی۔ اس کے علاوہ کسی بھی فلم میں اس نے ایسا نہیں دکھایا ہیروئن ہوتی تھی تو اس سے محض دوستی یا رشتہ داری ہوتی تھی جس میں رومانس کی گنجائش نہیں نکلتی تھی۔ وہ بیٹیوں فلم کی کہانی کا کام کرتے رہے۔ پھر ریمینڈ جاؤ نے اسے لیے تیاری کرنے کا کہہ کر چلا گیا۔ ”بروس میں تیار ہو کر ریسٹورن پہنچ جاؤں گا تم بھی وقت پر آ جانا۔“

ساڑھے سات بجے اچانک بروس لی نے شدید سر درد کی شکایت کی تو بیٹی نے اسے ایٹا کیو سیک اور ایکویسک کی گولیاں دیں۔ اس... میں اسپرین بھی تھی اور وہ مسکن بھی

English

Your
Herbal
DentistEnglish Herbal
FLUORIDE TOOTHPASTE

جہل کر دی اور ایک نئی کہانی اور کچھ نئے اداکاروں کے ساتھ اس فلم کو مکمل کیا، حالانکہ بروں نے تقریباً سو سوٹ کی فلم بننا چکا تھا مگر نئی کہانی کے مطابق اس میں سے بشکل پندرہ سوٹ کی اصل فلم استعمال کی گئی باقی پوری شوٹنگ میں دو اداکاروں کم تانی چونگ اور یوان بیاؤ سے کام لیا گیا جو تھوڑا بہت بروں لی سے ملتے تھے اس کے علاوہ کچھ مناظر بروں لی کی پرانی فلموں سے لیے گئے ہیں۔ ایک جگہ تو انہوں نے بروں لی کا چہرہ گتے پر لگا کر کام چلایا یوں یہ فلم ڈیڑھ گھنٹہ عمل ہوئی مگر یہ فلم کچھ کی کچھ بن کر تیار ہوئی۔

نئی کہانی یہ بتاتی تھی کہ بی لوائیک کا میلب اداکار اور مارشل آرٹس ہوتا ہے اسے ایک مجرموں کا ٹولہ اپنے لیے استعمال کرتا چاہتا ہے اس کے انکار پر اس کے قتل کا حکم دے دیتا ہے۔ شوٹنگ کے دوران ایک منظر میں اس پر کچھ لوگ گولیاں چلاتے ہیں ان میں مجرموں کا مقررہ قاتل شامل ہو جاتا ہے اور کسی کی جگہ اصلی گولی چلا کر فرار ہو جاتا ہے۔ گولی بی کے چہرے پر ملتی ہے وہ بھاگ جاتا ہے مگر پلاسٹک سرجری کی ضرورت پڑتی ہے۔ وہ اپنی موت کی جھوٹی خبر پھیلا دیتا ہے۔ (اس موقع پر بروں لی کا اصل تاوت اور ہانگ کانگ کی سڑکوں اور لوگوں کا حال دکھایا گیا ہے)۔ پلاسٹک سرجری کے بعد وہ انتقام لینے نکلتا ہے۔ کئی مختلف واقعات کے بعد یوں کے حکم پر اس کی منگیتر کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ جسے بچانے بی لوائیک ہے۔ اب یہاں وہ مناظر جو بروں لی نے پکڑا دیں فٹائے تھے استعمال کیے گئے ہیں۔ مگر پکڑاؤ کے بجائے یوں کی ملکیت ریڈیو بیچ رہے ستوراں دکھایا گیا ہے جس کی منزلوں پر مختلف لوگوں سے لڑتے ہوئے وہ بالآخر اس تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ فلم 1978 میں مکمل ہو کر نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی۔

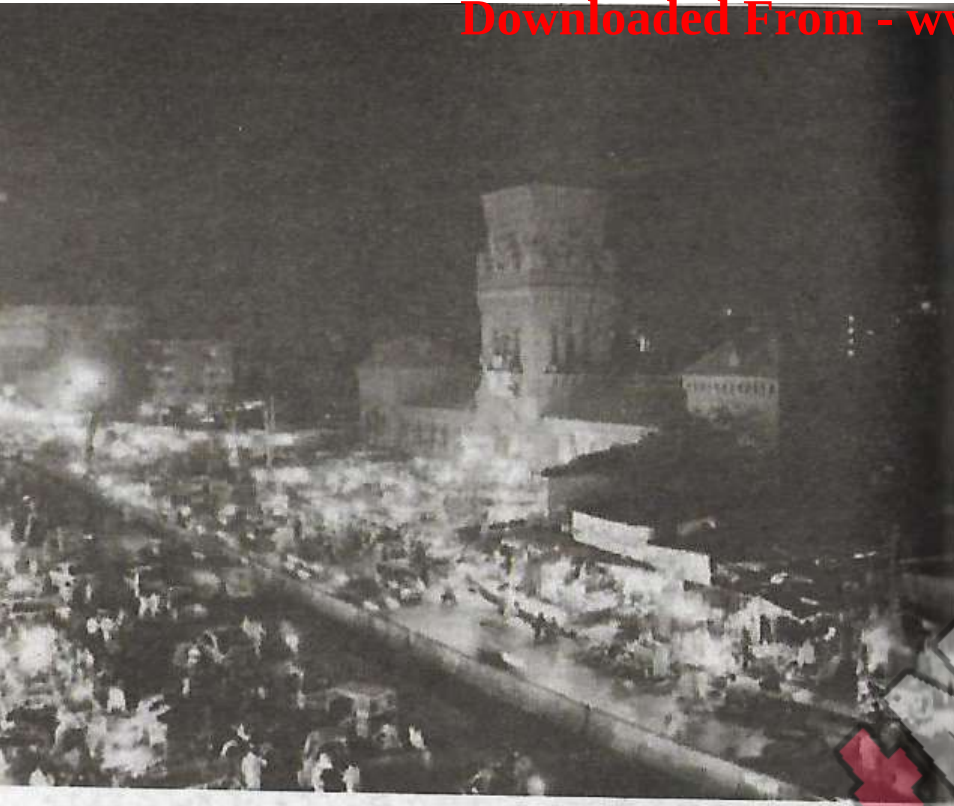
بروں لی کی موت کے پچیس سال بعد اس کے کاغذات نکالے گئے تو حیرت انگیز طور پر اس فلم کی کہانی اور منظر نامے کے کچھ حصے برآمد ہو گئے۔ مگر اب اسے سال تک توجہ نہ دینے سے باقی فلم جو استعمال نہیں ہوئی تھی غائب تھی۔ مگر ڈیوڈ نے والوں نے بہت نہ ہاری اور پھر وہ بھی مل گئی یوں پچیس سال بعد چلا کہ بروں لی کی یاد تازہ کرتا کر چرچا ختم کا اب بھی کچھ پتا نہیں کیا تھا۔

بروں لی نے فنون حرب اور فلسفے پر قریب پینتھ کتابیں بھی لکھی ہیں۔ ان کے علاوہ وہ شاعر بھی تھا۔ مگر اس نے کبھی اپنی شاعری کو جمع کر کے شائع نہیں کیا، اس کی موت کے بعد اس کی بیوہ لنڈا نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور مختلف کاغذات پر لکھی اس کی شاعری اور اس کے اقوال کو جمع کر کے شائع

کئی برسوں کے ساتھ ہی چلا گیا)۔ اس کہتا ہے کہ میں چاہتا ہوں، ہم نے جو نیم اندر جانے کے لیے تشکیل دی ہے تم بھی اس کا حصہ بن جاؤ۔ یہ دوسری کوشش ہے اس سے پہلے ایک کوشش نام کام ہو چکی ہے۔ ہائی سٹی سے منع کر دیتا ہے۔ تو یوں ہائی کی بہن (بیٹی تنگ لی) اور چھوٹے بھائی کو اغوا کر لیتا ہے۔ ہائی مجبور ہو جاتا ہے اور اس چارر کئی نیم کا حصہ بن جاتا ہے۔ جن میں سے ایک بروں لی کی ابتدائی فلموں کا ساتھی جس تین اور دوسرا چین یوان تھا۔ یہ اس پکڑاؤ کی طرف جاتے ہیں۔ اس کی شوٹنگ کے لیے جنونی کوریائیں موجود ایک ٹکڑی کے پکڑاؤ کا انتخاب کیا گیا۔ پکڑاؤ کے نیچے داغی دروازے کے سامنے دس کرائے کے بلیک بیلٹ ماہر چہرہ دیتے ہیں۔ ان سے سوٹ کر اندر داخل ہوں تو ہر منزل پر ایک سے بڑھ کر ایک خطرناک پہرہ دار سے ٹکراؤ ہوگا۔ نیچے کے دس پہرے داروں کو مار کر یہ پہلی منزل پر پہنچتے ہیں جہاں ان کا ٹکراؤ پاسکل (ڈان انوسانتو) سے ہوتا ہے وہ ٹکڑی اور دن پکڑا کر ماہر ہے۔ وہ ہائی کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ اگلی منزل پر کوریون میپ کیڈو کے ماہر جی جائے سے مقابلہ ہوتا ہے اس لڑائی کے دوران چین یوان اور چلا جاتا ہے جہاں سے اس کی لاش نیچے آ کر گرتی ہے۔ پھر تیس تین اوپر جاتا ہے وہاں اس کا مقابلہ حکیم (کریم عبدالجبار) سے ہوتا ہے۔ جب تک ہائی جی ہان کو ختم کرتا ہے وہاں حکیم جیس کو ختم کر دیتا ہے۔ اب ہائی اوپر جاتا ہے تو سٹافٹ دو داؤج کے دشمن کو کچھ کریران رہ جاتا ہے۔ ان کا مقابلہ شروع ہوتا ہے اور ایک سخت مقابلے کے بعد ہائی حکیم کو بھی قتل کر دیتا ہے۔ اس کے بعد ہائی کھڑکی سے باہر بات کرتا ہے اور نیچے اتر جاتا ہے۔

اس سے اوپر کی شوٹنگ نہیں ہوئی اور بروں لینے اپنے شاگرد اور نائب تکی کیہورا کو بھی ایک منزل کے پہرے دار کا کردار دیا تھا جس کی شوٹنگ نہیں ہو سکی تھی۔ اس کے بعد کہانی کیا تھی وہ منظر آج تک نہیں مل سکے۔ چند صفحات اور شوٹنگ میں جو کچھ ملا وہ اتنا تھا۔ اس میں بروں لی نے کوئی مخصوص لباس پہننے کے بجائے پہلا ون ٹیس ٹریک سوٹ پہنا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسے مختلف فنون کے ماہرین سے مقابلہ کرنا ہے تو اس نے اپنے فلسفے کا عملی مظاہرہ کیا ہے کہ ہمارا اسٹائل وہ ہے جو کوئی اسٹائل نہیں ہے۔ اس میں بڑے مقابلوں کے دوران بھی وہ یوتا رہتا ہے اور اپنے اسٹائل جیت کو ٹھوڑے کے اصول بتاتا رہتا ہے۔

اصل کہانی نہ ملنے کی وجہ سے انہوں نے فلم کی کہانی



شہر نامہ

ڈاکٹر اقبال ہاشمانی

قلم کاری ایک ایسا فن ہے جس کے ہزار ہا پہلو ہیں۔ ایک اچھے قلمکار کی تعریف یہی ہے کہ وہ پڑھنے والے کو تحریر کے سحر کا اسیر کر لے۔ زیر نظر فسون ساز تحریر ماضی قریب کے کراچی کی تصویر ہے لیکن اس انداز سے کہ اس پر افسانے کا گمان ہو اور قاری پڑھتا ہی چلا جائے۔

ان مقامات کا تذکرہ جو ماضی کی قبر میں دفن ہو گئے

اس شام میں فریزر ہال میں پام کے درختوں میں گھری اپنی پسندیدہ بیج پر بیٹھا تھا۔ فریزر ہال کا یہ تھا گوشہ مجھے ہمیشہ اچھا لگتا۔ بھی طالب علمی کے دور میں جب یہاں آتا تھا تو پڑھائی کے بعد اسی بیج پر آکر بیٹھ جایا کرتا اور فریزر ہال میں آئے ہوئے کرچن جوڑوں اور پارسی بوڑھوں کو دیکھتا رہتا۔ شوخ و چنچل پیارے پیارے سے بچے پھولوں کے آس پاس کھیلنے ہوئے بہت ہی بھلے لگتے۔ میں سوچتا کہ دنیا بھر میں سارے بچے ایک سے ہوتے ہیں۔ پل دو پل

کر دیا۔
آخر میں بروں لی کے بارے میں چند دلچسپ حقائق جن سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔
1- بروں لی کی نظر کافی کمزور تھی اس لیے وہ عینک یا کوئیک لیئر کا استعمال کرتا تھا۔
2- اس کی ایک ٹانگ دوسری سے تھوڑی سی چھوٹی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ چلتے وقت کچھ جھولتا ہوا سمجھو ہوتا تھا مگر اس کمزوری کو اس نے لڑائی کے دوران ایک خوبی میں بدل دیا تھا۔
3- وہ کان بزلہ سنج تھا۔ ہر جگہ چاہے دوستوں کی محفل ہو یا قلم کاسیٹ وہ ہنستا ہنساتا رہتا تھا۔
4- اس کے ہاتھوں اور پیروں کی رفتار انتہائی زیادہ تھی جس کی وجہ سے قلم بندی کے دوران مشکل پیش آتی تھی۔ اس کے لیے کبیرے کو خاص رفتار پریسٹ کرنا پڑتا تھا۔
5- اس نے خاص قسم کے دستاں متعارف کروائے تھے جو بانگ کے دستاںوں سے مختلف تھے۔ آج ہر قسم کے مارشل آرٹ میں یہ دستاں استعمال ہو رہے ہیں۔
6- وہ چاول یا دال کا دانہ اچھا لکرا سے چوپ اٹکس (Chop Stick) سے ہوا میں ہی پکڑ لیتا تھا۔
7- اس کا وزن قریب ساٹھ کلو گرام اور قد پانچ فٹ آٹھ انچ تھا۔
8- بروں لی کو فن چکو چلانے میں خصوصی مہارت حاصل تھی۔ فن چکو اس کے ہاتھ میں آکر ایسی شین بن جاتا تھا جس پر نظر ٹکانا ناممکن ہوتا تھا۔
اس کے پاس وقت کم تھا اس لیے وہ بہت جلدی میں تھا۔ اس نے اس عمر میں اپنا اشاکل بنایا جس عمر میں ابھی لوگ مارشل آرٹ میں مہارت حاصل کر رہے ہوتے ہیں۔ اس نے کامیاب فلمیں دیں۔ اس نے مارشل آرٹس کو دنیا سے اس طرح متعارف کروایا کہ ایک عالم اس کا دیوانہ ہو گیا۔ آج دنیا میں ہر قسم کے مارشل آرٹ سیکھنے والوں کا جو جوش ہے بلاشبہ وہ بروں لی کا رہنما ہے۔ اس نے مارشل آرٹس اور فلسفے کے موضوعات پر کتابیں لکھیں۔ وہ شاعر تھا۔ اس نے قلم کی کہانیاں لکھیں، منظر نامہ تحریر کیا۔ وہ فلسفہ تھا ہدایت کا رہتا۔ غرض وہ ایک ہمہ جہت شخصیت تھا۔ وہ صرف تیس برس کی عمر میں یہ دنیا چھوڑ گیا مگر آج اس کی موت کے چوالیس برس بعد بھی لوگ اس کو یاد کرتے ہیں، اس کے دیوانے ہیں۔
اس کے چند اقوال درج ذیل ہیں۔



رو تے ہیں، پھر سب کچھ بھول کر زندگی کے کھیل میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ان سب کے لیے دکھ، تکلیف، خوشی، مسرت وقتی چیزیں ہوتے ہیں مگر دکھ، درد، رنج و الم کو اپنی زندگی کا بنیادی جز بنا لیتے ہیں۔

ہر شام جب میں ان پارسی بوڑھوں کو فریزر ہال کی بیچوں پر سکون کے ساتھ بیٹھا ہوا دیکھتا تو سوچتا کہ ساری زندگی دودھ و سوپ کرنے کے بعد، زندگی کی شام ایسی ہی پرسکون ہونی چاہیے۔ فریزر ہال کے وسط میں لیفت لائبریری اور صافین آرٹ گیلری کی چھت پر سرخ بادشاہ ڈھلتے سورج کی طرف منہ کیے ہوئے نظر آتا۔ دن بھر کے سفر کے بعد آگ برساتا، تھر ساماں سورج آہستہ آہستہ مغرب اُفتی پر چھٹکے لگتا۔ اب اس کی حدت میں کمی ہوتی۔ اس کی تھارت سرد پڑ چکی ہوتی مگر اس کے چہرے پر سرخوئی اب بھی نمایاں ہوتی کہ فطرت نے جو کام اسے سونپا تھا، وہ اسے بحسن و خوبی انجام دے کر غروب ہو رہا ہے۔ میں خود بھی اکثر سوچتا ہوں کہ جب میری زندگی کی شام ڈھلے گی تب کیا میرا دل بھی اسی قدر آسودہ ہوگا؟

اب بھی جب میری زندگی کے کسی موڑ پر کوئی اداسی آکر گھیر لیتی ہے۔ جب بھی دنیا کی مادی آسائشوں سے دل اکٹا سا جاتا ہے۔ دل میں کوئی وحشت گھر کرنے لگتی ہے تو میں فریزر ہال کے پام کے درختوں میں گھری اس بیچ پر آکر بیٹھ جاتا ہوں۔ یہ فریزر ہال کوئی آج کا تو ہے نہیں۔ اس کی تعمیر اگست 1863ء میں شروع ہوئی تھی اور مکمل 110 اکتوبر 1865ء میں ہوئی تھی۔ اس کا نقشہ ہنری۔ سینٹ کلینر والکنس نے بنایا تھا جب کہ تاج برطانیہ کی جانب سے مقرر کردہ سندھ ایڈمنسٹریٹر ہنری برائل فریزر جنہوں نے سندھی زبان کی ترویج میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ سندھ کی ترقی کے لیے کئی اہم اقدام کیے تھے۔ ان کے نام سے موسوم کیا گیا۔ تب سے یہ عوام و خواص میں پسندیدگی کا حامل رہا ہے۔ میں جب بھی وہاں پہنچتا ہوں تو پارک میں کھیلنے بچوں اور بچوں پر بیٹھے بوڑھے ہارپیسوں کو دیکھ کر اپنی ریزہ ریزہ بکھری ذات کو سینے کی کوشش کرتا ہوں۔ زندگی کی دو انجھاؤں کے درمیان کھوئے ہوئے غمی انسان کو تلاش کرتا ہوں۔ یہ بوڑھے اپنے بچپن میں شاید اسی بارش میں کھیلے رہے ہوں گے۔ یہ شوخ و شریر بچے ایک مدت کے بعد شاید اسی بارش میں، انہی بچوں پر بیٹھے، اپنے رشتہ زدہ جسموں کو سنبھالا دے رہے ہوں گے۔ وقت کا ریلا سیلاب کی مانند

آ کر گزر جاتا ہے اور اس سیلاب میں انسان کی پوری عمر بہہ جاتی ہے۔ اس سیلاب بلا خیز میں ہم جو کچھ آج گزار رہے ہیں، وہی تو بس ہمارا ہے۔ باقی سب وقت کا سیلاب بہا کر لے جاتا ہے۔

اس شام میں اپنے اداس لمحوں کو مٹانے وہاں گیا تھا۔ اس بار ایک لمبی مدت کے بعد یہاں آیا تھا۔ شاید چار یا پانچ برسوں کے بعد۔ اس شام جب میں نے اپنی ذات کو ٹھولا، تو حساب کتاب کا میزان ایک باہر چمک نکلا۔ میں نے سوچا کہ ابھی بہت سارے کام کرنے سے وہ مجھے ہیں۔ ابھی تو کسی کمر وارا لاغر جسم کو چار دینا پانی ہے۔ کسی زخموں سے پجور روح پر ستم لگنا پانی ہے۔ ابھی تو کسی افسردہ چہرے پر مسکراہٹ کا نقشہ چھانا پانی ہے۔ فطرت نے جو کچھ دیا ہے اسے واپس لوٹنا پانی ہے۔ چہرے کی چھبھاہٹ، بھولوں کی خوشبو، تپیلوں کے رنگ، چاند کی کرنیں، چھوٹوں کا تڑپنا، شوق کی سرخی، تاروں کی تڑی، سورج کی حرارت، بارش کی نرم جھم، مٹی کی مہک، ہواؤں کی سرکشیاں، درختوں کے سائے، چمنوں کی روشنی اور اپنے ہی ہم جنس دیگر انسانوں کی طرف سے دیا ہوا پیار۔ یہ سب کچھ لوٹنا ہے۔ میں اب تک فطرت کی مہربانیوں کا مقروض ہوں۔ میں اب تک اپنی دھرتی ماں کے بے شمار احسانوں تلے دبا ہوا ہوں۔

نہ جانے اور کتنی دیر میں انہی خیالوں میں ڈوبا وہیں بیٹھا رہا۔ سورج کب کا ڈوب چکا تھا۔ پارک میں پھیلے اندھیرے کو بکلی کے دوایک بلب دور کرنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ میں دھیرے دھیرے سروں میں ایک پرانا گیت گنگنا رہا، پارک کے گیت کی طرف چل دیا۔ گیت پر ورائی تھی۔ کبھی اس جگہ بکھیوں کی قطاریں کھڑی اپنی سوار یوں کا انتظار کیا کرتی تھیں مگر اب زمانہ بدل چکا ہے۔ کینٹ اسٹیشن سے آتی ہوئی یہ سڑک اداس اداس سی لگ رہی تھی۔ اس سڑک پر نواب آف جونا گڑھ کی کونھی بھی ہے اور امریکن کچر سینٹر بھی واقع ہے۔ آگے مسجد سے ذرا آگے، کچن کالونی ہے۔ میں خرابا خراب گاڑی آتی اور کنارے چلا جا رہا تھا۔ کبھی کبھار کوئی گاڑی آتی اور میرے قریب سے گزر جاتی۔ سڑک کے آخری سرے پر فلک ہاؤس کی عمارت تھی۔ اب یہ قائد اعظم میوزیم میں بدل گئی ہے۔ اسی چوراہے پر سامنے کی جانب ایک شادی ہال دکھائی دے رہا تھا۔ یہاں بھی بیلنس سینما ہو کر رہا تھا۔ میری نظر میٹرو پول ہوٹل کی عمارت پر پڑی جو اب بالکل

ویران پڑی تھی۔ کبھی اس ہوٹل میں بڑے بڑے افراد ٹھہرا کرتے تھے۔ 1950ء میں شاہ ایران ٹھہرے۔ 1955ء میں اردن کے شاہ حسین، 1952ء میں ہرناتیش آغا خان، اسپورٹس گریگر اور ایوارڈ رٹیریو کی کانفرنس کے وقت (مارچ 1956ء) امریکی وزیر مندوین۔ اگر یہ قوی ورثہ قرار نہ پانی ہوتی تو یہ کب کی ٹوٹ چکی ہوتی۔ سڑک عبور کر کے میں وینچ ریل ٹورنٹ کی طرف آ گیا۔ اندر سے موسیقی کی آوازیں آرہی تھیں۔ شاید کوئی فنکار اپنے فن کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

سامنے والی فٹ پاتھ پر ٹونے پر پھولوں کی دکان تھی۔ میں اسی طرف آ گیا۔ فٹ پاتھ پر چلتا چلتا شیزان ایکٹیس کی قریب سے گزرتا ہوا سروسز کلب کی باؤنڈری وال کے ساتھ ساتھ صاف ستھرے فٹ پاتھ پر چلنے لگا۔ فٹ پاتھ پر دو رنگ درختوں کی قطاریں۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اب میں ٹرنٹی چرچ تک آ گیا تھا۔ 1844ء میں برطانوی فوجیوں نے اسے قائم کیا تھا، اس کا ڈیزائن تیار کیا تھا۔ مینی میں مقیم کینٹن جون بل نے نہ جانے دل میں کیا سہمی کہ وہیں پر پڑی بیچوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔ سامنے کے چوراہے پر فوارہ چوک تھا۔ ٹرنٹک اس کے گرد گرد و دواں دواں تھا۔ میری نظر چرچ کے بلند ناؤں پر پڑی۔ شاید یہ ناؤں متوحش لگا ہوں سے اپنے کھوئے ہوئے بدلی لوگوں کو تلاش کر رہا تھا کہ جن کے دور میں اس چرچ کی تعمیر ہوئی تھی اور اس کے ناؤں کو اس لیے اتار دیا گیا تھا کہ یہ دور سے بھی نظر آ سکے یا پھر لوگ اس کی عظمت سے متاثر ہو سکیں۔ رات بھیک چلی تھی اور چرچ کے ناؤں کے اوپر سے چاند دھرتی کی طرف جھانک رہا تھا۔ ہوا کی نرم لہروں کے دوش پر بیٹھے یوں لگا کہ جیسے چرچ کی عمارت سے موسیقی کے مدھم سروں میں کچھ آوازیں کورس کی شکل میں تڑپ رہے ہیں۔ آوازیں دھیرے دھیرے واضح ہونے لگیں۔

گیت کی لے بلند ہونے لگی اور پھر نیچے یوں لگا کہ سامنے فوارہ چوک پر پانی ہر شے گردش کر رہی ہو۔ ارد گرد کی ہر شے جو رقص ہو۔ وہی رقص طاؤس۔ میرا جی چاہا کہ میں بھی اپنے محبوب شہر کی اس عظمت پارینہ کو سلام حق پیش کروں۔ کراچی جو میرا ہی نہیں بہت سے لوگوں کا محبوب ہے۔ اس کے حضور دیوانہ وار رقص کروں۔ مجھے یوں لگا کہ جیسے میرے اندر سے آواز آرہی ہو۔

جب بھی فطرت اٹھوٹتی لگتی ہے، رات گھدرا لگتی ہے، پرکھا بہار نکلتا لگتی ہے، ریلی پھوارم مجھ الہیے لگتی ہے اور مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو ہر سو پھیلنے لگتی ہے۔ جب دور بکس کی سندر سے بن میں، کسی بچوں پہاڑی کے دامن میں، کسی حسین سی وادی کی آغوش میں، کسی سرسبز جنگل کے خوشنما سے گوشے میں، کسی خوب صورت نیلی سی جمیل کے کنارے، کسی جلیقہ گھیرے جھرنے کے آس پاس، صبح سویرے، شام اندھیرے، دن کے اجالوں میں، چاندنی راتوں میں، مسرت بہاروں میں کوئی مورد اک عالم بے خودی دوسری مسرت میں کچھ ایسا دلہانہ رقص کرنے لگتا ہے کہ اس کے ساتھ کائنات کی ہر شے وجد میں آ کر جھومنے لگتی ہے۔ فطرت کا سر نہاں عیاں ہونے لگتا ہے، رجز حیات سے پردہ اٹھنے لگتا ہے۔ فطرت کا یہی رقص طاؤس ہے جو کائنات کا حسین ترین راگ ہے۔ ابدی الٹ کا ساز ہے۔ صبح ازل کا راڑ ہے۔ ہر ذی نفس کی زندگی میں یہ رقص فطرت چپکے سے در آتا ہے اور اپنی چھب دکھا کر چلا جاتا ہے اور پھر ایام رقص طاؤس کی صرف یاد باقی رہ جاتی ہے۔ یہی یاد سراپا حیات، متاع جاں بختی ہے، زندگی کے حسین افسانے کا رنگین عنوان بنتی ہے۔ جیون کی جنت کم گشت کا نشان بنتی ہے اور کائنات کا ذرہ ذرہ زبان حال سے کہنے لگتا ہے، می رقصم، می رقصم، می رقصم۔

☆.....☆

نئی دامن کہ آخر چوں دم دیداری رقصم مگر نازم بایں ذونے کہ بخش یاری رقصم (مثنوی ہارونی)

یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ چند ہی دنوں بعد کی کام کے سلسلے میں میرا صدر کی موبائل مارکیٹ میں جاتا ہوا۔ وہاں سے فارغ ہوا تو یاد آیا کہ بوہری بازار میں بھی ایک کام ہے سوچا اسے بھی منٹا چلوں۔ سو وہاں سے بوہری بازار کی جانب چل پڑا۔ منگر چورنگی سے کچھ پہلے جھانگیر پارک دکھائی دیا۔ نہ جانے دل میں کیا سہمی کہ میں پارک میں کھتا چلا گیا۔ اندر داخل ہوتے ہی دل و دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ دھول، مٹی، جھاد جھکار۔ ویرانی میرا منہ چڑا رہی تھی۔ ذہن میں ایک لمبی منزل کا شہر گونجنے لگا۔

یہ کیا جگہ ہے دوستو، یہ کون سا دیار ہے
حد نگاہ تک جہاں، غبار ہی غبار ہے
جہاں بھی خوب صورت روش ہوا کرتی تھی، وہاں
پتھر پڑے ہوئے تھے۔ سبز گھاس کی جگہ نشی اور اکھ کے
ڈھیر تھے۔ وہ حسین اور نفیس سا حوش جس میں بھی خوب
صورت لہجے تھے کرتی تھیں، گچھڑ اور دلدل سے اٹا ہوا تھا،
کیا یہ واقعی جہانگیر پارک ہے، وہی پیارا سا پارک کہ جہاں
ہم دوست تفریح کے لیے آیا کرتے تھے۔ میرے ذہن میں
ایک عجیب سی پہلی بچی ہوتی تھی۔ دفعتاً مجھے ایسا لگا کہ جیسے کسی
نے اس گھناؤنے منظر پر پردہ سا ڈال دیا ہے اور ایک دوسرا
منظر ابھرنے لگا ہے۔

جہانگیر پارک میں داخل ہوتے ہی دائیں ہاتھ پر
ایک خوب صورت ریستورانٹ ہے اور بائیں ہاتھ پر ایک
چھوٹا سا ریڈنگ روم، خوشنما روش پر سبک گامی سے چلتے
ہوئے، باتھوں میں ہاتھ ڈالے کر بچوں جوڑے، اس طرف
ایک فیملی بیٹھی ہے، بچے کھیل کود میں مصروف ہیں۔ ادھر
کونے والی بیچ پر دو پارسی بوڑھے وانگ اسٹیک پکڑے
خاموش بیٹھے پارک میں لوگوں کو کھوتے پھرتے دیکھ رہے
ہیں۔ آگے ایک جگہ پر بچوں کے جھولے پڑے ہیں۔ بچے
شوخ رنگ کے کپڑے پہنے خوشی سے جھولے جھول رہے
ہیں۔

پارک کے بچوں کے ایک خوشنما تالاب ہے۔ سفید
سنگ مرمر سے بنے اس حسین تالاب میں صاف ستھرا پانی
بھرا ہے جس میں سفید پٹیلیں تیر رہی ہیں۔ ایک ننھے سے چوٹی
پل کے ذریعے اس تالاب کے درمیان بنے ایک چھوٹے
سے جزیرے پر جانے کا بھی انتظام ہے۔ اس چھوٹے سے
جزیرے پر پتھروں کے رہنے کا انتظام ہے۔ ننھے ننھے خوش
رنگ پھولوں سے پورا جزیرہ مہک رہا ہے۔ شام کا اندھیرا
پھیلتے ہی پورا پارک بدلتی فیتھوں سے جگمگانے لگتا ہے۔

اچانک پردہ پھر سے ہٹ جاتا ہے اور میرے سامنے
وہی تباہ شدہ پارک آ جاتا ہے۔ میرے دل میں وحشتیں مگر
کرنے لگی ہیں اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ پارک میں
میکوں کے اس وحشتانہ رقص کے ساتھ کوئی نوحہ خوانی کر رہا
ہو۔ (لیکن اب اس کی قسمت دوبارہ سے مکمل ابھی ہے۔
دو ذرا پہلے نے خاص توجہ دی اور یہ پارک دوبارہ سے سج گیا
ہے) میں اس منظر اور یادوں کے سامنے سے گھبرا کر وہاں
سے نکل آیا۔ جہانگیر پارک سے متصل مسجد کے میدانوں سے

اذان کی صدا بلند ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا ہے شک ہر شے
کو فنا ہے اور ایک باقی رہنے والی ذات صرف ہمارے رب
کی ہے۔

اس روز جہانگیر پارک کیا گیا، یوں لگا کہ سوئے
ہوئے جذبات کو جگا دیا ہو۔ ماضی کی یادوں نے ذہن پر
ایسی پیلٹار کی کہ دل اداس اور افسردہ سا ہو گیا۔ پرانے
دوست، پرانے لوگ، پرانے دن بے تحاشا یاد آنے لگے۔
وہ سہانی خنک، وہ رنگین شامیں، وہ خوشگوار ہوائیں، وہ
چاندنی رات، وہ دوستوں کے تنگ گھومنا پھرنے، وہ مختلف
مقامات پر تفریح کے لیے جانے ماضی کی فلم ذہن کے پردے
پر چلنے لگی اور دل ان دنوں کو یاد کر کے سر دواہیں بھرے لگتا۔
نہ جانے کیوں میری جانے لگا کہ میں اس خوب صورت،
پرسکون کراچی کی سڑکوں پر بے خوف و خطر کوموں پھروں۔
بس یونی خواخواہ ان سامنے دنوں کی مانند شہر کی سڑکوں پر
چھل قدمی کروں۔ کئی دنوں تک دل میں یہی خواہش پار پار
چلتی رہی۔ ایسے میں نہ جانے کیوں مجھے اپنے ناول کا ایک
کردار داؤد کی یاد آنے لگا۔

ایوب خان کے مارشل لاء کے زمانے کا ذکر ہے کہ
جب بے حد حق ہو کر تھی۔ داؤد کو کسی اسمگلنگ کا سونا ایک
پارسی سے دوسری پارسی تک پہنچایا کرتا تھا۔ ایک روز غصہ
پولیس کے دو کارندے اس کے پیچھے لگ گئے۔ وہ صرف
بازار کی بجٹی ہوٹل کے پاس پہنچا تو اسے اندر فوراً بکرا نامی
ایک دوست بیٹھا نظر آیا ہے۔ وہ ہوٹل کے اندر چلا گیا اور
نورے بکرے کو ایک معقول معاوضے کے عوض اس بات پر
راضی کر لیا کہ وہ سونا اپنے گھر لے جائے تاکہ وہ بکڑا بھی
جائے تو سونا اس کے پاس سے برا آمد نہ ہو۔ اس کے بعد وہ
چائے پی کر ہوٹل سے باہر نکلا۔ غصہ پولیس والے یہی سمجھ
رہے تھے کہ سونا اب بھی داؤد کی ہی کے پاس ہے۔ وہ
اسے اس لیے نہیں پکڑ رہے تھے کہ دراصل وہ اس پارسی پر
ہاتھ ڈالنا چاہتے تھے جس کے پاس داؤد یہ سونا پہنچانے
جارہا تھا۔ جیسے ہی وہ ہوٹل سے باہر نکلا وہ دونوں اس کا
تقاب میں لگ گئے اور قصہ کچھ یوں آگے بڑھا۔

داؤد کی بھی کمال کا آدمی تھا۔ ہوٹل سے نکلنے ہی اس
نے اندازہ کر لیا کہ دونوں سادہ لباس والے اس کے پیچھے
لگ گئے ہیں۔ اس نے بھی سوچ لیا کہ اب وہ ان دونوں کو
خوب تنگی کا ناچ نہ جائے گا۔ اب وہ بے فکر تھا۔ مال اس نے
نورے کے حوالے کر دیا تھا۔ اسے اب ان سادہ لباس

دالوں سے کوئی ڈر نہیں تھا۔ گھوٹکی سے ہوتا ہوا وہ کاغذی
بازار میں نکل آیا۔ بازار تقریباً بند ہو چکا تھا۔ چند ایک
دکانیں کھلی تھیں، دکاندار مال سیٹ رہے تھے۔ وہ گلیوں
میں سے ہوتا ہوا اپنے بازار میں آ نکلا۔ یہاں سے وہ کھارادور
کی جانب چل دیا۔ پھر پنجاب کلب سے ہوتا ہوا ٹاورنگ
آ گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ دونوں اب بھی اس کے پیچھے
چلے آ رہے ہیں۔ اسے اپنی آنکھیں تھکا دوں گا دونوں یا جوج
ماجون کو، اس نے دل میں ٹھان لی۔

ٹاور سے وہ میلوڈ روڈ پر آ گیا جو اب آئی آئی
چندر نگر روڈ کہلاتا ہے۔ پہلے تو اس نے ارادہ کیا کہ کئی
انشین پر جا کر قہوڑا وقت گزارے مگر بعد میں ارادہ بدل کر
بولٹن مارکیٹ کی طرف آ گیا۔ کاروباری لوگ دکانیں بند کر
کے اب اپنے گھر لوٹ رہے تھے۔ کچھ لوگ سائیکل
رکشا میں بیٹھ کر اپنی منزلوں کی جانب روانہ ہو رہے تھے۔
کچھ لوگ ٹرام کے ذریعے سفر کرنے کو ترجیح دے رہے تھے۔
داؤد کی بھی صدر جانے والی ٹرام میں بیٹھ گیا۔

ٹرام..... ٹرام..... ٹرام کھتی بھاتی ہوئی ٹرام سڑک پر
چھٹی لوہے کی پہڑی پر دوڑنے لگی۔ ٹکڑی سے بنی ٹرام میں
ٹکڑی ہی سے بنی ہوئی بڑی بڑی پیچیں تھیں۔ ٹرام میں اچھا
خاصا رش تھا۔ ٹرام ڈینسو ہال، سٹی کورٹ اور لائٹ ہاؤس
سے ہوتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ جیسے جیسے اسٹاپ آتا، کچھ
لوگ اتر جاتے اور دوسرے لوگ سوار ہو جاتے۔ سعید منزل
تک ٹرام کسی حد تک خالی ہو چکی تھی مگر اب بھی چند ایک لوگ
کھڑے ہوئے تھے۔ بلازہ پر پھر کچھ لوگ سوار ہو گئے۔
نشا لا والے چوراہے پر جا کر ٹرام کارڈن روڈ پر مڑ گئی۔ پھر وہ
جہانگیر پارک سے ہوتی ہوئی انیسویں مارکیٹ کے قریب جا
رکی۔ یہاں سے وہ کیٹ انشین تک چلی گئی۔

داؤد دکی انیسویں مارکیٹ کے قریب اتر گیا۔
دونوں یا جوج مارجن بھی اس کے ساتھ ہی اترے تھے۔
اب وہ پھر پیدل مارچ کر رہا تھا۔ بوہری بازار کی اندرونی
گلیوں سے ہوتا ہوا وہ شاہراہ عراق پر آ گیا۔ اب اس کا رخ
وکنور روڈ کی طرف تھا جو اب عبداللہ ہارون روڈ کہلاتا
ہے۔ کوئے پر پیراڈا اتر گیا تھا۔ وہ نیمبا کے اندر گھسا اور
نیپے ہال میں فلم کے پسٹرز دیکھنے لگا۔ ابھی آخری خوش شروع
ہونے میں کافی وقت تھا۔ جیرا ڈائریسٹریا سے نکل کر وہ
وکنور پر آگے بڑھنے لگا۔ پریڈی اسٹریٹ اور وکنور روڈ
کے سنگم پر انڈر گراؤڈ راستے کے پاس واقع کیفے جارج

تک پہنچتے پہنچتے اسے اچانک بھوک کا احساس ہوا۔ اس نے
سوچا کہ کھانا کھایا جائے۔ وہ کیفے جارج میں مہس گیا۔
دونوں یا جوج مارجن باہر فٹ ہاتھ پر بنی لوہے کی
ریلنگ کے پاس کھڑے ہو گئے۔ سامنے چرچ کے ساتھ
فٹ ہاتھ پر فوٹو گرافروں کے سین میں سے کئی بند ہو چکے
تھے۔ کیفے جارج میں رش تھا۔ اس نے زسکی کوٹنے اور نان
منگوائے اور حوضے سے کھانے لگا۔ باہر یا جوج مارجن بے
چارے بھوکے کھڑے تھے۔ کالا چشمہ دونوں نے اب بھی
پہن رکھا تھا۔ سالے ڈاکٹر کو کی اولاد، مائی نیم از باٹر، جھو
باٹر، ایٹ ڈبل ڈیرسیون، داؤد کی سے سوچا۔ حال ہی
میں فلم ڈاکٹر نے کافی تھک کر چایا تھا اور ایٹ ڈبل ڈیرسیون
کو کافی شہرت ملی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد وہ کیفے جارج
سے باہر نکل آیا۔ کن گلیوں سے یا جوج مارجن کو دیکھتا ہوا
وہ ایک باہر وکنور روڈ پر گاڑن ہو گیا۔ اب اس کا رخ
بندر روڈ کی طرف تھا جس کا نام اب ایم اے جناح روڈ
ہے۔

وکنور پر روڈ کا یہ حصہ بالکل سنسان پڑا تھا۔ راستے
میں ڈاکٹر حبیب پٹیل کا اسپتال پڑتا تھا اور اس سے ذرا
آگے پارسیوں کا آٹس کدہ تھا۔ آخری کونے پر کیٹے پلیس
پڑتا تھا۔ سامنے والے فٹ ہاتھ پر چمچ علی ٹراموے
کارپوریشن کا گیراج اور دفتر تھا۔ وہ بندر روڈ سے دہلی
طرف مڑ کر پھر کارڈن روڈ والے چوراہے کی جانب چل
پڑا۔ روڈ کراس کر کے نازسٹیا پر پہنچ گیا۔ ناز میں پرانی
انڈین فلم ”دیدار“ چل رہی تھی۔ ٹرس، دلپ کمار اور
اشوک کمار کی فلم جو اس نے پہلے بھی کئی بار دیکھی تھی۔ اب
وہ بارہ آنے والے ٹکٹ کے لائنوں میں جا کھڑا ہوا تھا۔ اس
نے فیصلہ کیا کہ آج وہ یہ فلم ایک بار پھر دیکھے گا۔ یا جوج
ماجون کو بھی مجبوراً ٹکٹ لینا پڑا۔ فلم ختم ہوئی تو تماشا بین
اداس اور بسورنی ہوئی صورتیں بنائے ہال سے باہر نکلنے
لگے۔ فلم بھی بڑی ٹریڈی۔ سڑکوں پر سناٹا تھا۔ صرف
آخری شو دیکھ کر واپس جانے والوں کا رش تھا۔ کچھ لوگ
کچھوں میں اور کچھ بسوں میں جا رہے تھے۔ داؤد کی نے
سوچا سارا شہر نیند کے مزے لوٹ رہا ہے اور یہ دونوں
مستانے، بُری چھٹی کے لالچ میں پیدل چل چکے تھے۔
گئے ہیں۔ جیسے ہی داؤد اپنے ٹکٹے میں پہنچا۔ سادہ دالوں کو
احساس ہوا کہ ان کے ساتھ ”ہاتھ“ ہو گیا ہے۔ انہوں نے
بڑی چھٹی کا خیال ترک کر کے چارے ہی پر قناعت کرنے کا

کراچی کے سینما گھروں میں سے چند نام

☆ اسکالا سینما: بمبئی سے متعلق اسکالا سینما جواب بمبئی کے اندر آچکا ہے۔ اماں ٹاور کے بالمقابل 1970ء اور 80ء کی دہائی میں اس کا توئی بولتا تھا۔

☆ کیری سینما: اسے آگ لگائی گئی لیکن آتشزدگی کے بعد پھر سے تعمیر ہو گیا۔ ایم اے جناح روڈ پر نمائش سے نزدیک قائم یہ سینما اب غیر ملکی فلموں کی نمائش کے بھروسے پر چل رہا ہے۔

☆ ریڈیو سینما: اپنی شہرت کو کو صرف بالغان کے لیے مندرجہ شدہ فلموں کی نمائش پر سانس لے رہا ہے۔ اکل سر یا اسپتال کے بالمقابل یہ سینما 1970-80ء کی دہائی میں مقبول سینماؤں میں سے تھا۔

☆ افشاں سینما: 16 ستمبر 1977ء بروز جمعہ بابا اشریف وندیم کی فلم ”روڑ“ سے افتتاح ہونے والے یہ سینما جو حیدر مراد روڈ (مارٹن روڈ) پر واقع ہے بہت مقبول تھا۔

☆ بمبئی سینما: یہی اس شہرت کا حامل تھا کہ یہ آصف علی زرداری کے والد کا تھا۔ سی دیو پر واقع یہ سینما پاکستانی وغیرہ فلموں کی نمائش سے چل رہا ہے۔

☆ نسیم سینما: یہ سینما چل تو رہا ہے لیکن بہت اچھی حالت میں نہیں ہے اور ”بلی کلاس“ کی اردو پنجابی فلموں پر گزارہ کر رہا ہے۔

☆ فین سینما: افشاں کے نزدیک حیدر مراد روڈ پر واقع ہے۔ یکم اگست 1975ء میں پرویز ملک کی سپر ہٹ فلم ”پچپان“ سے افتتاح ہوا تھا۔

کراچی کے وہ سینما گھر جن کا وجود کھوکھلا

لیبرک: اسٹار، ناز، نشاط، نرس، جونی، شگیت، شمع، ریلک، ڈرائیو، شہناز، ڈرائیو، ان، قلعستان، علی بھائی، تھیر، امیر، ہالی، دوڈ، نوٹائی، کراؤن، سیمینک، ریڈر، محفل، انجمن، کوئین، کینک، ریو، الی، خاتم، ریو، لیسینو، لائٹ ہاؤس، ویش، نیٹرک، الفلاح، تاج محل، سپر، سوسائٹی، شیریں، شامیہ، شہانہ، صم، روبری، ریکس، قیصر، پرس، پلازہ، پیکر ہاؤس، پیراڈائز، پیکس، پکاڈلی، بی این ایس شفا، بی این ایس کراؤن، بی این ایس ہالی، بی اے ایف سینما، اوڈین، نورمل، مری ڈرائیو، ان، میجر، میر، لیبرک، ریکس، ادرا، نایاب، تھینک، نفیس، مرزا، معصوم، نگوری، لیبرٹی، کوہ نور، ارم، انجیریل، گلشن، گلزار، ہیکسی، فردوس، گوڈین، ایروز، پیکار، قسمت، قلیٹ کلب، فالگون، الف لیلہ، عرشی، چاندنی، دلشاد، لالازار، گلستان، ٹائیز، کینٹل، اسٹیل ٹاؤن کیوٹی، نگار، شبستان، لریٹ، نسرین۔

زمانے میں یہ شہر واقعی اس قدر خوب صورت ہو گا کہ آج بھی لوگ اسے یاد کرتے ہیں۔ اس کا گوارہ کہ جہاں ہر مذہب اور برادری کے لوگ آپس میں محبت سے رہا کرتے تھے۔ اسی پرسکون کراچی کے مناظر میرے ذہن کے پردے پر اپنا عکس دکھانے لگے اور میں ماضی کے حسین و لطیف مناظر میں کھوسا گیا۔

رات دھیرے دھیرے بجتی جا رہی ہے۔ دن تو قدرے گرم رہا لیکن شام سے جو غنڈی پروائیاں چلتی شروع ہوئی ہیں تو کافی راحت سی محسوس ہونے لگی ہے۔ دیے بھی جانی ہوئی گرمیاں ہیں اور اب بجلی کی کٹنگ کا بھی احساس ہونے لگا ہے۔ مطلع صاف ہے اور چاند بھی پورا ہے۔ ماما پاری اسکول، ماما پاری کراؤن اسکول کی بھی کی۔ کیا شاندار تاریخ ہے۔ ذہن کو ٹولیں، تاریخ کو چھائیں تو کیسے کیسے واقعات نظر آئیں گے۔ اسے یکم اپریل 1918ء کو جوشید نوسروانی مہتہ نے تین شخصیات کے تعاون سے قائم کیا۔ پہلے اسے بانی دیر باجی اسکول میں شروع کیا پھر جون 1919ء میں ایک بڑی عمارت میں لے آئے جو عبداللہ ہارون روڈ کے کارنر پر ہے۔ یہ عمارت مامانٹن کے نام سے پہچانی جاتی ہے۔ موجودہ عمارت میں 17 جنوری 1920ء میں منتقل ہوئی۔ یہ عمارت 26 جنوری 1925ء

ہمارے جس جو کراچی کی پہچان ہیں ان کی جگہ بنی عمارتیں تعمیر ہو رہی ہیں۔ عمارتیں تو اینٹ اور پتھر سے بنی ہوتی ہیں۔ بدل بھی جائیں تو اتنا فرق نہیں پڑتا لیکن اس شہر کا رویہ، یہاں کا ماحول، یہاں کی فضا تک تبدیل ہوئی ہے۔ وہ شہر جو ابھی بھجوں کا بچن ہوا کرتا تھا اب نفرتوں کا جہنم بن گیا ہے۔ جہاں بھی مذہبی رواداری ہوا کرتی تھی، وہاں اب فرقہ واریت نظر آنے لگی ہے۔ پرانے دنوں کی یادوں نے کچھ اتنا اثر دے کر دیا کہ دل اندر ہی اندر رونے لگا۔ کہتے ہیں کہ یاد ماضی عذاب ہے۔ لوگ گزرے بچپن، بچتی جوانی کو یاد کر کے ملوں اور افسردہ ہو جاتے ہیں۔ پرانے فنی گانے اس لیے سنتے ہیں کہ وہ ان کے سنہرے دور کی یادگار ہوتے ہیں۔ میں بھی عرصہ دراز تک یہی سمجھتا رہا ہوں مگر پچھلے دنوں ایک پرانا گانا سنا اور اس گانے سے اتنا مسحور ہوا کہ کئی دنوں تک روڈ انڈر پاس کو وہی گانا سنتا رہا۔ میں نے دل میں سوچا کہ یہ گانا تو میں نے آج سے پہلے بھی نہیں سنا۔ نہ بچپن میں نہ جوانی میں، نہ زندگی میں اس سے پہلے بھی۔ پھر یاد ماضی والا نظریہ کیا ہوا۔ یعنی بات ہے کہ چونکہ گانا اچھا تھا اس لیے پسند آیا تو پھر کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ کراچی کے سنہرے دنوں کو یاد کرنے والے اس لیے ان دنوں کو یاد کرتے ہیں کہ یہ دن واقعتاً اچھے ہوں۔ اس

اور اب اچھے کراؤن اسکول جانا ہے۔

مجھے احمد رشدی کے گانے میں اور داؤد دگی کی سرشتی میں جہاں کراچی کی سیر کی یکسانیت نظر آ رہی تھی، وہیں مجھے ان دونوں میں ایک شدید تضاد بھی محسوس ہو رہا تھا۔ احمد رشدی کا کیت رجائیت سے بھرپور تھا جب کہ داؤد دگی کی آواز ہر گدی میں باسیٹ تھی۔ اس کی وجہ شاید زمانے کا فرق ہے۔ احمد رشدی کے گانے میں نظر آنے والی عمارتیں اب بھی موجود ہیں جیسے ریڈیو پاکستان، بولٹن مارکیٹ، کشنی بلڈنگ، قمر ہاؤس وغیرہ لیکن داؤد دگی کی چہل قدمی والی جھنجھیں ختم ہو چکی ہیں جیسے پیراڈائز سینما، کیفے جارچ، پارسیوں کی عمارت گاہ اور ناز سینما۔ ایسا کیوں؟ میرے ذہن میں یہ سوال کھلنے لگا۔ آخر کیا کیوں؟

کافی دنوں تک میں اس بات پر سوچتا رہا۔ میرے ذہن میں اس کا یہی جواب آیا کہ مہدی ظہیر نے اپنا کیت کراچی کے سنہرے دنوں میں لکھا تھا۔ جب کراچی ایک خوب صورت شہر تھا اور داؤد دگی کی کہانی کراچی کے پُر آشوب ترین دور میں لکھی گئی۔ جب کراچی دنیا کے بڑے ترین شہروں میں شمار ہونے لگا۔ حسین ماضی اور کربلا کا حال۔ زمانے کا، تہذیب کا تضاد۔ کراچی کا حسین ماضی دھیرے دھیرے بھینک حال میں غرق ہو رہا ہے۔ وہ

فیصلہ کر لیا اور پھر اگلے ہی لمحے داؤد دگی گرفتار ہو چکا تھا۔ گرفتار ہونے کے بعد داؤد دگی کا کیا حال ہوا؟ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ میرے ذہن میں تو بس اس کی ٹراموے کی سیر اور ٹاور سے لے کر ناز سینما تک کی بھاگ دوڑ تھی۔ میرا ذہن ماضی کی ان ہی گزرگاہوں میں اٹکا ہوا تھا۔ میرے ذہن کے کسی خاموش گوشے سے دھیمے سروں میں کسی گیت کی لے ابھرنے لگی۔ رفتہ رفتہ یہ آواز میری سماعتوں میں واضح ہونے لگی اور پھر میرے ذہن میں ایک پرانا گیت کو جھنجھنے لگا۔

ہندو روڑ سے بھاڑی

میری چلی ہے کھوڑا گاڑی

باہو جو جانا فٹ پاتھ پر.....

پچاس کی دہائی میں احمد رشدی کی آواز میں یہ گانا بے حد مقبول ہوا تھا۔ اس گانے کے بول اور اس کی زمین مہدی ظہیر کی تھی۔ یہ گانا یاد آتی ہی میرے ذہن میں ماضی کا سنہرا دور جگمگ کرنے لگا۔ گیت کی موسیقی کے ساتھ وہ کھوڑے کی ٹاپوں کی آواز اور پھر کھوڑا گاڑی کی گھنٹی کا سہیلا پن۔ مجھے یاد آیا کہ جب صبح سویرے سڑکوں پر فرمائش چلتی شروع ہوا کرتی تھیں تو ان کی گھنٹیوں کی آواز سنا کر دیکھتے اور آدھے سوئے آدھے جاگے ذہن میں یہ بات آتی کہ کب ہو چکی ہے



میں جتنے والی قلموں کے رنگین پوسٹرز اور بڑی بڑی تصاویر صاف نظر آئیں۔ ان کو دیکھ کر فلم کے متعلق تو اعزاز نہیں لگایا جاسکتا البتہ ہیروئینوں کے چہرے دیکھ کر دل خوش کیا جاسکتا تھا۔ یہ علاقہ اب تک یوں بھی جاگ رہا تھا کہ ابھی ان سینما گھروں میں فلم کے آخری شو چل رہے ہیں جواب کچھ ہی دیر میں ختم ہونے والے ہیں۔

مارٹن روڈ کے اگلے سرے پر گوڈین سنیما کے پاس بھی کچھ روشنی نظر آرہی ہے۔ گوڈین سنیما کافی پرانا سنیما گھر ہے۔ تقسیم سے پہلے انگریزوں کے زمانے میں تعمیر ہوا ہے۔ اس میں انکس فلمیں اور بدی فلمیں دونوں ہی لگتی رہتی تھیں لیکن یہ ہالی ووڈ کی فلموں کے لیے زیادہ مشہور تھا۔ اس کے سین کے سامنے شہر علی ٹراٹس کے داخلہ روڈ پر پھوٹا۔ دن بھر شہر میں چلنے والی ٹراٹس رات کو اسی ڈپو میں پارک کر دی جاتی تھیں۔ گوڈین کے سامنے ہی ذرا اوپر کو جو چھوٹی سڑک پلازا سنیما کی طرف جا رہی تھی اس کے کونے پر ایرانی ہوٹل تقریباً بند ہوئے کھڑا۔

قیصر سنیما کا شمار نارتھ سے سنیما گروں میں ہوتا تھا۔ ساتھ ساتھ اور مقبول نہیں تھا۔ ایروڈ اور ویسٹ بنگال میں ہوا ہے۔ اس کا افتتاح مختصر مفاصلہ جناح کے دست مبارک سے ہوا تھا اور اس میں پہلی فلم انڈیا کی ”ہائل“ پیش کی گئی۔ یہ فلم تھی۔ ہائل میں دیپ کمار اور نرگس نے کام کیا تھا اور اس کے گانے بے حد مقبول ہوئے تھے۔ تقسیم کے بعد سب سے پہلا سنیما جو تعمیر ہوا تھا وہ جوہلی سنیما ہے جو بنگال میں مشہور ہے۔ شاید اسی سنیما کی وجہ سے سامنے والے فلٹنس جوہلی کو رازد کے نام سے مشہور ہو گئے تھے بلکہ یہ پور علاقہ اسی نام سے مشہور تھا جوہلی سنیما کا پلندہ بالاد اور کافی دور سے نظر آتا تھا۔

ریوالی سینما نسبتاً نیا تھا۔ اس کی مشینری بھی کافی جدید تھی۔ اس کی وجہ شہرت اس کا پردہ تھا۔ عموماً سینما گھروں میں اسکرین کے اوپر کپڑوں کے جو پر دے لٹکے ہوتے ہیں وہ ان میں بائیں کھلتے ہیں لیکن ریوالی کا پردہ اوپر سے نیچے پورے نیچے سے اوپر کھلتا بند ہوتا تھا۔ یہ لوگوں کے لیے ایک نئی چیز تھی۔ ویسے بھی مشینری اور عمارت نئی تھی تو یہ بھی لوگوں کی وجہ کا باعث تھا مگر اس کے ساتھ اچھی فلولں کا یہاں نمائش کے لیے پیش ہونا بھی اس کی مقبولیت کا سبب تھا۔

قلم کا آخری شوختم ہونے ہی والا تھا، اس لیے ان سنیما لہروں کے آس پاس بکھیاں، سوار یوں کے انتظار میں

میں مکمل ہوئی۔ پہلا سبق طالبات نے یکم اپریل 1925ء میں شروع کیا گیا جو یکم اپریل 2018ء میں ایک صدی پورا ہونے کا جشن منایا جاتا ہے گا۔ اس کے برابر میں وائی ایم سی کے زیر انتظام خواتین کے ہوش کے احاطے تاریکی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ YMCA کی بنیاد 1876ء میں رچی گئی تھی۔ پھر کراچی میں بھی اس کی شاخ قائم ہوئی۔ قیام پاکستان سے قبل یہ نیشنل کاؤنسل اب وائی ایم سی انڈیا، برما، سیلون کے زیر نگرانی تھی۔ 1956ء میں یہ خود مختار بنادی گئی۔ خواتین کے لیے بنائے گئے ہاسٹل ایکی گورنمنٹ کے ممبرانے کے لیے بہترین قرار دیا جاتا ہے مگر اس وقت اس کے کیاؤنڈ میں کھتے درختوں کی شاخوں پر چاندنی سوئی پڑی تھی۔ صرف ایک کنبس، اور بھر کا جائنہا بندر روڈ بھی سکوت میں ڈوبا ہوا تھا۔ بھی کبھی کوئی گاڑی سن سے گزر جاتی تو چند لھوں کے لیے خاموشی اس ارتعاش پیدا ہوتا ہے۔

دور تک سناٹا ہے اور اسٹریٹ لائٹس کی روشنی میں بندر روڈ بھی سکوت میں ڈوبا ہوا ہے۔

اسٹریٹ لائسنس کی روشنی میں بندر روڈ کے پتھر لے کر ٹرام کی پٹریاں دور تک چمکی نظر آ رہی تھیں۔ کبھی کوئی بھی وہاں سے گزرتی تو کوھڑے کی پاپوں سے پورا روڈ گونجنے لگتا تھا۔ بندر روڈ کے اس طرف مارشمن روڈ پر لیکن اب تک چمک چمک نظر آ رہی ہے۔

کوئٹہ لال چمن کباب ہاؤس کے بڑے سے قوے پر سے ایک تال کے ساتھ کٹنا کٹ کی آواز گونج کر اس بات کا اعلان کر رہی تھی کہ ابھی رات کے اس وقت بھی لوگوں کو جوگ لگ سکتی ہے اور وہ کٹنا کٹ کھانے آ سکتے ہیں۔ ویسے بھی ریوایا کا یہ کباب ہاؤس شہر کے اوّلین کٹنا کٹ میں شمار ہوتا تھا۔ کٹنا کٹ والے کے برابر میں دودھ والے کی دکان بھی رونق تھی۔ بڑے سے کڑاے میں دودھ گرم ہو رہا تھا۔ ایک طرف کسی پھٹی جا رہی تھی۔ لوگ کسی کی گردن بھر کر مری مری رہے تھے کچھ جوان کسی کی کر جان بنارے تھے۔

اگرچہ جو کچھ ان روز اور روزہ گزاروں کی کہیاں خاموشی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ ان کے فلیٹس کے کمین گہری نیند کے برے لے رہے تھے۔ بس اسی کھلے میں روشنی نظر آرہی تھی۔ راولی سنیما، اردو سنیما اور پھر ان کے بالکل سامنے سرسینما کے برقی قہقہے روشن تھے۔ گوان میں سے آدھے عادیئے گئے تھے، پھر بھی اتنی روشنی ضرور تھی کہ ان سنیماؤں

برائن جوں کیا زبردست گٹار سے تھا۔ اس کی انگلیاں جب گٹار کو پھیرتیں تو فضا میں نقش کی طرح رقص کرنے لگتا۔ وہ مشہور میوزیکل بینڈ **rolling stone** کا بانی تھا۔ اس بینڈ نے پوری دنیا میں پھیل چھا دی تھی۔ برائن 28 فروری 1942ء میں انگلینڈ میں پیدا ہوا تھا۔ وہ بچپن ہی سے بیمار رہا کرتا۔ اس کو سانس کا مرض تھا جو آخر تک اس کے ساتھ رہا۔ اس کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا۔ اس کی ماں ایک پیاٹو نیچر میچس جو اسکولوں میں بچوں کو پیاٹو سکھایا کرتی۔ ماں سے اس نے پیاٹو بجانا سیکھا تھا۔ جب وہ سترہ برس کا تھا تو اس کے باپ نے برتھ ڈے گفٹ کے طور پر اسے ایک گٹار دیا تھا۔ یہاں سے اسے گٹار میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ اسکول میں اس کی ملاقات ایک لڑکی سے ہوئی جو اس کی دوست بن گئی اور اس دوستی کے نتیجے میں اس لڑکی نے ایک بچے کو جنم دیا جس کا نام لوئیس رکھا گیا لیکن برائن کی زندگی میں اب تنہا شامل ہونی شروع ہو گئی تھیں۔ اس نے اپنا شہر چھوڑ دیا اور اپنا گٹار لے کر انجانی منزلوں کی طرف چل پڑا۔ اس نے بہت عرصہ خانہ بدوشوں کی طرح گٹار بجا بجا کر گزارا۔ وہ سڑکوں اور فنٹ ہاتھوں پر گٹار بجا کر اپنا گزارا کیا کرتا۔ آوارہ گروہوں جیسی زندگی تھی۔ شاید اسی لیے اس نے اپنے بینڈ کا نام ”رولنگ اسٹون“ رکھا تھا۔ اسی آوارگی کے دوران لندن میں کچھ اور اسی جیسے میوزک دوست اس سے آئے۔ ان کے پاس اپنے گٹار تھے۔ اب ضرورت ایک ڈرم بجانے والے کی تھی۔ ایک ڈرم جو نی چپ مین مل گیا جس کے پاس نہ صرف اپنا ڈرم سیٹ تھا بلکہ وہ ہمیشہ اپنی جیب میں سگریٹ کا پیکٹ بھی رکھا کرتا جو ان دوستوں کے کام آتے۔ اس طرح یہ گروپ بن گیا اور انہوں نے مختلف کنسرٹس میں بجانا شروع کیا۔ برائن ہی نے اس گروپ کو رولنگ اسٹون کا نام دیا تھا۔ وہی اس بینڈ کے لیے نفع بھی لکھا کرتا۔ اس کی موت بہت پر اسرار انداز میں ہوئی تھی۔ وہ اپنے مکان کے سوئٹنگ پول میں ڈوب کر مر گیا تھا۔ یہ واقعہ 1979ء کا ہے۔ اس وقت اس 37 سالہ موسیقار کی عمر صرف 27 سال تھی۔

☆☆

کھڑی تھیں۔ دور جانے والے فلم بین خصوصاً فنی کی ساتھ آئے ہوئے، ترجیحاً انجی بکلیوں میں پیئہ کر جاتے تھے۔ یہ بکلیاں بھی ایک طرح سے شاہی سواری تھیں۔ فنی اگر پردے والی ہو یا دھوپ ہو تو اس کے اوپر سائیاں سا تان دیا جاتا تھا۔ وگرنہ شام کے بعد یہ سائیاں ہٹا دیا جاتا تھا۔ بھی کے چلے پر نرم ہوا کے تھیرے بہت بھلے لگتے تھے۔ نو جوان لڑکے انکو چوان کے ساتھ اوپر والی سیٹ پر بیٹھنا پسند کرتے تھے۔ کوچوان کبھی کبھار چابک تھما کر کھوڑے کو چھتا تھا تو انھوں نے ان سے بچنے کی آواز نکال کر کھوڑے کو کسی نامعلوم زبان میں نہ جانے کیا کچھ کہنے کی کوشش کرتا تھا۔ کبھی میں ایک کھٹی بھی ہوتی تھی جو راستہ صاف کرتے یا آگ کی گاڑی کو تھمے دینے کے لیے بھائی جاتی تھی۔ کبھی کے دونوں طرف دو لائیں تھابتیاں بھی راست کے وقت جلائی جاتی تھیں تاکہ اندھیرے میں چل سکے کہ کبھی آ رہی ہے۔

اس دن قصر میں تو فلم انشاز جیب کی کوئی برائی فلم چل رہی تھی۔ اس لیے شوقم ہونے پر کچھ زیادہ لوگ نہیں نکلے تھے۔ انکو چھڑے ہی تھے جو موجد مٹی کرتے پیدل ہی روانہ ہو گئے تھے۔ چند ایک بندر روڈ کی طرف چل دئے تھے جہاں آخری تینیں مسافروں کو لے جانے کے لیے کھڑی تھیں۔ ایروڈ پر بھی جو فلم چل رہی تھی۔ اس کا آخری ہفتہ تھا اس لیے اس میں بھی زیادہ رش نہیں تھا۔ اصل مجمع ریوالی سے برآمد ہوا تھا کہ جس میں فلم انشاز وحید مراد کی فلم زیر نمائش تھی وحید مراد جو چاکلیٹی ہیرو کے نام سے مشہور ہے۔ مقبولیت کے لحاظ سے وہ سب سے اوپر تھا۔ لوگ اس کے دیوانے تھے اس کی پہلی فلم اولاد تھی جس میں وہ نیز سلطانہ کا بیٹا تھا، اس فلم کا ایک گانا

تم قوم کی ماں ہو سوچو ذرا
عورت سے ہمیں یہ کہنا ہے
اولاد تمہاری دولت ہے
تعلیم تمہارا گہنا ہے

بے حد مقبول ہوا تھا۔ اس فلم میں وحید مراد کے کام کو بے حد سراہا گیا تھا لیکن اصل شہرت اسے فلم ارمان سے ملی تھی۔ ارمان میں وہ دنیا کے مقابل ہیرو تھا۔ اس فلم کا گانا ”اسکیل نہ جانا ہمیں چھوڑ کر تم“ بے حد مقبول ہوا تھا۔ اس فلم نے بھی مقبولیت کے نئے ریکارڈ قائم کیے اور وحید مراد فلم بیٹوں کے دلوں کی دھڑکن بن گیا تھا۔ اس کے بالوں کا اشاکل بھی فیشن بن گیا تھا اور نو جوان اسی قسم کے بال بنانے

لگتے تھے۔ خواتین میں بھی یہ اتنا ہی مقبول تھا۔ اس کی فلم دیکھنے کے لیے خواتین کافی تعداد میں آتی تھیں۔ خواتین میں اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ جب اس کا گانا فلم میں آتا ہے تو خواتین سینما ہال میں بیٹھے لٹائی تھیں۔ چمن کر کے لٹائی بیٹھے سینما ہال کے فرش پر گرتے تھے اور بچے وہ سکے لوٹنے لگتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اچھے سینما گھر اس کی فلم لانے کے لیے ہر وقت کوشاں رہتے تھے۔

ریوالی پر یہ آخری شو بھی باؤس فل گیا تھا۔ اب شوقم ہوا تھا اور لوگ شاداں و فرجاں سینما ہال سے باہر آرہے تھے۔ فلم اچھی تھی اور ان کے پیسے وصول ہوئے تھے۔ مردوں اور عورتوں کی تعداد قریب قریب یکساں تھی۔ لوگ بکلیوں میں بیٹھ کر چارے تھا اور کچھ پیدل ہی جارہے تھے۔ خواتین کے جھنڈے کے جھنڈ سینما ہال سے نکل رہے تھے اور یہ خواتین مختلف ٹولیوں کی شکل میں اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو رہی تھیں۔ یہ خواتین باہم مل کر اپنے پروگرام بنا کر فلم دیکھنے آ جاتی تھیں۔ عموماً سات آٹھ پڑوسی مل کر فلم دیکھنے کا پروگرام بناتی تھیں۔ ان کے ساتھ مردوں کا آنا بھی ضروری نہیں تھا۔ یہ جھنڈ کی شکل میں آتی تھیں۔ فلم دیکھ کر

میرے سے باتیں کرتی ہوئی اپنے گھروں کو روانہ ہو جاتی تھیں۔ یہ خواتین زیادہ تر بندوقوں میں ہوتی تھیں لیکن بہت سی ایسی بھی ہوتی تھیں جو صرف چادر اوڑھنا کافی سمجھتی تھیں۔ رات آدمی بیت چکی تھی تو کیا ہوا۔ سڑکوں پر سناٹا ہے تو کیا ہوا۔ کوئی مرد ساتھ نہیں تو کیا ہوا۔ ان خواتین کو کسی بات کا ڈر، خوف نہیں تھا۔ راستے میں نہ ان کو کوئی چھیڑتا تھا اور نہ کوئی بدصالح ان کا راستہ روکتا تھا اور نہ کوئی لفٹا ان سے پرس یا زور لوٹنے کی جرات کرتا تھا۔ یہ خواتین چہرے پر مسکراہٹ، دل میں اطمینان لیے شہر کی سڑکوں پر ایسے چل رہی تھیں جیسے اپنے گھر کے کمرے میں ٹہل رہی ہوں۔ اوپر آسان پر چلکا ہوا چاند ان کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ اس کی چاندنی کے نور میں اضافہ سا ہو جاتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ خاموشی کی زبان میں اس شہر کے امن و امان کو خراج تحسین پیش کر رہی ہے۔

اسے شہر کے لوگوں کی تمجیدیں یادیں، میں سمجھی اس شہر کی جان تھا۔ اس کا مان تھا۔ اس شہر کی روایتوں کا نشان تھا۔ تہذیبی اقدار کی پہچان تھا۔ میں تمہارا اپنا نشاط تھا۔ میرے نام سے آج تک یہ چوک مشہور ہے۔ نصف صدی سے بھی

تروٹی سپر یو ایک پیاری بچی جس نے پورے ہندوستان میں دھوم مچا دی تھی۔ اس نے بے شمار کمرشل میں کام کیا۔ اس کے علاوہ اس نے ایتنا بھ چٹن جیسے اداکار کے ساتھ فلم ”پا“ میں کام کر کے اپنی صلاحیت اور خود اعتمادی ثابت کر دی تھی۔ اس کو پیارے ”رنا گل“ کہا جاتا تھا۔ اس کا انتقال ایک ہوائی حادثے میں نیپال میں ہوا تھا۔ اس وقت وہ صرف 14 برس کی تھی۔ یہ حادثہ 2012ء میں ہوا تھا۔ اسی سے اس کی پیدائش کے سال کا اندازہ لگالیں۔

☆☆

جیسا کا ڈیروف ایک خوب صورت لڑکی جو امریکن پائلٹ تھی۔ 5 مئی 1988ء کو امریکا میں پیدا ہونے والی ایسی لڑکی جس نے سات سال کی عمر میں جہاز اڑا کر ورلڈ ریکارڈ بنایا۔ اس کو بچپن ہی سے پائلٹ بننے کا شوق تھا۔ وہ فضا میں اڑتے ہوئے جہازوں کو بہت شوق سے دیکھا کرتی۔ اس نے خد کر کے پائلٹ بننے کی کوشش کی اور ایک جہاز اڑاتے ہوئے حادثے کا شکار ہو کر چل بسی۔ اندازہ کر لیں۔ پیدائش 1988ء اور موت کا سال 1996ء یعنی اس کی زندگی کل سات سال تھی۔ سات سال کی عمر میں اس نے جہاز اڑایا اور اسی کم عمری میں حادثے کا شکار ہو کر اس دنیا سے چل بسی۔ اس نے چونکہ ابھی زندگی کی ابتداء ہی کی تھی۔ اسی لیے اس کی زندگی کے واقعات بہت کم ہیں۔ جس عمر میں اس کی موت ہوئی ہے وہ عمر کھلوں سے چھلنے کی تھی۔

☆☆

جیا خان، ایک خوب صورت، پڑھی لکھی اور شوق اداکارہ۔ اس کی پیدائش 20 فروری 1988ء کو نیویارک میں ہوئی تھی۔ اس نے لندن میں پروڈکشن پائی۔ اس کے بعد ہالی ووڈ کی فلموں میں کام کیا۔ پھر وہ ایک لڑکے کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھی۔ بہر حال اس نے بہت کم فلموں میں کام کیا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ یہ آگے چل کر ہالی ووڈ میں تہلکہ مچا دے گی لیکن موت نے اس کو تہلہ نہیں دی۔ وہ مر گئی۔ موت کے وقت اس کی عمر صرف پچیس سال تھی۔ اس کی موت 2013ء میں ہوئی تھی۔

☆☆

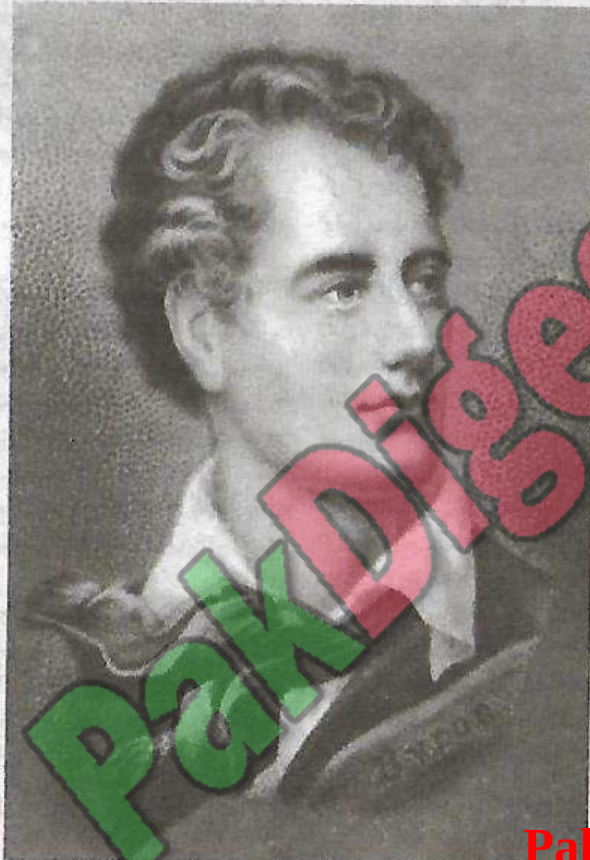
باغی

زویا اعجاز

وہ جدت کا پرستار تھا، روایت سے بغاوت کو اس نے جزو ایمان سمجھ لیا تھا، اس کی سوچ تھی کہ زندگی کے تقاضوں پر پورا اترنے کے لیے پرانی، فرسودہ روایتوں کا جہل کھرچنا ضروری ہے۔ انہوہ میں ایک ہونا بے وقوفی ہے، انفرادیت پر جگہ نمایاں ہو، ہر جگہ الگ سُر گونجے۔ اسی وجہ سے وہ باغی بن گیا تھا۔

وہ معاشرے سے بغاوت کا حامی تھا

وہ ننھا سا لڑکا بہت سیسے ہوئے انداز میں کمرے کے باہر کھڑا تھا۔ اس کی نیکیوں آنکھوں میں بہت سی الجھنیں اور سوال نظر آ رہے تھے۔ آوازیں بلند ہوتی جا رہی تھیں اور ہر لفظ اس لڑکے کا دل خنجر کی طرح زخمی کر رہا تھا۔ وہ دونوں افراد اس کی زندگی میں بہت اہم تھے اور وہ ان سے بہت محبت کرتا تھا۔ ان کا اس طرح بحث و مباحثہ اس کے لیے کوئی نیا منظر نہیں تھا لیکن ہر بار وہ پہلے سے کمرے کے اندر دو افراد کے جھگڑنے اور بحث کی



کے سینما گھروں کا ایک جدید سینما، شاید سیٹوں کی نمائش کے لحاظ سے شہر کا سب سے بڑا سینما تھا۔ کئی خوب صورت فلمیں یہاں نمائش کے لیے پیش ہوئیں۔ رفتہ رفتہ فلموں کا معیار گرتا گیا۔ فلم بینوں کا معیار بھی گرتا گیا۔ یہ پھر بھی سانس لیے جا رہا تھا۔ لوگوں کو ان کے کھڑے ہوئے مزاج کے ساتھ سستی تفریح مہیا کر رہا تھا۔ کھیل ختم، پیسا ختم، بند ہو گیا بے چارہ۔

میں اپنے سامنے ناز کو دیکھتا ہوں۔ سوچتا ہوں اچھا ہوا اس نے اپنا روپ بدل ڈالا۔ شاپنگ سینٹر بن گیا۔ صحن والوں کی دنیا میں فن والوں کا کیا کام۔ کیا زمانہ تھا اس کا بھی۔ ناز جو کبھی رادھا ٹائیکز ہوا کرتا تھا۔ شاندار فلمیں نمائش کے لیے پیش کرتا تھا پھر مالکان بدلے تو کام بھی بدل گیا۔ ٹریڈ بائی ٹریڈ سائیکل نے وارد ہا ٹائیکز کو ناز ٹائیکز کا نام دیا اور اس شہر نے اسی ناز سینما کے فٹ پاتھوں پر ولولہ خیز مناظر بھی دیکھے۔ جب فلم ”آن“ اس تھیٹر پر نمائش کے لیے پیش کی گئی تو محض اس فلم کے ٹکٹ لینے کے لیے لوگ رات سے یہاں بستر بچھا کر سویا کرتے تھے کہ دن میں انہیں ٹکٹ کی لائن میں آگے جگہ مل سکے۔ کیا شوق تھا، کیا جنون تھا پھر اسی ناز پر وحید مراد، محمد علی اور ندیم کی فلمیں دھوم مچاتی رہیں۔ فلم انڈسٹری کے زوال نے جہاں فلموں کا ستیا ناس کیا وہیں سینماؤں پر بھی آفت آنی شروع ہوئی اور ماضی کا یہ سینما، رادھا ٹائیکز سے ناز ٹائیکز کا سفر کرتا ہوا شاپنگ سینٹر بن گیا اور اس کا نام شہر کی تاریخ میں ماضی کا حصہ بن گیا۔

حتیٰ کہ ادھر سر آغا خان روڈ پر انکل سر یا اسپتال کے سامنے واقع ریو سینما نے فحش فلموں کے سلسلے میں بدنامی کما لی، پھر بھی میں نے اپنا معیار گرنے نہیں دیا۔ آخر وقت تک فلم بینوں کو اگر فلمی کے ساتھ کوئی دیکھنی ہوتی تو ان کی نگاہ انتخاب مجھ پر ہی پڑتی تھی لیکن اب میں بھی خاموش پڑا ہوں۔ برباد اور پامال پڑا ہوں۔ اور اس شہر کی بے وقا شاموں میں اپنے ماضی کو یاد کر کے چپ چاپ روتا ہوں۔

کچھ دیکھتے خواب سجائے ہوئے
کچھ چھپتی یادیں بسائے ہوئے
میں ریزہ ریزہ بکھر گیا
کوئی دیکھنے والا ہے کہ نہیں

زیادہ عرصے تک میں اس شہر کے لوگوں کو نشاط و سرور کے لمحے بانٹا رہا۔ ہر روز مجھے ماندے لوگ میری چھت کے تلے، تفریح کی چند گھڑیاں بتانے آیا کرتے تھے۔ شہر کے لوگوں کی من پسند اور سستی تفریح مہیا کرنا میرا کام تھا اور اپنے ہم عصروں میں میرا اپنا ایک مقام تھا۔ میں اس شہر کے اس کے زمانے کا رفیق ہوں، میں اس شہر کی تاریخ کا حصہ ہوں۔ میں اس شہر کے ہر پرانے باسی کے ذہن پر نقش ہوں کیونکہ میں ان کے کئی سنہرے خوابوں کا عکس، اس شہر کے ماضی کا دفتر بپ رقص ہوں۔ ہاں، میں نشاط ہوں۔ شہر کے فوٹو گر کو!

اپنے اندر کی آگ بجائے بھانے کے یہاں تک لے آئے۔ وہ اس طرف کبھی رہے۔ تم جنت ذرا سخت جان نکلا کہ اب تک موجود ہے اور شہر کے لوگوں کا دل بھلانے اب بھی پتلی تماشا پیش کیے جا رہا ہے۔ اپنے اسی ڈوبی ساؤنڈ سسٹم کے ساتھ کہ جس نے بھی شہر میں دھوم مچا رکھی تھی، یاد ہے، جب انگریزی فلم ایٹش میڈ میڈ ورلڈ کے شروع کے منظر میں وہ بڑے میاں کچھ لوگوں کو خزانے کا پتا بتانے کے بعد آخری جگہ لیتے ہیں۔ ان کے پاؤں کی ٹھوکر سے قریب پڑا ہوا تین کا ڈبہ لڑکھڑاتا ہوا چٹائی پھروں سے نیچے کی طرف لڑکھٹنے لگتا ہے۔ تب کبھی کا ساؤنڈ پورے والیوم سے کھول دیا جاتا تھا اور سینما ہال قہقہوں سے گونج اٹھتا تھا۔ لوگ بڑے میاں کے مرجانے پر نہیں اپنے ڈر جانے پر کھیانے ہو کر ہٹا کرتے تھے۔

یہی وہ کبھی تھا کہ جہاں آؤں درجے کی ہالی ووڈ فلموں کی نمائش ہوا کرتی تھی۔ گریگری پیک اور عمر شریف کی مشہور دی میکنا ز کوئلہ زیادہ سے ناں۔ اس فلم کا ٹائٹل سوگن اولڈ ٹرکی بزرگ بھی یاد ہوگا اور پھر اس فلم کے آخری مناظر، وہ لمبی تیز و ملی چٹانوں کے سایوں کا سرکنا اور پھر پھاڑی درے کا نمایاں ہونا کہ جہاں خزانے کے انبار لگے ہوئے تھے اور پھر زوردار زلزلہ اور ہر شے کا تباہ ہو جانا۔ کتنی زبردست فلم تھی۔ ایسی ہی اور مزید فلموں کی ایک پوری فہرست ہے جنہیں دیکھ کر لوگ اپنی ذہنی گفتگو کو چند منٹوں کے لیے سہی بھول جایا کرتے تھے اور پھر ایک فلم دی گڈ وی بیڈ اینڈ دی اگلی، اس فلم کا بیک گراؤنڈ میوزک جو آج بھی فلموں اور ڈراموں کے سٹپس والے مناظر میں بجایا جاتا ہے۔ کیا یہ سب بھلا دیا گیا ہے۔

اچھا ہوا بھول گئے۔ پرنس کو بھی بھول گئے۔ کراچی

زیادہ دھمکس کرتا۔

”مجھے اس وقت تمہارے ساتھ کی بہت ضرورت ہے۔“ مرد کی آواز مزید بلند ہوئی۔

”میں نے کب تمہارا ساتھ نہیں دیا؟“ عورت چلائی۔

”مجھے کچھ پیسے درکار ہیں ورنہ مسئلہ پیدا ہو جائے گا۔“ مرد نے التجائی کی۔

”میں اپنا سب کچھ تو تم پر برباد کر چکی ہوں۔ اب مزید کیا چاہیے تمہیں؟“ عورت پر اس التجا کا کوئی اثر نہ ہوا۔

”اس مرتبہ آخری بار میری مدد کر دو۔“

”میں بالکل فلاح ہو چکی ہوں۔ میرے پاس کچھ بھی باقی نہیں بچا۔“

”تھوٹ بولتی ہو تم! تمہارے پاس اب بھی بہت دولت ہے۔“ مرد غصا ہوا۔

”اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو یونہی سہی ورنہ حقیقت تم خود بھی جانتے ہو۔ انجان بننے کی کوشش کر رہے ہو۔“ عورت نے بے نیازی مگر سختی سے کہا۔

مرد کو اب اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اس نے فوراً ہینترا بدلا اور لب و لہجے میں مضاس بھر لی۔ ”دیکھو کتنی بات سمجھنے کی کوشش کرو تم معاملہ کی سبھی نظر انداز کر رہی ہو۔“

”مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سننی۔“ وہ ڈھٹائی سے بولی۔

”حق عورت! تم نے اپنی ضد نہ چھوڑی تو سب کچھ تباہ ہو جائے گا۔“

”پہلے بھی تو سب کچھ برباد ہی ہے۔“

”میرا نہیں تو جارج ہی کا خیال کرو! اس نے دھمکایا۔

”اب تک صرف اسی کا تو سوچا ہے لیکن اب میں تمہارے مطالبات پورے نہیں کر سکتی۔“

”ٹھیک ہے! اس صورت میں مجھے یہاں سے جانا ہو گا۔“

”تم پہلے بھی میرے ساتھ کب ہو جان!! تمہاری موجودگی بھی میرے لیے کسی سزا سے کم تو نہیں رہی۔“ عورت نے دکھ سے کہا۔

اگلے روز جان اس نئے لڑکے کے پاس آیا اور کافی دیر تک اسے گلے لگاتے سر سہلا تا رہا۔

”میں چاہ کر بھی یہاں نہیں رہ سکتا میرے بچے! کتنی نے میرا ساتھ نہیں دیا۔ میں تمہیں بہت یاد کروں گا۔“ وہ اسے محبت سے کہہ کر چلا گیا۔

اس روز کے بعد جارج کو وہ بھی نظر نہ آیا۔ جارج بہت افسردہ رہنے لگا۔ ہر روز صبح اٹھ کر وہ جان کا چہرہ تلاش کرتا اور ہر رات سوئے سے قبل بھی اس کی آنکھیں باپ کی دید کی خطرناک بینکوں کی دیکھ بھی واپس نہ آیا۔

جارج کے ننھے سے ذہن میں ایک ہی بات نقش ہوئی کہ اس کی باپ خندی اچھی اور ظالم ہے۔ کیترائن کی وجہ سے اس کا باپ کبھی واپس نہیں آسکا اور اسی لمحہ سے جارج اور کیترائن میں نفرت کا رشتہ استوار ہو گیا۔ ایسی نفرت جس کی لپیٹ میں آکر بہت سی زندگیوں برباد ہوئیں اور بہت سے وجود بے محول ہو گئے۔

☆.....☆

جارج اپنی کم عمری کی وجہ سے ماں کے لیے خود ساختہ اندازے لگا کر زندگی بھر بھاتا رہا۔ وہ اپنے باپ کو بہت مثالی سمجھتا تھا۔ اس کی یادداشت میں ایک بار کا جھگڑا زندگی سے بھر پور شخص رہتا تھا جو اس سے بہت پیار کرتا تھا اور اس کو اپنے آباؤ اجداد کی کہانیاں سنایا کرتا تھا۔ اصل قصوں سے وہ ہمیشہ متاثر رہتا۔

کیترائن جان بائرن برطانوی بحریہ میں افسر تھا۔ وہ ایک معصوم بھی تھا۔ اسے ”میسز جیک“ کے نام سے بھی پکارا جاتا۔ جان خاندانی طور پر بحریہ سے وابستہ تھا۔ اس کے والد بھی نائب امیر البحر تھے۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ جب بھی کسی سمندری سفر پر روانہ ہوتا موسم کمزور بدلتا اور بہت طوفانی روپ اختیار کر لیتا۔ اسی وجہ سے وہ Foul Weather کے نام سے بھی مشہور تھے۔

کیترائن جان بائرن ایک عیاش طبع شخص تھا جس نے زندگی میں محنت کے سوا سب کچھ کیا۔ اس کی پہلی شادی ایک دھواں دھار معاشیے کا نتیجہ تھی۔ امیر رابرٹ ڈارسی کی بیٹی ایمیلیا کو اپنے دام میں پھنسانا اس کے لیے بالکل مشکل ثابت نہیں ہوا تھا۔ رابرٹ ڈارسی برطانوی امراء کے طبقہ میں ارباب (تیسرے درجے کا امیر) تھا۔ ایمیلیا شادی شدہ تھی۔ اس کا شوہر ”کارمارٹن“ کا نواب تھا۔ دولت ان کے گھر کی باندی تھی اور اسی دولت کی وجہ سے ہی جان اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ ایمیلیا نے اپنے شوہر سے طلاق لے کر جرن 1779 میں جان سے شادی کر لی۔ اسے گمان تھا کہ جان ہمیشہ اسے اپنے ہاتھ کا چھالا بنا کر رکھے گا اور ان کی محبت بھی سدا قائم رہے گی لیکن ایسا نہ ہوا۔ جان کا رویہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اچھا نہ ہوتا گیا۔ وہ اسے ذاتی لذت دیتا۔ کیونکہ جہان ایک وحشی اور جنگلی انسان تھا۔ ایمیلیا نے اس دوران دو لڑکیوں کو جنم دیا۔ ایک بیٹی زیادہ

فرحہ زندہ نہ رہ سکی۔ دوسری بیٹی آگسٹا بھی عجیب و غریب حادثات اور گھٹنے ہوئے ماحول میں پرورش پانے لگی۔ ایمیلیا نے زندگی بہت ناز و نعم میں گزاری تھی۔ وہ اپنے والدین کی انگوٹھی اور لڑکی۔ محبت کے نام پر کھایا گیا جھوکا اور جان کا رویہ اسے ایک گہرے روگ میں مبتلا کر گیا۔ وہ نرم و نازکی عورت یہ سب برداشت نہ کر پائی اور پانچ سال میں ہی موت کو گلے لگا بیٹھی۔

☆.....☆

جارج اپنے کھیل میں مصروف تھا۔ وہ پیدائشی طور پر ایک ایسی پیاری میں مبتلا تھا جس نے اس کی زندگی کو بہت سی مشکلات میں ڈال رکھا تھا۔ اسے ClubFoot کا عارضہ تھا۔ اس مرض میں پاؤں کی ہڈیاں صحیح پروان نہیں چڑھتیں۔ ایڑھی ٹکوسے سے بہت بڑی ہو جاتی ہے اور پنچہ ملنے سے بڑھتی کی طرف بڑھتا رہتا ہے۔ اس جسمانی نقص کا علاج تو ممکن تھا لیکن جارج کی بد قسمتی یہ تھی کہ اسے اچھی طبی سہولیات نہ ملیں اور یہ مرض بڑھ گیا۔

وہ اپنے اس نقص کی وجہ سے خاصا بیزار اور چڑچڑا بھی رہتا۔ ساری لڑکیوں کو بھاگ دوڑ کرتے دیکھتا تو دل میں نفرت اور حسد کی ایک آگ پیدا ہو جاتی۔ چھوٹی سی عمر ہی سے اس کے ذہن میں بہت سی انجھٹیں تھیں۔ وہ اکثر اپنے آپ سے سوال کرتا رہتا۔

”میں دوسرے لڑکوں کی طرح کھیل کود میں حصہ کیوں نہیں لے سکتا؟“

”میری ماں دوسری عورتوں کی طرح چست چالاک اور نرم خو کیوں نہیں ہے؟“

”میرا باپ واپس کیوں نہیں آیا؟ وہ مجھے بھی اپنے ساتھ ہی لے جاتا۔“

اس طرح کے کئی سوال اس کے ذہن میں کھلبلی مچاتے اور وہ خود ہی ان کے جواب تلاش کرنے کی کوشش کرتا رہتا۔ اس دن وہ اپنا کھیل چھوڑ کر کیترائن سے کچھ سوال پوچھنے کے لیے اسے ڈھونڈنے لگا۔ وہ ہمیشہ کی طرح سیڑھیوں میں بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر غصہ، نفرت اور بیزاری تھی۔ جارج کے لیے یہ رنگ نہیں تھے۔ اس نے ماں کو ہمیشہ ایک روپ میں دیکھا تھا۔ وہ غلامیں تک رہی تھی۔ جارج نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا لیکن جب کچھ نظر نہ آیا تو غصے سے پاؤں پیچ کر ایک جانب دھکی کر پیٹھ پٹیا۔ وہ کیترائن کو غور سے دیکھتے رہتا جانتا تھا۔ وہ صرف یہ بھی کہ وہ جانتا جانتا تھا کہ خلا

میں اسے کیا نظر آ رہا ہے؟ کیترائن اپنے پاس کھڑے جارج کی حرکات سے لاعلم نہیں تھی لیکن وہ اس کے کئی سوالوں کا جواب نہیں دیتا جانتی تھی اس لیے نظر انداز کیے ہوئے اپنے ماضی اور جان کے حلقے سوچ سوچ کر گڑھتی رہی۔

کیترائن کوئی معمولی عورت نہیں تھی۔ وہ ولیم ہارن کی بیٹی تھی۔ ولیم ایک معزز سیاستدان اور نواب تھا اور ریچلرڈ میں لکاسٹر کاؤنٹی کی نواب نسل میں چوتھا جانشین تھا۔ کیترائن نے زندگی میں بے شمار دولت دیکھی تھی۔ اس کی بد قسمتی کا آغاز اس وقت ہوا جب جان سے شادی کی حامی بھر لی۔ ابتدا میں وہ اس کی فطرت بالکل نہ سمجھ سکی اور اس کی محبت کو ہی بچ مان کر خود غریبی کا شکار رہی۔

شادی کے بعد جان نے اسے بہت محبت دی اور اپنا خاندانی نام تک تبدیل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ کیترائن اس فیصلے سے بہت خوش تھی۔ اس کی ایک عزیزہ نے اپنے خدشات بیان کیے۔ ”کیترائن! کیا تمہیں یقین ہے کہ جان تم سے ٹھیک ہے؟“

”ہاں وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے اور میرے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔“

”وہ تو مجھ میں بھی نظر آ رہا ہے کہ اس نے اپنا خاندانی نام تک تبدیل کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“ اس نے طنز کیا۔

”اس میں اتنا جھپٹا نہیں کیوں ہو رہی ہو۔ کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ وہ مجھ سے بہت غلط ہے۔“ کیترائن نے اترا تے ہوئے کہا۔

”نہیں میری بہنا! یہی تو اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ شخص ابن الوقت اور موعج پرست ہے۔ خاندان اور نام تو انسان کی پہچان ہوتے ہیں۔ جو شخص اسے تبدیل کرے گا وہ بہت خطرناک ہوگا۔ اس لیے اب بھی وقت ہے اعتبار کی اپنی آنکھوں سے اتار دو۔“

”تم مجھے میرے شوہر سے گمراہ کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ شاید تم حسد میں مبتلا ہو رہی ہو۔ تمہاری یہ باتیں مجھے اس سے بدگمان نہیں کر سکتیں۔“ کیترائن کو اپنے شوہر پر بہت اعتماد تھا۔

کچھ عرصہ مرنزا تو جان نے اپنے سر کا خاندانی نام اپنا لیا اور جان کو ڈن بائرن بن گیا۔ کیترائن بہت خوش تھی۔ یہ خوشی زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی۔ جلد ہی جان نے اپنے اصل رنگ دکھانے شروع کر دیے۔ وہ دولت کا بچاری تھا اور پیسہ یا اس کا لہجہ تھا۔ عیاشی اس کی رگ رگ میں بھری تھی۔ آنے

والے وقت نے یہ بات ثابت کر دیا کہ اس نے بیوی کے اثاثہ جات پر قبضہ برقرار رکھنے کے لیے ہی اپنا نام تبدیل کیا تھا۔ وہ بہت شاطر انسان تھا۔ چلے ہاتھوں سے پیسے اکٹھا کر کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ لڑکھنوں میں زندگی گزارنے کی وجہ سے بال بال مقروض تھا۔ قرض خواہوں کے مطالبات جب حد سے بڑھ جاتے تو کیتھرائن سے پیسے وصول کر کے انہیں ادا کر دیتا۔ دو سال ہی کے عرصہ میں اسے اپنی جائیداد فروخت کرنی پڑی۔ شادی سے قبل اس کے اثاثہ جات 23,500 پاؤنڈ تھے لیکن شوہر کے قرضوں کی ادائیگی کے بعد نوٹ یہاں تک آچکی کہ اس جائیداد کو فرسٹ سے اسے صرف دو تڑھ سو پاؤنڈ سالانہ کا منافع باقی رہ گیا۔ کیتھرائن کی آنکھوں سے محبت کی پٹی اتاری تو یہ بھی ایک حقیقت نظر آئی کہ جان کو اس سے بھی کمی محبت نہ تھی۔ وہ ایک جوگن نما انسان تھا جو اس کی ساری دولت چوس گیا تھا لیکن اپنے اطوار اب بھی نہ سدھارے اور قرض لینے کا سلسلہ بھی شیطان کی آنت کی طرح پھیلتا چلا گیا۔

کیتھرائن اس آگاہی سے ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئی۔ اس کا پندار ڈھی ہو گیا اور دھوکے کے طور پر وہ سردہ اور بے حس ہو گئی۔ قرض خواہوں کے مطالبات جب حد سے بڑھے تو وہ شوہر کے ساتھ 1786 میں فرانس جا کر درپوش ہو گئی۔ فرانسیسی سرزمین ان کے رشتے میں کوئی خاص تبدیلی پیدا نہ کر سکی ماسوائے اس بات کے کہ جارج کی پیدائش کی خبر نے اس کی طبیعت میں ہلکی سی تبدیلی پیدا کر دی اور وہ شوہر کے بد اطوار کو بھول کر آنے والے سہمان کے خیالات میں گم رہنے لگی۔

تھوڑا وقت اور گزر تو اس کے دل میں پھر سے اپنی آبائی سرزمین کی بزرگ پیدا ہونے لگی۔ وہ اپنی اولاد کو انگلستان میں جنم دینا چاہتی تھی اس لیے اس نے شوہر کو مجبور کر کے واپس پر آمادہ کیا۔ جان نے بھی وہی مصالحت کے تحت اس کی بات مان لی اور 1787 میں وہ وٹن واپس آ گئے۔

اگلے سال 24 Holles Street میں 22 جنوری 1788 کو ان کے گھر ایک بہت معصوم نقوش اور من موئی سی صورت والے بچے نے جنم لیا۔ بچہ بہت خوبصورت تھا۔ کیتھرائن اسے دیکھ کر نہال ہوئے گی۔ اسے 'سینٹ میری لیون' بیڑن چرچ میں چھم دے کر 'جارج گورڈن بائرن' کا نام دیا گیا۔

جارج کی پیدائش کے بعد بھی حالات میں کوئی سدھار نہ آیا۔ دو سال بعد وہ بیٹے کے ساتھ Aberdeenshire

منتقل ہو گئی۔ زندگی بہت کسہری کا شکار تھی۔ کچھ عرصہ بعد جان بھی انہی کے پاس آ گیا اور ایک بار پھر لڑائی جھگڑوں کا آغاز ہو گیا۔ ان دنوں وہ کوئیز اسٹریٹ میں رہ رہے تھے۔ جان اپنے قرض خواہوں سے بہت پریشان تھا اور ایک جھگڑے کے بعد اس نے دوبارہ فرانس منتقل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

فرانس میں ایک سال گزارنے کے بعد وہ جب وطن میں جہلا ہو گیا۔ اٹھارہویں صدی میں یہ ایک مہلک مرض تھا۔ اپنی عیاش اور قرض میں ڈوبی زندگی سے اسے 1791 میں نجات مل گئی۔ موت کے وقت اس کی عمر صرف پچیس برس تھی۔

بیز جیوں میں پہنچی کیتھرائن کو شوہر کے فریب اس سے ملی اذیت اور اس کی موت یاد آتی تو وہ ہسٹریائی کیفیت میں جہلا ہو گئی۔ "تم پر خدا کی لعنت ہو جان! تم مرنے کے بعد بھی جہنم میں جلو گے۔ تم نے میری زندگی برباد کر دی۔ تم مرنے کے بعد بھی اسی سکون میں نہیں رہو گے۔"

بلند آواز سے چیختی ہوئی کیتھرائن بھول گئی کہ جارج بھی یہ سب سن رہا تھا۔ جارج کو اس وقت اپنی ماں سے شدید نفرت محسوس ہوئی۔ اس کی خند احقانہ پن اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے ہی جان ان سے دور چلا گیا تھا اور اب بھی وہ اسے گالیاں دے رہی تھی بدو عاؤں سے نواز رہی تھی۔

جارج گاؤن بائرن نے سوچ لیا کہ اس کی ماں ایک 'اچھی عورت' بالکل نہیں تھی۔ وہ ماں سے مزید نفرت کرنے لگا۔

☆.....☆

جارج اور کیتھرائن ایک ہی گھر میں رہتے تھے لیکن ذہنی اور قلبی طور پر ایک دوسرے سے بہت دور تھے۔ کیتھرائن کو بچنے کے طور طریقوں اور خوبصورتی میں جان کی جھلک دکھائی دیتی۔ وہ اس کی ہٹ دھرم طبیعت سے بھی عاجز تھی۔ جارج ایک مشکل بچہ تھا۔ اسے سنبھالنا آسان نہیں تھا۔ اپنے جسمانی نقص کی وجہ سے وہ چڑچڑے پن میں مبتلا رہتا۔ کیتھرائن نے فیصلہ کیا کہ وہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دے۔ وقت گزرتے گئے ساتھ ساتھ اس کے مزاج میں سدھار آ جانے لگا۔

دوسری جانب جارج کو اپنی ماں کے عجیب و غریب اطوار دیکھ کر بہت غصہ آتا۔ وہ اپنے ہی مزاج کی عورت تھی۔ کبھی بہت خوش ہوتی، کبھی ٹھنڈی دکھائی دیتی اور کبھی اس پر عجیب اداسی تیزاری اور ہسٹریائی کیفیت طاری ہو جاتی۔ اس حالت میں وہ خود کو کای کرنے لگتی، غلامی جتنی ہوتی جانے کیا بڑبڑاتی رہتی اور پھر چیخ و پکار کرتے لگتی۔ جب وہ خوشوار مڑو میں ہوتی تو جارج اس کے پاس چلا جاتا اور مختلف

چلے ہاتھوں سے اپنے باپ کے بارے میں جاننے کی کوشش کرنے لگتا۔

"وہ اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔" کیتھرائن نے ایک روز اسے حقیقت سے آشنا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

"کیوں؟ وہ اگر نہیں آئیں گے تو مجھے ان کے پاس بھیج دیں۔"

"تم بھی اس کے پاس نہیں جا سکتے۔ وہ مرج چکا ہے۔"

"لیکن وہ بوڑھے تھے نہ ہی بیمار۔ ایسا کیسے ممکن ہے؟"

"وہ بیماری تو تھا۔ اس نے اپنی بیماری مجھے بھی منتقل کر دی۔ اس نے خود ہی اپنا گلا گھٹا لیا۔" کیتھرائن نے اس کے ماضی کی حادثات کا حوالہ دیتے ہوئے کہا۔

جارج اس کی یہ بات مکمل طور پر سمجھ نہ سکا اور اس کے ذہن میں ایک اور غلط فہمی نے جگہ بنائی کہ اس کے باپ نے اپنا گلا گھٹا لیا تھا اور اس کی ذمہ داری بھی صرف اس کی ماں ہی تھی جس کے دھوپ چھاؤں جیسے مزاج نے نوبت یہاں تک پہنچا دی۔

کیتھرائن کے لیے اب جارج کو سنبھالنا اور اس کی پرورش کرنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی مدد کے لیے ایک اسکالر لڑکی سے گھرے کر بطور آپارکھ لیا۔ یہ فیصلہ بھی درست ثابت نہ ہوا۔ گھرے اخلاقی طور پر ابھی خاتون نہ تھی۔ وہ جارج کی طرف مائل ہو گئی اور اسے بھی اپنی طرح اخلاقی پستیوں کا عادی بنانے لگی۔ جارج کبھی بھی ماں سے اتنا نزدیک نہیں تھا کہ اپنی زندگی میں آنے والے مسائل اور ایسے حادثات کا ذکر بھائی طلب کرتا۔ وہ بخوشی اس اخلاقی گمراہی میں جہلا ہو گیا۔ کیتھرائن کو ذہنی اذیت دینے کا کوئی بھی موقع وہ ہاتھ سے جانے ہی نہ دیتا چاہتا تھا۔

جارج بائرن کی زندگی کو گمراہیوں کے حوالے کرنے والا دوسرا شخص اس کے اپنے ہی خاندان سے تھا۔ لارڈ گھرے ڈی روٹھین، کیتھرائن کا رشتہ دار تھا اور اس کا بھی وہ اخلاقی پستی کا شکار تھا۔ نو سال کی عمر میں اس نے جارج بائرن کا بچپن اور معصومیت اس سے چھین لی، اسے بے شمار نفسیاتی الجھنوں میں مبتلا کر دیا۔

جارج کو اپنے گھر میں گھرے کی آمد و رفت بالکل پسند نہ تھی لیکن کیتھرائن اس کا استقبال خوشدلی سے کرتی۔ شوہر کے دینے گئے قریب اور اس کی وفات سے وہ احساسِ محرومی کا شکار تھی اس لیے لارڈ گھرے کے فطرت کا خندہ پیشانی سے سامنا کرتی۔ اسے اس بات کا علم نہ تھا کہ اس کی یہ حرکات بچے کو مزید

نفرت میں مبتلا کر رہی ہیں۔ وہ یہی سمجھتی تھی کہ جارج اور لارڈ ایک دوسرے کو بہت پسند کرتے ہیں۔ اس کا مجرم جارج ہی نے ایک روز چٹکانا چور کر دیا۔ لارڈ گھرے ان کے گھر میں موجود تھا۔ اس نے جارج کو بہت محبت سے اپنے پاس بلا دیا۔ "جارج! امیرے پیارے بچے! کیسے ہوتم؟ میں تمہیں اور کیتھرائن کو اپنے گھر دعوت کرتا تھا۔" وہ کیتھرائن کے کمرے میں اس کی اچانک آمد پر کھٹک گیا تھا۔

"آئندہ اس شخص کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا کرو۔" جارج کی نسیلگوں آنکھوں میں نفرت کی تپش تھی۔

"کیا تمہیں میری یہاں آمد پسند نہیں آتا؟" لارڈ نے ایک بار پھر محبت جتائی۔

جارج نے غصے سے فرش پر چوکا اور حقارت سے اسے گھورتا وہاں سے چلا گیا۔

"اس کی بد نظیری پر میں تم سے معذرت چاہتی ہوں۔ وہ بہت بے ہودہ ہو چکا ہے۔ ہر وقت ناک میں دم کیے رکھتا ہے۔" کیتھرائن نے بات سنبھالی۔

لارڈ گھرے کے جانے کے بعد اس نے جارج کو آڑے ہاتھوں لیا۔ "تمہیں مہمانوں سے برتاؤ کی تحریز نہیں رہی؟"

"مجھے وہ شخص سخت ناپسند ہے۔"

"لیکن کیوں؟ وہ تو تم سے بہت پیار کرتا ہے۔"

"مجھے اس شخص سے گھن آتی ہے۔ اگر کبھی موقع ملا تو میں اسے قتل کر دوں گا۔" جارج کے چلانے پر کیتھرائن بھی غصے میں آ گئی۔ کچھ دھوکے کی کٹی شراب نوشی بھی اپنا رنگ بھانے لگی تھی۔

"تم لنگڑے چھوکرے! اپنے باپ ہی کی طرح خود غرض ہو۔ تمہیں بھی رشتوں کی قدر نہیں۔"

"میں لنگڑا چھوکرہ نہیں ہوں۔ میں لنگڑا شیطان ہوں۔ تمہارے جسم کی طرح دماغ پر بھی حریفی چڑھ چکی ہے۔ میرے ساتھ آئندہ مت الجھنا۔" وہ ترکی بڑی بولا۔

ممکن ہے ان ماں بیٹے کا یہ رشتہ لنگھو اور انداز غیر فطری محسوس ہو لیکن حقیقت بھی یہی تھی کہ وہ دونوں ہی ایک غیر فطری زندگی جی رہے تھے۔ اپنی اپنی ذات میں نفرت کے بلند قلعہ تعمیر کیے وہ انہی قلعوں میں قید ہو چکے تھے اور اب باہر آنے کا راستہ بھی بھول گئے تھے۔

جارج بائرن خیر و شر کا الجھا ہوا ملاپ تھا۔ اس کی فطرت میں یہ دونوں رنگ اس قدر ملا چکے تھے کہ ان کی الگ الگ تیز کرنا ناممکن تھا۔ ایک وقت میں وہ خوش مزاج، خوشی و شہارت کا عکس نظر آتا تو دوسرے ہی لمحہ نفرت خود سری اور سرکشی جھلکنے

گنتی۔

یہی حال کیتھرائن کا بھی تھا۔ وہ بیٹے سے بہت محبت کرتی تھی۔ اپنے پیچیدہ حالات کے باوجود اسے انگلستان کے بہترین تعلیمی ادارے Harrow میں داخل کروانے لیے جوڑ توڑ کر دے۔ تھی لیکن دوسری جانب اس کی سرکشی کیتھرائن کی روح میں گئے دشمنوں سے لگائی تو وہ مزید بکھر جاتی۔ اسی اذیت اور دکھ میں وہ اس پر پختہ چلنے لگتی۔ کیتھرائن کی یہ نفسیات بیٹے کو اس سے بہت دور کر دیتی تھی۔ اپنے دکھوں پر ماتم کرتی اس عورت کو یہ احساس ہی نہ ہو سکا کہ وہ اگلوٹے بیٹے کو خود رنجی پودے کی طرح پروان چڑھا رہی ہے۔ وہ اس کی پرورش تو کر رہی تھی لیکن تربیت میں مکمل ناکام تھی۔ جارج کی تربیت کا ذمہ سے کرے جیسی عورت کے سپرد کردہ ہر سکون ہو چکی تھی مگر یہ نہیں جانتی تھی کہ جن باتوں میں بیٹے کو سونپا ہے وہی اسے گمراہی کے رستوں پر لگتی تمام کر چلنا سکھاتے ہیں۔

☆.....☆

کیتھرائن اور جارج بائرن کی زندگی یونہی گتائی میں گزر جاتی لیکن پھر ایک ایسا حادثہ ہوا کہ ان کی کامیابی پلٹ گئی۔ 1798 میں ریچرڈ ہل کا پانچواں نواب موت سے ہکٹار ہو گیا۔ وہ بھی طبیباً بد فطرت تھا۔ اس کی وفات کے بعد یہ تاج جارج گورڈن کے سر پر بٹھا قرار پایا۔ جارج کی عمر اس وقت دس سال تھی۔ دور و زدیک میں صرف وہی دراشت کا حقدار تھا لہذا انیس مئی 1798 کو اسے ریچرڈ ہل کا چھٹا نواب قرار دے دیا گیا اور اس روز سے دنیا اسے لارڈ بائرن کے نام سے جاننے لگی۔

تمام جائے اور جاہ ادا اس کے حصہ میں آگئیں۔ تو پتھم شائر میں واقع آبائی گھر Newstead Abbey بھی اسی کے قبضہ میں آ گیا۔ کیتھرائن بائرن اس روز بے حد خوش تھی۔ فخر اور طمطراق سے وہ ولیم بائرن کی بیٹی کی سی شان لیے جارج کے ہمراہ دوبارہ اسی گھر میں منتقل ہو گئی۔

معاشی رتبہ میں تھیں لی آتے ہی لارڈ بائرن کی بچپن کی محرومیوں، زیادتیوں اور استحصال نے اپنے چھن پھیلنا لیے۔ ماضی نے اسے اس قدر زہریلا بنا دیا تھا کہ اب وہ اپنا زہر دوسروں میں بھی منتقل کرنا چاہتا تھا اور اس فیصلے کو اس نے زندگی کی آخری سانس تک جمایا۔

کیتھرائن اسے بہترین تعلیم دینا چاہتی تھی۔ اس کی رسی تعلیم کا آغاز Aberdeen Grammar School سے ہوا تھا۔ اگست 1799 میں وہ ڈل ویج میں

ڈاکٹر ولیم گلمن، کے اسکول میں داخل ہو گیا۔ اس ادارے میں ڈاکٹر نیلی نے اسے بہت توجہ، شفقت اور محبت سے پڑھایا۔ وہ اس کے مزاج کی انتہا پسندی اور ذہنی مکی بجانب گیا تھا اور اسے استعمال پسندی کی راہ پر چلانا چاہتا تھا۔ بائرن کی فطرت میں بچپن کے رنگ اس قدر گہرے ہو چکے تھے کہ وہ اساتذہ کی سر توڑ کوششوں کے باوجود اپنی اس شدت پسندی سے چمکا رہا حاصل نہ کر سکا۔

اس ناکامی میں ایک بڑا حصہ کیتھرائن کا بھی تھا۔ وہ قوت فیصلہ اور قوت ارادی سے محروم عورت تھی۔ اس نے ہمیشہ غلط میں نیپلے کیے اور بغیر سوچے سمجھے ان پر عمل بھی کر دیا۔ اس کی بھی جلد بازی بائرن کے لیے بہت نقصان دہ ثابت ہوئی۔ اپنے مزاج کے تحت وہ اسے غلط تعلیمی اداروں میں داخل کرواتی رہی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ بھی تعلیم و ضبط اور نظم و انضباط کی نہر کا۔

1801 میں اسے لندن کے مشہور بورڈنگ اسکول Harrow میں داخل کروا دیا گیا۔ اس ادارے کا تعلیمی ماحول بے مثال تھا۔ وہ ایک غیر نمایاں طالب علم تھا جس کی زندگی میں نظم و ضبط کا فقدان تھا۔ اسے صرف اپنی ذات سے دلچسپی تھی۔ زندگی کے ہر لمحہ سے خوشی کشید کرنا اسے خوب آتا تھا اور اس کم عمری میں ہی اس کی زندگی میں صنف نازک کی آمد و رفت کا آغاز بھی ہو گیا تھا۔

Mary Chaworth اس کی ملاقات اسکول ہی میں ہوئی تھی۔ کیو پڈ نے اپنا اثر دکھایا اور وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف مائل ہو گئے۔ میری سے قبل بھی بائرن کی زندگی میں دو لڑکیاں آچکی تھیں۔ مارگریٹ پارک اور میری ڈیوف اس کی کزن تھیں۔ اس نے ان سے بھی اسی سبائی و ایمانداری سے 'محبت' کی تھی جس طرح وہ میری سے کر رہا تھا۔ اس نے اپنے مزید معاشے بھی کسی سے پوشیدہ رکھنے کی ضرورت ہی نہ تھی اور کیتھرائن کو بھی میری کے متعلق سب کچھ بتا دیا۔

کیتھی کا جوانی و زعم بہت شدید تھا۔ اس نے واضح الفاظ میں بیٹے کو تنبیہ کی۔ "تمہیں ایک خطرناک مرض لاحق ہو چکا ہے۔ بگ بگ محبت ایک مرض ہی ہے جو بدترین قرض میں جکڑ دیتی ہے۔"

بائرن کی زندگی میں انتشار پھیل چکا تھا۔ اسکول میں اس کی دوستی اور تعلقات صرف میری تک ہی محدود نہ تھے۔ لارڈ گرے کے دیئے گئے فخر اس قدر زہریلے ہو چکے تھے کہ وہ

اخلاقی طور پر بھی دیوالیہ ہو گیا تھا۔ جان فٹز گن تھا اس کلیرج جان ایڈمنٹن جیسے ہم مزاج دوست معمولی گھرانوں کے افراد نہیں تھے۔ وہ بائرن اور نامور خاندانوں کے چشم و چراغ تھے۔ انیسویں صدی کا برطانیہ بہت سی گمراہیوں میں جکڑا تھا۔ برطانوی امراء اور اشرافیہ میں یہ اخلاقی مکی مکمل سرایت کر چکی تھی اور کسی معتدی بیماری کی طرح پھیلتی ہی چلی جا رہی تھی۔ ایسی صورت میں تربیت سے محروم جارج گورڈن بائرن اس گمراہی سے بچتا بھی تو کیسے؟

☆.....☆

اسکول کی پڑھائی جاری رکھے تین سال گزر چکے تھے۔ اس کی سوچ اور معمولات میں کوئی فرق نہیں آیا۔ جن دنوں وہ نو پختہ شائر میں واقع اپنے گھر میں ہوتا تھا کیتھرائن کو ہر وقت زنجیر لگتا۔ ایک روز وہ اپنے اسی پسندیدہ مشغلے میں مصروف تھا کہ عقب سے مترجم آواز میں ملائی فخر سے سن کر خاموش ہوتا ہوا۔ "میں بھی تھی کہ میرے والد مرحوم جان بائرن کا بیٹا جارج بہت مہذب اور شائستہ طور طریقوں کا مالک ہو گا لیکن آج میرا بھرم ٹوٹ گیا۔"

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہاں آگسٹا کھڑی تھی۔ وہ اس کا صورت آشنا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ جان بائرن کی پہلی بیوی کی وفات کے بعد آگسٹا نے بہت سخت زندگی گزار لی تھی۔ پہلے پہل اس کی نانی لیڈی ہولڈر نہیں نے اس کی پرورش کی لیکن وہ بھی بچھتا ہوا چراغ تھی۔ آخر کب تک اس کا ساتھ دے پائی۔ اس کی وفات کے بعد مختلف رشتہ داروں اور دوست احباب کے گھروں میں شب و روز گزار کر وہ اپنی زندگی کے دن پورے کر رہی تھی اور بھی بکھار کیتھرائن سے ملنے بھی چلی آیا کرتی۔

بائرن کو اس کے الفاظ سن کر ذرا شرمندگی ہوئی اور وہ خاموشی سے لوٹ گیا۔ اس روز کے بعد ان دونوں میں ایک بے نام ماحلق استوار ہو گیا۔ وہ جب بھی گھر آتا آگسٹا سے ماں کی موافقت میں سمجھانے کی ہر گھن کوشش کیا کرتی۔ وہ دوستی اور اعتماد کے تعلق میں بندھ گئے۔

"تم بہت اچھے لڑکے ہو جارج ارچرڈ ہل کے نواب ہو اس لیے ایسی بڑبڑ بھی تم پر نہیں چلتی۔"

"میں جان بوجھ کر ایسا نہیں کرتا۔ بس خود بخود ہو جاتا ہے۔"

"مجھے تو کبھی اس کا پیرا نظر نہیں آیا۔" وہ ہنسا۔
"تم انہیں اذیت دینے کے لیے اپنا نقصان بھی کر رہے ہو۔"

"یہ بات کس ہتھ پر کھڑی ہو؟"

"تمہارے پاؤں کا عیب ٹھیک ہو سکتا تھا لیکن آئی نے بتایا کہ تم نے تمہارے خاصے خاصے جوڑے پہنے سے ہمیشہ انکار کیا۔ کیا یہ تمہارا ذاتی نقصان نہیں؟" اس نے سجاوے سے کہا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ بائرن کبھی اس پہلو یا اپنی ذات کی کسی بھی کمزوری کا تذکرہ پسند ہی نہیں کرتا۔

"مجھے لوگوں کی ترم اور تاسف آمیز نظروں سے سخت نفرت ہے۔ اس لیے میں ایسے جوڑے پہن کر اپنے جسمانی نقص کا اشتہار نہیں لگوانا چاہتا تھا۔"

"لیکن خصوصی جوڑے تو تم اب بھی پہنتے ہو۔ کیا اس سے تمہیں اذیت یا پریشانی نہیں ہوتی؟" آگسٹا نے اس کے لیے خاص طور پر بنوائے گئے جوڑوں کی طرف دیکھا جنہیں پہن کر پاؤں کا عیب زیادہ نمایاں نہیں ہوتا تھا۔

"اس سے ملنے والی اذیت صرف مجھ تک محدود ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ میں کیسے محسوس کرتا ہوں لیکن جسے پہن کر ہر ایک مجھ سے اظہار ہمدردی کرے گا ترس کھائے گا۔ یہ مجھے منظور نہیں۔"

آگسٹا کو اس کی قوت ارادی اور سوچ نے بہت متاثر کیا۔ وہ دونوں اپنی زندگی کے چھوٹے موٹے مسائل پر بات کر لیا کرتے تھے۔ آگسٹا اس سے پانچ سال بڑی تھی۔ اسکول جانے کے بعد بائرن نے اس سے خط و کتابت جاری رکھی۔ وہ خطوط میں بھی اسے کیتھرائن سے مثبت رویہ اپنانے پر زور دیتی رہی۔ ان کی دوستی کافی گہری ہو گئی تھی۔

☆.....☆

بائرن سترہ سال کا ہو چکا تھا۔ بلوغت نے اس کی سرکشی ہمت دھری اور اخلاقی رے راء روی میں مزید اضافہ کیا تھا لیکن اس سال اس کی زندگی میں دو تہدیلیاں آئیں۔ اس نے 'لارڈز' کے تاریخی کرکٹ گراؤنڈ پر ہونے والے Eton Vs Harrow کرکٹ میچ میں حصہ لیا۔ اپنی تکلیف دہ بیماری کے باعث اس میچ میں شرکت آسان نہیں تھی لیکن اس نے قوت ارادی کی بدولت یہ کام بھی ممکن کر دکھایا۔

بائرن تعلیمی اعتبار سے ایک ناکام کرکٹر تھا اور اس بات سے آگاہی کے باوجود وہ صرف قرضی احباب اور رشتہ داروں کو متاثر کرنے کے لیے اس مشکل مرحلے سے بھی گزر گیا۔ اس کی

لیے وقت اور طریقہ کار منتخب کر لیا اور روزمرہ کے کاموں میں مشغول ہو گیا۔

1808 کے آغاز میں اس نے اپنے ایک کزن جارج بنیٹس درجہ کے ساتھ بحری سفر کا منصوبہ بنایا۔ وہ مختلف ممالک کا دورہ کر کے اپنا تخیل اور مشاہدہ وسیع کرنا چاہتا تھا۔ وہ بہت پرجوش تھا لیکن سخی میں ہونے والی Alvoen کی جنگ سے یہ سفر موخر ہو گیا۔ یہ ڈنمارک ناروے اور برطانوی بحری جنگ تھی۔ بنیٹس درجہ HMS 32 gun frigate Tartar کا کپتان تھا جسے اس مہم میں عملی حصہ لینا تھا۔ اس کی موجودگی کے بغیر ہائرن کا سفر ناممکن تھا۔ وہ کچھ مایوس سا ہو گیا۔

☆.....☆

لاڈل ہائرن کی زندگی کا اکیسواں سال اس کے لیے بہت ہنگامہ خیز ثابت ہوا۔ مارچ میں 'ایڈمن برگ ریویو' ادبی جریدہ میں اس کی نئی تخلیق English Bards and Scotch Reviewers شائع ہوئی۔ ہائرن نے اسے بطور گرامر شخص شائع کروایا۔ یہ ایک طویل نظم (ہجو) تھی جس میں ناقدین کی جانب سے اس کی گذشتہ تخلیقات پر تنقید برائے تذیل کو نشانہ بنایا گیا۔

13 مارچ 1809 اس کے لیے ایک یادگار دن تھا۔ برطانوی ایوان بالا ہاؤس آف لارڈز میں اسے ایک نشست ملی۔ سیاست میں آمد ایک بہت اہم کامیابی تھی لیکن اس کی زندگی سے وابستہ مختلف آزار اس کامیابی سے لطف اندوز ہونے میں رکاوٹ ثابت ہونے لگے۔ اس نے ہوب ہاؤس سے اپنے خدشات کا اظہار کر دیا۔ "میں ایک طویل سفر کرنا چاہتا ہوں۔ اس وقت منظر عام سے ہٹنا ہی میرے لیے بہتر ہے۔" "یہ تمہارے سیاسی اور ادبی زندگی کا بہت اہم موڑ ہے۔ ایسے موقع پر منظر عام سے ہٹنا کیا بہتر ہوگا؟"

"لوی (ملازمہ) کا بیٹا میرے نام سے مسموب کیا جانے لگا ہے۔ (اور حقیقت بھی یہی تھی)۔ میری گلے کا بار بن چکی ہے جبکہ اب مجھے اس میں کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ قرض خواہ بھی بہت بڑھ گئے ہیں۔ سفر وسیلہ ظفر ہوتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ میرے ادبی سفر کو ایک نیا جذبہ قوت ملے گی۔"

"تھیک ہے دوست! میں تو ہر حال اور فیصلہ میں تمہارے ساتھ تھا اب بھی ہوں اور ہمیشہ رہوں گا۔" ہائرن کی اس خلاصہ بیعتیں وہابی پُر سکون ہو گیا۔ اسے ہوب ہاؤس کی دوستی پر ہمیشہ فخر تھا لیکن اس کے باوجود وہ اپنے اس فیصلہ کی ایک اہم وجہ اسے بتانا چاہتا ہوں

تنقید کرنے لگتے ہیں۔ کیا تم اپنی تخلیقات پر ایسی بے رحم تنقید برداشت کر لو گے؟"

ہائرن کا جواب نفی تھا۔ وہ چچر کی بات سمجھ گیا تھا۔ اس نے تجویز کر لیا کہ وہ بہت جلد اپنی شاعری میں مثبت تبدیلی لے آئے گا۔

شاعری میں جدوجہد کے علاوہ اس کے معمولات زندگی میں کوئی فرق نہ آیا۔ ذاتی و اخلاقی بے راہ روی میں اضافہ ہوتا رہا۔ وہ اپنی وجاہت اور کشش سے آگاہ تھا۔ اس کا قد لگ بھگ پانچ فٹ 9 انچ تھا اور وزن 89 کلو۔ اپنی شخصیت کو مزید روشن بنانے کے لیے وہ مصنوعی آرائشی چیزوں کا سہارا بھی لیا کرتا۔ اس کا جسم ورزش تھا لیکن اپنی جسامت سے غیر مطمئن رہتا۔ وہ ایک قابل مکہ باز گھڑسوار اور شاندار تیراک بھی تھا۔ کالج میں وہ اپنی غذا کے معاملہ میں بہت محتاط رہتا۔ وزن قابو میں رکھنے کے لیے ڈانٹنگ کیا کرتا تھا۔ اس کے جسمانی نقص کی وجہ سے مطلوبہ معیار کی ورزش ممکن نہ ہوتی تو ڈھیروں کپڑے پہن لیا کرتا تاکہ اسے زیادہ پینا آئے اور جسم سے فاضل مادے خارج ہو سکیں۔

ہائرن سبزی خوردہ وغیرہ کی کئی روز خشک لیکٹ اور سفید دانن برائے سالی سے گذار لیتا۔ کبھی کبھار گوشت اور مٹھی چیز بھی کھا لیتا تھا لیکن بعد میں ورزش بھی لازم تھی۔ اس کے پاؤں کی وجہ سے ورزش ایک دردناک مرحلہ ہوتی تھی جس کی بدولت وہ خواہش کے باوجود وزن کم نہ کر پایا۔

کالج میں پڑھائی کے دوران اسے قمار بازی کی بات بھی لگ گئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ قرض کے بوجھ تلے دبے لگا۔ وہ انتہائی شاہ خرچ تھا۔ یہ تحرائن نے اسے ایسی روش پر چلنے سے بہت منع کیا لیکن بے سود قرض بڑھنے لگا۔ کچھ ترانوں کو اس کی صورت میں ایک اور جان ہائرن نظر آنے لگا۔

دوسال مزید گذر گئے۔ اس کے معمولات جوں کے توں برقرار رہے۔ 1807 میں اس کی ملاقات جان کیم ہوب ہاؤس سے ہوئی جو بہت جلد گہری دوستی میں تبدیل ہو گئی۔ اسی سال ہائرن کی شاعری کا پہلا مجموعہ Hours of Idleness شائع ہوا۔ یہ کتاب سابقہ اور کچھ نئے مختصر نظموں پر مشتمل تھی جس میں اس کا انداز بیان قدیم روم کے شاعروں سے ملتا جلتا تھا۔ ہائرن کی عمر اس وقت انیس برس تھی۔ فنی چٹلی کی کمی کے باعث اس کتاب پر بے رحم تنقید ہوئی۔ بعض حلقوں میں تو یہ تنقید تذلیل کا روپ دھار گئی تھی۔ ہائرن کے لیے یہ صورت حال ناقابل برداشت تھی۔ اس نے ردعمل دینے کے

"تم ایسا کیسے کر سکتے ہو؟ اسے کیسے اپنے ساتھ رکھو گے؟"

"یہ نہ صرف میرے ساتھ رہے گا بلکہ میں اس کا داخلہ بھی کرواؤں گا۔ یہ کالج کا اسٹوڈنٹ ہوگا اور میری کلاس میں بیٹھ کر پڑھائی بھی کرے گا۔" ہائرن کا اطمینان قائل دید تھا۔ وہ اپنے خلاف ہونے والے کسی بھی کام کا بہترین انتقام لیا کرتا تھا۔

درحقیقت وہ ایک انتقامی زندگی ہی جی رہا تھا۔

☆.....☆

1805 میں ہائرن نے اپنے جذبات کو شاعری کے قالب میں ڈھالنا شروع کر دیا۔ اس وقت وہ سترہ سال کا تھا۔ آغاز میں اس نے چند نظمیں لکھیں۔ اس دوران اس کی شائسانی اڑا تھ جو کچھ اور اس کے بھائی جان سے ہوئی۔ یہ شائسانی جلد ہی قریبی تعلقات میں ڈھل گئی۔ اس نے جان کے ساتھ تفریحی عصر پر مشتمل دو راتے تیار کیے۔ اڑا تھ کی دلچسپی ہائرن کی شاعری میں بھی۔ وہ اس کے مسودے اکٹھے کرتی اور انہیں قدر سے بہتر لکھائی و انداز میں ڈھالنے لگی۔

ہائرن کو یقین تھا کہ وہ بہت جلد کامیاب اور نامور شاعر بن جائے گا۔ اس نے اپنی ابتدائی شاعری کے بھی مسودے جمع کیے اور ایک قریبی دوست 'جے۔ ٹی۔ چچر' کو دکھائے۔ "اسے پڑھ کر اپنی رائے دو پھر!" "یہ کیا ہے بھئی؟"

"میری شاعری کا پہلا مجموعہ ہے۔ میں اسے کتابی شکل میں شائع کروانا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ شاعری انگلستان میں دھوم مچا دے گی۔" چچر نے مسودے پر ایک نظر دوڑائی اور فوری نتیجہ پر پہنچ گیا۔ اس نے کاغذات کو تہ کیا اور قریبی امتحان میں پیش کیا۔

"یہ کیا حرکت کی تم نے؟" ہائرن کو فحشہ آیا۔

"یہ مسودے اسی قابل ہیں۔" چچر نے زری سے سمجھایا۔ "میں تمہاری لکھنے کی صلاحیتوں سے انکار ہی نہیں لیکن یہ شاعری منفی تنقید حاصل کرے گی۔ جذبات و احساسات کا بیان بہت بے باک ہے۔ میری کے لیے لکھنی کی نظم تو ضرورت سے زیادہ ہی بے باک ہے۔ عوام کو وہ ادب پڑھاؤ جو ان کے لیے قابل ہضم ہو۔ تمہاری شاعری میں عشقیہ جذبات کی بھرمار ہے۔ ہم سب اپنی زندگی میں ایک بار اس دور سے گذرتے ہیں لیکن جب کہ شاعر یا ادیب کے قلم سے یہ جذبات پڑھتے ہیں تو

مشکل پسندی سے سب متاثر ہوتے ہیں کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ 'اکھر' مغرور، خندو اور بظاہر سخی دکھائی دینے والے لارڈ ہائرن کے اندر ایک حساس، گہری سوچ اور کڑھنے والا شخص بھی چھپا ہے جسے پھولوں اور رنگوں سے پیار ہے اور وہ اپنے خیالات کو الفاظ کا روپ دینا چاہتا ہے۔

لارڈ ہائرن نے سترہ سال کی عمر میں شاعری کا آغاز کر دیا۔ اسی سال خزاں میں اس کا داخلہ Trinity College Cambridge میں ہو گیا۔ پڑھائی لکھائی کا اسے کوئی خاص شوق تو تھا نہیں اس لیے کالج میں بھی اپنے سابقہ معمول جاری رکھے۔ کالج میں ہائرن کو اپنا کمرہ بالکل پسند نہ آیا اور وہ انتقامی افسر کے پاس جا پہنچا۔ "مجھے کمرے میں کچھ تبدیلیاں کرنی ہیں۔"

"کیسی تبدیلیاں؟" ایڈمن نے حیرانی سے اس معصوم صورت لڑکے کی طرف دیکھا۔

"کمرے میں شیشے کی صراحی، بلوریں گلاس، چار بوتل وائن، چار بوتلیں پورٹ، چار عدد شیریں اور چار ہی بوتلیں ارغوانی شراب ہونی چاہیے۔ مجھے یہ سب مہیا کیا جائے یا انہیں رکھنے سے منع نہ کیا جائے۔" اس کا مطالبہ سن کر ایڈمن نے سر پینٹ لیا۔

ہائرن کی ضد صرف یہیں تک محدود نہ تھی۔ وہ اپنے پالتو جانوروں سے بہت محبت کرتا تھا۔ Boatswain نامی بلفاگ میں تو اس کی جان تھی۔ وہ اس کا بہت خیال رکھتا۔ اس کے کانٹے یا کسی بھی انگلیوں کی پروا کیے بغیر اس کی آیا گیری تک کر لیا کرتا۔ وہ اسے کالج میں بھی ہمراہ رکھنا چاہتا تھا لیکن ادارے نے اپنے تحریری قوانین کا حوالہ دیتے ہوئے اسے منع کر دیا۔ اس وقت تو وہ خاموش ہو گیا۔ انتظامیہ نے بھی سکون کا سانس لیا لیکن یہ سکون اس وقت ہوا ہو گیا جب کچھ عرصہ بعد ہائرن ایک دلچسپ لکھ لکھ چلا آیا۔

"یہ کیا اٹھالائے ہوسا جھ؟" ایڈمن حیرت سے چلا یا۔ "یہ میرا پالتو بچہ ہے اور آج سے یہ سیکس میرے ساتھ رہے گا۔"

"ایسا ممکن نہیں ہائرن! یہ خلاف قانون ہے۔" "ایسا بالکل ممکن ہے ڈیرسیر!! اور قانون ذرا مجھے بھی تو دکھائیے؟ آپ کے تحریری قوانین میں جن پالتو جانوروں کو یہاں لانے سے منع کیا گیا ہے ان میں دیکھ کا تو ذکر ہی نہیں۔ اس لیے آپ اس معصوم کو یہاں رہنے سے روک نہیں سکتے۔" وہ معصومیت سے بولا۔

انگلستان میں کچھ عرصہ سے شدید عوامی بغاوت کی وجہ سے نئی اصلاحات نافذ ہوئی تھیں جن کے تحت غیر اخلاقی حرکات کے محرک افراد کے گرد گھیرا بہت تنگ کر دیا گیا۔ اس سزا سے کسی کو بھی استیصال حاصل نہیں تھا۔ شک کی بنیاد پر بھی مطلوبہ فرد کو گرفتار کر کے سرعام پھانسی دے دی جاتی۔ ایسی صورت حال میں بائرن کا خوفزدہ ہونا کوئی حیرانی کی بات نہ تھی۔

11 جون 1809 کو وہ لندن سے روانہ ہو گئے۔ اس سفر میں کئی ملازمین بھی ہمراہ تھے۔ ولیم پیکر اس کا خاص خدمت گار اور خانا ماں تھا۔ ان دونوں فرانس اور اس کے اتحادیوں سے برطانوی جنگ بھی زبردست پریشانیوں سے یورپی ممالک کی طرف رخ کرنے سے گریز کیا اور بحیرہ روم کا سفر شروع کر دیا۔ بحیرہ روم اور مشرقی ممالک کی جانب بائرن کا رجحان نیا نہیں تھا۔ بچپن میں فارس اور ترک سرزمین کے متعلق پڑھے جانے والے قصے اسے بہت بھانتے تھے۔ وہ اسلام کے بارے میں جاننے کے لیے بھی تجسس تھا۔ صوفیانہ تصوف اس کے لیے ایک بہت اعلیٰ شے تھی۔ انگلستان سے شروع ہونے والا یہ سفر برنگال، آئین اور بحیرہ روم سے البانیہ تک پہنچا۔ برنگال میں گذرا جانے والا وقت یادگار تھا۔ اس نے وہاں قیام کے دوران برنگالی زبان میں بھی کافی مہارت حاصل کر لی۔ نت نئے لوگوں سے ملنے اور انسانی فطرت کی گہرائی سمجھنے کے مواقع ملے۔ وہ اس سفر میں بہت خوش تھا لیکن پھر آگسٹا کی جانب سے ملنے والے ایک خط سے علم ہوا کہ تیرا ان اپنی مختلف بیماریوں نفسیاتی الجھنوں اور ایک غیر فطری زندگی جیتے رہنے کی جنگ ہار گئی ہے۔ یہ خبر پڑھ کر اسے وقتی طور پر دکھ ہوا کیونکہ زندگی میں کسی بھی کسی بھی موڑ پر وہ اپنی ماں کے قریب نہیں رہا تھا۔ البتہ آگسٹا کی جانب سے ایک طویل عرصہ بعد ملنے والے اس خط نے اسے خوشی ضرور دی تھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اس تعلق میں اب کوئی بے غلام پیدا نہیں ہونے دے گا۔

بائرن کی پیش گوئی کے عین مطابق یہ سفر اس کی ادبی زندگی کے لیے بہت فائدہ مند ثابت ہوا۔ انگلستان واپسی کے بعد اس نے Childe Harold's Pilgrimage کے دو باب رقم کیے اور ان کی اشاعت کے بعد راتوں رات شہرت کی بلندیوں پر پہنچ گیا۔ اس نظم میں ایک ایسے نوجوان کے جذبات بیان کیے گئے تھے جو مادی دنیا اور اس کی چمک دمک سے گمراہی میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اپنی زندگی گمراہی میں گزارنے کے بعد وہ اوب گیا اور پھر اسے انجینیئری دس اور سرزمین اپنی جانب مددائیں دینے لگیں۔ وہ ایسے ہزار کی تلاش کرنا چاہتا

تھا جہاں خود فراموشی کی کیفیت ملادی ہو جائے۔ اسے ایک علامتی نظم بھی قرار دیا گیا جس میں غزل کی جنگ اور اخلاقی برائیوں سے بیزاری خود دکھائی کے انداز میں بیان کی گئی۔ ادبی حلقوں میں اسے بہت سراہا گیا اور لاڈ بائرن کی پیشہ وارانہ زندگی نے ایک نئے عروج کی طرف سفر شروع کر دیا۔

☆.....☆

شہرت کا نشہ لاڈ بائرن کے حواس پر چھا چکا تھا۔ وہ ہر جگہ موضوع گفتگو تھا۔ نجی اور سرکاری تھیں، کلیمز پارٹیز اور ڈرائنگ روم میں بھی صرف اس کا تذکرہ ہوتا۔ خواتین کے لیے اس کی ذات میں کشش بہت بڑھ گئی۔ اس کی وجاہت کے ساتھ شاعری کا اضافہ انیس بہت سے خواب دیکھنے پر اس نے لگا۔ بائرن بھی اس میدان کا بارانا کھلاڑی تھا۔ ایسی ہی کئی محفل میں اس کی نظر ایک حسین خاتون پر جا پڑی۔ یہ خاتون چھبیس سالہ لیڈی کیرویل تھی۔ اس کی شادی ولیم کیمسب سے ہو چکی تھی جس کا تعلق اشرافیہ سے تھا۔

بائرن نے اسے اپنی جانب متوجہ کرنے کے لیے دواؤں آزما لیے لیکن وہ اپنی بے نیازی میں غرق تھی۔ اپنی شاعری اور گفتگو کا حوالہ دیتے پر بھی اس نے کوئی خاص رد عمل نہ دیا اور دل چاہنے والی مسکراہٹ سے بولی۔ ”میں بھی ایک معصوم ہوں اس لیے عام خواتین کی طرح شاعروں اور مصنفین کو اپنے حواس پر سوار نہیں کرتی۔“

بائرن اس کی اس اداسے مزید متاثر ہوا اور اپنی چرب زبانی جاری رکھی۔

”تم ایک دیوانے اور شیطانی ذہن کے مالک ہو۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ تم سے آشنائی بڑھانا بہت خطرناک ہے۔“ کیرویل نے اس کے بھی داؤد کا تہ بندادیے۔

بائرن نے ہمت نہ ہاری اور اسے اپنی جانب راغب کرنے کی کوششیں کرتا رہا اور آخر کار لیڈی کیرویل کیمسب اپنی تمام تر سمجھداری متانت اور ذہانت کے باوجود اس کی ذات کی اسیر ہو گئی۔ ان کا رشتہ دھواں دھار تھا۔ بائرن اسے کیرویل کی بجائے سرعام کیرویل کا رتا اور جواب میں دوسرے فریق نے بھی اس عرفیت کو اپنا عوامی تک نیم بنالیا۔ وہ عوامی مقامات پر ساتھ دیکھے جانے لگے تو فواہوں کا ایک نیا بازار گرم ہو گیا لیکن انہیں کوئی پروا نہ تھی۔

اس ساری صورت حال میں ولیم کیمسب کی حالت سب سے زیادہ قابل رحم تھی۔ اس نے کسی طریقے سے کیرویل کو آزر لینڈ بھیج دیا۔ یہ طویل فاصلہ اور جدائی بھی اس کے جذبات

میں کوئی کمی نہ لاسکی اور خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کیرویل اس کے لیے بہت پیچیدہ ہو چکی تھی اور ہر عورت کی طرح اسے بھی یہی لگتا تھا کہ بائرن اسے کبھی دھوکا نہیں دے گا اور اس کی واپسی کا شدت سے منتظر ہوگا۔

انگلستان میں لاڈ بائرن کی زندگی ایک نئے بھونچال میں گھر چکی تھی۔ لیڈی کیرویل کے جانے کے بعد اس کا رشتہ آگسٹا میں بی بی سے قائم ہو گیا۔ وہی آگسٹا جو اس کی سوتیلی بہن تھی اور اپنے کزن لیشینگٹن کرٹل جارج کی سے شادی کے بعد دو بچوں کی والدہ بھی تھی۔

آگسٹا سے اس کے تعلقات نے یہ نیا اور شرمناک موزک لپا لیا اس بارے میں مؤرخین نے دانستہ طور پر خاموشی اختیار رکھی ہے۔ قیاس یہی کیا جاتا ہے کہ وہ دونوں اخلاقی طور پر دیوالیہ تھے۔ بچپن میں جب انسانی کردار اور شخصیت کی بنیاد رکھی جاتی ہے اور اپنی ذات سے جڑے غیر فطری مسائل سے جنگ میں مصروف تھے۔ تربیت ان دونوں کو بھی نہ لاسکی اور نتیجہ یہ ظاہر ہوا کہ رشتوں کی نزاکت سمجھنا اور ان کا احترام کرنا بھی کسی نہ سیکھ سکے۔

1813 میں کیرویل نے بھی لندن لوٹ آئی۔ اسے گمان تھا کہ بائرن کا رد عمل بہت پرجوش ہوگا لیکن یہ جان کر اس کی مایوسی اور مدمر کی کوئی انتہا نہ تھی جب بائرن نے واضح انداز میں اس رشتے کو ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔

”تم میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتے ہو؟“ کیرویل نے اپنی دولت برداشت نہ رکھی۔

”ایسا کرتا میرے لیے کبھی بھی مشکل نہیں رہا۔ مجھے اب تمہاری ذات میں کوئی دلچسپی نہیں۔“ اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

کیرویل کی حالت قابل رحم تھی۔ آنے والے وقت میں وہ بھکاریوں کی طرح اسے اپنی محبت اور گذشتہ تعلق کے واسطے دیتی رہی لیکن بائرن کی سرمدھی ختم نہ ہوئی۔ ایک محفل میں ان کا جھگڑا اس قدر بڑھا کہ اس نے سرعام کیرویل کی تذلیل کر دی۔ کیرویل اپنے حواس کو ٹھنڈی اور وہاں موجود ایک گلاس ٹوڑنے کے بعد اپنی کلائی کی ٹیس کاٹنے کی کوشش تک کر ڈالی۔ بائرن کو یہ منظر بھی موم نہ کر سکا۔ اس کے فیصلے ہمیشہ حرف آخر ہوتے تھے۔

لیڈی کیرویل کے لیے بائرن کی بے رخی اور بے وفائی بہت بڑا سانحہ تھی۔ محبت اس کے لیے ایک روگ بن گئی۔ اس کی محبت پر بہت منفی اثر پڑنے لگا۔ کچھ ہی عرصہ میں اس کا وزن

لاڈ بائرن کے چند دانشمندانہ اقوال

1- مسکراہٹ کبھی ترک نہ کرو۔ یہ دنیا کی ارزاق ترین دوا ہے۔

2- جو دیل سے بات نہ کرے، متعصب ہے۔ جو کہ نہ سکے، بے وقوف ہے۔ اور جو جرات سے کام نہ لے، وہ غلام ہے۔

3- آفت و مصیبت سچائی کی طرف چلنا سکھا دیتی ہے۔

4- محبت ایسے خطرناک رستوں پر بھی چلنا سکھا دیتی ہے جہاں بھیڑیے بھی شکار کے لیے قدم نہ رکھ سکیں۔

5- دوستی ایک زینہ چڑھ کر ہمیشہ محبت میں تبدیل ہو جاتی ہے لیکن محبت بھی ایک ایک اتر کر دوستی میں تبدیل ہونا نہ سکھائی۔

6- میری شاعری کا موضوع انسانی بے وقوفیاں ہیں۔

7- زندگی چار سوالات کی تلاش کا نام ہے۔ روح کس مادے سے بنی ہے؟ تقدیر کیا ہے؟ زندگی گزارنے کی بہترین راہ کون سی ہے؟ بہترین موت کیا ہے؟ اور ان سب کا جواب ایک ہی ہے۔ محبت۔ صرف محبت۔

☆☆☆

☆ ہمدردی کا شہنشاہ کا نام ہی آنسو ہیں۔

☆ غم زندگی سے آگاہی کا دوسرا نام ہے۔ جو جتنا زیادہ آگاہ ہوگا اتنا ہی غمگین ہوگا۔ غم حیات ہی شجر حیات ہے۔

☆ سچائی انسانوں سے زیادہ عجیب ہوتی ہے۔

☆ خلوص عاجز ہو سکتا ہے لیکن خادم نہیں۔

☆ زندگی خواہشات کے سہارے زندہ رہتی ہے۔

☆ کتب بینی کسی دوست کی ضرورت محسوس نہیں ہونے دیتی۔

☆ شہرت کیا ہے؟ ایسے لوگوں کا آپ کو چاہنا جنہیں آپ جانتے ہیں اور نہ ہی پروا کرتے ہیں۔

☆ باقاعدہ زندگی میں آنسوؤں کی کوئی جگہ نہیں ہوتی۔

☆☆☆

اس حد تک کم ہو گیا کہ بائرن نجی محافل میں اکثر یہ کہنے لگا۔ ”میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ مجھے ایک ڈھانچے سے کیہ کھربخت ہو گئی تھی؟“

کیرویلین اسے اپنی جانب متوجہ کرنے کے لیے ہنسنے لگا۔ ”میں نے اپنا کریمی نا کام رہی تو انتقام کی آگ میں جلنے لگی۔ اس نے ایک ناول Glenarvon تخلیق کیا اور اس کے مرکزی کردار لارڈ رتھوین کے روپ میں بائرن کا کردار میں دین بیان کر دیا لیکن بائرن بھی سابقہ بحثوں کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھا تھا۔ وہ ان دنوں نئے آسان کی سیر میں تھا۔

آگستا سے تعلقات اب کسی سے بھی پوشیدہ نہیں تھے۔ عوامی حلقوں میں انہیں طرد و مزاح کا نشانہ بھی بنایا جاتا رہا۔ 1814 میں آگستا نے ایک لڑکی ”مڈورا“ کو جنم دیا اور زبان خلق کا دھوکا دیا کہ وہ بائرن کی بیٹی ہے۔ اس موقع پر بائرن کا اپنا لہجہ ”بھرا سراسر اہمہ رویہ بھی اس دعوے کو بوج ثابت کرتا رہا۔ عوامی لعن طعن اور اپنی پیشہ وارانہ زندگی کو ایسے تنازعات سے بچانے کے لیے اس نے ایک اہم فیصلہ کر لیا۔

☆.....☆

لارڈ بائرن کی زندگی اب ایسے مقام پر آ گئی تھی جہاں اس کی ہر جنبش عوام کی نظروں میں ہوا کرتی۔ وہ ایک مقبول اور ہر دلیز شاعر بن چکا تھا۔ لوگ اس کے بارے میں جاننے کے لیے بے تاب رہتے۔ اس نے شادی کا فیصلہ کر لیا اور قمرہ فال این ایز ایلا کے نام نکلا۔

بیلا لیڈی کیرویلین کے شوہر ولیم لیب کی کزن تھی۔ وہ نہایت مہذب شائستہ اطوار مذہبی خیالات کی مالک بہترین ریاضی دان نرم خور اور با کردار تھی۔ بائرن سے کئی بار مختلف سماجی تقریبات میں ملاقات بھی کر چکی تھی۔ وہ ان تمام عورتوں سے بہت مختلف تھی۔ جواب تک بائرن کی زندگی میں آئی تھیں۔ اس نے دو سال قبل بیلا کی ایک رشتہ دار بزرگ خاتون کے توسط سے اسے شادی کی پیشکش کی لیکن اس نے انکار کر دیا۔

اس انکار کے باوجود وہ بائرن کے سحر سے بچ نہ سکی۔ اس کی شخصیت میں گندھے خرد و شکرے رنگوں سے باہم ہونے کے باوجود وہ دوسری بار شادی کی پیشکش ٹھکرا نہ کی۔ وہ ایک مختلف عورت تھی لیکن پھر بھی ہر عورت کی طرح یہی سوچتی تھی کہ اس کی محبت توجہ اور اعتماد بائرن کی زندگی بدل دے گا۔ اگر وہ کچھ وجوہات کی بناء پر ابھی بھری زندگی بچنے لگے تو یہ بیلا کا مذہبی فریضہ ہے کہ اسے سیدھے رستے پر لانے میں مددگار ثابت ہوا۔ فی خیالات کی بناء پر اس نے بائرن کا رشتہ قبول کر

لیا اور دو جنوری 1815 میں وہ رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئی۔ آغاز میں سب اچھا تھا۔ بائرن ان دنوں معاشی بحران میں مبتلا تھا۔ وہ قرضوں سے نجات کے لیے اپنی جائیداد بیچنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا لیکن کامیابی مل کے ہی نہ دیتی۔ اس کی پیشہ وارانہ زندگی کا ستارہ عروج پر تھا۔ اس کی بھی نظمیں اشاعت اور مقبولیت کے نئے ریکارڈ بن رہی تھیں لیکن ذاتی زندگی بہت متشدد تھی۔ وہ شراب کے نشے میں غرق رہنے لگا۔ یہاں تک تو بیلا سب کچھ برداشت کرتی رہی لیکن دوسری عورتوں سے تعلقات اس کے لیے ہرگز قابل قبول نہیں تھے۔ بائرن کی الماریوں اور بہت سی ذاتی اشیاء کی حفاظت اسے کی حفاظت سے آگاہ کیا۔ وہ شوہر سے الجھنے لگی۔ ”یہ طریقہ کار ہرگز مناسب نہیں ہے۔ آج کل تمہارا نام سون بولس نامی اداکارہ کے ساتھ کیوں لیا جانے لگا ہے؟“

”ہم دونوں کے اچھے تعلقات ہیں بیلا! اس میں اتنا چیخنے کی کیا ضرورت ہے؟“

”مجھے تمہارے مختلف عورتوں سے معاشرے اور عوام میں ان کا چرچا بالکل قبول نہیں۔ اور آگستا سے ملاقات تو بالکل برداشت نہیں۔“

”میں تو شروع ہی سے ایسا تھا بیلا! اب اتنی چیخ دیکار کیوں؟ وہ سب وقت گذاری کا ذریعہ ہے اور تم میری بیوی ہو۔ اس حقیقت کو بخشی جلد سمجھ لو گی برداشت کرنا اتنا ہی آسان ہو گا۔“

”بالکل نہیں۔ میں اپنے شوہر میں یہ سب کچھ نہیں دیکھ سکتی۔“

”تو پھر مجھ سے شادی ہی کیوں کی تھی؟“ بائرن کا طعنے لہجہ اسے اپنی غلطی کا احساس دلانے لگا۔ اسے تبدیل کرنے کی سوچ کے ساتھ اس نے شادی کی بھی وجہ وہ تبدیل ہونے کے لیے تیار ہی نہ تھا۔ ان کے رشتے میں دراڑیں پیدا ہونے لگیں۔ بائرن کا مزاج دن بدن سخت ہوتا چلا گیا۔ بیلا کو یقین ہونے لگا کہ اس کا ذاتی توازن درست نہیں رہا۔ وہ اس سے بدترین سلوک کرتا۔ مغالطات بکنا اور مختلف مردو خواتین سے تعلقات بنانے میں بھی کوئی شرم محسوس نہ کرتا۔ اسی سال دسمبر میں بیٹی کی پیدائش کے بعد بیلا نے قانونی طور پر علیحدگی کا فیصلہ کر لیا۔ بائرن اس معاملہ کو طول دینا چاہتا تھا۔ بیلا ایک وسیع و عریض جاہلاد کی وارث تھی۔ اس سونے کی چڑیا کو ہاتھ سے جانے دینا بھی دانشمندی نہیں تھی۔ وہ اسے جاندارا دلے کے بند اپنے قرضے چکا سکتا تھا لیکن بیلا مزید دیر نہیں کرنا چاہتی

تھی۔ اس نے قانون کا سہارا لیا اور مارچ 1816 میں بائرن کے نام اور شادی کے بندھن سے آزاد ہو کر بیٹی ”ایلا“ کو ساتھ لیے والدین کے پاس لیسنس شائع نکل ہو گئی۔ اس علیحدگی کے بعد اس نے بھی بائرن سے دوبارہ ملاقات کی کوشش کی نہ ہی اسے ایسا موقع دیا۔

☆.....☆

ذاتی زندگی میں نا کام لارڈ بائرن سیاسی میدان میں بھی اپنی گہری چھاپ چھوڑ چکا تھا۔ آفس لارڈز میں اس کی تقاریر بہت دہنگ ہوتیں۔ انہیں اخبارات میں نمایاں جگہ دی جاتی۔ وہ صنعتی میدان میں مشینوں کی اجارہ داری اور انسانی بے وقعتی کے خلاف تھا۔ انہیں اصل مقام دلوانا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ برطانیہ میں مذہبی برداراری کی کئی بھی اس کے لیے لمحہ فکریہ تھی۔ وہ اپنے سماجی لارڈز کو اس بات سے آگاہی دینا چاہتا تھا کہ دوسرے مذاہب اور مختلف عقائد کے لوگوں کو بھی مذہبی آزادی حاصل ہونی چاہیے۔ تقاریر میں اس کے الفاظ سخت اور تلخ ہوتے تھے لیکن لہجہ کی چاشنی ان کی سختی کم کر دیتی۔

انگلستان میں اس کی شاعری کا طوفانی بول رہا تھا۔ 'The Glaour', 'The Bride of Abydos' نے بے پناہ مقبولیت حاصل کی اور 'The Corsair' کی اشاعت کے بعد تو مقبولیت کے تمام ریکارڈ ٹوٹ گئے۔ پہلے ہی روز دس ہزار کاپیوں کی فروخت ہوئی۔ 'The Seigh of 'Lara, A tale' 'Cornith', 'Parisina', 'She Walks in Beauty', 'And thou art dead' عوام میں مقبول بھی تھیں اور اعلیٰ فی صیغار کے مطابق بھی۔

بائرن کی شاعری پر دھڑیر ہونے کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ انسانی فطرت کی مکمل عکاسی کرتا۔ شاعری کا موضوع انسانی رشتوں کی پیچیدگیاں ہوتا تو کبھی سیاسی کشیدہ اور جبر میں مبتلا مزدور طبقہ کے مسائل۔ سلطنت عثمانیہ کا اعلان اس کے قلم کی نوک پر چمکتا تو کبھی سوتیلے رشتوں میں پیدا ہوجانے والی ایسی محبت دکھائی دیتی جو سانج اور مذہب کی رو سے شرمناک ہوا کرتی۔ وہ جو بھی لکھتا دلوں میں گھر کر لیتا لیکن دلوں پر راج کرنے والے لارڈ بائرن نے اپنی ذاتی زندگی کی ڈور اس قدر اچھا لی تھی کہ اب انگلستان میں اسے محسن محسوس ہونے لگی۔ ناقدین اس کے فن پر تنقید کی بجائے ذاتیات پر حملے کرنے لگے۔ بیوی اور بیٹی سے علیحدگی نے ایک نیا محمول دیا تھا۔ ایسے ماحول میں اس کا قلمی سفر بھی کامیابی سے جاری نہ رہا۔ اپنے قلم اور خصل کو

بے موت مرنے سے بچانے کے لیے اس نے انگلستان چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا اور ایک طویل سفر پر روانہ ہو گیا۔

وہ اس سرزمین پر کبھی بھی واپس نہیں آنا چاہتا تھا۔

☆.....☆

1816 میں لارڈ بائرن نے ایک بار پھر سمندری سفر اختیار کیا۔ اسی سال گرما میں وہ اپنے ذاتی معالج جان ولیم کے ساتھ سوئزر لینڈ میں ایک جینووا منتقل ہو گیا۔ سفر اس کے لیے ہمیشہ بہت فائدہ مند ثابت ہوتا تھا۔ اس بار بھی یہی ہوا۔ یہاں اس کی ملاقات ایک اور شاعر ”شیلے“ اور اس کی منگیز ”میری گوڈون“ سے ہوئی۔ ان کے ہمراہ کارل کٹر مونت نامی خاتون بھی تھی جو لندن میں اس کی خاصی قریبی سماجی رہ چکی تھی (مورخین کے مطابق ان کی ایک بیٹی بھی تھی)

شیلے سے ملاقات بائرن کے قلمی سفر کا ایجنڈا ثابت ہوئی۔ اس نے Childe Harold's Pilgrimage کے مزید باب تخلیق کیے جن کی اشاعت کے بعد ناقدین نے یہ بات برملا تسلیم کی کہ بائرن کا قلم اور خصل بہت گھر گیا ہے۔ یہ سال اس کے لیے بہت کامیاب ثابت ہوا۔ 'The Prisoner of Chillon', 'The Dream', 'Prometheus', 'Darkness', 'My Soul is Dark' کی اشاعت نے اس کی شہرت کو چار چاند لگا دیے۔ وہ راک اسٹار بن چکا تھا۔

موسم سرما وینس میں گزرا۔ یہاں اس کی ملاقات ماریانا سے ہوئی اور حسب سابق محبت میں تبدیل ہو گئی۔ وہ ماریانا کے گھر رہائش پزیر تھا۔ کچھ عرصہ بعد محبت کے یہ جذبات بائیس سالہ مارگریٹا کا لگی کی طرف منتقل ہو گئے۔ دونوں خواتین شادی شدہ تھیں اور بائرن پر بری طرح فریضہ بھی۔ مارگریٹا خواندہ تھی۔ وہ اپنے جذبات سے اس قدر مغلوب ہوئی کہ شوہر اور گھر چھوڑ کر بائرن کے ساتھ رہنے چلی آئی۔ ایک نیا م میں دو نکواریں کس طرح رہ سکتی تھیں؟ دو دنوں خواتین میں لڑائی جھگڑے شروع ہوئے اور ایک طوفان بدتمیزی برپا ہو گیا۔ دونوں ہی ایک دوسرے سے نفرت اور بائرن سے جونی محبت کرتی تھیں۔

بائرن نے پہلے پہل تو ذاتی سکون کی خاطر ایک بجزے میں وقت گذارنا شروع کیا لیکن جب معاملہ مزید بگڑا تو اس نے مارگریٹا کو واپس چلے جانے کا حکم دے دیا۔ شوہر اور گھر کو ٹھکانے والی مارگریٹا کے پاس خود کشی کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس نے خود کو نہر کی لہروں کے حوالے کر دیا تاہم بعد میں

اسے بچالیا گیا۔

☆.....☆

آرمینیا میں قیام بھی لاڈ بازن کے لیے بہت شاندار تھا۔ وہ آرمینیائی ثقافت سے بہت متاثر تھا۔ قادراچ اوگریں سے آرمینیائی زبان و بیان سیکھنے کے ساتھ ساتھ اس نے زبان اور تاریخ پر مشتمل کئی سینئرز میں شرکت کی۔ یہ وہی اس حد تک بڑھ گئی کہ اس نے انگریزی اور آرمینیائی کرامر پر مشتمل لغت بنانے کی تیاریاں بھی شروع کر دیں۔

1817 میں بھی ایک معروف سال تھا۔ روم کا سفر و غیر میں رہائش Childe Harold's Pilgrimage کے باب، نوٹنگھم شائر میں Newstead کے فروخت کے قانونی مراحل نے اسے بہت الجھائے رکھا۔ زندگی میں کچھ ٹھہراؤ آیا تو تحقیقی صلاحیتیں بھی ٹھہر کر سامنے آئیں۔ اسکے برس Don Juan پر کام شروع کیا جس نے اسے شہرت کی نئی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ یہ تعریف بازن کا شاہکار اور انگریزی ادب کی طویل نظموں میں 'جان ملٹن' کی شہرہ آفاق کتاب پیراڈائر لوسٹ کے مساوی معیار کی بھی جاتی ہے۔

ڈان وان ایک لہجہ افسانوی کردار ہے۔ ابتداء میں اس کردار کو انجین کے ڈراما نگار نے الفاظ کے روپ میں ڈھالا تھا جو اس قدر مقبول ہوا کہ جس مخالف میں بے انتہا دلچسپی رکھنے والے افراد کی جتنی جاتی علامت بن گیا۔

بازن نے اس کردار کے ساتھ ایک نیا تجربہ کیا۔ اب تک تو اسے خواتین پر غریبہ ہو جانے والوں کی علامت سمجھا جاتا تھا لیکن بازن کا یہ کردار بہت مصوم فطرت تھا۔ خواتین خود اس کی طرف مائل ہوئیں اور نت نئے ہتھکنڈے آزما کر اسے اپنے دام فریب میں جکڑ کر لیتیں۔ ڈان وان کا یہ نیا روپ قارئین کے دلوں میں گھر کر گیا اور اپنے ساتھ بازن کو بھی دائمی لا ذوال شہرت عطا کر کے امر بنا گیا۔

وقت پر لگا کر گذر رہا تھا۔ بازن کا قلمی سفر کامیابی اور شہرت کے ذینے طے کرتا رہا۔ اس کے رومانوی معاملات بھی زوروں پر تھے۔ اس کے سحر اور کشش سے کوئی بھی بچ نہ پاتا۔ Don Juan کے مزید باب تخلیق کرنے کے ساتھ ساتھ The Revenna Diary اور My Dictionary and Recollections مکمل کیے۔ اسی دوران بازن کا ناشر تھامس مور بھی کئی بار اس سے ملنے کے لیے آیا۔

”میں تمہارے کام اور طریقہ کار سے بہت خوش ہوں تھامس!“ بازن نے فرخاندی سے کہا۔

”تمہاری ذرہ نوازی ہے میرے دوست اور تمہاری تخلیقات کی اشاعت میرے لیے ایک اعزاز ہے۔ قارئین تمہیں پڑھنا چاہتے ہیں۔ تمہاری نظمیں ان کے دلوں کی دھڑکن بن جاتی ہیں۔“

بازن فر سے مسکرانے لگا۔ ”اب میں تمہارے ذے ایک اور کام لگانا چاہتا ہوں۔“

”مجھے خوشی ہوگی۔“

”میں اپنی خود مختار رقم کرنا چاہتا ہوں۔ اس کا عنوان Life and Adventures ہوگا۔ اس کتاب کو ایک شاہکار بنانا ہے۔ میں اپنی زندگی کا کوئی بھی گوشہ اور محفل نہیں رکھنا چاہتا۔“

”بہت زبردست خیال ہے۔ یہ ایک بیسٹ سلیر ثابت ہوگی۔“

”اس پر کام شروع کرو اور میرا مکمل تعاون تمہیں حاصل ہوگا۔“

تھامس مور بخوشی رضامند ہو گیا۔ اس کتاب کی اشاعت کا رد باری نقطہ نظر سے بھی اس کے لیے بہت فائدہ مند ثابت ہوئی۔ وہ مستقبل میں اپنی پانچوں انگلیاں بھی میں محسوس کر کے بہت پرجوش ہونے لگا۔

☆.....☆

لاڈ بازن کے لیے راوی جین ہی جین لکھ رہا تھا۔ شیلے اور میری کے ساتھ قیام نے اس کے مزاج پر بھی بہت خوشگوار اثر ڈالا۔ وہ دوپہر گئے نیند سے بیدار ہوتے شام چھ بجے تک بیٹھے کہیں جاتے، قریبی جنگلات کی سر کر تے۔ ڈنر کے بعد صبح چھ بجے تک بھر محفل جتنی اور ادبی خیالات پر بحث و مباحثہ ہوتے۔ اپنی نئی تخلیقات ایک دوسرے کو دکھا کر اس میں مزید نکھار بھی پیدا کیا جاتا۔

اس رہائش گاہ میں حسب معمول بازن کے ساتھ ڈھیروں ملازمین کے علاوہ دس عدد گھوڑے، آٹھ جیسیم کتے تین بندر پانچ بلیاں، ایک خیل، ایک کوا اور عقاب بھی اٹھانے ہی کی طرح رہتے۔ گھوڑوں کے سوا سبھی چرند و پرند مگر میں آزادانہ گھومتے پھرتے۔ دکھائی دیتے۔ جانوروں سے اس کی محبت ویسے بھی مثالی تھی۔ دس سال قبل Boatswain کی وفات پر اس نے مقبرہ بنوانے کے بعد اپنی تدفین بھی اسی مقام پر کرنے کی وصیت تک لکھ دی تھی۔

لی ہنٹ اور شیلے کی دوستی اس کے لیے بہت توانا جذبوں کا سرچشمہ تھی۔ اس مغلظم نے The Liberal نامی اخبار کے اجراء کے لیے منصوبہ بندی کر لی۔ 1822 میں اٹلی آمد کے بعد اس کا مزاج بہت مثبت ہو گیا۔ وہ ڈنر پارٹیز منعقد کرنے لگا۔ ان دنوں اس پر زندہ دلی خوش اخلاقی اور عیش و نشاط کا غلبہ تھا۔ انہوں نے مشترکہ طور پر ساحل پر ایک گھر کرائے پر لیا اور دوستوں کا جہاز تعمیر کروانے لگے۔ بازن اپنی ذاتی کشتی خریدنا چاہتا تھا، ایک مشترکہ دوست کینیڈن ڈینیئل روبرٹس نے اس کے لیے کشتی ڈیزائن کی اور تعمیر شروع کر دی۔ اس کا نام The Bolivar رکھا گیا۔ ان کے ارادے بہت بلند اور منصوبے بے شمار تھے لیکن شیلے کی حادثاتی موت سے سب کچھ ٹھہر گیا۔

☆.....☆

ان سبھی دوستوں کو سمندر سے عشق تھا۔ تیراکی اور کشتی رانی بھی پسندیدہ مشغلہ تھا۔ آٹھ جولائی 1822 کو مقامی طور پر موسم میں تبدیلی اور سمندری طوفان کی پیش گوئی بھی کر دی گئی تھی۔ اس روز سفر کرنے کی کوئی خاص ضرورت بھی نہ تھی لیکن یہ موت کی عداوتی جی جو شیلے اور ایڈورڈ ولیمز کو سفر پر اکسار رہی تھی۔ وہ کسی کے روکنے سے نہ روکے۔

سمندر میں انہیں طوفان نے آلیا۔ شیلے کی نقش دریافت ہوئی تو اس کی شناخت صرف کپڑوں اور جیب میں موجود جان کیس کی شاعری کی چھٹی سی کتاب سے ہوئی۔ اس کے ختم کے کئی حصے سمندری مخلوق چاکر غائب کر چکی تھیں۔

بازن پر اس حادثہ کا گہرا اثر ہوا۔ اس کا دل یکدم ہر شے سے اجاٹ ہو گیا۔ شیلے کی موت سے قبل وہ دسیوں طویل نظمیں تخلیق کر کے پسندیدگی کی سند حاصل کر چکا تھا لیکن اس سانحہ کے بعد وہ بچہ سا گیا۔ اب پہلی جیسی تھیں جتنی تھیں اور نہ ہی ادبی بحث و مباحثہ ہوتے۔ ہر شخص پر جو طاری ہو گیا۔ بازن اس مٹھن زدہ ماحول میں نہیں رہنا چاہتا تھا۔ 1823 میں اس نے ضروری تیاریوں کے بعد اپنی کشتی ایک مقامی نواب کے ہاتھوں فروخت کی اور جینوا چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس کی اگلی منزل یونان تھی۔ اس کے سر میں ایک نیا سودا سا گیا۔ ان دنوں یونان اور ترک حکومت حالت جنگ میں تھے اور بازن اپنی زندگی میں چھائے کھر کو ختم کرنے کے لیے اس جنگ میں غلبي حصہ لینا چاہتا تھا۔ اس فیصلہ پر عمل

کرنے میں واحد رکاوٹ مقامی نواب کی بیٹی ٹریسا تھی جس نے بازن کی محبت کے لیے اپنا گھر بار اور شوہر چھوڑ دیا تھا۔ اس کی جینوا سے روانگی ٹریسا کے لیے ناقابل برداشت سانحہ تھی۔ وہ روتی دھوتی ہوئی بندرگاہ تک پہنچ گئی جہاں ہر کوئیں پر سوار بازن نے یونان کے لیے روانہ ہونا تھا۔

قارئین متوجہ ہوں

پرجا نہیں ملتا

پانچہرے سے بعض مقامات پر یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرجا نہیں ملتا۔ انجینوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرجا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر چاوستیاب نہ ہو۔

☆ شہر اور علاقے کا نام۔

☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

شمر عباس 0301-2454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سینس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت

63-0301-2454188

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

ٹریا کی خستہ حالت دیکھ کر بائرن کا دل پہلی بار کسی کے لیے سچ گیا۔ اس نے جہاز کے کپتان سے خصوصی درخواست کے بعد چند چھٹات کے لیے واپس بندرگاہ کی طرف مڑنے کے لیے کہا۔ وہ ٹریا کو مسافر بنانا چاہتا تھا لیکن بندرگاہ پہنچنے پر غم ہوا کہ وہ مایوس ہو کر واپس جا چکی ہے۔ اب وہاں ٹھہرنے کا کوئی جواز نہیں تھا اس لیے خاموشی سے ایک بار پھر سفر کا آغاز ہو گیا۔

یونان پہنچ کر ایک ہنگامہ خیزی شروع ہو گئی۔ بائرن نے یونانی بحری بیڑوں کی مرمت کے لیے چار ہزار پاؤنڈ فراہم کر کے مقامی لوگوں اور فوج کا دل جیت لیا۔ 28 دسمبر 1823 کی رات یونانی سرزمین کی جانب سفر کے دوران ان کے جہاز کو عثمانی سلطنت کے جنگی جہاز نے گھیر لیا تاہم کوئی خطرناک صورت حال پیش نہ آئی۔ بائرن نے مزید سفر کے لیے راستہ تبدیل کر لیا اور پانچ جنوری 1824 کو مغربی یونانی علاقے "میسولونگی" پہنچ گیا۔

بائرن ہر ممکن طریقہ سے ان کی مدد کرنے کا فیصلہ تو پہلے ہی کر چکا تھا اس لیے ریچڈیل میں اپنی جائیداد فروخت کروائی اور 11,250 پاؤنڈز کی رقم فراہم کر دی۔ اس سخاوت کے بعد اس کے پاس بیس ہزار پاؤنڈز بچے تھے۔ اس رقم کو اگر جدید تناظر میں دیکھا جائے تو وہ کروڑ پتی تھائیں باقی ماندہ رقم بھی بائرن نے مناسب وقت آنے پر اسی مقصد کے لیے خرچ کرنے کی منصوبہ بندی کر لی تھی۔

اس سببہ سخاوت کی خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیلی۔ یونان جیسے غریب اور جنگ زدہ ملک میں ایک برطانوی نواب کی بحیثیت فوجی آمد اور مقامی معاشی مدد کوئی معمولی بات ہرگز نہیں تھی۔ مقامی لوگوں نے شہر کی گلیوں کی طرح اسے اپنے گھیرے میں لے لیا اور اپنے چھوٹے چھوٹے مسائل کے حل کے لیے بھی اسی سے رقم طلب کرنے لگے۔

کچھ عرصہ مزید گذرا تو بائرن پر بہت سی حقیقتیں کھل گئیں۔ یونانی ترک حکومت کے خلاف جنگ سے زیادہ اسے اندرونی معاملات میں الجھے ہوئے تھے۔ ملک میں خانہ جنگی کی سی کیفیت تھی۔ مذہبی رواداری کا کہیں بھی نام و نشان نہیں تھا۔ وہ مایوس ہونے لگا۔

انہی دنوں اس کی ملاقات ایک نو سالہ ترک لڑکی "پوٹوس" ہوئی۔ اس کے والدین یونانیوں کے ہاتھوں مارے جا چکے تھے۔ مذہبی منافرت اس قدر بڑھ چکی تھی کہ یونانی

عیسائی کسی بھی ترک مسلمان کا وجود برداشت کرنے کے روادار ہی نہ تھے۔ بچے پورے جوان مرد و عورتیں بلا تخصیص اور بے دھرم قتل کر دیے جاتے تھے۔ وچرل کے لیے صرف ان کا مسلمان ہونا ہی بہت تھا۔ بائرن نے بچی کو گود لینے کا فیصلہ کر لیا اور خانقاہی نقطہ نظر کے تحت اسے ایک دوسرے علاقہ میں منتقل کر دیا۔

کئی بھی جنگ میں حصہ لینے کا عمل بظاہر بہت پرکشش اور توانا محسوس ہوتا ہے۔ دل میں انگلیں جمانے لگی ہیں۔ اپنے متعین کردہ مقصد کے لیے کٹ مرنے کا جذبہ اور آزادی کے سہانے خواب بھی دل لگاتے ہیں لیکن جب عملی طور پر اس عمل سے گذرا جائے تو اعصاب کا اصل امتحان شروع ہوتا ہے۔ جنگ میں سب سے پہلے اخلاقیات اور اقدار کا خاتمہ ہوتا ہے۔ انسان حیوانیت کے درجے تک جا پہنچتا ہے۔ لہو کی چاٹ اسے اپنے ہی جیسے انسانوں کی بے رحمی کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ جنگ کی تباہیاں جھیلنا ہرگز آسان نہیں ہوتا۔ بائرن کے لیے بھی ایسی ہی صورت حال تھی۔ اس دوران اس کے قلم نے بہت سی تعلیمیں رقم کیں جو اساعت کے بعد پندرہ صدی تک بھی پاتی رہیں۔

بائرن کی اخلاقی بے راہ روی بھی جوں کی توں برقرار تھی۔ یونان پہنچ کر تو اس میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ اعصابی سکون اور وقتی خود فراموشی حاصل کرنے کے لیے اس نے نا بالغ لڑکوں کا استحصال شروع کر دیا۔ ستم ظریفی تو یہ بھی کہ کئی لڑکے خود ہی اس کی جانب کھینچے چلے آتے تھے۔ ایسے ہی ایک مقامی لڑکے پر وہ اس بری طرح فریفتہ ہوا کہ اس کی خوراک لپاس سمیت ہر قسم کی ضروریات اپنے ذمہ لے لیں۔ مختصر عرصہ میں ہی بائرن نے اس پر چھو پاؤنڈز لاد دیے جو موجودہ وقت میں 24,600 برطانوی رقم کے مساوی ہیں۔

کولونو جیراڈ نامی چودہ سالہ لڑکے کے لیے وہ اس قدر سنجیدہ ہوا کہ اس سے اطالوی زبان سیکھنے کے ساتھ ساتھ اسے تعلیم و تربیت کے لیے عیسائی خانقاہ میں داخل کر دیا اور اپنی وصیت میں اس کے لیے سات ہزار برطانوی سکے مقرر کر دیے۔

رومانوی معاملات کے ساتھ اس نے مایوسی کے باوجود یونان آمد کا مقصد فراموش نہیں کیا تھا۔ ایک مقامی حریت پسند کے ساتھ مل کر ترک قبضہ میں موجود ایک قلعہ پر حملہ کرنے کا

منصوبہ بنایا گیا۔ بائرن نے اپنی صلابت پر ایک شخص کو توپ خانہ کے معاملات چلانے کے لیے ملازم رکھا۔ اسے فوجی مہمات کا کوئی تجربہ نہیں تھا لیکن یونانی باغیوں کی فوج کی کمان سنبھال کر اس نے جنگ میں عملی حصہ لینا شروع کر دیا۔

فردی انصاف سفر طے کر چکا تھا۔ قلعہ پر قبضہ کی مہم کی تیاریاں آخری مراحل میں پہنچ گئیں لیکن بائرن کی طبیعت اچانک بہت خراب ہو گئی۔ ان دنوں علاج کے لیے ایک خصوصی طریقہ بہت مقبول تھا۔ مریض کے جسم سے خصوصی اوزاروں کی مدد سے خون نکالا جاتا۔ فاسد خون کے اخراج کے بعد جسمانی نظام بھلا چکا ہو جاتا تھا۔ بائرن کے ساتھ بھی یہی طریقہ آزما یا گیا۔ ممکن ہے کہ یہ طریقہ علاج دیگر افراد کے لیے بہت فائدہ مند ثابت ہوتا لیکن بائرن کی پیش و طرب پر مقتول زندگی نے اسے جسمانی طور پر پہلے ہی بہت کھوکھلا کر رکھا تھا۔ اس اجراء کے بعد وہ مزید نقاہت میں مبتلا ہو گیا۔

کچھ وقت گذرا تو وہ جزوی طور پر صحت یاب ہو گیا لیکن اپریل کا آغاز ہوتے ہی اسے سردی نے دوبارہ لیا اور شدید بخار کے باعث وہ ایک بار پھر عضو معطل بن کر بستر سے لگ گیا۔ اس کا معالج "جوئیس وان میلنگن" اس صورت حال پر بہت پریشان تھا۔ جوئیس نے ایک بار پھر سابقہ طریقہ علاج پر عمل کیا۔ اب یہ بائرن کی بد قسمتی کہ یہی معالج کی پیشہ وارانہ کوتاہی۔ اس علاج میں استعمال ہونے والے لمبی اوزار جراہیم سے پاک نہ تھے۔ بائرن کے زخم بگڑ گئے۔ ان میں نقصان اور پیچیدہ پیدا ہوئی تو اس کی حالت مزید خراب ہو گئی۔

لاکھوں دنوں کو اپنی شاعری سے کرما دینے اور ہر ایک کو اپنی شخصیت کے سحر سے دیوانہ کر دینے والا ریچڈیل کا چھٹا نواب جارج گورڈن بائرن یونان کے اس جنگ زدہ علاقے میں نقاہت و درداور بدبودار زخموں کی اذیت جھیلنا بستر مرگ پر موجود تھا۔ اس کٹھن وقت میں اس کی شہرت اتفاق دے رہی تھی نہ ہی اب تک کی جانے والی سیکڑوں محبتیں۔ وہ اپنی موت کی آہٹیں سننے لگا تھا۔ آسمان پر اس کی آمد کا تقاریر چکا تھا۔ انیس اپریل 1824 کو شہرت، عزت، محبت، شاعری، عیش و نشاط وہیں دھڑے دھڑے اور صرف چھتیس سال کی عمر میں فرشتہ اجل خاموشی سے اس کی روح قبض کر کے اسے اصل مقام تک لے گیا۔

☆.....☆

مؤرخین لکھتے ہیں کہ اگر بائرن کی زندگی میں یونان کو

آزادی مل جاتی تو اس کی خدمات مد نظر رکھتے ہوئے اسے بادشاہت عطا کر دی جاتی تاہم اگر غیر جانبداری اور منطقی بنیادوں تک بائرن کی یونان آمد کے بعد حالات کا جائزہ لیا جائے تو ایک نتیجہ آسانی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اس کی ذات سے جنگ میں کوئی عسکری فائدہ نہیں ہوا تھا۔

بائرن نے اپنی زندگی میں کبھی خواہشات کی تکمیل کی۔ یونان میں اس کی موجودگی کا مقصد حریت پسندوں کو فائدہ پہنچانا تھا اور وہ اس مقصد میں جزوی طور پر کامیاب ضرور ہوئے۔ عملی طور پر وہ کسی یونانی علاقے کو فتح دلا سکا نہ ہی ان کی خانہ جنگی ختم کر کے اتحاد پیدا کر سکا۔ اسے صرف اخلاقی اور انسانی بنیادوں پر ہی کامیاب قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس نے اپنی دولت ان لوگوں کی مدد اور قلاع کے لیے جھوک دی۔ ایسے حالات میں اس کی موت نے عالمی برادری کی توجہ بھی اپنی جانب کھینچی۔ ریچڈیل کے نواب اور انگریزی زبان کے صف اول کا شاعر کمپیوٹر کی حالت میں زندگی کی بازی ہار تو گئی دیگر اقوام کی ہمدردیاں بھی یونان کے ساتھ ہو گئیں۔

یونانی اس کی جرأت، بہت اور فاضی کو یاد کرتے ہوئے خون کے آنسو رونے لگے۔ اس کی لاش حوط کر دی گئی۔ اخلاقی تقاضا یہی تھا کہ میت اس کی آبائی سرزمین انگلستان بھیج دی جائے۔ وہی انگلستان جہاں سے خود ساختہ جلاوطنی اختیار کر کے وہ جگر گھومتا رہا۔ یونانی اس سے بے حد محبت کرنے لگے تھے اور اپنے اس ہرودی کوئی نہ کوئی نشانی بھی اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے۔ لاش حوط کرتے وقت اس کا دل الگ محفوظ کر لیا گیا۔ یونانیوں کا خیال تھا کہ وہ بہت خوبصورت اور لازوال دل کا مالک ہے اور اسی کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک پرانی جنگ لڑنے چلا آیا۔ یونان کے قومی شاعر نے اس کی خدمات کے اعتراف میں ایک نظم To The Death of Lord Byron لکھ کر خراج تحسین پیش کیا۔

بائرن کی حوط شدہ لاش اس کے ایک خصوصی ملازم Tita کے ہمراہ انگلستان پہنچی تو ایک کھرام برپا ہو گیا۔ تابوت میں اس کے آخری دیدار کے لیے ایک خلعت اٹھ آئی۔ برطانوی حلقوں میں اسے ہیرو کا درجہ مل گیا۔ دوروزنیک عوامی دیدار کے بعد آخری رسومات ادا کر دی گئیں اور سینٹ میری کیٹھالون چرچ کو مقیم شاعر میں دفنا دیا گیا۔ قبر پر سنگ مرمر کی سلیب یونانی بادشاہ نے بطور خاص پیشگی۔ انگریزی شاعری اور ڈراما نویس کا ایک عہد خاک نشین ہو گیا۔

فلم نگری

سپر اسٹار

انور فرہان

جب بھی پاکستان کی فلمی صنعت کا ذکر چھڑے گا تو ایک نام تواتر سے سامنے آئے گا جس نے فلمی شاعری کا ایک سنہرا باب، جداگانہ انداز کے گیتوں سے رقم کیا۔ افسوس کا مقام تو یہ ہے کہ ہماری نئی نسل ان ناموں سے واقف ہی نہیں جنہوں نے کم وسائل کے باوجود پاکستانی فلمی صنعت کو اوج پر پہنچایا۔ ایسا ہی ایک نام زخمی کانہوری کا ہے۔ اس نامور گیت کار کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے ایک مختصر سنی تحریر۔

قلم کے جادو سے کانوں میں رس گھولنے والے گیت کار کا تذکرہ

کچھ ادبی کتابیں، کچھ مذہبی کتب کا مطالعہ کرتے تھے اور ایک بڑا طبقہ تھا جو نثری ادب یا پاپولر لٹریچر پڑھتا تھا۔ پڑھنے والوں میں مرد و خواتین بھی ہوتے تھے اور کس نوعمر طالب علم بھی۔ میں نے اپنے بچپن میں اپنی ایک چچی کو

اللہ شوق دے تو کتابیں پڑھا کر دو
ایک دور تھا جب لوگ ایسے مشورے دیتے تھے اور
اوکھ ان پر عمل بھی کرتے تھے۔ پڑھنے والوں کی مختلف
یکجیڑی ہوتی تھی۔ کچھ علمی نوعیت کی کتابیں پڑھتے تھے،



ہے۔ اس کے لیے کوئی یادگار تقریر نہیں کی گئی۔ مجسمہ ٹرینیٹی کالج کی لائبریری میں نصب کر دیا گیا ہے۔ ”ہوب ہاؤس ایک عظیم شاعر کی ایسی بے قدری پر بہت افسردہ تھا۔“

انگلستان میں یہ نظر اندازی ایک طرف لیکن یونان میں نیشنل گارڈن کے باہر ایک مجسمہ نصب کر دیا گیا جس میں ایک عورت ہائرن کو تاج پہناتے دکھائی گئی۔ فرانسیسی مجسمہ سازوں کی محنت اور مہارت نے اسے لازوال حیثیت عطا کر دی۔ مقامی طور پر اسے megalos kai kalos (عظیم اور اچھا انسان) کا خطاب دیا گیا۔

بیسویں صدی کا آغاز ہوا تو انگلستان کے ادبی حلقوں نے ہائرن کے لیے صدائے احتجاج بلند کرنی شروع کر دی۔ اخبارات میں کالم شائع کئے گئے جس میں ایک نہایت تلخ حقیقت کی جانب توجہ مبذول کرانی گئی کہ ہائرن کے ہاتھ کتے بوٹسوں کے لیے ایک مقبرہ موجود ہے لیکن خود ہائرن جیسے شہرہ آفاق شاعر کے لیے کوئی یادگار تک موجود نہیں۔ انگلش حکومت کو اس شرمناک حقیقت کا احساس ہوا تو Westminster Abbey میں اس کے لیے ایک یادگار تعمیر کرنے کی منظوری دے دی۔ اسکول کے بچوں نے اس موقع پر بہت تعاون کیا اور اپنے محبوب شاعر کے لیے چھو بھی اکٹھا کیا۔

لارڈ ہائرن کی ذاتی زندگی کے تضادات سے قطع نظر اسے ہمیشہ ذہن شاعر تسلیم کیا جاتا رہا۔ انگریزی ادب براس کا اثر اس قدر طاقتور ہے کہ ایک ایسے نئے ہیر و کو الفاظ اور کردار میں ڈھال لایا گیا جس کی ذاتی زندگی عام لوگوں کی طرح تھی۔ اس کے کردار میں بشری کمزوریاں بھی تھیں لیکن وہ ذہن و وطن تھا۔ سماج کی تبدیلی کا خواہشمند بھی تھا لیکن اس کا ماضی و افکار ہوتا۔ فطرت باغیانہ ہوتی تو تکبر ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی جلا وطنی دور اندیشی کی کمی بھی اس کی خصوصیات ہوتیں۔ یہی تشریح لارڈ ہائرن کی ہے اور انہی خصوصیات پر مبنی کردار ادب اور سیاست کا ایک ان مٹ حصہ بن گیا۔

جارج گورڈن ہائرن عہد شباب میں چھتیس بہاریں دیکھنے کے بعد عدم سدھار گیا لیکن قارئین کے دلوں میں اپنے ان مٹ نقوش چھوڑ گیا۔ ایک غیر فطری اور باغی زندگی جینے والا ہائرن اگر مزید زندہ رہتا تو ادب اور شاعری میں مزید تہلکہ خیز تخلیقات کا اضافہ کرتا یا رومانوی معاملات میں نئی داستانیں رقم کرتا؟ کون جانے؟

☆.....☆

تھامس مور کو اپنی ذمہ داری اب بھی پانچویں لارڈ ہائرن کی خود نوشت منظر عام پر لانے کا بہترین وقت آ گیا تھا۔ اس نے کچھ اہم پہلوؤں پر بات چیت کے لیے ہائرن کے قریبی دوست ہوب ہاؤس سے رابطہ کیا۔

”ہائرن کی آخری خواہش کی تکمیل کے لیے یہی بہترین موقع ہے۔“ اس نے اپنا جواب بیان کیا۔

”اس کی آخری خواہش کیا تھی بھلا؟“

”وہ اپنی خود نوشت Life and Adventures منظر عام پر لانا چاہتا تھا۔ میں نے کتاب کے کچھ ڈرافٹ تیار کر لیے ہیں اور کچھ کی تیاری میں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ مجھ سے جلد از جلد ملاقات کرو۔ مسودات ساتھ لے آؤ اور اس کتاب کا کسی سے بھی تذکرہ نہ کرنا۔“

تھامس مور پر جوش ہو گیا۔ یہ کتاب کاروباری نقطہ نظر سے بلاک مسر جابت ہوتی۔ وہ اپنے تمام مسودات لیے ہوب ہاؤس کے پاس پہنچ گیا جس کے چہرے پر بہت سنجیدگی اور سختی طاری تھی۔ اس نے مسودات لے کر کرائس دان میں پھینک دیے۔

”یہ کیا کر دیا احمق انسان! میری سالہا سال کی محنت برباد کر ڈالی۔“

”حق میں نہیں تم ہو۔“ ہوب ہاؤس نے قتل سے کہا۔ ”تم بھی میری طرح ہائرن کے دوست رہے ہو۔ میں یہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کی زندگی کے حساس اور متنازعہ پہلوؤں پر میری عام کر دیے جائیں۔ وہ جو بھی تھا جیسا بھی تھا اب اس دنیا میں نہیں رہا اور میری دوستی کو یہ گوارا نہیں کہ عوام اس کے نجی معاملات کو ہتھیارے لے کر بیان کرے۔ جب تک میں زندہ ہوں ایسا بھی نہیں ہونے دوں گا۔ کاروباری مفاد مت دیکھو۔ ایک دوست کی حیثیت سے سوچو۔“

”ٹھیک کہہ رہے ہو۔ لیکن ایسا کب تک ہوگا؟ کبھی نہ کبھی تو اس پر لکھا جائے گا اور اس وقت ہم کیسے روک پائیں گے؟“

”تب تک بہت وقت گزر چکا ہو گا۔ تنازعات کی شدت اور واقعات پر گرد بیٹھ گئی ہو گی۔ اس وقت ہائرن کی ذات پر مبنی اثر نہیں پڑے گا۔ اب تم خود دیکھ لو اتنا عرصہ گزر چکا ہے ہم بھی دوستوں نے ہزاروں پاؤنڈ زائے کر کے مجسمہ تعمیر کروایا لیکن حکومتی سطح پر اسے اب بھی نظر انداز کیا جا رہا

زندگی نامہ

نام: جمیل احمد
 قلمی نام: ذہنی کانپوری
 پیدائش: کانپور (بھارت)
 سن پیدائش: 18 اگست 1938ء
 والد: ظہور احمد مرحوم
 تعلیم: ایم اے، ایل ایل بی 1978ء
 ملازمت: پہلی ملازمت بطور کلرک پاک بحریہ میں
 کی جو 1962ء میں شروع ہوئی اور 18 برس تک
 جاری رہی اور دولت شروع کرنے کے بعد ختم ہوئی۔
 شادی: 1956ء میں ہوئی۔
 البیہ: بالوتیکم
 اولاد: تین صاحبزادیاں، ماشاء اللہ شادی شدہ ہیں۔
 کتابیں: گیارہ۔ آٹھ ان کی زندگی میں شائع
 ہوئیں۔ تین انتقال کے بعد۔
 رشتے دار: دو بھائی اور دو بہنیں۔ جن میں ایک بھائی
 اور ایک بہن کا انتقال ہو چکا ہے۔
 انتقال بر ملا: 8 مئی 2011ء کو کراچی میں ہوا۔

دفتر کے قریب ہی ہے۔ آصف حسن صرف ادبی کتابیں
 چھاپتے تھے۔
 میں ان سے ملا اور ”رنگیلا“ کے بارے میں پوچھا تو
 بولے۔
 ”انور بھائی! میں فلمی کتابیں نہیں چھاپتا مگر بھائی
 جان (خالد بھائی) کے حکم پر اسے چھاپ رہا ہوں جو میری
 ہی دکان سے ڈسٹری بیوٹ ہوگی۔ یہ کتاب اس وقت پریس
 میں ہے۔“

اب جب میں خالد بھائی کے دفتر جاتا تو آصف حسن
 سے بھی دو چار گھڑی گپ شپ لگا لیتا۔ بہر حال ”رنگیلا“
 چھپ کر منظر عام پر آئی۔ اس کی سن اشاعت 2010ء
 ہے۔ جو اس کتاب میں کچھ اس طرح تحریر ہے۔
 ایڈیشن 2010ء۔ یعنی اس کے بعد بھی ایڈیشن چھاپی
 جائیں گی۔ اس کتاب کی اشاعت سے اس کے پبلشر کو
 خاطر خواہ فائدہ ہوا۔

”رنگیلا“ کی اشاعت کے کچھ عرصے بعد ایک دن
 آصف حسن نے مجھے بتایا۔ ”ذہنی کانپوری میرے پاس اپنی

ایک مضمون لکھا جاسکتا ہے؟“
 ”نہیں۔ خالد بھائی میرا یہ خیال نہیں۔“
 خالد بھی ایک دم خوش ہو گئے۔ پھر بولے۔ ”تو کیا
 آپ رنگیلا پر ایک نئی کتاب لکھ دیں گے؟“
 ”لکھ دوں گا..... مگر.....“

”آپ جانتے ہیں۔ میں قلم کا مزدور ہوں۔ لکھنا
 پڑھنا ہی میری روزی روٹی کا سہارا ہے۔ میں بلا معاوضہ یہ
 کام نہیں کر سکتا۔“
 ”میں جس طرح ”ڈور“ کی کہانیوں کا اعزاز یہ آپ کو
 اور دوسروں کو دیتا ہوں اسی طرح اس مخصوص کتاب کا بھی
 آپ کو معقول معاوضہ دوں گا۔“
 ”تو پھر ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں آج ہی سے
 اس کتاب پر کام شروع کر دیتا ہوں مگر تھوڑا وقت لگے گا۔“
 ”ہاں ہاں مجھے معلوم ہے کہ ایسی کسی کتاب کے لیے
 فیکس اور دیگر کی تلاش اصل مرحلہ ہوتا ہے اس کے لیے
 آپ کو وقت تو درکار ہوگا۔“

یہ وہ وقت تھا جب رنگیلا کا سورج غروب ہو چکا تھا۔
 اپنے عروج پر اور پھر زوال کا زمانہ دیکھ کر وہ اس عالم فانی سے
 عالم جاودانی کوچ کر چکے تھے۔ جیسے جیسے ان کے بارے میں
 مجھے مواد ملتا گیا میں نے اپنے خاص انداز اور اسلوب میں
 ان پر لکھنا شروع کر دیا اور پھر ایک دن کتاب مکمل ہوئی اور
 میں نے مسودہ خالد علی بھائی کو تصدیق دیا۔ وہ بہت خوش ہوئے۔
 چائے تو وہ ہر ملاقات میں پلاتے ہی تھے آج اپنے محبوب
 فنکار پر کتاب کا مسودہ وصول کر کے مارنے خوشی کے وہاں
 موجود ہم تمام لوگوں کا مدد بھی بٹھا کر آیا۔
 کچھ دنوں کے بعد میں نے پوچھا۔ ”رنگیلا“ کی
 اشاعت کس مرحلے میں ہے؟

”یہ تو آپ کو آصف حسن ہی بتائیں گے۔“
 ”کیوں؟ وہ کیوں نہیں بتائیں گے؟“
 مسکراتے ہوئے بولے۔ ”یہ میں آپ کو بتانا بھول
 گیا تھا۔ ان دنوں میرے پاس کتابوں کی طباعت کا بہت
 کام جمع ہو گیا ہے۔ اس لیے ”رنگیلا“ کو میں نے آصف حسن
 کے سپرد کر دیا ہے۔ وہی اب اس کتاب کو پرنٹ کریں گے۔“
 آصف حسن، خالد بھائی کے چھوٹے بھائی ہیں۔ ان
 کا ہندو بھی کتابوں کی طباعت و اشاعت ہے اور ان کی
 کتابوں کی دکان بھی ہے اردو بازار میں۔ جو خالد بھائی کے

ناول یا شوبز کی شخصیات اور واقعات پر مبنی کتابیں۔
 دوسری نوعیت کی کتابیں اب بھی چھپتی ہیں، جو خاص
 ادبی نوعیت کی ہوتی ہیں یا شاعری کے مجموعے۔ مگر اب یہ
 منافع خور پبلشر نہیں شائع کرتے۔ صاحب کتاب اپنی
 کتابیں خود طبع کر دیتے ہیں جن کی تعداد بہت محدود ہوتی
 ہے۔

شوبز کی شخصیات، حالات و واقعات پر مبنی کتابیں،
 کتابوں کا کاروبار کرنے والے ادارے کا ہے لگے شائع
 کرتے ہیں۔ ایسی کتابیں زیادہ تر لاہور میں شائع ہوتی ہیں
 جو معروف فلم جرنلسٹوں کی ہوتی ہیں۔ یاسین گوہر، طفیل
 اختر اور قابل راہی ایسے ہی چند کئے جئے رائٹروں کی کتابیں
 قابل ذکر ہیں۔ اب کراچی میں بھی کچھ برسوں کے دوران
 کئی فلمی کتابیں شائع کی گئی ہیں جن میں سب سے اہم نام
 ذہنی کانپوری کا ہے۔ اللہ انس فریقین رحمت کرے۔ ان کی
 آٹھ کتابیں ان کی زندگی میں شائع ہوئیں جب کہ ان کی
 وفات کے بعد بھی ان کی تین کتابیں ان کے پبلشر نے
 چھاپیں اور ان سے اپنی تجوری کا بیٹ بھرا۔

جس ادارے نے ان کی ساری کتابیں چھاپی ہیں
 اس نے ان کتابوں سے پہلے میری لکھی ہوئی ایک کتاب
 شائع کی تھی جو اداکار، ہدایت کار، فلم ساز، گلوکار اور نامور
 کامیڈین رنگیلا پر تھی۔

اس کتاب کے لکھنے اور چھپنے کی بھی ایک کہانی ہے۔
 ایک بک سٹر، پبلشر اور ایڈیٹر خالد علی صاحب ہوا کرتے ہیں
 جنہوں نے ایک دو ادبی ڈائجسٹ بھی نکالے اور ایک ہورر
 ڈائجسٹ، طویل عرصے سے نکال رہے ہیں۔ ”اس
 ڈائجسٹ“ میں، میں نے بھی طویل مدت تک ہر مہینے ایک
 کہانی لکھی۔

ایک دن خالد علی صاحب کہنے لگے۔ ”رنگیلا میرا
 فورٹ فنکار ہے۔ میں اس پر ایک کتاب شائع کرنا چاہتا
 ہوں۔ اس مقصد سے میں نے کئی فلمی صحافیوں سے کہا کہ
 رنگیلا پر ایک کتاب لکھ دو۔ سب نے ایک ہی جواب دیا۔“
 ”کیا جواب دیا؟“ میرا سوال تھا۔
 ”رنگیلا پر تو ایک آدھ مضمون ہی لکھا جاسکتا ہے۔
 کتاب نہیں۔“

”اچھا۔“ کہہ کر میں خاموش ہو گیا۔
 ”آپ بھی تو فلم جرنلسٹ ہیں۔“ خالد بھائی بولے۔
 ”کیا آپ کا بھی یہی خیال ہے کہ رنگیلا پر زیادہ سے زیادہ

مطلوعے کا شیدائی دیکھا۔ وہ گھر کے کام کاج کے ساتھ
 ناویں بھی پڑھتی رہتی تھیں۔ اکثر یاد رہی خانے میں چولہے
 پر ہانڈی چڑھا کر پڑھنا شروع کرتیں تو بھی کھارہوں بھی
 ہوتا کہ سنان جل بھن جاتا اور انہیں اس وقت ہوش آتا جب
 جلنے کی جھبک سے یاد رہی خانے کی فضا مسموم ہو جاتی۔ جب
 چچی صادق سر دھوئی یا ایم اے سلم کو فرش پر بچ کر ہانڈی کی
 طرف متوجہ ہوتیں۔ میرا مطلب ہے ان کے ناول کو رکھ کر۔
 ان دنوں ہر محلے میں ایک دو آنے لاہری ہوا کرتی
 تھیں۔ ذرا ٹھہریے میں پہلے آنے لاہری کی وضاحت
 کر دوں۔ آج کے قارئین کے لیے یہ بہت ضروری ہے
 جس طرح آج کل سٹیپوں کا ایک روپا ہوتا ہے، اسی
 طرح ان دنوں سولہ آنے کا ایک روپا ہوتا تھا۔ ایک آنے
 میں پڑھنے والے ان لاہریوں سے کتاب ایٹو کر کے
 گھر لے جاتے تھے۔ اس دور میں مردوں کا بھی یہ حال تھا
 کہ انہیں رات کو نیند نہیں آتی تھی جب تک وہ کچھ دیر تک
 مطالعہ نہیں کرتے تھے۔

اور جب این صفی کے ناول ”جاسوسی دنیا“ اور
 ”عمران سیریز“ کا دور شروع ہوا تو سارے پڑھنے والے
 ان کے دیوانے ہو گئے۔ میں بھی ان دنوں اسکول میں
 پڑھتا تھا اور مجھے ہر مہینے ان ناولوں کا انتظار رشمت سے
 ہوتا تھا۔ ہماری دوست آپس میں چندہ کر کے دونوں ناول
 خریدا کرتے تھے اور گھر کے لوگوں سے چھپ کر انہیں پڑھا
 کرتے تھے۔

لیکن اب..... اب پڑھنے والوں کی تعداد نہ ہونے
 کے برابر ہو گئی ہے۔ اب تفریح طبع کے لیے متعدد ذرائع
 ہیں۔ ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ نے سارے لوگوں کو اپنے
 جادوئی حصار میں جکڑ لیا ہے۔ اس صورت حال پر میرا ہی
 ایک شعر ہے۔

ایک ٹی وی بولتا رہتا ہے بس
 سب کتابیں شیلیٹ پر خاموش ہیں
 اب لوگ باگ آدھی رات تک ٹی وی دیکھتے ہیں۔
 کچھ لوگ اگر کچھ پڑھنا بھی چاہتے ہیں تو فیس بک پر پڑھ
 لیتے ہیں۔ بے چاری کتابیں منہ دیکھتی رہ جاتی ہیں۔
 کتابوں کی ایسی بے توقیری سے کتابوں کی اشاعتیں بھی
 متاثر ہوئی ہیں۔ اب پبلشر ذہنی کتابیں شائع کرتے ہیں
 جن سے انہیں فائدہ کی امید ہوتی ہے۔ ایسی کتابوں میں
 تفریح کی کتابیں زیادہ تر ہوتی ہیں۔ افسانوں کے مجموعے،

ماہنامہ سرگزشت

حیثیت سے بھی ہوتی ہے۔

ایک دن انہوں نے مجھے ایک مضمون دیا اور کہا۔
”اسے پڑھ کر بتائیے کیا ہے؟“
میں نے پڑھا۔ بہت اچھا تھا۔ اپنے موضوع کے لحاظ
سے بھی اور زبان و بیان کے اعتبار سے بھی۔ میں نے منبر
بھائی سے کہا۔ ”بہت اچھا ہے۔“
”فلم ایلیا کے آنے والے شمارہ میں شائع
کر دیجیے۔“

یہ زخمی کانپوری کی پہلی تحریر تھی جس سے میری پہلی
ملاقات ہوئی تھی۔ اس مضمون کی اشاعت کے بعد ہر ماہ
ایک نئی تحریر مجھے منبر بھائی کے توسط سے ملتی جو زخمی کانپوری
صاحب کی ہوتی تھی۔ وہ کون ہیں؟ کب آکر اپنی تحریر منبر
بھائی کو دے جاتے ہیں؟ مجھے اس کے بارے میں کچھ معلوم
نہیں تھا۔ میں نے بھی پوچھا بھی نہیں۔ بہت بعد میں مجھے
معلوم ہوا کہ زخمی صاحب کی تردناڑہ اور توانا تحریریں ایم
اے مفتی صاحب کے توسط سے آتی تھیں۔ پھر وہ خود آکر
دے جاتے تھے۔

آج کے قارئین کے لیے ایم اے مفتی صاحب کا
تعارف کرنا بھی ضروری ہے۔ ان کی وجہ شہرت فلم پہلشی کے
ماہر کی حیثیت سے تھی۔ وہ پہلی فلم انٹرنیٹ سے وابستہ رہ
چکے تھے۔ وہاں کی بیشتر فلموں کے علاوہ شہرہ آفاق فلم ”پکار“
کی بھی انہوں نے زبردست تشہیر کی تھی۔ اس زمانے میں
آج کی طرح ٹی وی چینلوں سے نہ پرنٹ میڈیا اتنا پورفل
تھا اس لیے فلموں کی پہلشی کا کام بہت مشکل تھا جو ایم اے
مفتی صاحب بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیتے تھے۔
برصغیر کے ہمارے کے بعد وہ پاکستان آگئے اور انہوں نے
کچھ پاکستانی فلموں کی بھی پہلشی کی پھر ریٹائرڈ زندگی
گزرانے لگے۔ وہ فلم ایلیا میں اکثر اپنی یادداشتیں لکھا
کرتے تھے۔ منیر حسین کی طرح دیگر صحافیوں سے ان کے
اتنے اور دوستانہ مراسم تھے۔ مفتی صاحب ناظم آباد کراچی
میں رہتے تھے۔ اب یہ شخص اتفاق تھا کہ زخمی کانپوری ان
کے پڑوسی تھے۔ زخمی کانپوری اکتوبر 1947ء میں پاکستان
آگئے تھے اور مختلف محلوں اور علاقوں سے ہوتے ہوئے آخر
کار ناظم آباد میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ پڑوسی جب ایک
دوسرے سے ملنے ملائے ہیں تو ان کو ایک دوسرے کے
زخمی صاحب سے مفتی صاحب ملے تو ان سے پوچھا۔

ماہنامہ مسرگزشت

”آپ کا کیا مشغلہ ہے؟“

زخمی صاحب نے کہا۔ ”تعلیم سے فارغ ہو کر
وکالت کر رہا ہوں اور کچھ لکھنے لکھانے کا شوق بھی ہے۔“
”یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ کیا لکھتے ہیں آپ؟“
پہلے تو وہ ذرا شرمائے، پھر ہنچکاتے ہوئے بولے۔
”فلمی مضامین لکھتا ہوں۔“
”تو اس میں شرمانے کی کون سی بات ہے؟ کہیں چھٹی
بھی ہیں تنہا ہی تحریر ہیں؟“

”جی نہیں۔“ زخمی بولے۔ ”میں یہاں کسی کو نہیں
چانتا۔ نہ ہی مجھے کوئی جانتا ہے پھر چھپنے چھپانے کی بات
کیسے ہوگی۔“

”چھپنے کے لیے کسی تعارف کی ضرورت نہیں۔“ مفتی
صاحب بولے۔ ”تحریر کا اچھا ہونا ضروری ہے۔ اچھی تحریر
خود اپنا تعارف ہوتی ہے۔“

بہر حال اس مفید مشورے کے بعد مفتی صاحب
بولے۔ ”اپنی کوئی تحریر مجھے دیں۔ میں اسے اشاعت کے
لیے کسی کو دے دوں گا۔ اچھی ہوگی تو چھپ جائے گی اچھی
نہیں ہوگی تو ردی کی نوکری کی خوراک بن جائے گی۔“

اس طرح زخمی کانپوری کا پہلا مضمون 1987ء میں
ماہنامہ ”فلم ایلیا“ میں شائع ہوا جو آنجنابی راجندر کرشن پر
لکھا گیا تھا۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس وقت زخمی کانپوری اپنی
عمری گولڈن جوبلی مکمل کر چکے تھے۔ حالانکہ اکثر لکھنے والے
اس عمر میں لکھنا ترک کر دیتے ہیں مگر زخمی کانپوری نے اس
وقت لکھنا شروع کیا اس کے بعد روزنامہ جنگ کراچی بہت
روزہ اخبار جہاں کراچی میں بھی زخمی کانپوری کے مضامین
مفتی صاحب ہی کے توسط سے پہنچتے۔ ان تحریروں میں اتنی
جان تھی کہ اگر وہ مفتی صاحب کے ذریعے نہ بھی پہنچتیں تب
بھی شائع ہوتیں۔

ان مضامین کی اشاعت کے بعد زخمی صاحب کے
مضامین کی اشاعت کا باضابطہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہ مختلف
اخبارات و رسائل میں پابندی کے ساتھ چھپنے لگے۔ جن
میں روزنامہ جنگ، اخبار جہاں اور فلم ایلیا کے علاوہ ہفت
روزہ نگار کراچی، پندرہ روزہ فاصلہ، ماہنامہ ٹی وی ناٹمز،
ماہنامہ رومان کراچی، ماہنامہ صبح نو کراچی، ماہنامہ روپ
کراچی، ماہنامہ نوائے فکیو، اشار ڈسٹ کراچی، آواز
وطن، ادبی جریدہ دنیا کے ادب کراچی کے نام قابل ذکر ہیں

فروری 2018ء

92

جب کہ سبھا لکھنؤ کے جریدہ افکار کے جوش نمبر میں بھی
زخمی کانپوری کا جوش کی فلمی نغمہ نگاری پر مضمون شامل ہے۔

ایک وقت آیا جب زخمی کانپوری سے رو بہ ملاقاتیں
ہونے لگیں۔ یہ وہ دور تھا جب بھائی الیاس رشیدی کے
انقلاب پر ملائی کے بعد مجھے ہر ہفتہ ایک دن نگار کے دفتر جا
کر ادارے لکھنا پڑتا تھا۔ ادارے کے علاوہ میرا ایک مضمون یا
کالم بھی ہر ہفتہ شائع ہوتا تھا جو میں کمرے کے لکھ کر لے جاتا
تھا۔ اس دوران بھائی زخمی کانپوری بھی مجھے کبھی کبھار اپنے
مضامین لے کر آتے تھے اور ہماری ملاقات ہوا جاتی تھی۔

عام لوگوں کے مقابلے میں قلم قبیلے سے تعلق رکھنے
والے لوگ مجھے اپنی طرف راغب کرنے میں زیادہ کامیاب
ہوتے ہیں۔ بشرطیکہ ان کا حراج میری طبیعت سے زیادہ
عطف نہ ہو۔ میں جس طرح زخمی کانپوری کی تحریروں سے
متاثر تھا اسی طرح بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ ان سے مل کر
مجھے اچھا لگا۔ بتائیں یہ میری اچھائی ہے یا برائی کہ میں اصل
مضمون تو نہیں، ان کی تحریروں سے متاثر ہوتا ہوں۔

زخمی کانپوری کی تحریروں میں مجھے جامعیت اور اپنے موضوع
سے بھرپور انصاف کا احساس ہوا۔ ان کے زیادہ تر مضامین
چونکہ فلمی شخصیتوں سے متعلق ہوتے تھے جن کے بارے میں
لکھنے سے پہلے وہ تحقیق و تصدیق میں بڑی دیا اندازی سے
عمل کرتے تھے اس لیے ان کی تحریروں نے مجھ جیسے بہت
سے لوگوں کو بہت جلد اپنا گردیدہ بنالیا۔ میں بر ملا اس بات کا
اعتراف کروں گا کہ اکثر مواقع پر میں نے حوالے کے لیے
ان کی تحریروں سے اکتساب کیا ہے اور اس لیے کیا ہے کہ ان
کی تحریروں کو ممبر سمجھتا ہوں۔

اردو کی فلم جرنلزم کے حوالے سے جب بات ہوتی
ہے تو بڑی باریکی ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں اس شعبے کو اہمیت
فی نہیں دی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ بہت کم اچھے لکھنے والے
سامنے آئے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا شو بڑی صحافت کا
معیار پست سے پست تر ہوتا گیا۔ اچھے اخبارات و جرائد
کے ساتھ ساتھ اچھے صحافی بھی خال خال ہی رہ گئے۔ اب تو
یہ عالم ہے کہ فلم جرنلزم سے وابستہ صحافیوں کی اکثریت صحیح
معنے میں نہیں لکھ سکتی جب کہ کسی موضوع پر لکھنے کے لیے ان
کے پاس مواد بھی موجود نہیں ہوتا وہ اس کی تلاش کے لیے
کوشش بھی نہیں کرتے۔ لکھنے کے لیے پڑھنا ضروری ہوتا
ہے جو آج کے لکھاری ضروری نہیں سمجھتے۔ زخمی کانپوری کے
ہاں نہ صرف کتابوں اور جرائد کا ذخیرہ تھا بلکہ وہ کتب

زخمی کانپوری کا مشن جاری ہے

زخمی کانپوری کی کوئی اولاد نہ رہی تھی اس لیے
وہ اپنے چھوٹے بھائی کے صاحبزادے فیصل کانپوری کو
اپنے بیٹے کی طرح چاہتے تھے اسی لیے اس کی تعلیم و
تربیت میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ انہی کی ذمہ داری فیصل
کانپوری نے کر جویشن تک تعلیم حاصل کی۔ ان کا یہ بیٹا
بھی ان سے بہت محبت کرتا ہے اور ان کے نقش قدم پر
چلتے ہوئے اس نے بھی جون 2011ء سے لکھنا شروع
کیا۔ اب تک اس کے 50 مضامین اخبارات و میگزین
کی زینت بن چکے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے زخمی
کانپوری کے مشن کو جاری رکھنے کی نیت سے قلم کاری
شروع کی ہے۔ وہ فلمی مضامین کے علاوہ نعت خوانوں پر
لکھتے ہیں اور کہتے ہیں نعت نگاروں اور نعت خوانوں کے
متعلق میرا یہ فلمی سفر جاری رہے گا۔ فیصل کانپوری شادی
شدہ اور تین بچوں کے باپ ہیں۔

حضرت بہزاد لکھنؤ کی فلمی نغمہ نگاری

عام لوگ حضرت بہزاد لکھنؤ کو ایک صوتی منش
اور عاشق رسول کی حیثیت سے جانتے ہیں مگر زخمی
کانپوری بتاتے ہیں کہ حضرت بہزاد لکھنؤ نے پہلی کی
45 فلموں کے فلمی گیت بھی لکھے تھے۔ ان کی ایک غزل
چلتا ہوا دیا ہوں مگر روشنی نہیں

آج بھی بہت شوق سے سنی جاتی ہے۔ یہ راج کپور کی
پہلی فلم بطور ہدایت کا ”آگ“ میں شامل ہے۔ زخمی کانپوری
کو خود بہزاد صاحب نے بتایا تھا کہ ایک دن راج کپور مجھ سے
اسٹوڈیو میں ملا اور کہنے لگے۔ میں ایک فلم بنانا چاہوں جس کا
نام میں نے ”آگ“ رکھا ہے۔ آپ اس کے گیت لکھیے۔ ٹی
الحال مجھے ایک البم غزل چاہیے جس میں مکیش کی آواز میں
رنگار ڈکراؤں گا جس کی موسیقی رام گنگوئی ترتیب دیں گے۔
وہ مجھے اپنے ساتھ لے گیا اور مجھے ساری پتویشن بھجوائی۔ میں
نے وہیں بیٹھے بیٹھے یہ غزل لکھ دی۔ راج کپور بہت خوش
ہوا۔ یوں تو فلم ”آگ“ کے تمام گیت بہت پسند کیے گئے مگر
یہ غزل نے حد قبول ہوئی۔ شاید اس غزل کا اثر ہی تھا کہ راج
کپور اور مکیش دونوں ہی ملک ہو گئے۔ نامور ادیب اور نقاد
مشفق خولجی کا کہنا ہے کہ یہ ایک کلاسیکل غزل ہے۔ ان کا یہ
کہنا ایک سنڈک حیثیت رکھتا ہے۔

فروری 2018ء

93

فروری 2018ء

PakDigestNovels.Com

خانوں اور لائبریریوں سے بھی اپنے لیے تحقیقی مواد حاصل کرتے تھے۔ جب کہ موجودہ شخصیتوں سے بالمشافہ ملاقاتیں کر کے بھی ان کے بارے میں معلومات جمع کرتے تھے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ انہوں نے جن شخصیتوں کے بارے میں تحقیقی مضامین لکھے ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جو گوشگمنائی میں تھے۔ انہیں ڈھونڈ نکالنا اور ان کے بارے میں ان کی گفتگو کی روشنی میں لکھنا حقیقتاً بڑے جان جوکھوں کا کام تھا جو ڈی کاپوری نے کیا۔

ڈی کاپوری نے برصغیر ہندو پاک کے نغمہ نگاروں سے متعلق ہی مضامین قلم بند نہیں کیے۔ موسیقاروں، گلوکاروں، گلوکاراؤں، اداکاراؤں، فلم سازوں اور ہدایت کاروں کے بارے میں بھی متعدد شخصیتوں پر لکھنے کے ساتھ ساتھ میگزینوں، مضمونوں، موضوعات پر مضامین لکھے ہیں۔ ایک دن میں نے ان سے کہا۔ ”آپ اپنے مضامین کتابی صورت میں شائع کیوں نہیں کرتے؟“

”اس سے کیا ہوگا؟“ انہوں نے پوچھا۔
”اس سے یہ ہوگا کہ وہ دستاویزی صورت میں محفوظ ہو جائیں گے۔ شائع ہونے سے بچ جائیں گے۔“
1987ء سے تادم مرگ وہ لکھتے رہے، لکھتے رہے، بقول شاعر

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خوں چکان
وہ لکھتے رہے اور اخبارات و جرائد میں ان کی تحریریں شائع ہوتی رہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ ان مضامین کو کتابی صورت میں شائع کرنے کی نیت سے انہیں ترتیب دیتے رہے۔ انہی دنوں کی بات ہے۔ انہوں نے ایک دن مجھ سے کہا۔

”میری تحریروں کے بارے میں اپنے تاثرات لکھ دیں۔“

اور ان سے جب اگلی ملاقات ہوئی تو میں نے ان کی تحریروں کے علاوہ ان کی شخصیت کے بارے میں بھی اپنے محسوسات ایک مضمون کی صورت میں لکھ کر انہیں پیش کر دیا۔

”اگر اللہ نے چاہا اور میری کتابیں کبھی شائع ہوئیں تو ان میں سے کسی ایک کتاب میں، میں آپ کی یہ تحریر شامل کروں گا۔“

اور حسب وعدہ جب ان کی کتابوں کی اشاعت شروع ہوئی تو میری یہ تاثراتی تحریر انہوں نے اپنی ایک کتاب میں

شامل کی۔ ان کی اس کتاب کا نام ہے ”ذکر جب چھر گیا“ اس کتاب کی سن اشاعت 2008ء ہے۔ یہ ڈی کاپوری کی تیسری کتاب ہے۔ اس سے پہلے شائع ہونے والی کتابیں یہ ہیں۔

1۔ مجھے سب یاد ہے ذرا ذرا

2۔ پری چہرے

اور ان کے بعد شائع ہونے والی کتابیں یہ ہیں۔

3۔ داستان کیجے کیجے

4۔ ذکر فنکارانہ

5۔ وہ کوئی گائے

6۔ یہ باتیں بڑی فسانے ترے

ایک وقت تھا جب ان کی کتابوں کی اشاعت کا رتبہ کوئی لینے کو تیار نہیں تھا۔ یہ وہ وقت آیا جب ان کی کتابیں چھپنا شروع ہوئیں تو ایک کے بعد ایک چھپتی ہی چلی گئیں۔

مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ میں نے انہیں ان کے مضامین کو کتابی شکل میں شائع کرنے کا جو مشورہ دیا تھا اس پر وہ عمل پیرا ہوئے اور ان کے وہ مضامین جو بڑی عری ریزی کے بعد لکھے گئے تھے وہ تلف ہونے سے بچ گئے۔ فلم کے حوالے سے اردو زبان میں ایسی کتابوں کی بے حد ضرورت ہے جو فلمی صحافت کے طالب علموں کی درست رہنمائی کر سکیں۔

ڈی کاپوری کی شخصیت کا تفصیلی جائزہ لینے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ ان کی ابتدائی زندگی اور جدوجہد کے زمانے کی ایک تصویر آپ کو دکھا دوں۔

پاکستان 14 اگست 1947ء کو عالم وجود میں آیا تھا جس کے دو مہینے بعد ہی ڈی کاپوری بھارت سے ہجرت کر کے پاکستان آ گئے تھے اور کراچی میں سکونت اختیار کر لی تھی اور اسکول میں داخلہ لے لیا تھا۔ 1959ء میں کراچی بورڈ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ میٹرک کے بعد تعلیمی سلسلہ جاری نہ رکھ سکے کیونکہ اس وقت ان کے حالات بہتر نہیں تھے۔ انہیں ملازمت کر کے اپنے آپ کو سہارا دینا پڑا۔ پاک بحریہ میں انہیں بطور کلرک ملازمت ملی۔ یہ سال 1962ء کا تھا۔ اس نوکری کے بعد ان کی مشکلات آہستہ آہستہ کم ہونے لگیں۔ ان کے دل میں آگے بڑھنے اور کچھ کرنے کا جوش و جذبہ تھا اس لیے دس سال بعد یعنی 1969ء میں جب ان کے حالات کئی قدر بہتر ہوئے تو

انہوں نے اسلامیہ کالج میں انٹرمیڈیٹ میں داخلہ لے کر دوبارہ تعلیمی سلسلہ شروع کر دیا۔ 1973ء میں اس کالج کے طالب علم کی حیثیت سے گریجویشن کیا پھر 1976ء میں کراچی کے ایس ایم لاء کالج سے ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا اور 1978ء میں جامعہ کراچی سے بطور پرائیویٹ طالب علم اردو میں ایم اے کیا اور جب وہ ایم اے ایل ایل بی ہو گئے تو انہوں نے 1980ء میں پاک بحریہ کی 18 سالہ ملازمت سے استعفیٰ ہو کر وکالت شروع کر دی۔

وہ جو حرت موہانی نے بھی کہا تھا۔

”ہے مشتق سخن جاری بچگی کی مشقت بھی اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی تو کچھ ایسی ہی حالت ڈی صاحب کی بھی تھی۔ ملازمت بھی، تعلیمی مصروفیات بھی اور ساتھ ساتھ لکھنے اور چھپنے چھپانے کا سلسلہ بھی جاری رہا، کبھی شبیے میں اگر محنت کی جائے تو کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ ڈی کاپوری نے تمام تر نامساعد حالات کے باوجود دینی اور دیانت داری کے ساتھ جو جدوجہد کی اس کے نتیجے میں انہیں کامیابی نصیب ہوئی۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ وکالت کا پیشہ اختیار کر کے باعزت زندگی بسر کی اور متعدد کتابوں کے مصنف بن کر اندرون ملک اور بیرون ملک شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔

بقول سرور انور

جو زمانے میں ہمت نہ ہارے

اپنی تقدیر جو خود سنوارے

اس جہاں میں اسی کے ہمیشہ

کامیابی قدم چومتی ہے

انہوں نے اپنے آپ کو نقصان اور اپنے پبلشر کو اس لیے فائدہ پہنچایا کہ صحافت ان کا پیشہ نہیں شوق تھا جو مجھ جیسے قلم کے مزدور کے لیے ممکن نہیں۔

جب مجھے معلوم ہوا کہ ان کا اصلی نام جمیل احمد ہے تو میں سوچنے لگا۔ وہ ڈی جیسے ہو گئے۔ میں نے ان سے تو اس بارے میں نہیں پوچھا مگر سمجھنے والے کے ناطے اس کو حجب میں گیا اور آخر کار اپنے سوال کا جواب مجھے مل گیا۔

جب آتش جوان تھا تو ان کے ساتھ بھی وہی ہوا جو عام طور پر جوانی کے ایام میں جوانوں کا ہوتا ہے۔ کسی پری چہرہ پر ان کی نظر پڑی اور ان کے دل نے کہا۔

ساغر کمرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں
اس موقع قتل کے تناظر میں میرا ایک تازہ ترین شعر

عظیم موسیقار۔ عظیم تر انسان

نوشاد صاحب کو عظیم موسیقار کہا جاتا ہے۔ وہ بڑے میوزک ڈائریکٹری ہیں تھے بہت بڑے انسان بھی تھے۔ ڈی کاپوری نے ان کی عظمت کی کچھ باتیں لکھی ہیں۔ گلوکار محمد رفیع نے جب اپنی بیٹی کی شادی کی تو اس کے لیے ایک بڑا شادی ہال یک کر لیا۔ نوشاد صاحب کو معلوم ہوا تو انہوں نے رفیع سے کہا۔ بیٹی کو اپنے گھر سے رخصت کرو جہاں اس نے اپنی زندگی کے دن گزارے ہیں۔ محمد رفیع نے اس مشورے پر عمل کیا۔ ہال کی بنگلہ منسوخ کرائی اور سارا انتظام گھر پر کیا اور بیٹیوں سے بیٹی کو رخصت کیا۔ یہ بات جس نے بھی سنی نوشاد صاحب کی تعریف کی۔ ڈی صاحب بتاتے ہیں محمد رفیع کی شادی بھی نوشاد صاحب کے انتخاب پر ہوئی تھی۔ محمد رفیع کا سارا گھرانا لاہور میں رہتا تھا اس لیے تہائی محمد رفیع کو کھاتے جاتی تھی اس لیے نوشاد صاحب نے ہی محمد رفیع کی شادی کروائی تھی۔ اسی طرح نوشاد صاحب نے نغمہ نگار گلہیل بدایونی کا بھی ساتھ دیا تھا۔ گلہیل بدایونی اپنے آخری ایام میں بیمار ہوئے تو نوشاد صاحب نے انہیں اسپتال میں داخل کرایا اور ان کی بڑی اچھی طرح تیمارداری کی مگر وہ جانبر نہ ہو سکے۔ گلہیل بدایونی اور محمد رفیع کی موت کے بعد دونوں گھرانوں کی دیکھ بھال نوشاد صاحب ہی نے کی۔

☆☆☆

فلم آگ کی غزل

زندہ ہوں اس طرح کہ غم زندگی نہیں جلتا ہوا دیا ہوں مگر روشنی نہیں یہ چاند یہ ہوا یہ فضا سب ہیں ماند ماند جب تو نہیں تو ان میں کوئی دکھی نہیں گو مدہش ہوئی ہیں کسی سے جدا ہوئے لیکن یہ دل کی آگ ابھی تک بجھی نہیں ہونٹوں کے پاس آئے ہنسی کیا حال ہے دل کا یہ معاملہ ہے کوئی دل علی نہیں آئے کو آچکا تھا کنارہ بھی سامنے پر اس کے پاس ہی میری نیا گئی نہیں

ہیں۔

ان پہ پڑتے ہی نظر زور سے دھڑکا میرا دل
کیا ہوا پوچھا تو کہنے لگا قاتل قاتل
کچھ ایسی ہی کیفیت جو اس سال چھل اٹھی تھی۔
انہوں نے اس مقالہ سے راہِ رحمت بڑھانے کی کوشش کی
مگر انفس و مدافنس کا کامیاب نہ ہو سکے۔ نئے دور کی نئی
جنگ بڑی ہوشیار ہو گئی ہے۔ ہر جنموں کو لٹھ نہیں کرائی۔
دیکھتی ہے کہ کس میں کتنا دم خم ہے۔ کون اس کے ناز و غرور کا
بوجھ سنبھال سکے گا۔ کس کی جیب تنہی بھاری ہے۔ کس کے
بینک اکاؤنٹ میں کتنا مال ہے؟

ہمارے جنموں نے جب یہ کہا ہوگا "نہ سونا نہ چاندی
نہ کوئی کل تھ کو میں دے سکوں گا۔" تو ظاہر ہے اس امتحان
میں وہ ٹل ہو گئے ہوں گے۔ لیکن انہیں ریجنٹ کر دیا ہو
گا۔ ایسے میں وہی ہوا جو اس طرح کے حالات میں ہوتا
ہے۔ ان کے احساسات ڈھی ہو گئے۔ جذبات ڈھی ہو
گئے۔ ان کا دل ڈھی ہو گیا اور وہ خود بھی ڈھی ہو گئے۔ یہ ہے،
جیل احمد کا ڈھی کانپوری بننے کی اسوری۔

ہمارے ہاں لٹریچر کی ناکامی پر بات تو ناکام عاشق
انہاں پر بیان چاک (پھاڑ) کر کے جنگل میں نکل جاتا ہے یا
شاعری شروع کر دیتا ہے۔ جیل احمد نے بھی یہ آسان راستہ
اختیار کیا اور اپنی ناکام محبت کی نوہر خوانی شروع کر دی اور
پھر اپنی اور اپنی شاعری کی اصلاح کے لیے بہتر لکھنوی
جیسی شخصیت کا انتخاب کیا۔ بہتر ادا صاحب بھی عاشق تھے۔
عاشق رسول تھے۔ عاشق نے عاشق کا ہی سہارا لیا۔ کچھ
عرصے تک استاد کی بارگاہ میں رہے۔ ان کی خدمت کرتے
رہے اور اپنے نوئے ہوئے دل، ڈھی دل کی بیکار۔ اپنے
اشعار کی اصلاح بھی لیتے رہے پھر اس نتیجے پر پہنچے

تجھ سے دل کش ہیں کئی اور بھی تم اے غم دل!
مرے اور بھی ہیں زیست کے مشکل مشکل
ڈھی کانپوری کو عشق نے مکمل طور پر نکال نہیں کیا تھا۔
تھوڑے دنوں کے بعد وہ اپنے پر پڑے جھاڑ کا کارزار
حیات میں دوبارہ سرگرم عمل ہو گئے۔ ان میں یہ خوبی ابتداء
ہی سے تھی کہ وہ مشکلات سے گھبراتے نہیں تھے نہ جدوجہد
سے جان چرات تھے۔ ان کی زندگی کا بہت بڑا حصہ حالات
سے لڑنے اور مخالف ہواؤں سے مقابلہ کرنے میں گزرا۔
انہوں نے لکھنا شروع کیا تو دیانت داری سے تحقیق و
تصدیق کے ساتھ صحافی اصولوں کی پاسداری کی۔ دنیا

داری اور اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کو پیش نظر نہیں رکھا۔
اپنی ذات میں مست اور اپنی لکھن میں مستغرق رہے۔ انہیں
نہ تشہیر کی خواہش تھی نہ ڈھنڈورائیں کی ضرورت تھی۔ نہ وہ
داد کے طالب تھے نہ کسی تعریف کے بھوکے۔ وہ تو زیادہ تر
ان لوگوں پر کام کرتے تھے جنہیں دنیا والوں نے بھلا دیا تھا
جن کے اپنے انہیں فراموش کر بیٹھے تھے اور جن کا ذکر کرنے
سے پہلے لوگ سوچتے تھے کہ اب اس سے انہیں کیا فائدہ
ہوگا؟

ان کی طبیعت کی طرح ان کا بیکر بھی تھا۔ سانولا سلونا
رنگ، چمکون چہرہ، مطمئن آنکھیں۔ لہجے میں انکسار، کوئی
دعویٰ نہیں، کوئی ڈیک نہیں، نہ کسی کے سامنے اپنے کاٹنا سے
منواتے تھے نہ کسی کو سزا دینے کے لیے کسی عجزارنے کی
کوشش کرتے تھے۔ بڑے کم گو، اپنے آپ میں مست
رہنے والے۔ صوفی مثل شخصیت کے مالک تھے۔ بہت جھٹھا
لکھنے اور متعدد کتابوں کے مصنف ہونے کے باوجود نہ کسی
سٹائش کی تمنا کی نہ ان پر غرور و فخر کیا۔ وہ ہر وہ چیز جسے
درست سمجھتے تھے اس کا انتخاب کرتے اور جیسا دیکھتے، جیسا
اس کے بارے میں محسوس کرتے من و عن لکھ دیتے تھے۔ نہ
کسی کو بھی ڈرایا نہ کسی سے ڈرے۔ بڑی خویوں کے مالک
تھے۔

لکھنے والے کے لیے پڑھنے والا بھی ہونا ضروری
ہے۔ ڈھی کانپوری خاصے بڑھے لکھے انسان تھے۔ اردو
لسانیات میں ماسٹر کی ڈگری تھی اس لیے بہت اچھی صاف
ستھری معیاری اور دل میں اتر جانے والی زبان لکھتے تھے۔
ان کے طرزِ تحریر کی خاص بات یہ ہے کہ وہ اتنی آسان ہوتی
ہے کہ آٹھ سال کے بچے سے لے کر ساٹھ سال کا بوڑھا بھی
آسانی سے پڑھ لے اور سمجھ لے۔ ان کا حافظہ بہت تیز تھا
جہاں علم و فن کا بھی ختم نہ ہونے والا ایک عظیم خزانہ مدون
تھا۔ ان کے لکھے ہوئے بعض مضامین نصف صدی یا اس
سے زیادہ پر محیط ہیں۔

یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ ڈھی صاحب جیسے صاحبِ علم
نے فلم کا موضوع انتخاب کر کے اس کو عزت و تکریم کی منزل
تک پہنچایا اور نہ اس سے پہلے یہ موضوع عام طور پر سونپا نہ
اور کمتر سمجھا جاتا تھا۔ ایک بڑا رائٹر ان موضوعات پر لکھتا
کسب شان سمجھتا تھا۔ ڈھی صاحب نے اس صنف کی طرف
توجہ دے کر فلم کے شائقین کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ کسی لکھنے
والے کی یہ خوبی اسے پسندیدگی کی صف میں لاکھڑا کرتی

اس موضوع پر لکھنے کے لیے دو باتوں کا ہونا بہت
ضروری ہے۔ پہلا واقعات کو جمع کرنا، دوسرا تحریر کی روانی۔
ایک دونوں باتیں تحریر میں دلکشی پیدا کرتی ہیں۔ خدا کے فضل
سے یہ دونوں باتیں ڈھی کانپوری کی تحریروں میں بدرجہ اتم
موجود ہیں۔

آپ کو کتابیں ہر موضوع پر پڑھنے کو مل سکتی ہیں مگر فلم
کے موضوع پر کتابیں لکھنا امرِ محال ہے بلکہ ناممکن ہے کیونکہ
کسی بڑا آدمی اور رسائل میں چھپنے والے اکثر مضامین اس
ہائے کے نہیں ہوتے کہ انہیں کتابی شکل میں شائع کر لیا
جائے اس لیے وہ مضامین بہت جلد لوگوں کے ذہنوں سے
قائب ہو جاتے ہیں۔ ڈھی کانپوری کے مضامین کی یہ خوبی
ہے کہ یہ معیاری اور خوب صورت تحریر کے ساتھ دستِ
معلومات پر مبنی ہوتے ہیں۔ یہ کام انہوں نے بڑی محنت اور
لگن کے ساتھ ساتھ شوق اور دلچسپی سے کیا ہے۔

ڈھی کانپوری ایسے لکھنے والے تھے جن کے اخبار و
رسائل میں شائع ہونے والے مضامین کو اکثر لوگ سنبھال
کر رکھتے تھے تاکہ بوقتِ ضرورت بطور سند کام آسکیں۔

ڈھی صاحب یہ بات خود بتاتے تھے کہ اکثر لوگ مجھ
سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں۔ "ڈھی صاحب! آپ کے بہت
سے مضامین ہم نے بطور خاص جمع کر رکھے ہیں۔"

"کیوں؟ آخر کسی بنا پر جمع کرتے ہیں آپ؟"
"میں لے کر کہہ رہا ہوں ہمارے لیے معلومات کا ذریعہ
ہوتے ہیں۔ ہم قلمبیں دیکھتے ہیں مگر اپنے محبوب فنکاروں
کے بارے میں ہمیں بہت سی باتوں کا علم نہیں ہوتا۔ آپ ان
کی پس پردہ باتیں ہمیں بتاتے ہیں اس لیے ہمارے لیے
ایسی تحریریں اہم اور قیمتی ہوتی ہیں۔"

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ جس دن ڈھی کانپوری کا
کوئی مضمون کسی فنکار، محقق، محقق یا موسیقار پر شائع ہوتا تھا تو
لوگ صدر کی کیسٹ کی دکانوں پر جا کر اپنی اپنی پسند کے
محبت کیسٹ پر بھروانے جاتے تھے۔

ایک بار ایک دکاندار نے یہ بات مجھے بتائی۔ "جس
دن ڈھی کانپوری صاحب کا کوئی مضمون گانے کے کسی شیعہ
سے متعلق کسی اخبار یا رسالے میں چھپتا ہے۔ اس دن ہماری
دکان پر ایسی گلوکار یا موسیقار یا فنکار کے گیت بھروانے
والوں کا رش لگ جاتا ہے اور اس کے کیسٹ کی خریداری بھی
لگاتار ہوتی ہے۔"

مقبول گیت کا نام مقبول گیت نگار

بڑے ارمانوں سے رکھا ہے فلم تیری حم
پیار کی دنیا میں یہ پہلا قدم
یہ انڈین گیت آج بھی پرانے گیتوں کے شائقین بڑے
شوق سے سنتے ہیں مگر اس سدا بہار گیت کے بارے میں نہیں
جانتے کہ اس گیت کا لکھنے والا کون ہے۔ ڈھی کانپوری بتاتے ہیں
کہ فلم "لمہار" کے اس گیت کے شاعر کا نام کیف عرفانی تھا۔
"لمہار" گلوکار کشی کی پہلی ذاتی فلم تھی۔ اس کے موسیقار روشن
تھے۔ "لمہار" اگرچہ کاروباری لحاظ سے نرم گئی مگر اس کے تمام
گیت زبردست ہٹ ہوئے جو بک کے سب نقد نگار کیف عرفانی
کے لکھے ہوئے تھے۔ ایسا شوق و محبت میں ڈوبا ہوا فنکار جس نے
تحریر کیا وہ انقدر فنکار تھا۔ چھوڑ کر اس طرح کے ذرا کرتا
تھا۔ اس کے کاندھے پر ہر وقت ایک مکمل پڑا رہتا تھا۔ دراز ڈھنس
اس کی بچکانہ تھیں۔ اس شاعر نے "لمہار" میں ایسے زبردست
گیت تحریر کیے جنہوں نے مقبولیت کے تمام ریکارڈ توڑ دیے مگر
کبھی عجیب بات ہے کہ اس کے لکھے ہوئے گیتوں سے تو ایک
زمانہ واقف ہے مگر لکھنے والے کے بارے میں کوئی کچھ نہیں
جانتا۔

جتنو جس نے ولیپ کمار کو سورج بنا دیا

یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ولیپ کمار اپنی ابتدائی
فلموں، جوار بھاتا، پرستار، ملن اور گھر کی عزت کی ناکامی کے بعد فلم
انڈسٹری چھوڑنے کا ارادہ کر چکے تھے کہ انہیں فلم "جتنو" نے نہ صرف
اس ارادے سے باز رکھا بلکہ بھارتی فلم انڈسٹری کا عظیم اداکار بننے کا
موقع دیا۔ ڈھی کانپوری کا کہنا ہے کہ یہ فلم انڈسٹری اور گانوں کی وجہ
سے بہت ہوئی اور مکمل کے طور پر ایک گیت نگار کا پیش کرتے ہیں۔
یہاں بدلہ وفا کا بے وفائی کے سوا کیا ہے
ابھی کیا تھا ابھی کیا ہے اسی کا نام دنیا ہے
وہ کہتے ہیں کہ اس گیت نگار ایک غیر معروف شاعر
امیر سردی تھے جس کی شاعری کی وزن فیر و ڈھائی نے بانی
تھی۔ اسے محمد رفیع اور نور جہاں نے گایا تھا جو ولیپ کمار اور نور
جہاں پر فلما گیا تھا۔ 1947ء کا بڑا اثر آشوب زمانہ تھا۔ ہندو
مسلم فسادات ہو رہے تھے۔ اس کے باوجود یہ فلم ہمیشہ ثابت
ہوئی۔ اس گیت کی وجہ سے یہ فلم اور اس فلم کی وجہ سے گلوکار محمد
رفیع اور اداکار ولیپ کمار کلک کر گئے۔ محمد رفیع نے نئے
انڈسٹری میں آئے تھے اور ان کی مقبولیت اس وقت تک زیادہ
نہیں تھی۔

”ہاں“ کہہ کر میں خاموش ہو گیا۔ اس دکاندار سے میں کیا کہتا کہ حکومت تنفعہ اور اعزازات تو دیتی ہے مگر انہی کو دیتی ہے جن کی اپنی اہمیت مضبوط ہوتی ہیں۔ جن کی پہچان دور تک ہوتی ہے۔ جن کے سامنے چاہے کی رسائی مقدر لوگوں تک ہوتی ہے۔ ایوانِ اعلیٰ تک ہوتی ہے۔ بے چارے ختمی کانپوری کے آگے پیچھے کون ہے جو ان کو کوئی سرکاری اعزاز دلوائے گا۔

ایک دن زخمی صاحب سے گفتگو کے دوران میں نے یہی ذکر چھیڑ دیا۔ خاموشی سے سنتے رہے۔ جب میں خاموش ہوا تو انہوں نے کہا۔

”میں انور بھائی! ایسا نہ کہیں۔ سرکاری اعزازات حاصل کرنے والوں میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو صحیح معنوں میں ان کے حق دار ہوتے ہیں۔ جنہیں بغیر کسی سفارش کے تحفے اور ایوارڈز ملتے ہیں۔“

دیکھا آپ نے وہ کیسے بچے اور کھرے انسان تھے۔ مسکراتے ہوئے انہوں نے اپنی بات آگے بڑھائی۔ ”رہی میری بات تو آپ جیسے لوگوں اور میرے پڑھنے والوں کی پسندیدگی ہی میرا تنفعہ میرا ایوارڈ اور اعزاز ہے۔ یہی میرے لیے بہت ہے۔ رب العزت کی طرف سے دی ہوئی عزت ہی میرے لیے میری محنت کا صلہ ہے۔ میں کسی سے کوئی شکوہ شکایت کیوں کروں؟“

بندہ جب پڑھا لکھا اور باشعور ہوتا ہے تو اس کے گفتار و کردار میں بڑی شائستگی ہوتی ہے جو لوگ زنجی کا پوری سے ملتے جلتے رہے ہیں، وہ بخوبی جانتے ہیں کہ وہ کیسے اعلیٰ ظرف کے انسان تھے جہاں ان کے چاہنے والے متعدد لوگ تھے وہاں کچھ بندے ایسے بھی تھے جو ان کو پسند نہیں کرتے تھے۔ جب بھی موقع ملتا، ان پر تنقید کے تیر برساتے۔

”ارے یارا زخمی کی تحریریں بھی ان کی طرح زخمی ہوتی ہیں۔ مستند نہیں ہوتیں۔ فیکٹ اور فیکٹر کے معاملے میں کسر ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔“

قلم ساز و ہدایت کاری شان تارام کی عظمت

پنڈت جواہر لال نہرو ایک جہانگیرہ سیاستدان کی
 ہیں بلکہ انھیں بھارتی فلم انڈسٹری کے انٹرویو اور
 دلی حالات کا بھی بخوبی علم تھا۔ یہ بات دھرمی کانپوری
 نے اپنی ایک تحریر میں بتائی۔ ان کا کہنا ہے کہ ایک بار
 اس سے وہاں کا ایک فلمی وفد آیا اور پنڈت، جی سے دلی
 مٹا اور بتایا کہ ہم ایک مطالعاتی دورے پر آئے ہیں
 انڈین فلم انڈسٹری کے بارے میں معلومات حاصل
 کرنا چاہتے ہیں۔ نہرو جی نے کہا۔ آپ بمبئی جا کر صرف
 شامتا رام سے ملیں وہ آپ کو وہ ساری باتیں بتا دیں
 جو متعدد فلمی لوگوں سے معلوم ہو سکیں گی۔ یہ وفد بمبئی
 کی شامتا رام سے ملا اور وہ انہوں نے بمبئی کی ہی
 کانپوری انڈین فلم انڈسٹری کی تفصیلی معلومات سے
 آگاہ کیا اور یہ اسٹوڈیو میں اپنی فلمیں بھی دکھائیں۔ یہ
 جو کچھ معلوم کرنا چاہتا تھا اس سے کہیں زیادہ وہی شامتا
 رام نے وفد کو بتا دیا تھا۔ وفد نے روس جا کر اپنے
 سیاب دورے کا اظہار کرتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ
 رت جسے پنڈت جواہر لال نہرو وجیہ اور وزیر مٹا ہے
 اپنے ملک کی سیاست پر ہی گہری نظر نہیں رکھتا بلکہ
 فلم انڈسٹری پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔

ایسی باتیں کرنے والے کچھ فلمی صحافی ہی ہوتے
 رنجی صاحب تک بھی ان کی باتیں پہنچتی تھیں مگر انہوں
 نے پلٹ کر جواب نہیں دیا۔ نہ بھی کسی سے شکایت کی۔
 موقف یہی ہوتا تھا، جوان کا کام ہے وہ کرتے رہیں،
 کام سے میں کرتا رہوں گا۔“

جب میرے مشورے پر انہوں نے اپنی کتابوں کی تہ پر توجہ مبذول کی تو اپنی شائع شدہ تحریروں کو ترتیب دے کر دیکھ کر حیرت و شگفتگی کا شکار ہوئے۔ اس طرح کی

1۔ نغمہ نگار۔ اس میں 80 نغمہ نگاروں کے مضامین تھے۔

2۔ گلوکار، گلوکارہ۔ اس فائل میں 40 مضامین

3۔ موسیقار۔ موسیقاروں کی فائل میں 50 نامور
روں پر مضامین تھے۔

4۔ اداکارہ۔ اس فائل میں بھی 50 مشہور ہیردینز کے مضامین شامل کئے۔

5۔ ہیرو، ہدایت کار۔ اس میں 55 ہیروز اور ہدایت کاروں کے مضامین رکھے۔

مجھ سے ملاقات ہوئی تو مجھے اطلاع دی۔ ”انور صاحب! میں نے اپنے مضامین کی ترتیب و ترتین کا کام شروع کر دیا ہے۔“ انور اوپر درج پانچ فائلوں کا ذکر کیا۔ پھر دے۔ ”مگر یہ فائل ورک نہیں ہے۔ میں نے انہیں پڑھ کر ان میں سے منتخب مضامین سلیکٹ کئے ہیں۔“

”تو گویا.....“ میں نے کہا۔ ”یہ منتخب مضامین مکمل کتاب کے روپ میں آگئے ہیں۔“

”جی ہاں بس کچھ ضروری تحریروں کے بعد۔ جیسے بچاؤ وغیرہ کے بعد۔ وہ پرنٹنگ کے لیے عمل مسودہ ہوگا۔“

”گڈ! تو بہت اچھا کام کرا آئے۔“

”آپ کا مشورہ بہت صائب تھا۔ میں نے سوچا یہ
 ام آسان نہیں، قدرے دشوار ہے۔ آہستہ آہستہ ہی مکمل کیا

”سو کر تے کرتے مکمل صورت میں پہنچا ہوں۔“
 ”تو گویا! پانچ کتابوں کے مسودے تیار ہو گئے؟ کچھ
 دوام بھی رکھا ہے ان کا؟“

پانچ نہیں۔ فی الحال تین کتابوں کے مسودے تیار
ہوئے ہیں اور ہر مسودے میں مختلف النوع موضوعات کے

ہا میں رکھے ہیں کیونکہ اگر ایک ہی طرح کے سارے
ہا میں ہوتے تو میرا خیال ہے کہ پڑھنے والے اکتا جاتے
س لیے میں نے دراصل کا خیال رکھ کر یہ مسودے ترتیب
دے دیے ہیں۔

”تو ان کے کچھ نام بھی رکھے ہوں گے؟“
 ”جی ہاں رکھے ہیں۔ جو کچھ یوں ہیں۔“

1۔ مجھے سب یاد ہے ذرا ذرا
2۔ داستان کہتے کہتے

3- ذکر جب چھڑ گیا
”کیوں، کیسے ہیں یہ نام؟“ انہوں نے سوال

”بہت اچھے ہیں مگر.....“

میرا جملہ نسل لڑنے سے پہلے ہی بے تابی سے
 لے۔ ”تو کیا؟“

میری سی مہمانیں نے بمبوں کی بجائے افسانوں
 کا مری کے مجموعوں کے نام لگتے ہیں۔“

۱۰۰۰

گلوکار بخان مستانہ کا انجام

فرادہ دیکھنے دیکھی کانپوری کی جستجو اور کھوج کا
 زہ انہوں نے ایک گھوکا رخاں مستانہ کا ذکر بھی کیا
 جنہوں نے کئی مشہور فلمی گیت کا کرشمہ حاصل کی
 ہمیشہ تنگ دست رہے۔ ان کا بڑا چاہا عسرت میں
 را۔ نفسیاتی مریض بن گئے۔ ان کی کیفیت یہ ہوئی
 کہ بال بڑھے ہوئے، کپڑے پھٹے ہوئے، سڑک پر
 لڑکے کھڑے چلتے پھرتے تھے۔ اسی کیفیت میں ان کا
 دل ہو گیا۔ خان مستانہ کی آواز بہت اچھی تھی۔ ان کا
 سے مشہور گیت "فلم زندگی یا طوفان" میں گایا ہوا تھا
 کی دھن موسیقار ناشاد نے بنائی تھی جو منتخب کا لکھا
 تھا۔

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے
لوگ پتہ گیت محمد ربیع کا سمجھتے ہیں اور سارا
بلیٹ محمد ربیع کے کھاتے میں جاتا ہے۔ فلم ”شیریں
و“ کی یہ قوالی انہوں نے محمد ربیع اور ساتھیوں کے
مقامی تھیٹر۔

انھوں میں تمہارے جلوے ہیں ہونٹوں پر تمہارے افسانے
باتنیاں دل سے نکل آکر پہنچے ہیں یہاں تک دیوانے
اس تواری کے دوہند خان مستانہ کی آواز میں ہیں۔
فلم ساز مہابت کار اور اداکار نذیر کی مشترکہ فلم
”ایجنٹ“ (1944ء) جس میں ”لیلیٰ“ کا کردار سورن
نے ادا کیا تھا اور اس فلم کے بعد دونوں نے شادی
کر لی تھی۔ اس فلم کے لیے بھی خان مستانہ نے گیت
تھے جو بہت مقبول ہوئے تھے۔

اتنے اچھے گلوکار ہونے کے باوجود خوش حالی کی
بے خبری کر سکے اور جلد ہی قلم انڈسٹری سے فیڈ آؤٹ
ہوئے اور بڑی المناک موت مرے۔

میری بات پر مسکرانے لگے۔ مجھے اطمینان ہوا کہ

بہت بڑی دلکشی تھی۔

بات دراصل یہ ہے اور بھالی! اسی سکرابٹ
ران انہوں نے کہا۔

فروری 2018ء

قطع کلائی کرتے ہوئے میں نے کہا۔ ”نہیں آپ
ایسے خاصے پتہ کار اور مستند شاعر ہیں۔“

”یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے۔ میں کہہ رہا تھا کہ شاعر
ہونے کے ناطے اپنی کتابوں کے نام بھی شاعرانہ انداز کے
رکھے۔ اس طرح جدت کا احساس بھی ہوتا ہے اور ایسے
ناموں کو دیکھ کر پڑھنے والوں کے ہاتھ کتابوں تک نہیں
انداز میں بڑھیں گے۔“

ذہنی صاحب کی اپنی تحریروں کے عنوانات بھی کچھ اسی
طرح کے ہوتے تھے۔ جیسے ایک کتاب میں دیباچہ کے طور
پر انہوں نے اپنے بارے میں لکھا جس کا عنوان تھا۔
کچھ عشق کیا، کچھ کام کیا۔

ذہنی صاحب نے اپنی کتابوں کی ترتیب و ترتیب کا
کام بڑے سلیقے اور خوبی کے ساتھ کیا ہے۔ جس کا صحیح
اندازہ ان کی اشاعت کے بعد ہوا۔ تقریباً ان کی ہر کتاب
میں مضامین اس انداز میں شامل کیے گئے ہیں کہ کسی پلیٹ کا
احساس ہوتا ہے۔ مثلاً ایک کتاب ذکر جب چھڑ گیا، کے
حوالے سے آپ کو بتاؤں۔ اس میں ہدایت کاروں میں
اے بے کار دار، شیخ حسن، شوکت باہمی اور ضیاء سرحدی کو
ادا کاروں میں ولیپ کمار، وحید مراد اور ندیم کو۔ ادا کاراؤں
میں نور جہاں، مینا کماری کو، موسیقاروں میں نوشاد کو نغمہ
نگاروں میں فہم شگافی، مجروح سلطان پوری، ساحر
لدھیانوی، راجا مہدی علی خان اور رئیس امر وہوی کو اور
گلوکاروں اور گلوکاراؤں میں طلعت محمود اور ملکہ ترنم کو شامل
کیا ہے جب کہ دیگر مضامین کچھ اس طرح کے ہیں۔ (1)
اردو زبان کی ترقی میں فلموں کا کردار۔ (2) ماضی کے یادگار
گیتوں کا درد۔ (3) نغمہ پارلنیں۔ (4) ڈھاکے کی فلم
انڈسٹری کا مختصر جائزہ۔ (5) پہلا دو گنا۔ رخصتی، لوری اور
سارنگہ۔ (6) فلموں کے حوالے سے نادر معلومات۔ (7)
مخشب اور ایلاس رشیدی میں مصالحت۔ (8) جمیل الدین
عالی کی قومی گیت نگاری۔

مزے کی بات یہ کہ انہوں نے شخصیتوں کے حوالے
سے جو کچھ لکھا ہے وہ ان کا عام پر دفاکتل نہیں ہے۔ کسی خاص
پہلو کو پیش نظر رکھ کر لکھا گیا ہے۔ جیسے طلعت محمود کی آواز کی
لرزش۔ ساحر لدھیانوی کی رومانی شخصیت اور ان کی فلمی
شاعری، وحید مراد کے چند واقعات، ادا کار ندیم کے گائے
ہوئے چند مقبول گیت، فہم شگافی اور ان کی فلمی شاعری،
رئیس امر وہوی اور فلم۔

امر گیت

شاعری اگر اچھی ہو اور اسے گانے والا بھی اچھا
ہو تو وہ شاعری اور گیت گاتی ہے اور اگر اس کی دھن
بنانے والا بھی اچھا ہو تو گیت امر بن جاتا ہے جیسے
نہ یہ چاند ہو گا نہ تارے رہیں گے
مگر ہم ہمیشہ تمہارے رہیں گے

یہ توں پہلے حقیق ہونے والا یہ گیت آج بھی اسی طرح
مقبول ہے جس طرح اچھے ابتدائی دور میں تھا۔ اسے سن کر
چھوٹے والے لوگ اس بات سے بے خبر ہوتے ہیں کہ کس فلم
کا گیت ہے کس نے اسے گایا اور اس کی موسیقی کس نے کمپوز
کی؟ ذہنی کا پتہ یہ کہ اسان ہے کہ وہ آج کے فلم بینوں اور اس
گیت کو پسند کرنے والوں کو بتاتے ہیں۔ یہ ناقابل فراموش
گیت محنت کمار اور گیت گانے والے ایک ایک گایا تھا جب کہ
اس کی دھن محنت کمار نے ہی ترتیب دی تھی اور اس گیت کو
لکھنے والے شاعر کا نام ایس اے جی بھاری تھا۔ یہ خوب صورت
گیت فلم ”شرط“ کے لیے لکھا گیا تھا۔ یہ فلم غلاب ہوئی
تھی مگر اس کا یہ گیت لوگوں کے ذہنوں میں آج بھی تازہ
ہے۔ نغمہ نگار ایس اے جی بھاری کا نام فلمی تاریخ میں اکر رہا جائے
گا تو صرف اس گیت کی بدولت رہے گا۔

اس طرح شخصیتوں پر ان کی تحریروں کی الگ صورت
سامنے آتی ہے۔ ذہنی کا پتہ یہ کہ وہ سننے کا انداز
جدا گنا تھا۔ اس لیے وہ کسی اہم پہلو یا گوشے کو ڈھونڈ کر
سامنے لاتے تھے اور اس کی بنیاد پر اپنی تحریر کی عمارت کھڑی
کرتے تھے۔

متذکرہ کتاب میں کچھ اور تحریریں بھی موجود ہیں۔
جیسے کچھ یادیں کچھ باتیں، کیا آپ کو معلوم ہے؟ پاکستانی
بھائی فلموں کے مقبول گیت، نام بڑے اور درشن چھوٹے۔
ایک نغمہ ایک نغمہ نگار۔ اردو فلموں کی ترقی کے لیے کراچی کو
مرکز بنانا ہوگا۔ فلمی تحریروں کو بھی ادب کا حصہ قرار دیا جائے
وغیرہ۔

یہ بات قارئین کو بتانے کی ہے کہ ذہنی کا پتہ یہ کبھی
بھی کسی اخبار یا جریدے سے وابستہ نہیں رہے۔ رپورٹریا
سب انڈسٹری کے طور پر ملازمت نہیں کی۔ فری لانس کی حیثیت
سے فلم جرنلزم سے منسلک رہے۔ یہاں تک کہ صحافیوں کی
کسی تنظیم کی ممبر شپ بھی حاصل نہیں کی۔ نہ ہی صحافت کو اپنا
ذریعہ معاش بنایا۔ وہ اپنے طور پر جو مناسب سمجھتے تھے اس پر

لکھتے تھے۔ انہوں نے جہاں ماضی کی فلمی صنعتوں (برصغیر
ہند پاک اور تقسیم سے پہلے کی) اور فلم والوں کے بارے
میں بے شمار مضامین لکھے وہاں موجودہ حالات و واقعات پر
ایک لکھا۔ فلم اور فلم والوں کے حوالے سے جو واقعات رونما
ہوتے تھے، ان پر بھی لکھتے تھے۔

مخشب جارجی ایلاس رشیدی سے سخت ناراض تھے
مگر انہوں نے نگار میں یہ لکھ دیا تھا کہ مخشب کی بھارتی
زمینیں پاکستان میں نہ دکھائی جائیں۔ حکومت ان کی
اجازت نہ دے مگر ان دونوں کی رجسٹریشن کو ایک بار معر ف
تعمیم کا رعبے آئندے رعبے دفع کر دیا۔ یہ پوچھ واقعہ
ذہنی صاحب نے بڑے پیارے انداز میں تحریر کیا ہے۔ وہ
اپنے ہی واقعات و ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے تھے اور اپنے پڑھنے
والوں کو اپنی تحریروں کی زبان میں سناتے تھے۔

اسی طرح ایک انٹوسناک واقعہ کا ذکر بھی ذہنی
کا پتہ یہ کہ انہوں نے اپنی ایک کتاب میں کیا ہے کہ پاکستان بننے
کے بعد ہدایت کار محبوب خان اور ہدایت کار اے آر کاردار
ایک ہی سے کراچی آئے تھے۔ ان کے آنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ
کراچی میں اپنے نگار خانے قائم کریں اس کے لیے وہ اس
وقت کے وزیر تعلیم سندھ ایوب کھوڑو سے ملے۔ وزیر تعلیم
صاحب نے ان کی بات سن کر کہا۔ ”ہمارا کیا شیر ہوگا؟“

یہ جملہ سن کر دونوں بہت مایوس ہو گئے اور واپس بسپٹی
چلے گئے اور کراچی کی فلمی صنعت کو جو ایک بہت بڑا فائدہ
دینے والا تھا وہ اس سے محروم ہو گئی۔

فلم دیکھنے والے تماشا شانی، سلور اسکرین پر نظر آنے
والے نگاروں اور ان فلموں کے ہنرمندوں کے پس پردہ
ہونے والے واقعات و حالات جاننے کے شائق ہوتے
ہیں۔ کا پتہ یہ کہ صاحب کو یہ گہری بات معلوم تھی اور وہ ایسی
باتوں کی جستجو میں سرگرداں رہتے تھے جو عام فلمی صحافی
صوبتے بھی نہیں۔ ایسے بے شمار واقعات و حالات کا ذکر ذہنی
صاحب کی کتابوں میں ملتے ہیں۔ ایسی تحریروں سے ہی وہ
اپنے قارئین کے دلوں تک رسائی حاصل کر سکتے۔

ہمارے ہاں جس نے بھی فلم یا فلم والوں پر دو چار لکھی
مہدی تحریریں لکھ لیں۔ فلمی صحافی بن جاتا ہے اور اپنے
ماہمہ ساتھ ہی صحافت کی بھی مٹی پلید کرتا ہے۔ بقول شاعر
ہر ابوبوس نے حسن پرستی شہار کی
اب آبروئے شیوہ اہل ہنر مہی
ایسے ہی چھٹ بھیلوں کی وجہ سے فلمی صحافت کی قدرو

روح کی تسکین کے لیے

محمد رفیع بڑی خاموشی کے ساتھ لوگوں کی مدد کیا
کرتے تھے۔ ذہنی کا پتہ یہ بتاتے ہیں کہ ایک دن
انہوں نے نوشاد صاحب سے کہا۔ چھوٹی موٹی نیکی
کرنے سے میری روح کو تسکین نہیں ملتی۔ میں کوئی بڑا
کام کرنا چاہتا ہوں۔ آپ مشورہ دیں میں کیا کروں؟
نوشاد صاحب بولے۔ تم ایسا کرو کہ گردے صاف
کرنے کی ایک مشین (ڈائلاکسز کی مشین) خرید کر
کسی اسپتال کے لیے وقف کر دو۔ پتہ یہ کہ اس طرح
علاج بڑا بڑا ہوتا ہے اس لیے غریبوں کے لیے نامکن
ہے۔ محمد رفیع نے نوشاد صاحب کے اس مشورے پر
عمل کیا جس سے غریبوں کو یہ علاج مفت حاصل ہو
گیا۔ ذہنی صاحب بتاتے ہیں کہ محمد رفیع زندگی بھر
غریبوں کی دل کھول کر مدد کرتے تھے۔ گلوکاری کے
علاوہ محمد رفیع کا جنوبی بھارت میں فلم ڈسٹری بیوٹن
آفس بھی تھا جس کی دیکھ بھال ان کا سالا کرتا تھا۔

خوش قسمتی۔ بد قسمتی

فلمی دنیا میں کیسے کیسے واقعات رونما ہوتے ہیں،
ان پر عام صحافی توجہ نہیں دیتے مگر ذہنی کا پتہ یہ کہ انہیں
بھی اپنی تحریر کا موضوع بنا کر اپنے پڑھنے والوں کو حیران
کر دیا۔ مثال کے طور پر انہوں نے بتایا۔ ایک فلم بنی تھی
”منڈا بکڑا جائے“ جس نے اس دور میں 5 کروڑ کم کر
اگلا پچھلا ریکارڈ توڑ دیا تھا۔ اس فلم کی ہدایت کارہ میڈیم
شیم آراء تھیں جب کہ اس کے فلم ساز حاجی شیرا تھے۔ یہ
وہ دور تھا جب مار دھاڑ سے بھر پور فلمیں بری طرح
نا کام ہو رہی تھیں۔ شیم آراء نے ایسے وقت میں ایک
بلکہ گنا سے بھر پور رومانی فلم بنا کر باکس آفس پر تھمکے چا
دیا۔ اس فلم کی آمدنی سے جو بہت معمولی بحث سے بنائی
تھی تھی اس کے فلم ساز نے جی ٹی روڈ لاہور میں بھی کی
ایک ٹیکسٹری لگا لی مگر شیم آراء جس کی ہدایت کارانہ
کاوشوں سے یہ فلم سپر ڈرہٹ ہوئی اسے کیا ملا؟ اسے فلم
نماز سے معافی دے کے تخت صرف پچاس ہزار روپے
ملے۔ عام فلم بین فلمی دنیا کی ایسی اندرونی حقیقت سے
کم ہی واقف ہوتے ہیں جنہیں پبلک کرنا ذہنی کا پتہ یہ
ای کا کارنامہ تھا۔

عینک

ابوالفرح ہمایوں

اسے شوق تھا کہ وہ نوادرات جمع کرے۔ اسی شوق نے اس تک ایک ایسی عینک پہنچا دی جو اس کے لیے وبال جان بن گئی۔



یورپ سے درآمد ایک عجیب واقعہ

بھی ہے۔ جب بھی مجھے موقع ملتا ہے میں کارلے کرنگل پڑتا ہوں۔ یورپ کا بہت کم علاقہ بچا ہے جہاں میں جائیں سکے۔ اپنے اسی شوق کی پھیل میں اگلا تھا کہ ہیریڈا سے میں آ گیا۔ پہلی ہی نظر میں یہ شہر مجھے بھا گیا تھا۔ میں نے ایک دو دن اس

چارلس روئل سے میری پہلی ملاقات ہیریڈا میں ہوئی۔ ہیریڈا فرانس کے جنوب مغرب کا ایک بہت ہی خوبصورت شہر ہے۔ اس شہر کی خوبصورتی بیان کرنے کی بجائے میں یہ نادوں کے میرے اولین شوق میں سے ایک شوق آوارہ گردی

حصہ لیا ہے۔ روزنامے نہ صرف ہفتہ میں ایک بار قلم ایلٹیشن شائع کرتے ہیں بلکہ کئی بڑے اخبارات روزانہ شوہز کی خبریں بھی شائع کرتے ہیں۔

یہ سب کچھ ایک دن میں نہیں ہوا، یہاں تک پہنچنے میں ڈیڑھ گھنٹہ کی کمی صحافی کی کوششوں کا طویل سلسلہ ہے۔ انہوں نے نہ صرف شوہز کی دلچسپ، معلوماتی اور معیاری تحریریں لکھ کر شوہز اور اس سے وابستہ لوگوں کے متعلق عوام الناس کو آگاہ اور ڈکاروں کی طرف متوجہ کیا بلکہ اس انڈسٹری کی ترقی اور فروغ میں بھی اپنا شہرت کردار ادا کیا۔

صحافیوں کا کردار ہر جگہ اور ہر دور میں بڑا تعمیری رہا ہے۔ اب جب کہ الیکٹرونک میڈیا کی وجہ سے پرنٹ میڈیا پر کم توجہ دی جانے لگی ہے۔ اب بھی صحافی اپنا کام کر رہے ہیں۔ الیکٹرونک میڈیا نے بھی ان کی خدمات حاصل کر رہی ہیں۔

ڈیڑھ گھنٹہ کی کمی صحافی نہیں تھے، اس لیے انہوں نے فی وی جوتلو کے لیے کوئی کام نہیں کیا مگر جوتلو اور ان کے فنکاروں اور دیگر معاملات پر لکھے ضرور ہیں۔ ڈیڑھ گھنٹہ کی کتابوں کی تعداد سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے بہت لکھا، بے تحاشا لکھا۔ ثقافت اور فنکار کے پس منظر میں فکر انگیز اور تعمیری پہلوؤں کو سامنے رکھ کر لکھا۔ ایسی باتیں لکھیں جو عام جرنلسٹ نہیں لکھتے۔ وہ بس سامنے کی باتوں کو اہمیت دیتے ہیں اور پورے ملک کے انداز میں حالات حاضرہ پر قلم فرمائی کرتے ہیں۔ یہ ڈیڑھ گھنٹہ کی کارٹون اتیا تھا کہ انہوں نے شوہز اور اس سے وابستہ لوگوں کے حالات و واقعات کے بارے میں وہ باتیں بتائیں جو عام شائقین قلم کو معلوم نہیں تھیں۔ مثال کے طور پر انہوں نے اس راز سے پردہ اٹھایا کہ محبوب خان نے اپنی شہرہ آفاق قلم ”آن“ میں ٹرس کیوں کاسٹ نہیں کیا۔ اس کی جگہ ایک نئی اداکارہ نادروہ کو دلپ کمار کے مقابلے میں کیوں پیش کیا۔ جب کہ ٹرس ان کی پسندیدہ اداکارہ تھیں اور ان کو لے کر محبوب اعظم نے ”مڈ رائڈیا“ جیسی قلم بنائی تھی۔

یہ اور ایسی بہت سی باتیں ہیں جن کے بتانے والے اور لکھنے والے ڈیڑھ گھنٹہ کی کمی صحافی تھے۔ یہ بات بہت خوش آئند ہے کہ ڈیڑھ گھنٹہ کی کمی صحافیوں کی انمول تحریریں ضائع ہونے سے بچ گئیں اور کتابوں کی صورت میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئیں۔ جب تک یہ کتابیں باقی رہیں گی ڈیڑھ گھنٹہ کی کمی کا نام اور کام زندہ رہتا بندہ رہے گا۔

قیمت متاثر ہوئی ہے۔ جب کہ ترقی یافتہ ممالک میں یہ صورت حال نہیں۔ ہمارے ہاں جب بھی بڑے لکھے اور باشعور لکھاریوں نے قلم اور قلم والوں پر لکھا ہے ان کی تحریروں سے عام قلم بینوں کے علاوہ سلجھے ہوئے اور شاکستہ لوگوں نے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ صفدر برلاس، اے آر سلوٹ، اے کے شاد، علی سفیان آفاقی، اسد جعفری، ولی رضوی، یاسین گوربچہ، دکی پریم نگر، فدا احمد کار، کلیم مٹائی، بشیر نیاز، اقبال احمد خان، سلیم باسط، شہنشاہ حسین، اے آر ممتاز، مختل پروار، جمیل قریشی، رضوان حیدر برنی ایسے تعلیم یافتہ اور باشعور قلم جرنلسٹ تھے جن کی تحریریں مستند ہوتی تھیں اور بڑے لکھے لوگ انہیں پسند کرتے تھے۔ طاہر میر، صلاح الدین ناسک، طفیل اختر، مشتاق سبحانی، شاہ سردار، عمر خطاب، یونس ہدم، ایم ابراہیم، شیخ لیاقت علی، عبدالجبار ساگر، نسreen شاہین، یونس ریسیانی، رفیق بانیکل، سرفراز فرید نیہاش، مرزا افتخار بیگ، پرویز مظہر، اسلم قریشی، نادر شاہ عادل، سید سلیم احمد سلسلی، سلیم احمد صدیقی، طفیل رشید، یعقوب رشید، ایم فکیل خان، ناصر رضا، سرور ندیم، رکن یوسف ذکی، خالد احمد سید، ایس ایم شاکر، عابد بشیر، نسreen اختر، بزرگ ارشد رضا، شفیق موہی منصوری، خرم سہیل، اقبال راہی، ایم شمیم سید پوری، نصیر احمد، شمس م، ریاض احمد قریشی، ملک یوسف جمال، قصیر افتخار، خرم جنید، ماجد یزدانی اور ایسے ہی کئی اور معتبر لکھاری کارزار صحافت میں قلم اور قلم والوں کے بارے میں تحریری خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس موقع پر ان صحافیوں کا ذکر خیر بھی ضروری ہے جنہوں نے اخبار و جرائد کا اجراء کر کے قلم انڈسٹری کی خدمت کی۔ ان میں الیاس رشیدی مرحوم، منیر حسین مرحوم، سعید امرت مرحوم، ایس اے چاؤدھری مرحوم کے نام قابل ذکر ہیں جب کہ ماہنامہ اشار ڈسٹ کے ایم حبیب اوفت روزہ رنگ و روپ کے ملک یعقوب نور کے علاوہ مرحوم الیاس رشیدی کے فرزند ارجمند اسلم الیاس رشیدی بھی قابل ستائش ہیں جو پہلی نگار کو اب تک زندہ رکھے ہوئے ہیں۔

قلم بینی بھی سب سے سستی تفریح ہوا کرتی تھی جو اس گرائی کے دور میں سستی نہیں رہی مگر قلمی کاروبار اب بھی زندہ ہے۔ لوگ اب بھی سنیما گھر جا کر فلمیں دیکھتے ہیں۔ اس کا ریڈیٹ جہاں کئی لوگوں کو حاصل ہے وہاں میڈیا کا بھی بہت بڑا سپورٹ اور تعاون حاصل ہے۔ پرنٹ میڈیا کے ساتھ الیکٹرونک میڈیا نے بھی فلموں کی ترویج و ترقی میں

میرے استقبال کے لیے باہری موجود تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ بے حد لاغر اور کمزور سا ہو گیا ہے۔ اس کا چہرہ بالکل بے رونق تھا اور وہ پیارو و مصلح نظر آ رہا تھا۔ ایک بات میں نے اور بھی محسوس کی کہ وہ صرف بیمار ہی نہیں ہے بلکہ اس کے دل و دماغ پر کوئی خوف سا چھایا ہوا ہے۔ کبھی کبھی نگاہوں سے وہ یوں ادھر ادھر دیکھتا جیسے وہ اپنے کسی ناپیدہ دشمن سے خوفزدہ ہو۔ وہ بار بار چونک اٹھتا اور اپنے بدن کو سمیٹ کر یوں ایک طرف دھک جاتا گویا اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش کر رہا ہو۔

حسب معمول چارلس کے وفادار ملازم ہنری نے کھانے کا انتظام کیا لیکن آج ہنری کی کچھ بدلا بدلا سا نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس بات پر کافی غور کیا کہ ادھر عمر ہنری کے چہرے میں جوتہ لگی مجھے نظر آ رہی ہے، آخر اس کی وجہ کیا ہے؟

اور پھر میں ڈیڑھ دو گھنٹے بعد وہ وہ جان لینے میں کامیاب ہو گیا۔

آج اس کا چہرہ عینک سے بے نیاز تھا۔ مجھے بے حد تعجب ہوا۔ ہنری کی نظر کمزور تھی اور اس کے باوجود وہ عینک کے بغیر اپنا کام سر انجام دے رہا تھا۔ اس کی عینک کیوں غائب تھی؟ یہ میں نے پوچھنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ یہ اس کا ذاتی مسئلہ تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے کھانا بھی بے لطف سا لگا۔ شاید اس لیے کہ میرا عزیز دوست جو بیمار تھا۔

خلاف معمول چارلس کچھ بھجا بھجا اور خاموش سا تھا۔ اس نے ٹھیک طرح سے کھانا بھی نہیں کھایا۔ ہم لوگ جلد ہی کھانے کی میز پر سے اٹھ گئے اور سنگ روم میں جا کر اجنبیوں کی طرح بیٹھ گئے۔ میں عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ میرے بے شمار سوالات کے جواب میں چارلس ہوں ہاں کرتا رہا بلکہ بعض دفعہ وہ میری بات کو یوں ٹال جاتا جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ بیزار ہو کر میں بھی خاموش ہو گیا۔ چارلس نے فوراً ہی میری عدم دلچسپی کو محسوس کر لیا اور بڑے ہی محذرت خواہانہ انداز میں آہستہ آہستہ کہنے لگا۔ ”مجھے اندازہ ہے کہ تمہاری اچھی طرح خاطر مدارات میں نہیں کر سکا، مجھے معاف کر دینا میرے دوست۔ میں بے حد شرمندہ ہوں۔ یہ مت سمجھنا کہ تمہاری آمد میرے لیے باعث زحمت بن گئی ہے۔ تمہیں اپنے سامنے دیکھ کر مجھے جو خوشی ہو رہی ہے اس کا اظہار الفاظ میں کرنا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ میری خوشیاں مجھ سے چھین گئی ہیں۔ میں آج کل ذہنی طور پر بے حد پریشان ہوں۔“ اس نے ایک بار پھر چمکتے ہوئے اپنے اور درو دیکھا۔

بچانے کا اشارہ کیا اور پھر ایک ہی اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”ادھر آؤ، میں تمہیں ایک اور چیز دکھاؤں۔“

ڈرائنگ روم کے اندر ہی موجود ایک بھاری بھر کم دروازے کو اس نے کھولا۔ میں نے دیکھا کہ یہ ایک انتہائی وسیع و عریض اور خوبصورت لائبریری تھی۔ یہاں تیس و دہدہ زیب الماریوں میں کئی صاف ستھری کتابیں اعلیٰ ذوق کی گواہی دے رہی تھیں۔ میں نے پرستاش نگاہوں سے اسے دیکھا۔ وہ دیر سے مسکرایا۔

”میں اپنا بیشتر وقت مطالعے میں گزارتا ہوں۔“ اس نے اپنی جاوہری مسکراہٹ سے ایک بار اور مجھے دیکھا اور پھر بولا۔ ”آؤ اب کھانے کے کمرے کی جانب چلتے ہیں۔ ہنری نے اب تک کھانا جن دیا ہوگا۔“ میں چپ چاپ اس کے ہمراہ چل پڑا۔

کھانا بے حد پر لطف اور مزیدار تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے چارلس روم کی شخصیت نے اس حد تک متاثر کر دیا تھا کہ اس کی ہر چیز مجھے دنیا سے انوکھی اور نرمالی لگ رہی تھی۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ میں کبھی ہی ملاقات میں اس کا گریوہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ میں نے اس سے تعلقات بڑھانے اور دوستی کا رشتہ مضبوط بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ انگلینڈ سے بھی میں اسے باقاعدہ خط لکھتا رہا اور وہ بھی جواب سے نوازتا رہا۔ میں اکثر و بیشتر ہر پر کی طرف جانے کا موقع نکالتا رہتا۔ وہ بھی مجھ سے مل کر مسرت کا اظہار کرتا۔ مجھے اپنے گاؤں لے جاتا اور اچھی طرح آؤ بھگت کرتا۔

ہماری دوستی خوشگوار انداز میں رواں دواں تھی لیکن پھر نہ جانے کیا ہوا کہ فلک کج رفتار کو شاید ہماری دوستی ناگوار گزری اور اس نے ایک ایسی ہیودہ چال چلی کہ ہمارے درمیان ایک طعنے حائل ہو کر رہ گئی۔

استاذ کا گاؤں میرے لیے خوشیوں کا ایک خزانہ تھا۔ میں وہاں خالی ہاتھ جاتا اور خوشیوں سے بھرا خزانہ دل میں لیے واپس آتا۔ وہاں گزارے ہوئے لمحات میری زندگی کا حاصل تھے۔ آج بھی جب میں وہاں کی رنگینیاں اور حسین و دلنریب مناظر کا تصور کرتا ہوں تو میرے دل سے ایک آہ سی اٹھتی ہے اور میرے قلب و جگر کو جلا کر خاک کر دیتی ہے۔ یہ سب ہوا کیسے، آپ بھی سن لیں۔

ڈھیر سا رے دن گزر چکے تھے۔ میں کہیں گیا نہیں تھا۔ اب کس شہر کا رخ کروں؟ یہی سوچ رہا تھا کہ استاذ کا نام ذہن میں آیا اور میں نے وہیں چلنے کا پلان بنالیا۔ مقررہ وقت پر وہ

میں نے فوراً ہائی بھری۔ ہم دونوں اپنی اپنی کار میں بیٹھے۔ وہ رہنمائی کرتے ہوئے آگے آگے چل رہا اور میں اس کے پیچھے۔ روانگی سے قبل اس نے بتا دیا تھا کہ وہ میرے شہر سے تقریباً پچاس کلومیٹر دور ایک گاؤں استارز میں قیام پذیر ہے۔

اس کا گھر بہت بڑے رتبے پر محیط تھا۔ چاروں طرف پھیلے ہوئے شاندار باغ میں دکش اور طرح طرح کے خوشنما پھول لہلہا رہے تھے۔ بلند و بالا سرخ و شیشم اور دیوار کے درختوں نے اس کی شان میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ یوں لگتا جیسے کسی بادشاہ کا وسیع و عریض محل ہو۔ مجھے اندازے کی دعوت دیتے ہوئے اس نے آواز لگائی۔ ”ہنری ایسا ہر آؤ۔“ پھر میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔ ”ہنری میرا ملازم ہے اور میرے مکان کی دیکھ بھال اس کی ذمہ داری ہے۔“

چند ہی لمحوں بعد ایک کئی ساہتک شخص نمودار ہوا۔ میرے میزبان چارلس روم نے میرا اس سے تعارف کرایا اور کھانے کا بندوبست کرنے کا حکم دیا۔ ہم دونوں نے ڈرائنگ روم میں اک ڈرا آرام کیا اور پھر نوادرات دیکھنے اٹھ کھڑے ہوئے۔ چارلس روم کا انتخاب بلاشبہ جواب تھا اور اس پر استاذ کی کہ اسے اکثر و بیشتر اشیاء کی تاریخ بھی اذہر تھی۔ وہ ہر چیز کے بارے میں اس قدر بے ساختگی کے ساتھ مجھے بتاتا جا رہا تھا کہ میں اس کی خوش گفتاری کے محسوس محسوس ہو کر رہ گیا۔ بلاشبہ وہ جس قدر دولت مند تھا، اتنا ہی شیریں زبان بھی تھا۔ اس کی معلومات حیرت انگیز تھیں۔

خدا خدا کر کے یہ سلسلہ ختم ہوا تو میں نے اس سے پوچھا۔ ”یہاں تمہارا وقت کیسے گزرتا ہے؟ میرا مطلب ہے استارز تو ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ یہاں نہ زندگی کے ہنگامے ہیں اور نہ دلچسپی کا کوئی سامان۔“

اس نے جواب دینے سے گریز کیا اور آگے قدم بڑھا دیئے۔ ڈرائنگ روم میں داخل ہو کر ہم ایک دوسرے کے مقابل صوفوں پر بیٹھ گئے۔ میں نے سوچا شاید وہ ناراض ہو گیا ہے۔ ابھی میں معدنت کے لیے موزوں الفاظ کا انتخاب کر ہی رہا تھا کہ ایک جاگ وہ دیکھنے لہجے میں گویا ہوا۔ ”تمہارا اندازہ درست ہے کہ یہاں وقت گزارنا مشکل ہے لیکن میں نے اپنی مشکل کا حل تلاش کر لیا ہے۔ یہ بہت پرسکون جگہ ہے۔ صبح شام ٹھوڑی سی چھل قدمی کر لیتا ہوں اور یہاں کے دلنریب قدرتی نظاروں سے لطف اندوز ہونے کے بعد موسیقی کے بحر میں گم ہو جاتا ہوں۔“ اس نے ایک دیوار پر دیو گرام کی

شہر میں ٹھہرنے کا ارادہ کر لیا تاکہ خوب اچھی طرح سے اس شہر کی خوبصورتی کو اپنے اندر اتار لوں، اچھی طرح سے یہاں کی گلیاں محلے دیکھ لوں۔ اسی خیال سے بازار کی جانب رخ کر لیا۔ اس بازار میں پرانا ترنچر فروخت کیا جاتا تھا۔ میں نے اپنی کار ایک جگہ پارک کی اور مختلف شور و محاکازہ لیتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ ایک جگہ میرے قدم رک گئے۔ سامنے والی دکان میں ایک آئل پینٹنگ تھی جو کئی گھنٹے پہنچا گئی تھی۔ دکان میں داخل ہو کر بھاؤ تاؤ کیے بغیر پینٹنگ خرید لی اور دکاندار کو اسے عمدہ طریقے سے پیک کرنے کا حکم دیا اور وقت گزاری کے لیے میں یوں ہی ادھر ادھر گھٹنے لگا۔

ایک جگہ دیوار سے لگی ایک ڈرائنگ ٹیبل رکھی تھی۔ میں اسے دیکھنے کے لیے رک گیا۔ میرے قریب ہی ایک صاحب کھڑے تھے۔ وہ ایک چھوٹی سی قدیم آہوی میز کو بار بار لٹ پٹ کر دیکھ رہے تھے۔ بالآخر ان کی گفتیش ختم ہوئی۔ انہوں نے میز کو اپنی جگہ پر واپس رکھا اور ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے اپنے آپ سے بولے۔ ”میز تو خوبصورت ہے لیکن میرے پاس اس سے بھی زیادہ خوبصورت اور پائیدار میز پہلے ہی سے موجود ہے۔ بہر حال اگر مناسب قیمت پر مل جائے تو اسے بھی رکھ لوں گا۔“ یہ جملہ انہوں نے رواں انگریزی میں ادا کیا تھا اور اسی بات نے مجھے اس شخص میں دلچسپی لینے پر مجبور کر دیا۔

”گویا آپ بھی نوادرات کے قدردان ہیں؟“ مسکراتے ہوئے میں اس سے مخاطب ہوا۔ ”مجھے بھی تاریخی اشیاء سے دلچسپی ہے۔ خصوصاً اطالوی پینٹنگز۔“ ساتھ ہی ساتھ میں انہی کے چہرے کا جائزہ بھی لیتا جا رہا تھا۔ دراصل اس کے چہرے میں ایک ایسی انجمن سی دلچسپی اور جاذبیت تھی جس نے مجھے اس کی طرف مائل کر دیا تھا۔ اگرچہ عمر میں مجھ سے کافی بڑا تھا لیکن اس کی شخصیت اس بات کی غماز تھی کہ وہ انتہائی ذہین ہے۔ میں نے یہ بھی اندازہ لگالیا کہ وہ برطانوی نہیں بلکہ فرینچ ہے لیکن انگریزی کی زبان کا دلدادہ ہے۔

باتیں شروع ہوئیں تو میرے اندازے صحیح ثابت ہوئے۔ اس کی باتیں دلچسپ تھیں۔ اس کی خوش گفتاری نے مجھے اور بھی زیادہ متاثر کیا اور پھر ایک جاگ ہی اس نے مجھے اپنے گھر چلنے اور وہ پھر کا کھانا کھانے کی دعوت دی ڈالی۔ اس نے کچھ اس قدر دلنریب انداز سے دعوت دی تھی کہ میں انکار نہ کر سکا۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ میں نوادرات کا دیوانہ ہوں اور اس کی تلاش کے سلسلے میں ہر جگہ جانے کو تیار ہوتا ہوں لہذا

میراتھن ریس

میراتھن ریس کا تاریخی پس منظر کیا ہے؟ یقیناً یہ آپ بھی جانتا چاہیں گے تو سنئے، یوں تو میراتھن یونان کے ایک شہر استھنز سے 40 کلومیٹر دور ایک میدان کا نام ہے جہاں 490 قبل مسیح میں یونان اور ایران کے درمیان ایک تاریخی جنگ ہوئی تھی اور اس جنگ میں فتح کی خوشخبری لے کر یونان کا ایک ایجنٹ میراتھن سے استھنز پہنچا تو اس کی یاد میں 1896ء میں اولمپک گیمز کے ساتھ میراتھن ریس شروع ہوئی جب کہ 1977ء میں امریکا کے جارجیاکس نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت میراتھن ریس کو دنیا کے تمام ملکوں میں فروغ دینے کی کوشش شروع کی۔ اس کا فلسفہ تھا کہ مخلوط میراتھن سے معاشرہ میں آزادی آئے گی اور اگر عورتوں مردوں کی الگ الگ میراتھن ہو جائے گی تو عورتیں مرد سب اذکر دیکھیں گے۔ یوں ان سب میں دوڑنے کی تحریک آئے گی اور معاشرہ میں آہستہ آہستہ کھلا پن آتا جائے گا۔ اس فارمولے کو خاص طور پر مسلم معاشروں سے شرم و حیا وغیرہ کو ختم کرنے کے لیے بطور ہتھیار استعمال کیا گیا اور آج ہم اپنے معاشرے میں مزید کھلا پن پیدا کرنے کے لیے بڑے فخر کے ساتھ اس ریس میں حصہ لے رہے ہیں۔

مرسلہ: محمد عبدالحماس - کراچی

واقعہ بیان کر رہا ہوں۔ بہر حال مایا نے عینک نکال کر پادری کو دے دی۔ شکر یہ ادا کر کے پادری نے عینک آنکھوں پر لگائی اور مطالعے میں مشغول ہو گیا۔ کچھ دیر کے بعد پادری نے گارات کے قدموں کی آواز سنی۔ وہ کہنے سے اٹھا اور گارات کا استقبال کرتے ہوئے اپنے دونوں بازوؤں کو دے کر دے جیسے وہ گارات کو اپنے گلے لگانا چاہتا ہو۔ گارات بھی آگے بڑھا لیکن اچانک اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ اپنی جگہ پر کھڑے کا کھڑا رہ گیا اور ایک تنک انتہائی سراسیمگی کے عالم میں اس عینک کو گھومنے لگا جو اس وقت پادری کی آنکھوں پر جمی ہوئی تھی۔ "انتا کہہ کر چارلس اچانک خاموش ہو گیا اور زمین کی طرف دیکھنے لگا۔

"کیا کہانی نہیں پرستم ہو گئی؟ یا شاید اس سے آگے کے واقعات تمہاری یادداشت میں محفوظ نہیں ہیں؟" میں نے اسے پھیرا۔

وئی کا کوئی موقع نہیں ہے۔ بہر حال اس نے ساری ذمہ داری عینک پر ڈال کر اس کو ایک دراز میں بند کر دیا اور فیصلہ کر لیا کہ آجندہ وہ کوئی بھی عینک استعمال نہیں کرے گا۔

"لیکن گارات نے عینک کو ضائع کیوں نہیں کر دیا؟ وہ اسے استعمال بھی نہیں کرنا چاہتا تھا اور پھر محفوظ بھی کر لیا، آخر کیوں؟" میں نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔

"اس بارے میں میں واقعی لاعلم ہوں۔" میرے استفسار پر چارلس نے جواب دیا۔ "اب کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں۔

گارات کی عمر کافی ہو چکی تھی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ قریب المرگ تھا۔ وہ دنیا کے سب کام چھوڑ چھاڑ کر استازہ میں اپنے مکان میں گوشہ نشین ہو گیا تھا اور اپنا تمام وقت عبادت اور دعاؤں میں گزارتا۔ اس زمانے میں ایک برگزیدہ پادری بھی یہاں رہا کرتا تھا جس کا نام میں بھول رہا ہوں۔ دو دروازے سے لوگ اس پادری کی خدمت میں حاضری دینے کے لیے آیا کرتے اور اپنے لیے دعائیں کرواتے۔ گارات نے بھی اس پادری کی پناہ ڈھونڈ لی۔ اب پادری آزادانہ طور پر گارات کے

عالیشان مکان میں آنے جانے لگا تھا۔ ایک دن پادری ایسے وقت میں وہاں آ گیا جب کہ گارات کی ضروری کام سے باہر گیا ہوا تھا۔ پادری اس کے انتظار میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور وقت گزاری کے لیے ایک کتاب اٹھالی۔ اتفاقاً وہ اپنی عینک

کھین بھول آیا تھا اور اب اسے پڑھنے میں دقت ہو رہی تھی۔ اس نے گارات کی ملازمت دیا سے کہا کہ اگر گھر میں کوئی عینک

ہو تو اسے تھوڑی دیر کے لیے لے کر آئے۔

"عام طور پر کسی کی عینک دوسرے کے لیے موزوں نہیں ہوتی ہے۔ ایسا اتفاق بہت ہی کم ہوتا ہے کہ ایک کی عینک دوسرے کے لیے بھی صحیح ہو۔" میں نے ایک بار پھر دخل اندازی کی۔

"تم درست کہہ رہے ہو۔" چارلس نے میری بات کا برا منائے بغیر کہا۔ "پادری کی فرمائش پر نایا کو یاد آ گیا کہ دراز میں ایک بہت پرانا چشمہ بیکار پڑا ہوا ہے۔ اس نے وہ عینک نکال کر پادری کے حوالے کر دی۔

"لیکن تم نے پہلے ذکر کیا تھا ملازمت کو انتہائی سختی سے تاکید کر دی تھی کہ اس عینک کو بالکل بھی اتھم نہ لگائے۔" میں نے پھر اعتراض کیا۔

"ہاں! میں نے ایسا کہا تھا لیکن مایا کیا کرتی ہے اور کیا نہیں کرتی ہے۔۔۔۔۔ میں اس کا ذمہ دار نہیں ہوں۔" چارلس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھرے۔ "میں تو صرف اصل

تھا؟" اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا اور میرے جواب دینے سے قبل ہی بول اٹھا۔ "وہ گارات تھا اور پھر بعد میں شاہ لوئیس شش دہم کی موت کا ذمہ دار بھی وہی بنا۔"

"یہ کیسے؟ یعنی شاہ لوئیس شش دہم کو قتل کرنے میں گارات نے کیا کردار انجام دیا؟" خود کو سوال کرنے سے میں روک نہ سکا۔ "گارات نے فلوار کے ایک ہی وار سے بے بس بادشاہ کا سر قلم کر دیا ہوگا؟"

"نہیں۔۔۔۔۔ بات اس طرح نہیں ہے جیسا تم سمجھ رہے ہو۔" چارلس نے میری بات کی تردید کرتے ہوئے کہا۔ "بادشاہ کو گرفتار کر کے اس پر باقاعدہ مقدمہ چلایا گیا اور عدالت نے اسے سزائے موت سنائی۔ عدالت نے گارات کو حکم دیا کہ وہ نظر بند بادشاہ کے پاس جائے اور عدالت کا حکم

نامہ اس کے رو برو پڑھ کر سنائے۔ گارات کو یہ حکم ماننا ہی پڑا۔ لیکن اس کا دل رور رہا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ مجبوراً اسے اس بادشاہ کو یہ حکم سن کر مزید ذلیل کرے۔ گارات کی بیوقوفی ذرا

نکمزور تھی۔ بادشاہ کے سامنے جا کر اس نے عینک اپنے چہرے پر لگائی اور بادل ناخواستہ موت کا پروانہ پڑھ کر سنایا۔ بادشاہ کی حالت اچانک غیر ہو گئی اور وہ وحشت کھا کر گر پڑا۔ اور اسی

حالت میں اس کی روح نفس غصری سے پرواز کر گئی۔

"لیکن بات میری سمجھ میں نہیں آتی؟ جو کچھ ہوا وہ واقعی افسوسناک ہے۔ لیکن شاہ لوئیس شش دہم کی موت میں تمہارا کیا کردار ہے، جو تم آج پونے دو سو سال گزر جانے کے

باوجود بھی شرمندہ اور متاسف نظر آ رہے ہو؟" میں نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"تم نہیں سمجھو گے۔" اس نے بزرگوں کی طرح مجھے ڈانٹا۔ "ذرا توجہ سے یہ واقعہ سنو۔ گارات اپنے آپ کو بادشاہ کی موت کا ذمہ دار سمجھ رہا تھا۔ اس کے ذہن میں یہ خیال بڑ

کچڑ چکا تھا کہ اگر وہ حکم نامہ پڑھ کر نہ سنا تو بادشاہ کی حرکت قلب بند نہ ہوئی (اگرچہ پھر بھی عدالت کے حکم کے مطابق موت اس کا مقدر تھی) دراصل گارات بادشاہ کو سزائے موت

دینے کے حق میں نہ تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ بادشاہ کو تخت سے اتار دینا ہی کافی ہے۔ لیکن اس کے ساتھیوں کو اس سے اتفاق نہ تھا۔ چند دنوں بعد اس نے عینک کو ہی مخوش قرار دے دیا۔

اس کا کہنا تھا کہ اس عینک کے اندر کوئی ایسا طلسم پوشیدہ ہے جو کسی انسان کو دیکھ لینے کے بعد اس کی جان لیے بغیر نہیں چھوڑتا ہے۔ اس کا یہ نظریہ صحیح تھا یا غلط، اس پر فی الحال رائے

"کیا تم اپنے عزیز دوست کو اپنی پریشانی اور مصیبت کا حال نہیں بتاؤ گے؟" میں نے دلی دل سے پوچھا۔ "مجھے بتاؤ! تمہارا دشمن کون ہے اور وہ تم سے کیا چاہتا ہے؟"

"تمہارا شکوہ بجا ہے۔ میں تم سے کچھ بھی نہیں چھپاؤں گا لیکن تمہارا یہ اندازہ غلط ہے کہ میں کسی مشکل میں گرفتار ہوں۔" اس کے چہرے پر کئی ہی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"بات بالکل معمولی سی ہے، بس ایک عینک اس مصیبت کی جڑ ہے۔"

"کیا کہا؟ صرف ایک عینک کا معاملہ ہے؟" میں حیرت سے ٹپک رہ گیا۔ "یہ کیا بات ہوئی؟ کہیں ہنری کی عینک کا کوئی مسئلہ تو نہیں؟"

"نہیں بھئی، بالکل نہیں۔ ہنری کی عینک کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔" وہ چند لمحوں کا اور پھر ٹھہرے ٹھہرے انداز میں بولا۔ "دراصل یہ سارا فساد گارات کی عینک نے

پھیلا دیا ہے۔۔۔۔۔" وہ ابھی کچھ اور بھی کہنے جا رہا تھا کہ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "یہ گارات کون ہے؟ کیا وہ دوسری عینک نہیں خرید سکتا؟"

میری کیفیت دیکھ کر چارلس بے اختیار ہنس پڑا۔ "اسنے جذباتی نہ ہو اور توجہ سے میری بات سنو۔ میں اصل قصہ شروع سے سناتا ہوں۔" اس کی ہنسی یک لخت رک گئی اور وہ بے حد

سنجیدہ نظر آنے لگا۔

اس کے اس عجیب و غریب انداز نے ظاہر کر دیا کہ معاملہ ایسا سیدھا سا دائیں ہے جیسا کہ میں سمجھ رہا ہوں۔ "ہینا کوئی بہت ہی پیچیدہ اور پراسرار واقعہ ہے۔ میں نے اپنے دل کو ہر قسم کے حالات سے مقابلہ کرنے کو تیار کر لیا۔" ہاں، اب کہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"تم ہینا فرانس کی تاریخی سے لاعلم ہو۔" چارلس نے بڑے بڑے ذہب انداز میں بات وہاں سے پھیری جس کا میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ "میں ڈوئیک جوزف گارات کے

حالات زندگی نہیں سناتا ہوں۔ گارات 1749ء میں میرے گاؤں استازہ میں پیدا ہوا۔ وہ بچپن ہی سے بے حد ذہین اور ہوشیار تھا۔ ابتدائی تعلیم اس نے استازہ ہی میں

حاصل کی اور پھر پیرس چلا گیا۔ جلد ہی اس نے وہاں کی سیاست میں اپنا ایک اعلیٰ مقام پیدا کر لیا۔ 1789ء میں فرانس میں انقلاب آیا۔ حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا اور پیرس کی گلیاں خون سے سرخ ہو گئیں۔ جانتے ہو یا غیول کا سرغزہ کون

English

تیرا روپ بہت خوب

”چند ماہ قبل کی بات ہے..... میں بایون چلا گیا۔ وہاں ایک دکان میں کچھ اور چیزیں دیکھ رہا تھا کہ اچانک ایک بوسیدہ سے چڑے کے کیس میں لپٹی ہوئی اس عینک پر میری نظر پڑ گئی۔“ میرے پوچھے بغیر ہی چارلس نے عینک حاصل کرنے کے پس منظر سے مجھے آگاہ کیا۔ وہ میری بدلتی ہوئی حالت دیکھ کر سمجھ گیا تھا کہ میں کیا پوچھتا چاہتا ہوں۔ ”پہلے تو میں نے اس عینک کو یہ سوچ کر نظر اٹا کر دیا کہ کوئی شخص اپنی عینک یہاں بھول کر چلا گیا ہوگا لیکن پھر میں نے فطری تجسس سے مجبور ہو کر اسے کھول لیا اور اس کو بخود دیکھنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ فریم کی داہنی لمائی پر ایک نام کندا ہوا تھا۔ یہ نام تھا ”گارات“ مزید غور کیا تو دھندلا دھندلا سا D.J بھی نظر آ گیا۔ انہی دو خوف نے مجھے چمکنے پر مجبور کر دیا ورنہ صرف گارات تو ایک عام نام ہے لیکن D.J کے حروف اس بات کی نشان دہی کر رہے تھے کہ اس عینک کا تعلق کسی اہم تاریخی شخصیت سے ہے۔“

”ڈومینک جوزف.....“ میں نے بے اختیار کہا۔
”یہنا۔“ چارلس نے تائید کی۔ ”تم بھی تاریخی اشیاء کی اہمیت کو سمجھتے ہو۔ ہمیں اندازہ ہوگا کہ ایسی اہم چیز کو دیکھ کر میری کیا حالت ہوئی ہوگی اور خاص طور پر جبکہ میں اس کی تاریخ سے بھی واقفیت رکھتا تھا۔ چنانچہ میں نے فوراً ہی اس عینک کو اپنے خزانے میں شامل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ مگر آکر میں نے بار بار اس کا اچھی طرح معائنہ کیا۔ یہاں تک کہ مجھے یقین ہو گیا کہ میرے خزانے میں ایک اہم اور نہایت ہی شاندار اضافہ ہوا ہے۔“

میں حیرت سے ٹنگ چارلس کی باتیں سن رہا تھا اور گزشتہ کئی منٹوں سے خاموش تھا۔ میری تجویز کا یہ عالم اس وقت ٹوٹا جب ہنری نے آکر اطلاع دی کہ کافی تیار ہے اور ہم لوگ دوسرے کمرے میں آکر کافی نوش فرمائیں۔

ہنری تو یہ اطلاع دے کر چلا گیا لیکن چارلس اسی طرح دم صم اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ مجھے بھی مجبوراً اس کے ساتھ بیٹھنا پڑا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد چارلس نے پھر عینک کا قصہ چھیڑ دیا۔ ”میں نے عینک کو میز کی ایک درواز میں ڈال دیا۔ بالکل اسی طرح جس طرح گارات نے اس کو ایک طرف ڈال دیا تھا۔ مجھ میں یہ ہمت نہیں تھی کہ میں اس عینک کو شوقیہ ہی سمجھ، اپنی آنکھوں پر لگا کر دیکھوں، خاص طور پر ایسے حالات میں کہ مجھے اس کے بارے میں سب کچھ معلوم تھا۔ اس کے علاوہ مجھے کوئی ضرورت بھی نہیں تھی۔“

”نہیں نہیں۔ مجھے سب یاد ہے۔“ وہ یوں گھبرایا جیسے اچانک ڈر گیا ہو۔ اس کا لہجہ بے حد افسردہ کی اور پشیمرد کی لیے ہوئے تھا۔ ”عینک دیکھ کر گارات کا پورا جسم تھر تھرا کا پھٹے لگا۔ شاید اسے وہ وقت یاد آ گیا تھا جب اس نے یہی عینک پہن کر شاہ لوئیس شش دہم کو زمانے موت کا پروانہ پڑھ کر سنایا تھا اور یہ حکم سن کر بادشاہ کا جسم بھی اسی طرح تھر تھرا ہوا اور کانپا تھا۔ اچانک گارات لڑکھڑایا اور فرش پر کسی یکے ہوئے پھل کی طرح گر پڑا۔ پادری اور مایا نے اسے جلدی جلدی اٹھایا اور بستر پر لٹا دیا۔ گارات پر عشی کا عالم طاری تھا پادری نے اندازہ لگالیا کہ اب گارات کی زندگی کا چراغ گل ہونے کو ہے۔ اس نے بستر مرگ پر پڑھی جانے والی دعاؤں کا ورد شروع کر دیا۔ عینک بدستور اس کے چہرے پر موجود تھی اور پھر ٹھوڑی ہی دیر میں گارات موت کی آغوش میں پہنچ گیا۔“ چارلس کا چہرہ بے حد سنا ہوا تھا جیسے ابھی ابھی اس کا کوئی جان سے پیارا داغ مفارقت دے گیا ہو۔

میں خود بھی ایک عظیم شخصیت کی المناک موت پر رنجیدہ تھا۔ چند لمحے کف افسوس ملنے کے بعد میں نے چارلس کو تسلی دیتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ”گارات واقعی بے حد مظلوم تھا۔ مجھے اس سے ہمدردی ہے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ خدا اس کے گناہوں کو معاف کرے اور اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ لیکن چارلس! اس دردناک حادثے کو گزرے ایک زمانہ بیت گیا۔ اب ان واقعات کو فراموش کر دو۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تاریخ کو دہرا کر تم خواہ خواہ اپنی جان کو روگ لگا رہے ہو۔ ذرا اپنی حالت زار پر دم کھاؤ۔ تمہارے چاہنے والے کتنے کبیدہ خاطر ہیں۔ شاید تمہیں اس کی خبر نہیں۔“ میری آنکھوں سے دو آنسو ٹپک پڑے۔ چارلس مائی انداز میں آنکھیں بند کیے کوئی دعا پڑھ رہا تھا۔ اچانک میرا ادھیان پھر عینک کی جانب چلا گیا۔ ”گارات کی موت کے بعد اس عینک کا کیا حشر ہوا؟“

”یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ بعد میں وہ عینک کس کس کے ہاتھ لگی۔ ہاں! اتنا ضرور بتا سکتا ہوں کہ وہ شخص عینک اس وقت میری خواب گاہ میں موجود ہے۔“ چارلس نے یوں سا دگی سے اتنی بڑی بات کہہ دی جیسے کچھ ہوائی نہیں۔

میں نے ہنشل خود پر ضبط کیا۔ سردی اور شدید خوف کی ایک لہر میرے پورے جسم میں پھیل گئی۔ اپنے حواس کو قابو کرنے کی کوشش کرتے ہوئے میں چارلس کے اور قریب سمٹ گیا۔ میں کچھ پوچھتا چاہتا تھا لیکن میری آواز نے میرا ساتھ نہ دیا۔



شمشاد ٹورنٹو

ندیم اقبال

شاعر نے غلط نہیں کہا ہے کہ چاند میری زمیں پھول میرا وطن۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ میرا وطن چاند سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔ اس کی وادی، اس کے دریا، شہر و کوہسار سب کے سب بے نظیر و بے مثال ہیں۔ لیکن ان فضاؤں سے جو نکل کر کسی اور شاخ پر آشیانہ سجانے کی خواہش کرتا ہے۔ اسے کیسی کیسی پریشانیاں گھیرتی ہیں اس کا ذکر جو یورپ و امریکا میں بسنا چاہتے ہیں وہ اس تحریر کو ضرور پڑھیں۔



ایک جداگانہ انداز کی دلچسپ سرکاری کابائیسواں حصہ

پروٹیس کی زندگی بھی عجیب ہے۔ کبھی تو اسی آسان کردل شکرانے کی لٹل پڑھنے کو چاہے اور کبھی اتنی سخت کہ تمام دن نگر و درویش گزرے۔ ہمارے ساتھیوں میں سب کے سب مصیبت کے بیکر تھے۔ دل کے اتنے صاف کہ کوئی کسی کی بات کا برا نہ مانتا۔ اگر کوئی بات بری لگتی بھی تو وہ کھینے آدھ کھینے میں دور ہو جاتی اور پھر سے وہ سب ایک ہو جاتے۔ خان اپنی ٹیلی کے ساتھ ایک دوسرے اپارٹمنٹ میں رہتا تھا لیکن موقع ملنے ہی ہمارے اپارٹمنٹ میں

چارلس کی خوش خلقی کہاں غائب ہو گئی ہے۔ بس صدمہ تھا تو صرف اس بات کا کہ میرے پیارے دوست کا ایک ذہنی مرض انتخاب کر لیا ہے؟ مجھے اپنے آپ سے بھی یہ لگتا تھا کہ میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔

تین دن بعد پریس میں اخبار پڑھتے ہوئے ایک مختصر خبر پر میری نگاہیں جم کر رہ گئیں۔ وہ خبر بڑی حسرت ناک تھی۔ صدمے سے میری بری حالت ہو گئی اور میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپک پڑے۔ خبر کے مطابق فرانس کی ایک اہم شخصیت چارلس رول کا ان کے گاؤں استارز میں اچانک حرکت لے کر بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔ مرحوم تاریخی اشیاء کے شوقین تھے اور ان کا خزانہ بے شمار نوادرات اور یادگار چیزوں پر مشتمل ہے۔ فرانس کی حکومت ان کے انتقال کے بعد یہ خزانہ قومی ملکیت میں لینے کے لیے قانونی کارروائی کر رہی ہے۔ میں کافی دیر تک رنج و غم کے عالم میں غرق رہا اور پھر استارز کی جانب روانہ ہو گیا۔ وہاں جا کر اظہار آفس کرنا اور دعائے خیر کرنا میرا فرض بننا تھا۔

ہنری نے اپنی شکستہ آنکریزی میں مجھے بتایا کہ ان کی اچانک موت کسی کے لیے بھی اچھے کا باعث نہیں تھی۔ سچی لوگ جانتے تھے کہ ان کی عمر اب اسی سال سے تجاوز کر چکی تھی اور وہ کافی عرصے سے بیمار بھی چلے آ رہے تھے۔

نہ جانے کیا سوچ کر میں نے فیصلہ کیا کہ اک ذرا اس منحوس عینک کو تو دیکھ لوں جو کم از کم تین عظیم شخصیتوں کی موت کا سبب بن چکی ہے اور آئندہ بھی نہ جانے کیا کیا کارنامے انجام دے گی۔ میری فرمائش پر ہنری نے وہ عینک لاکر میرے سامنے رکھ دی۔ میں نے اسے بالکل بھی ہاتھ نہیں لگایا۔ بس ایک نظر دیکھا اور واپسی کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

چارلس رول اپنے گاؤں کی مٹی تلے ابدی تین سو رہا ہے۔ خدا اس کی روح کو سکون کا ل عطا کرے۔ گارات بھی اس کے قریب ہی مدفون ہے۔ میں نے ان دونوں مظلومین کے لیے صدق دل سے دعا کی اور پھر آنسو پونچھتا ہوا اپنے وطن روانہ ہو گیا۔ بے شک ہر انسان کو موت کا ڈاٹھ چھکنا ہے۔ یہ قانون قدرت ہے لیکن کبھی کبھی نہ جانے کیوں میں سوچ میں پڑ جاتا ہوں کہ عینک والے وہاں میں کتنی صداقت تھی اور کیا میرے دوست چارلس رول کی موت واقعی قدرتی تھی؟

میں آج تک اسی شش و پنج میں مبتلا ہوں اور نہ جانے کبھی یہ معاملہ ہوگا بھی یا نہیں۔

چارلس اب میری موجودگی کو فراموش کر چکا تھا اور یوں لگ رہا تھا گویا وہ اپنے آپ سے ہی باتیں کر رہا ہے۔ اس کا چہرہ دوسری طرف دیوار کی جانب تھا اور آواز گونگر ہو چکی تھی۔ ”گزشتہ شب جب میں چھل تدری کر کے وہاں آیا تو ہنری میرے استقبال میں باہر ہی موجود تھا۔ اس کے چہرے پر عینک موجود تھی۔ میں نے نہ جانے کیا سوچ کر اس کی عینک پر توجہ مرکوز کر دی اور یہ دیکھ کر میرا کجہ مزہ کوا گیا کہ وہ عینک اس کی اپنی نہیں بلکہ گارات والی تھی۔ شدت خوف سے میری حالت بری ہو گئی۔ ہو بہو ہی منظر ہوگا جب کسی زمانے میں گارات کو دیکھ کر بادشاہ لوئیس شش و دم کا ہوا تھا، اور پھر اس کے کئی سال بعد گارات کا ہوا جب پادری نے یہی عینک پہن کر اس کو دیکھا تھا۔ چنانچہ جب ہنری نے وہ عینک لاکر میری جانب دیکھا تو خوف و وحشت کے مارے میں کانپ اٹھا اور مجھے اپنی موت کا یقین ہو گیا۔ میری پرسش کے جواب میں ہنری نے بتایا کہ گزشتہ روز اس کی عینک ٹوٹ گئی تھی اور کام چلانے کے لیے اس نے عارضی طور پر یہ عینک استعمال کر لی ہے۔ بہر حال میں نے برا بھلا کہتے ہوئے اس سے عینک چھین لی اور دوبارہ دراز میں ڈال دی۔“ چارلس اپنی بات مکمل کرنے کے بعد کمرے خیاوں میں غرق ہو گیا۔

اس کہانی کا ظلم میرے دل و دماغ کو اس قدر متاثر کر چکا تھا کہ مجھے بھی چارلس کی موت نظر آنے لگی۔ میری ہمت و طاقت نے جواب دے دیا اور میں نے اسی میں شہریت دیکھی کہ اب یہاں سے بھاگ نکلنا چاہیے۔ بظاہر ایسی باتیں بے سرو پا ہی لگتی ہیں لیکن ان کے اندر چھپا کوئی ایسا ظلم ہوتا ہے جو بڑے سے بڑے بہادر انسان کا جگر بھی پانی کر دیتا ہے۔ مجھ پر ایک اضطراب کا عالم طاری تھا۔ میں لرزیدہ قدموں سے اٹھا اور کا پتے ہوٹلوں سے چارلس سے معذرت خواہ ہوا۔ ”چارلس! میرے عزیز دوست! مجھے ایک بے حد ضروری کام کے سلسلے میں فوراً جیسر پہنچنا ہے۔ اگر میں نے دیر کر دی تو بہت نقصان ہو جائے گا۔ خدا نے چاہا تو دوبارہ ملاقات ہوگی۔“ یہ کہہ کر میں نے معاملے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ مجھے فی الفور اس ہیبت ناک ماحول سے دور ہو جانا تھا۔

چارلس اپنے ہی خیالات کی دنیا میں گھوبا ہوا تھا۔ اسے اس بات سے اب کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی کہ میزبانی کے اصول کیا ہیں۔ اس نے انتہائی سرد مہری سے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا اور میں اپنے دوست کی حالت ڈار پر آنسوں کرتا ہوا باہر نکل آیا۔ مجھے اس بات کا ذرا بھی قلق نہیں تھا کہ

ماہنامہ سرگزشت

کے کام چور، سب سے الوداد اور معلوم نہیں کیا کیا ہیں۔
مفتی نے ایک دم ٹی وی کی اسکرین سے منہ موڑا اور
سر جی کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ مطیع اللہ غریب کمر سرتی
سے مخاطب ہوا۔ ”خدا تجھے عافیت کرے۔ یہ تو میں بولا بھی
نہیں۔“

سر جی خفا ہوئے اور کھڑکی کی جانب منہ کر کے کہنے
لگے۔ ”تمہارا مطلب تو یہی تھا کہ چل نہ سکوں میرے بارہ
خزے۔“

شہباز جو سدا کا تھکا ہوا لیٹا تھا۔ وہ بھی بول پڑا۔
”پشمان بھائی کے بعد اب سر جی کا بھی سیاہ۔“
میں نے سر جی کو چھیڑتے ہوئے کہا۔ ”مفتی ٹھیک
تھا کہ تو چلے جا اور چلتے ہوئے خزے کہاں کرتا ہے؟“
مفتی اب خصوصی نظروں سے سر جی کو گھور رہا تھا۔ سر جی
بولے۔ ”میں نے تو محاورہ بولا ہے۔“

”آئندہ سے، پہلے محاوروں کا مطلب بتایا کرو اور
پھر یہ مشکل الفاظ بولو۔“ مفتی نے کہا۔

”اس کا مطلب تو بہت آسان ہے کہ کام چور کو
ساری مراعات بھی چاہئیں۔“ سر جی بولے۔
شہباز بھی اب اٹھ کر بیٹھ چکا تھا۔ وہ مفتی سے بولا۔
”دیکھو یہ پھر تمہیں کام چور، بد حرام اور شاید نمک حرام بھی
کہہ رہا ہے۔“

مفتی نے ایک عجیب کام کیا۔ وہ یہ کہ پہلی بار ہمارے
سامنے ٹی وی بند کیا۔

پھر لال بھڑکا ہوا اور اس کے بعد آلتی پالتی مارکر
اپنے میٹر ٹیس پر بیٹھا سر جی کو خوشخوار نظروں سے دیکھنے لگا۔
میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ چنگاری مطیع اللہ نے سلگائی اور دنگل
مفتی اور سر جی کے بیچ پڑ گیا۔ وہ خود معصوم بنا ابھی تک چھت
کو گھور رہا تھا۔

”سر جی یہ آپ ہر وقت کچھ نہ کچھ کہتے رہتے ہیں۔
مگر اپنے آپ کو نمک حرام کہلوانا میں ہرگز پسند نہیں کروں
گا۔“ مفتی نے کہا۔

”مفتی ایسا انسان ہے جس نے نہ کسی کا نمک کھایا
ہے اور نہ ہی کسی کو کھلایا ہے اس لیے نہ کسی کا نمک حرام
اور نہ کوئی اس کا تو بس جھگڑا ہی ختم۔“ میں نے اسے منانے
کی خاطر کہا۔

مفتی چکرا گیا اور بولا۔ ”وہ کیسے؟“
میں نے کہا۔ ”جب نمک بھی نہیں کھایا تو نمک حرام

کیسے ہو گئے، اسی لیے شہباز کی بات غلط ہے۔“
مفتی بولا۔ ”مگر شہباز نے تو نہیں کہا۔“
میں نے پوچھا۔ ”کیا سر جی کی زبان سے سنا ہے؟“
”نہیں۔“

”تب کس کے منہ سے سنا ہے؟“
”شہباز کے۔“

شہباز، مفتی اور سر جی تینوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا
کہ یہ بات کیا کس نے ہے، خود مفتی بڑبڑا رہا تھا کہ شہباز
”تھکوا کروں یا سر جی؟“ وہ بے بس ہو گیا اور بولا۔
”مجھے نہیں آ رہی ہے کہ نمک حرام بولا کس نے ہے؟“

میں نے کہا۔ ”ایک گلاس پانی پی کر سوچو تو معلوم ہو
جائے گا کہ مطیع اللہ نے کیا ہے۔“

اب مفتی کے علاوہ سب کو معلوم ہو گیا تھا کہ میں اصل
مجرم کو سامنے لے آیا ہوں اور مفتی اب اس پریشانی میں بیٹھا
تھا کہ اتنا غصہ اس نے اپنے دماغ میں مجھ لیا ہے اسے کس پر
ٹکالے۔

مطیع اللہ کو ایک جگہ ٹکی نظر آئی تو وہ اس میں کس کیا
یعنی بات بدل کر مفتی سے پوچھا۔ ”تم تین دن کی چھیڑوں
میں بہن کے گھر کیوں نہیں چلی جاتی۔“

مفتی پہلی سوچ سے نکل کر دوسری میں ڈوب کر بولا۔
”سوچ تو یہی رہا تھا مگر ہر وقت کام کرتے کرتے تھکاوٹ
آتی ہے۔ سوچتا ہوں آرام کروں۔“

مطیع اللہ بولا۔ ”لوگوں کی عادت ہے باتیں بنانے
کی ایسے ہی تمہیں کام چور کہتے ہیں۔“ کوئی اور بات اس
سے پہلے ہونی کہ ”مطیع نے پوچھا۔ ”مذمب بھائی! آپ کا ان
دنوں کیا پروگرام ہے؟“

میں نے کہا۔ ”پرنس ایڈورڈ کا وٹنی میں سینڈز بینک
پارک، وہاں سورج ڈوبنے کا نظارہ دیکھنے کے قابل ہوتا
ہے۔“

یہ سن کر سب نے ایک ساتھ سوالات کیے۔ کس نے
بتایا اس کے بارے میں؟
کس کے ساتھ جاؤ گے۔

سختی دور ہے؟
کیسے جاؤ گے؟
کیوں جاؤ گے؟

اگر کل مجھے تو وہاں کب آؤ گے؟
میں نے مختصر آبتایا کہ یہاں سے دو ڈھائی گھنٹے کی

مسافت پر نو رنڈ اور اوناوہ کے بیچ اونٹار پو جمیل پر ریت کے
اونچے اونچے ٹیلے ہیں، نیلے پانیوں کی جمیل جس کے اوپر
نیلے آسمان تلے کئی رنگوں کے بادل تیرتے رہتے ہیں۔ پانی
کناروں سے لہروں کی صورت آ کر سنہری رنگوں میں عکس
ہے اور وہاں جا کر دوبارہ ٹیلا ہو جاتا ہے۔ پھر میں نے
پوچھا۔ ”کون میرے ساتھ جانا چاہتا ہے؟“

میری خواہش تھی کہ ان میں سے کوئی ایک میرے
ہمراہ جائے مگر امید نہ تھی۔ مفتی کا جانا میرے لیے بیکار تھا۔
باقی تینوں کا مجھے کوئی اعزاز نہ تھا کہ کوئی وہاں جانے پر تیار
ہوتا ہے کہ نہیں۔ مطیع اللہ نے ہر بات کو جولائی تک ٹال رکھا
ہے۔ مفتی سے بھی یہی کہہ رہا تھا کہ کلب جولائی میں چلوں
گی اور مجھ سے بھی یہی بولا۔ ”جولائی میں چلیں گے۔“

شہباز بولا۔ ”اس کی جاب ہے اور چھٹی ملنا بہت
مشکل ہے۔“

سر جی مفتی خیر لیجے میں بولے۔ ”نیلے پانیوں میں
خوب صورت چہروں کے عکس دیکھو، ہمیں دیکھ کر اپنی چھٹی
خراب کرتی ہے۔“

ان کی بات کا مطلب میں سمجھ گیا تھا مگر مطیع کی طرح
بے پروا بن کر چھت بکتے لگے۔

☆.....☆

شام اتر رہی تھی۔ سائے لیے ہو کر دھندلے پڑنے
لگے تھے۔ میں کمرے میں لیٹا ڈور وال سے باہر کے ٹیلے
چمک دار آسمان کی وسعتوں میں کھویا آسودگی سے لیٹا تھا۔
سر جی دھیرے سے دروازہ کھول کر اندر آئے اور پھر آہستگی
سے دروازہ بند کر کے راز داری سے بولے۔ ”باجی نسرین کو
ساتھ کیوں نہیں لے جاتے؟ وہ معصوم تو تمہارے ساتھ
جانے پر تیار بھی ہو جائے گی۔“

میں بولا۔ ”آپ سے وہ بہت کم عمر ہے اسے باجی
کیوں کہتے ہیں آپ؟“

جواب دیا۔ ”آپ کی وجہ سے عزت کر رہا ہوں۔“
میں نے کہا۔ ”اس کی اپنی جاب بھی ہے۔ سعد کا
اسکول بھی ہے۔ کہتے ہوئے اچھا نہیں لگتا۔“

کہتے لگے۔ ”بات کرنے میں کیا حرج ہے۔ وہ
معصوم اداس آنکھیں لیے خاموش بیٹھی رہتی ہے۔ اس کا بھی
دن اچھا گزر جائے گا۔“

مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ بنجید ہیں یا مذاق کر رہے ہیں
مگر میں نے اس بارے میں شبجیگی سے سوچنا شروع

کر دیا۔ کچن میں جا کر اپنے لیے جانے بنائی اور اندر میٹرس
پر لیٹ کر پھر سے سوچنے لگا لیکن کسی نتیجے تک نہ پہنچا تو فون
اٹھا کر نسرین کا نمبر ملا لیا۔ دوسری تیل پر نسرین کی آواز آئی۔
”سعد بھی کھڑا تھا کہ اٹکل آج فون ضرور کریں گے۔“
”سعد کی ماں سے بھی پوچھ لیتی۔ شاید وہ بھی کچھ کہہ
رہی ہو۔“

”سعد کی ماں اپنے بیٹے سے کھد رہی تھی کہ اپنے اٹکل
سے کہو۔ چند منٹ ہمارے جانے میں رہ گئے ہیں۔ نلے میں
اتنی دیر کیوں اور ہماری ٹکٹوں کا انتظام بھی کرتا ہے۔ اسی
لئے بھی آج بھی جایا کریں۔“ اس کے لہجے میں شوخی تھی۔

”سعد سے کھد دینا کہ اٹکل پوچھ رہے ہیں کہ ان کے
ساتھ کہیں چلو گے؟ اور کوئی بات نہیں، اپنی ماں کو بھی ساتھ
لیتا۔“ میں بولا۔ وہاں کچھ لمبے خاموشی رہی اور پھر کھکتی
ہوئی آواز آئی۔ ”سعد سے نہیں بلکہ سعد کی امی سے سیدھا
پوچھ لیا ہے۔ وہ کہتی ہے۔ کہیں بھی لے چلو، پرلے تو چلو،
مجھے وہاں ہی چھوڑ دینا۔“

میں نے اس سے سیدھا سوال کیا۔ ”یہاں سے دو
گھنٹے کی مسافت پر ایک پارک ہے۔ بیچ بھی ہے چلتا ہے؟
اور شاید رات بھی وہیں گزارنی پڑے۔“

وہ شاید کچھ سوچنے لگی۔ پھر پوچھا۔ ”تم چھٹی کرو
گے؟“

”میری ویسے بھی چھٹیاں ہیں اچھی جگہ ہے ہو سکے تو
چلی آؤ۔“

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ ”میری بھی کل جاب ہے۔ سعد
کے اسکول میں تو اطلاع دی جا سکتی ہے مگر میرا اس وقت
انہیں بتانا مناسب نہیں۔“ کچھ لمبے خاموشی رہی پھر
بولی۔ ”کیا خیال ہے۔ پرسوں کا پروگرام بناؤ۔ میں بھی کل
جا کر دو دن کی چھٹی لے لوں گی۔“

میں نے کچھ سوچنے کے بعد کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ تم
پرسوں کے لیے ساتھ کچھ کھانے بھی بنا لیتا۔ رات وہیں
ٹھہریں گے۔ تم کل آ کر تیاری کر لینا۔ میں بھی رہائش اور
ٹرانسپورٹ کا دیکھتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے وہاں چھوڑ تو نہیں آؤ گے؟“
”کبھی نہیں۔“ میں ہنس پڑا۔ اپنی بات آگے
بڑھائی۔ ”میں کل شام کو فون کروں گا۔ تم سے جو کہتا ہے اس
کی تیاری کرلو۔“

فون رکھنے سے پہلے وہ بولی۔ ”وہ تو میں ابھی سے

شروع کر دیتی ہوں۔“

بات ختم کی۔ میں باہر لیوٹنگ روم میں آیا۔ سر جی سے بولا کہ میں باہر واک کرنے جا رہی ہوں چنانچہ، ساتھ ہی انہیں اشارہ بھی کر دیا۔ دوسروں سے پوچھا تو ہمیشہ کی طرح واک سے کئی کترا گئے۔ ”منشی اللہ بولا۔“ ”انشاء اللہ جولا کی سے واک شروع کروں گی۔“

میں اور سر جی اپارٹمنٹ بلڈنگ سے باہر آئے۔ شام دھل چکی تھی۔ آسمان چاند سے خالی تھا۔ تارے چمک رہے تھے مگر آس پاس کی روشنیوں نے ان کی جگہ گاہم مدھم کر دی تھی۔ ہم چلتے ہوئے اس پارک میں آ بیٹھے جہاں ایک بچے پہلے سب پھول سفید تھے اور درخت ایسے لگ رہے تھے کہ جیسے چاندی کی مالا میں پہن لی ہوں۔ آج بچے تو حیرت ناک طور پر سب پھول گلانی ہو چکے تھے۔ وہ رات میں دکتے نہ تھے پر محسوس ہوتے تھے۔ میں نے انہیں آج دن میں بیسویں سال سے واپسی پر دیکھا تھا۔ اب ایسے کردہنوں کا لباس زیب تن کر رکھا ہو۔ خشک ہوا انہیں نہ جانے کب سے چل رہی تھیں اور متواتر مجھے تازگی دیتی تھیں۔

ہم پارک میں بیٹھ کر بیٹھے تھے۔ سر جی سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں نے انہیں بتا دیا کہ سرین اور اس کا بیٹا میرے ہمراہ جا رہے ہیں اور ایک رات بھی درمیان میں وہیں آئے گی۔

سر جی سوچ میں پڑ گئے۔ پھر بولے۔ ”مجھے معلوم ہے۔ وہ شریف لڑکی ہے۔ تمہیں اس سے بھی بہت بہتر کوئی مل سکتا تھا مگر وہ پاگل ہے جو تم پر اس کا دل آ گیا۔“ اپنی بات ایک مختصر وقفے کے بعد جاری رکھی۔ ”وہ تم پر اعتماد بھی ہے حد کرتی ہے۔ کاش نہ کرتی خرابی تو تمہیں سے شروع ہوتی۔“

میں نے سگریٹ کا گھبراہٹ لیا اور بولا۔ ”کیا مطلب؟“ ویسے شام کے بعد معلوم نہیں تمہاری باتیں مجھ میں بھی نہیں آتیں۔“ میں نے ان کے مذاق کو نظر انداز کرتے ہوئے ان کے سوال کا جواب دیا۔ ”اگر وہ اتنا اعتماد اور اعتبار نہ کرتی تو میں اسے بھی کاچھوڑ کر آگے نکل گیا ہوتا۔ یہ اعتماد مجھے اس کے لیے مگر مندر رکھتا ہے۔“

میں نے سگریٹ کا ایک اور کش لگایا اور اپنی بات جاری رکھی۔ ”مشکل صورت یا دولت پر لڑکیاں اگر کسی کے پیچھے آئیں تو سرین جیسی حسین و جمیل لڑکی کم از کم میری جانب بھی نہ جھکتی۔“

سر جی مدبرانہ انداز میں سر ہمارے تھے۔ میری بات ختم ہونے پر بولے۔ ”میری آنکھ تو اسی دن پھڑک اٹھی تھی جب پہلے دن تم نے اسے پھول بولا اور وہ تمہیں دوست بول رہی تھی۔ میرا اندازہ بالکل ٹھیک نکلا کہ یہ چاند ایک دن چڑھے گا۔“

دوسرے دن میں ناشتا کرنے کے بعد مائیکر سینٹر چلا گیا۔ یہ وہی سینٹر تھا جو کینیڈا کی حکومت نے تاریکین وطن کے لیے کھولا تھا کہ یہاں انٹرنیٹ سے اپنی جاب تلاش کر سکیں۔ ہمارے پاس ابھی انٹرنیٹ اپارٹمنٹ میں نہیں تھا۔ وہاں مفت میں انٹرنیٹ، فون اور پرنٹر بہم استعمال کر سکتے تھے۔ میں نے پرنس ایڈورڈ کا ڈوئی اور سینڈیچ پارک کی معلومات انٹرنیٹ سے نکالیں۔ کاڈوئی کے ساتھ یہ اوتار پوکی سب سے خوب صورت اور بڑی سچ ہے۔ سینڈیچ کہتے ہیں۔ یہ ایک بڑے پارک میں ہے۔ رہائش کے لیے پارک میں کیمپنگ کی جاتی ہے جو مجھے ہرگز نہیں کرنی تھی۔ اس کے علاوہ کاڈوئی میں ہوں موجود تھا مجھے زیادہ دلچسپی ان گھروں سے ہوئی جو مکمل سامان اور کچن کے ساتھ کرائے پر اٹھائے جاتے تھے۔ انٹرنیٹ پر میں نے تین چار دو دو بیڈ روم کے گھر مارک کیے اور سینٹر سے انہیں فون کیا۔ ایک ایڈر ہوتا تو کرائے خاصے زیادہ ہوتے۔ چونکہ درمیانی دنوں میں فون کر رہا تھا تو ایک گھر مجھے بہت مناسب ریٹ پر ایک رات کے لیے مل گیا۔ بالکان بھی ارزاں ریٹ پر گھر کرائے کے لیے اٹھا دیتے ہیں کہ کم از کم خالی تو نہیں جائے گا۔ دوسرا ابھی گرمیوں کا سیزن شروع نہیں ہوا تھا کہ لوگ دھڑا دھڑ چھ پر نہانے کے لیے نکل پڑتے۔ میں نے ان سے ایڈریس لیا اور اپنا کریڈٹ کارڈ دے کر گھر کل رات کے لیے بک کروا لیا۔ ان دنوں ڈاؤن ٹاؤن یونین اسٹیشن سے ایک مشل سروس کا ڈوئی تک دن میں تین بار چلتی تھی۔ صبح نو، گیارہ اور ایک بجے اس کے اوقات تھے۔ واپسی شام چار، پانچ اور سات بجے ہوتی تھی۔ ان کو فون کیا تو جواب ملا کہ آپ آدھ گھنٹے پہلے آ جائیں۔ سٹیشن آسانی سے مل جائیں گی۔ مجھے سب چیزیں آسانی سے اس لیے مل رہی تھیں کہ ابھی باہر نہانے کا موسم ایک ماہ دور تھا۔

یہ دونوں کام کر کے میرے سر سے ایک بوجھ سا تھا جو اترا۔ گو میرے چار گھنٹے صرف ہو گئے تھے مگر میں مطمئن تھا کہ ایک باعزت رہائش اور ٹرانسپورٹ کا انتظام ہو گیا ہے۔ ٹورنٹو میں یہ میری جہاں گرو کی ابتدا تھی۔ میں آغاز بھی

ایسے طریقے سے کرنا چاہتا تھا۔ میرے پاس ان دنوں ڈرائیونگ لائسنس نہ تھا اور اسی لیے میں نے ابھی گاڑی نہیں خریدی تھی۔ لہذا مجھے پبلک ٹرانسپورٹ پر انحصار کرنا پڑ رہا تھا۔ بہر حال پبلک ٹرانسپورٹ میں سفر کرنے کا اپنا ایک لطف ہے۔ نہ ڈرائیونگ کی کھجیٹ اور نہ ہی پارکنگ کے مسائل۔

اپارٹمنٹ آکر میں نے کچھ آرام کیا اور چائے پیتے ہوئے سرین کو فون کرنے کے لیے اس کا نمبر ملایا۔ فون پہلی کھنٹی پر ہی اٹھا لیا۔ شاید انتظار میں تھی۔ میں نے جب یہ بتایا کہ رہائش کے لیے دو بیڈ روم کا گھر کرائے پر لیا ہے تو خوش ہونے کی بجائے خفا ہو گئی ہوئی۔ ”انتی فضول خرچی کی کیا ضرورت تھی۔ تمہاری فیملی آ رہی ہے اور تمہیں اندازہ بھی نہیں کہ کتنے زیادہ اخراجات ہوں گے۔ ابھی سے بچت نہیں کرو گے تو اپنے لیے مشکلات بڑھا دو گے۔“ وغیرہ وغیرہ۔ اسے ابھی تک یہ معلوم نہ تھا کہ میری فیملی پہلے نیویارک میں رکے گی۔ سوچا تھا کہ کل اسے بتا دوں گا۔ جب میں نے اقرار کیا تو اسی ناٹے قدرتی طور پر وہ اپنا یہ حق سمجھنے لگی کہ مجھے کہیں روکے، کہیں ٹوٹے اور کہیں بڑھنے دے۔ غورتوں کو شاید یہ حق جتلا کر تسکین ملتی ہے۔ میں نے بھی اس کی نصیحتوں کو کھلے دل سے سنا اور آئندہ محتاط رہنے کی یقین دہانی بھی کرادی۔

ہم نے فیصلہ کیا کہ صبح نو بجے کی مشل سروس استعمال کریں گے۔ اس کے لیے ہمیں ساڑھے آٹھ بجے صبح یونین اسٹیشن پہنچنا تھا۔ لہذا ساڑھے سات بجے گھر سے ہر حالت میں نکل جانا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ تم سامان لے کر کیل اسٹیشن آ جاؤ۔ اتنا سامان اکیلے اٹھانے مشکل پیش آتی، میں نے سوچا کہ کیل اسٹیشن اترا کر سامان میں لے لوں گا۔ وہاں سے آئی ٹرین پر یونین اسٹیشن ایک ساتھ چلے جائیں گے۔ ایک ٹائم مقرر کر کے اسٹیشن پر ملنے کا کہہ کر میں نے اللہ حافظ کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔

میں کمرے میں بیٹھا فون کر رہا تھا۔ سر جی آس پاس منڈلا رہے تھے۔ فون بند ہوا تو آکر پوچھنے لگے۔ ”آپ لوگ ایسا نہ ہو کہ راستے قریب ہو جائیں کہ پچھڑے میں مشکل پیش آئے۔ اپنا بیٹا تو اس کا سوچ لو۔“

”آدھا سوچ لیا ہے اور آدھا حالات پر چھوڑ دیا ہے۔ یا میں بے بس ہو گیا تھا اور یا وہ حاوی ہو گئی تھی یا ہم دونوں بے بس تھے۔“ پھر سر جی کی جانب دیکھ کر میں بولا۔

”ایک بات کی یقین دہانی کر سکتا ہوں کہ میرے قدم کسی غلط راستے پر نہیں جائیں گے اور جو میں سوچ رہا ہوں، اگر وہ پورا ہو گیا تو ایسا کام کروں گا جس سے میرے بچے اور میری فیملی انشاء اللہ مجھ پر ناز کرے گی۔“

دوسرے دن میں صبح جلدی بیدار ہوا۔ نماز ادا کی۔ جینز کی پینٹ، پورے بازو کی شرٹ اور ہلکی جیکٹ پہنی۔ شو لڈر بیک میں رات کا لباس رکھا، ساتھ شیڈنگ کٹ رکھی اور گھر سے مقررہ وقت پر باہر نکل آیا۔ جب کیل اسٹیشن اترا تو وہ ہمیشہ کی طرح پہلے سے موجود تھی۔ مجھے اب ملی تو پہلے سے زیادہ خوب صورت لگی۔ شاید میری دیکھنے کی نظر بدل گئی تھی کہ زانو پر تبدیل ہو گیا تھا۔ سعد نے ایک چھری اٹھا رکھی تھی۔ وہ دو بیک بمشکل اٹھانے کھڑی تھی۔ میں نے سعد کو پیار کیا۔ جب بیک میں نے اٹھائے تو ایک دوسرے سے وزنی تھا۔ وہ بولی اس میں کھانا ہے اور دوسرے میں کپڑے وغیرہ ہیں۔ ہماری بیک میں نے تھا۔ دوسری ٹرین پڑی اور آدھے گھنٹے میں ہم یونین اسٹیشن پر کھڑے تھے۔ وہاں سے باہر نکلے تو ساتھ ہی ایک ہوٹل کے کپاؤنڈ سے وہ مشل ہمیں مل گئی۔

وہ ایک بڑی شاندار اور نئی گھوڑ تھی۔ سبز اور سفید رنگ کی دھاریوں سے اس کی شان اور بڑھتی تھی۔ میں نے کشیش خریدیں۔ اندر داخل ہوئے، دیکھا تو سٹیشن بہت آرام دہ تھیں۔ دو روڈی ڈبل سٹیشن تھیں۔ دو پرسن اور سعد بیٹھ گئے اور سچ راستے سے ادھر میں جا بیٹھا۔

جب تک ہم نے اپنی اپنی سٹیشن نہیں سمجھ لیں۔ مجھے چین نہ تھا۔ بیٹھنے کے بعد میرے بہت سارے تفکرات ختم ہوئے۔ ایک تو مجھے وہ ہوٹل ڈھونڈنا تھا جہاں سے بس ملتی۔ دوسرا میں اب اکیلا نہ تھا۔ ان دونوں کی ذمہ داری بھی مجھ پر تھی۔ میں یہ تمام راستہ نہ سرین سے ٹھیک بات کر کا تھا اور نہ سعد سے۔ حالانکہ وہ دونوں بہت خوش تھے مگر میرے چہرے پر تفکرات دیکھ کر سرین خود بھی چپ ہو گئی تھی اور سعد کو بھی خاموش کر رکھا تھا۔ میں بھی دوسرے عام مردوں کی طرح ایک مرد تھا جسے یہ بات اچھی لگتی ہے کہ عورت اس کے مزاج کو سمجھے۔ یہ بہتر سرین بہت اچھی طرح جانتی تھی۔ اس کی خوبیاں ایک ایک کر کے مجھ پر واضح ہو رہی تھیں۔ اسے اس بات کا مکمل ادراک تھا کہ کسی کے دل میں کسے گھر بنایا جاتا ہے۔ خوش دیکھا تو اس آگئی۔ سوچوں میں پایا تو فاصلہ رکھ لیا۔ صرف یہ پوچھ لیا کہ سب ٹھیک ہے ناں؟ ادھر اور

سوشل میڈیا / فیس بک انٹرنیٹ پر

بعض افراد گروپ، ادارے کے نام سے اکاؤنٹ صفحات بنا کر تارکین کو فریب دے رہے ہیں کہ وہ ادارے کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ تارکین کی اطلاع کے لیے یہ واضح کیا جاتا ہے کہ ادارہ، کانگریس اکاؤنٹ یا پیج نہیں ہے۔ بعض افراد اس ادارے سے شائع ہونے والے جرائد کو بلا کسی اختیار غیر قانونی و غیر اخلاقی طور پر اپنے ذمہ کے ادارے کے کاروباری اور مالی مفادات کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ ایسے تمام عناصر کو اٹھایا گیا جاتا ہے کہ وہ ذریعہ طور پر اپنی حرکات ترک کر دیں۔ ادارہ مختلف فورم پر کارروائی کا آغاز کر چکا ہے۔ مذکورہ بالا عناصر نے فوری طور پر اپنی روش ترک نہ کی تو جملہ اخراجات کی وصولی سمیت تمام نتائج کی ذمہ داری ان پر ہوگی۔

لیتے ہیں اور تم عقل سے فتح کرتی ہو۔

ہم پکڑنے سے لکھتے تو نورنہ تمام ہوا اور گرد، درخت، جنگل تھے اور سڑک پر چند گاڑیاں اڑنا وہ یا مونٹر پال کی جانب جاری تھیں۔ ہائی وے تین روہ ہو گئی مگر رفتار نہ کم ہوئی اور نہ زیادہ۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ میں نے وقت پا کر اپنی آنکھیں بند کر لیں اور بھی نیند نے موٹے کا فائدہ اٹھا کر مجھے دیوچ لیا۔

میں تب بیدار ہوا جب کسی کے ہاتھ کا نرم لمس کندھے پر محسوس ہوا۔ وہ نرسن تھی جو میرے جاگ جانے پر بھی کندھے پر ہاتھ رکھ کر کھڑی تھی۔ یہی بس ایک جنت نظیر مناظر میں کھری رہی ہوئی تھی۔

وہ بولی۔ ”دو گھنٹے سوئے ہو۔ اچھا کیا آرام بھی مل گیا ہو گا اور دماغ کو سکون بھی۔“

میں نے پوچھا۔ ”بس کیوں رکی ہوئی ہے؟“

بولی۔ ”ہم کاؤنٹی پہنچ چکے ہیں۔ یہی تمہاری منزل ہے؟“

میں ششدر بیٹھا اپنے ارد گرد دیکھ رہا تھا۔ چند ہزار کی آبادی کا قصبہ تھا اور وہ چند ہزار بھی غائب تھے۔ پانچ سینٹر کے لیے کہیں بھی نظر اٹھا کر دیکھو تو سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں شجر نظر آچائیں اور سب کے سب رنگ ہر گئے پھولوں سے بھرے تھے۔ بس ایک خوب صورت چھوٹے سے ہوٹل کے کپاؤڈ میں کھڑی تھی۔ میں نے فی الحال ارد گرد دیکھنا شروع کیا اور دوسرے ساحلوں کے ہمراہ نیچے اترتا۔

بس کے فیلڈ کراشمنٹ سے اپنا سامان نکالا اور اس پاس گزرتی صلیب پر ہواؤں میں گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ میرے پاس اس جگہ کا ایڈریس تھا جو میں نے ایک رات کے لیے کرائے پر لی تھی دور نزدیک کوئی ٹیکسی نہ تھی بلکہ سامنے دور دوریہ سڑک بھی مکمل خالی پڑی تھی۔ سوچا کہ خدا جانے یہ سب کہاں چلے گئے۔ سعد ماں کے سہارے خاموش

جس میں یہ لکھ رہا ہوں تو میرا دل دماغ پاکستان جا پہنچا ہے۔ دل روتا ہے جب یہ دیکھتا ہوں کہ اس ملک کو سب نے مل کر کسی نہ کسی حیثیت میں بھنڈا ڈالا ہے۔ سیاست دان سب سے بڑے مجرم ہیں۔ بس چلے تو انہیں نے بغیر ہی سزا سنادوں۔

میں میں پڑی کے ایوب گارڈن، اسلام آباد کے چٹیلی باغ اور لاہور کے جناح باغ میں انہی درختوں اور پودوں کے سہارے اپنی تنہائیاں گزارتا رہا ہوں۔ چٹیلی ہار لاہور آیا تو ٹیکسی والے کو جناح گارڈن جانے کا بولا۔ وہاں پہنچا تو جب منظر تھا۔ کوئی اجڑا یاد تھا کہ کیا تھا؟ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ نور شاہ ابھی دلی اجاڑ کر گیا ہے۔ اتنا تو کسی بار برہنہ نہیں کی تھی لٹا ہوا جتنا سیاست دانوں نے مل کر غور چھایا ہے۔ زردہ تو میں درخت لگا رہی ہیں، جنگلات آباد کرنی ہیں تاکہ کل کے بچوں کو سانس ملے۔ ادھر ہم ہیں کہ درخت اور جنگلات کاٹ کر سیاہی کا ڈھب دیتے ہیں وٹوں میں، انہوں نے درخت نہیں بلکہ شجر ادارے اور شجرادیاں پلانٹ کیے ہیں۔

ہم DVP ہائی وے سے 401 پر آئے تو سڑک تین روہ سے اٹھ رہی ہوئی۔ گاڑیوں کے جھوم ایسے بھائے چلے جا رہے تھے جیسے جیسے کہیں آگ ان کا پیچھا کر رہی ہو۔ ہائی وے کی دونوں جانب بلند و بالا خوب صورت عمارتیں خاموش کھڑی تھیں۔ آسمان وہی ہمیشہ کی طرح نیوٹیل اور کہیں کہیں تیرتے بادل، ہلکی ہوا چل رہی تھی جب ہم بس کے کپاؤڈ میں کھڑے تھے۔ وہ ستانی تھی بلکہ دلا سے دیتی تھی۔

نرسن وٹ اسکرین کے پار نہ جانے کیا دیکھ رہی تھی جو اتنی خوشنمی تھی۔ سعد اس کے بازو پر سر لگا کر سو رہا تھا اور اس نے ہاتھ میں چھتری مضبوطی سے پکڑ رکھی تھی۔ میں نرسن کے چہرے کی لگائی رنگت، پتلی ناک، بڑی آنکھیں، نازک ہونٹ اور چوڑی پیشانی تادیر دیکھتا رہا۔ وہ معلوم نہیں کہاں کھوئی تھی جو میرے نظروں کی حرارت بھی محسوس نہ کر رہی تھی۔ میں نے سامنے ہائی وے پر بس کو کراس کرتے گاڑیوں کو دیکھ کر بھی سوچا کہ رفاقت کو بھی یہی دھما اور خاموشی بھی ہونا چاہیے۔ پروقت کا ہنگامہ خیر ساتھ شاید اپنے پریاسامی پر گراں نذر تھا ہے۔ یہ نہ تھا کہ وہ میری نظروں کو بھانپ نہیں رہی تھی۔ وہ شاید مجھے میرا وقت دینا چاہتی تھی۔ اس لیے اس سے اکثر کہتا تھا کہ دوسرے دل سے کسی کو جیت

جواب ملا تو دوبارہ سوال نہ پوچھا۔ اب میں بس میں بیٹھا اس کے اسی روہے کے بارے میں سوچ کر دل میں مسکرا رہا تھا۔ مجھے جب مطمئن دیکھا تو نظریں بھر کر دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔ ”آخر تم اتنا پریشان کیوں ہو جاتے ہو؟ ہم ٹائم پرتو نکلتے تھے اور بس کہیں بھاگی تو نہیں جا رہی تھی۔“

میں نے جواب دیا۔ ”میری بہت سی بری عادتوں میں سے ایک یہ بھی ہے ٹوٹ کر لو۔“

وہ مسکرا کر خاموش ہو گئی۔

میں سعد کی طرف متوجہ ہوا اور اس سے باتیں کرنے لگا۔

کچھ ہی دیر میں آدمی بس کاؤنٹی جانے والوں سے بھر گئی۔ بارودی ڈرائیور نے آکر کھنٹی کی اور پھر سوا دو گھنٹے میں پیچھے کا اعلان کر کے آگلی سے کپاؤڈ سے بس کو نکالنے لگا۔ ہم QEW ہائی وے پر آئے اور پھر شال کی جانب چل پڑے۔

DVP ہائی وے، QEW اور 401 ہائی وے کو آپس میں ملاتی ہے۔ میں نے بائیں جانب کی اپارٹمنٹ بلڈنگز دیکھیں، ان میں سے ایک پر میری پہلی جانب، پہلی سکیورٹی کی جانب تھی۔ جب نئی صدی شروع ہو رہی تھی تو میں نے ستر سال اور صدی کا استقبال وہیں کیا تھا۔

روڑے تھے اور ایک پاکستانی خاتون نے مجھے اپنے ہاتھوں سے محری بنا کر بھیجی تھی۔ یہ وہ دن تھے جب میں حواس باختہ ہو کر ٹورنٹو میں پھرتا تھا۔ کیا وہ دن تھے جب میں ہر رات اپنے کمرے کی دیواروں سے لگ کر روتا تھا۔ کوئی سلی دینے والا بھی نہ تھا کیونکہ بھی کسی نہ کسی صورت میں آنکھوں سے یا پھر دل سے رو رہے تھے۔

عمارتوں اور ہائی وے کے بیچ ایک جنگل نظر آیا۔ گھنا اور دل موہ لینے والا مگر بعد میں ادھر ہی کہیں تھا تو کسی نے بتایا کہ یہ پارک ہے۔ میں حیران ہی رہ گیا تھا جب اس پارک میں گیا۔ بلند و بالا درخت، گھنے سائے، گہری خاموشی، مہربان تھائی۔ ایسا لگتا تھا کہ میں کہیں فورنیا کے جنگلات میں محسوس آیا ہوں۔ پر شور شہر کے بیچ تھائی کے لمحے صرف تاریک امریکا اور یورپ کے شہروں میں ہی مل سکتے ہیں۔ اگر ہنگامہ خیر دنیا سے آپ ٹورنٹو، میں دور جانا چاہتے ہوں تو ہر دو یا تین میل کے فاصلے پر کوئی نہ کوئی ایسا ویرانہ مل جائے گا جہاں صرف پرندوں کا شور ہو گا اور ہواؤں کی سرسراہٹ۔

میں نے کسی کیب کے لیے اپنا مدعا بیان کیا۔ سوچتے لگا کہ کہیں کھری کھری سنا ہی نہ دے۔ جس کی امید کم تھی۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ ہم نے ایک گھر رینٹ کیا ہے اور وہاں تک جانے کے لیے کوئی ٹیکسی چاہیے۔ وہ براہ منہ کی بجائے ویسے ہی مسکرائی رہی۔ دراز سے ایک کارڈ نکالا اور کھڑے کھڑے کسی نمبر پر فون ملادیا۔ وہ کسی کیب کھنٹی کے کنٹرول روم سے بات کر رہی تھی۔ جو کچھ مجھے بتایا کہ وہ کیب کی بات کر رہی تھی۔ اپنے ہوٹل کا نام بتایا اور پھر شکریہ ادا کیا اور اب مسکرائی ہوئی مجھے وہی کارڈ تھا رہی تھی کہ آئندہ بھی کیب کی ضرورت ہو تو اسی نمبر پر فون کر لیتا۔

میں نے شکریہ ادا کیا اور اچھا ہوا واپس نرسن کے پاس پہنچا جہاں بیٹے کا سر گود میں رکھے اس کے بالوں کو نہلاتا رہی تھی اور وہ شاید سو گیا تھا۔

میں نے نرسن سے کہا۔ ”اندھ ہوئی کے لاؤنج میں بیٹھے ہیں۔ اسی دوران میں ٹیکسی وغیرہ کا انتظام کرتا ہوں۔“

دو منزلہ ہوٹل سارا کا سارا دھانی رنگ سے رنگا تھا۔ جو تھوڑا بہت شور مسافروں کے اترنے سے ہوا تھا۔ وہ بھی ختم ہو چکا تھا۔ ہم چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوٹل کے ریواریوگ دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ ارد گرد دیکھا تو چند مسافروں کو آرام دہ صوفوں پر کسلندی سے اٹھتے پایا۔

عملہ بھی غائب تھا۔ نرسن سعد کو میں نے ایک صوفے پر بٹھایا اور خود ریسپشن کی جانب آیا۔ دو اسٹول رکھے تھے اور دونوں ہی خالی مکمل سکوت چھایا تھا۔ پہلے تو مجھے اچھا لگا اور پھر ابھرنے ہوئے تھی۔ ہمارے منٹے کا حل یہ خاموشی نہ تھی۔ اتنے میں ایک لڑکی پیچھے دروازے سے برآمد ہوئی۔

مجھے ایسے خوش آمدید کہا کہ جیسے ہوٹل کے آدھے کمرے میں ریویر کرانے والا ہوں۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔ ”میں کیا خدمت کر سکتی ہوں۔“

میں نے کسی کیب کے لیے اپنا مدعا بیان کیا۔ سوچتے لگا کہ کہیں کھری کھری سنا ہی نہ دے۔ جس کی امید کم تھی۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ ہم نے ایک گھر رینٹ کیا ہے اور وہاں تک جانے کے لیے کوئی ٹیکسی چاہیے۔ وہ براہ منہ کی بجائے ویسے ہی مسکرائی رہی۔ دراز سے ایک کارڈ نکالا اور کھڑے کھڑے کسی نمبر پر فون ملادیا۔ وہ کسی کیب کھنٹی کے کنٹرول روم سے بات کر رہی تھی۔ جو کچھ مجھے بتایا کہ وہ کیب کی بات کر رہی تھی۔ اپنے ہوٹل کا نام بتایا اور پھر شکریہ ادا کیا اور اب مسکرائی ہوئی مجھے وہی کارڈ تھا رہی تھی کہ آئندہ بھی کیب کی ضرورت ہو تو اسی نمبر پر فون کر لیتا۔

میں نے شکریہ ادا کیا اور اچھا ہوا واپس نرسن کے پاس پہنچا جہاں بیٹے کا سر گود میں رکھے اس کے بالوں کو نہلاتا رہی تھی اور وہ شاید سو گیا تھا۔

میں ساتھ جا بیٹھا اور بولا۔ ”کچھ دیر میں کیب آنے والی ہے۔“

وہ ہمیری جانب دیکھ کے مسکرا کر بولی۔ ”اور وہ کیا کہہ رہی تھی؟“

میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”کون؟“

مسکراتی آنکھوں سے اس نے کہا۔ ”وہ جس سے ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔“

اس خاموشی میں میرا قبضہ بلند ہوا جسے میں نے فوراً ہی دبایا۔ اس کا چہرہ ٹھوڑی سے پکڑ کر اپنی جانب کھینچا اور مسکرا کر بولا۔ ”پاکستان کی ہو یا ایران کی یا کہیں کی بھی مگر عورتیں سب بنی ایک ہی خیر سے ہوتی ہیں۔“

شیشے کی کھڑکیوں سے باہر دیکھا تو عیسائی آجکی تھی۔ ہم نے سامان اٹھایا اور باہر جانے لگے۔ سعد شاید بس میں بھی سویا رہا تھا اسی لیے اب دوڑ رہا تھا۔ وہ چستری پکڑے عیسائی کی جانب پہلے بھاگا تھا۔ میں نے ریسپشن پر لڑکی کا دود کرنے پر شکر یہ ادا کیا۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ ”تمہاری بیوی بہت خوب صورت ہے۔“

میں نے شکر یہ ادا کیا اور پھر نرسین کی جانب دیکھا تو وہ اچھی آنکھوں اور ہونٹوں پر مسکراہٹ لیے میری ہی جانب دیکھ رہی تھی۔

عیسائی کی ڈوگی میں سامان رکھا۔ ڈرائیور ایک عمر رسیدہ گورا تھا۔ اسے ایڈریس دیا تو اس نے اشارے سے پیٹنے کا اشارہ کیا۔ میں فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس نے گاڑی ریورس کی اور بائیں سڑک پر لا کر دائیں جانب مڑ گیا۔

صاف اور چمکتی ہوئی سڑک کے دونوں جانب چھوٹے چھوٹے درخت تھے اور یہ بھی پھولوں سے لدے تھے۔ درختوں کے پیچھے چھوٹے چھوٹے خوب صورت گھر نظر آنا شروع ہوئے جو بیسٹر سفید رنگ کے تھے۔ ان کے ارد گرد دو دور در دور کھل کی طرح ہنبرہ بچھا تھا اور اسی ہنبرے میں کئی ایک بلند درخت ہوا سے جھوم رہے تھے۔ یہ خاموشی، سکون اور تنہائی میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ مجھے اپنے آپ پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں واقعی اسی سیارہ زمین پر ہوں جہاں کے قہبے میں اتنی خاموشی ہے؟ میں۔۔۔ ابھی تک ہوٹل میں لڑکی کو چند اونچے لوگوں کو اور اب اس عیسائی ڈرائیور کو دیکھ رہا تھا۔ گویا یہ گاؤں صرف تین نفوس پر محدود تھا؟

پتلی بائیں جانب مڑی اور پھر سے وہی منظر شروع ہو گئے۔ سامنے سے اب ایک کار ہمارے پاس سے گزری تو

مجھے یقین آیا کہ یہاں لوگ بھی رہتے ہیں۔ ہم شاید ایک میل ہی گئے ہوں گے کہ کسی نے دائیں جانب موڑنا اور پھر اگلے ہاتھ پر سڑک کنارے چھوٹے چھوٹے گھروں کے ٹھوڑا سا پیچھے ایک نیکی جھیل نظر آئی۔ میں دم بخود بیٹھیا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ انتہائی دیدہ زیب مکانات، دو دور در دور پھلے سبز گھاس کے قطعے، درخت اور بہت سے پھول۔ یہ منظر میرے بائیں جانب تھا۔ اچانک عیسائی سڑک سے بائیں ہی جانب ایک بڑی بھرے راستے پر مڑی جس کے آگے تازہ تازہ سفید رنگ، ہوا ایک چھوٹا سا کچا تھا۔

یہاں آنے سے پہلے میں نے بہت سے سڑا بے کیے جہاں میں کسی ایسے کچا کچا زمین کو دیکھ سکوں جو ان مناظر میں نظر آتا ہو۔ مجھے ایسا بھی نہ نظر نہ آیا جو میں اس روز دیکھ رہا تھا۔ میں جہاں بھی گیا تو مجھے ٹھوڑا ٹھوڑا منظر ملا گویا میرے خیال کے مناظر کی ایک جگہ تھے۔ پورے نزل سکے۔ ایک چھوٹا سا پراٹا صاف ستھرا گھر جس کے ارد گرد دو دور در دور کھاس کے قائلین تھے۔ ہوں۔ پھولوں بھرے درختوں سے گھرا ہوا ایک گھر جہاں چھوٹے چھوٹے پتوں سے درختوں پر بیٹھے اپنی نیکی بولیاں بولتے ہوں۔ پھر پرواز بھرتے ایک بھر سے دوسرے کی جانب اڑتے ہوں۔ گھر کے پچھواڑے پر بہت بڑا گھاس بھرا میدان ہوا اور پھر درختوں کے جھنڈ اور اس سے جڑی ایک خوب صورت جھیل۔ جھیل جس کے کنارے پھولوں بھرے پودے ہواؤں میں لہرا کر جھومتے ہوں۔ اس سارے منظر میں تنہائی اور خاموشی ہو۔ آواز ہو تو صرف پرندوں کے چھپکھپکانے یا ہواؤں کی۔ گاؤں کے اس گھر کو دیکھنے کے چند سال بعد میں انگلینڈ گیا تھا۔ میں لندن سے بذریعہ ٹرین اسکاٹ لینڈ کے پرانے محلات، آس پاس کی جھیلیں اور جزیرے دیکھنے جا رہا تھا۔ راستے میں ایک ڈسٹرکٹ کے ایک مقام پر ٹرین رکی۔ میں نے منظر دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اپنا چھوٹا سا ٹرک سبک جن میں صرف میرے چند کپڑے اور پاکستانی آم تھے، وہ اٹھانے ٹرین سے اتر آیا۔ میں تین دن اسی قہبے میں گھومتا رہا۔ گھومتے گھومتے ایک جھیل کنارے رک گیا۔ وہ منظر میرے دل میں اترتا چلا گیا۔ نیلے اور بزرگ شفاف پانی کی چھوٹی سی جھیل جس کے کنارے پر خود دو پھولوں کے پودے لہرا رہے تھے۔ پیچھے چھوٹی چھوٹی سبز پہاڑیاں تھیں جن میں روٹی کی کالوں جیسی سفید نظر آتیں، سینکڑوں بھیڑیں تھیں۔ جھیل سے ذرا فاصلے پر ایک گھر تھا، بہت قدیم

پُر کیف صاف ستھرا۔ میں وہاں چلا گیا۔ چند لوگ تھے اور خاموشی تھی۔ اس گھر میں دو ٹرین نظر آئیں۔ میں چلتا ہوا گیا۔ کتبہ پڑھا تو وہ مشہور شاعر ولیم ورڈز ورڈز کی قبر تھی۔ دوسرا ناموس نام تھا میرے لیے۔ وہ گھر کھلا تھا۔ اب وہ میوزیم بن گیا تھا۔ اس کے ایک کمرے میں کھڑکی تھی۔ اس کھڑکی سے ایک صبح ولیم ورڈز ورڈز نے جھیل کنارے ڈیفنڈر پھولوں کو لہراتے دیکھا تو اس نے اپنی مشہور ماوند نظم ڈیفنڈر لکھی تھی۔ میں کالج میں لٹرم پڑھا کرتا تھا اور پڑھ کر اپنے خیالوں میں ولیم ورڈز ورڈز کا منظر حقیق کرتا تھا۔ وہ نظم بذات خود کتنی اچھی تھی تو میں نہیں بتا سکتا مگر اس منظر میں جس طرح وہ فن پیش کرتی تھی وہ حیرت انگیز بات تھی۔ اس کھڑکی سے پہلے نظر آتے ہنبرہ زرد پھر درخت اور جھیل اور جھیل کنارے لہراتے پھول۔ یہی منظر میں نورٹون کی پرنس ایڈورڈ کاؤنٹی کے ایک چھوٹے سے کالج کے باہر کیب سے نکل کر دیکھ رہا تھا۔

گھر کے میل باکس میں میرے لیے ایک لفافہ پڑا تھا۔ لفافے میں سب ضروری معلومات درج تھیں جن کی مجھے ضرورت پڑ سکتی تھی۔ اس کے علاوہ گھر پر لگے نمبروں والے نکل کا کوڈ بھی لکھا تھا اور سب سے اہم بات یہ کہ وہاں فون بھی موجود تھا اور ہماری کسی بھی کال کے چار جزی میرے کریڈٹ کارڈ سے کاٹ لیے جاتے۔

ہم سامان ڈوگی سے نکال کر کیب ڈرائیور سے خود گفتگو تھے۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”سینڈیکس کچا ہیں لے جا کر تین چار گھنٹے بعد واپس لا سکتے ہو؟“

اس نے بڑی نفاس سے جواب دیا۔ ”گھر میں فون ہے۔ کیب کچنی کو کال کرو گے اور میں آ جاؤں گا، وہ زیادہ دور بھی نہیں ہے۔“ اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”کچا پر چھوڑ بھی آؤں گا، جس نام کا کوڈ لے آؤں گا اور اگر وہاں کے اسٹور سے فون بھی کر لو گے تو تمہارے وقت کے مطابق کچا جاؤں گا۔“

مجھے اس سے زیادہ پوچھنے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ ہم نے سامان اٹھایا اور سامنے کی چند سڑکیاں چڑھ کر کھڑکی کے ایک چھوٹے سے برآمدے میں کھڑے ہو گے۔ برآمدے میں تین پلاسٹک کی کرسیاں رکھی تھیں۔ اس سے زیادہ کی گنجائش بھی وہاں نہ تھی۔ کوڈ مارک لاک کھولا اور دروازہ اندر کی جانب کھلی کر ہم تینوں کھڑکی کے بے فرش پر جا کھڑے ہوئے۔

قدموں تلے قائلین کا ایک چھوٹا سا کھڑا تھا اور سامنے کچن کا کؤنٹر تھا۔ کؤنٹر کے پیچھے دو کھڑکیاں جو پیچھے جھیل کی جانب کھلتی تھیں۔ کچن کے سامنے اور ہماری بائیں جانب لیوگ روم جہاں صوفے اور کافی ٹیبل تھی۔ نوٹے میں چھینیں اچ کا ایک ٹی وی فریج پر رکھا تھا اور ٹی وی کے ساتھ اس کی ریوٹ کنٹرول ایک سفید رومال پر پڑا تھا۔ کافی ٹیبل پر کچھ میزین بھی رکھے تھے۔ کچن کا کؤنٹر کے نیچے چار برز کا چولہا، ساتھ میں پٹیلیں دھونے کا سبک تھا۔ کؤنٹر کے ایک کونے میں مائیکرو ویو اور ساتھ ایک قد آدم سے بھی بڑا فریج رکھا تھا۔ ہمارے دائیں جانب دو کمرے تھے اور ان دونوں کے نیچے تھوڑا سا کمرہ تھا۔ مائیکرو ویو پیچھے تھا جہاں سے ایک بڑی کھڑکی جھیل کی سمت کھلتی تھی۔ دوسرے کمرے میں دو چھوٹے بیدر تھے اور ایک چھوٹی کھڑکی گھر کے دائیں جانب درختوں میں کھل رہی تھی۔ بائیں جانب کونے میں لائڈری روم تھا۔ لیوگ روم اور کچن کے نیچے چار کرسیوں سے گھری گول بریک فاسٹ ٹیبل تھی۔ ہم نے سامان کافی ٹیبل پر رکھا۔ نرسین نے پہلے کچن کا مائیکرو ویو دروازوں میں دیکھا، فریج، کیتیاں، کچا، پٹیلیں غرض کھانے پکانے کی ہر چیز موجود تھی۔ کوک اسٹل اور برتن دھونے کے لیے ڈش سوپ بھی موجود تھا۔ ٹوسٹر، بنیادی مصالحات قریب سے کؤنٹر پر رکھے تھے۔ فریج کھول کر دیکھا تو اٹلے، ڈبل روٹی، جام اور ایک مگین دودھ کی بوتل رکھی تھی۔ فریج پر نوٹ لگا تھا کہ اگر یہ چیزیں استعمال کیں تو اتنی رقم کریڈٹ کارڈ سے منہا کر دی جائے گی۔ گلاس، جگ، کافی کے مگ وغیرہ ایک دروازے میں ترتیب سے رکھے گئے تھے۔ لائڈر اور نارنج بھی موجود تھی۔ ہاتھ روم میں تویہ، صابن، شیمپو، لوٹن سب رکھے تھے۔ مائیکرو ویو میں صاف ستھرا بستر، کبل اور ٹیکے سجے تھے۔ وہاں ایک بڑی الماری میں مزید کبل اور ٹیکے رکھے تھے۔ چھوٹے کمرے میں بھی دونوں بیڈ اپنے بستر دے سے آراستہ تھے۔

غرض پورا سا بچایا گھر تھا۔ چابی سے دروازہ کھولیں اور ہمارا شروع کریں۔

نرسین جب کچن دیکھ رہی تھی تو میں اس دوران کالج کا کھل جائزہ لے چکا تھا۔

وہ اور سعد یہاں آ کر بہت خوش لگ رہے تھے۔ سعد اپنے ساتھ کچھ منسوبے بھی لایا تھا۔ وہ کھلونے ریل کو آپس میں لڑا رہا تھا۔ نرسین نے وہ کھانے فریج میں رکھے جو بنا کر

میں نے اس سے پوچھا۔ ”سینڈیکس کچا ہیں لے جا کر تین چار گھنٹے بعد واپس لا سکتے ہو؟“

اس نے بڑی نفاس سے جواب دیا۔ ”گھر میں فون ہے۔ کیب کچنی کو کال کرو گے اور میں آ جاؤں گا، وہ زیادہ دور بھی نہیں ہے۔“ اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”کچا پر چھوڑ بھی آؤں گا، جس نام کا کوڈ لے آؤں گا اور اگر وہاں کے اسٹور سے فون بھی کر لو گے تو تمہارے وقت کے مطابق کچا جاؤں گا۔“

مجھے اس سے زیادہ پوچھنے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ ہم نے سامان اٹھایا اور سامنے کی چند سڑکیاں چڑھ کر کھڑکی کے ایک چھوٹے سے برآمدے میں کھڑے ہو گے۔ برآمدے میں تین پلاسٹک کی کرسیاں رکھی تھیں۔ اس سے زیادہ کی گنجائش بھی وہاں نہ تھی۔ کوڈ مارک لاک کھولا اور دروازہ اندر کی جانب کھلی کر ہم تینوں کھڑکی کے بے فرش پر جا کھڑے ہوئے۔

قدموں تلے قائلین کا ایک چھوٹا سا کھڑا تھا اور سامنے کچن کا کؤنٹر تھا۔ کؤنٹر کے پیچھے دو کھڑکیاں جو پیچھے جھیل کی جانب کھلتی تھیں۔ کچن کے سامنے اور ہماری بائیں جانب لیوگ روم جہاں صوفے اور کافی ٹیبل تھی۔ نوٹے میں چھینیں اچ کا ایک ٹی وی فریج پر رکھا تھا اور ٹی وی کے ساتھ اس کی ریوٹ کنٹرول ایک سفید رومال پر پڑا تھا۔ کافی ٹیبل پر کچھ میزین بھی رکھے تھے۔ کچن کا کؤنٹر کے نیچے چار برز کا چولہا، ساتھ میں پٹیلیں دھونے کا سبک تھا۔ کؤنٹر کے ایک کونے میں مائیکرو ویو اور ساتھ ایک قد آدم سے بھی بڑا فریج رکھا تھا۔ ہمارے دائیں جانب دو کمرے تھے اور ان دونوں کے نیچے تھوڑا سا کمرہ تھا۔ مائیکرو ویو پیچھے تھا جہاں سے ایک بڑی کھڑکی جھیل کی سمت کھلتی تھی۔ دوسرے کمرے میں دو چھوٹے بیدر تھے اور ایک چھوٹی کھڑکی گھر کے دائیں جانب درختوں میں کھل رہی تھی۔ بائیں جانب کونے میں لائڈری روم تھا۔ لیوگ روم اور کچن کے نیچے چار کرسیوں سے گھری گول بریک فاسٹ ٹیبل تھی۔ ہم نے سامان کافی ٹیبل پر رکھا۔ نرسین نے پہلے کچن کا مائیکرو ویو دروازوں میں دیکھا، فریج، کیتیاں، کچا، پٹیلیں غرض کھانے پکانے کی ہر چیز موجود تھی۔ کوک اسٹل اور برتن دھونے کے لیے ڈش سوپ بھی موجود تھا۔ ٹوسٹر، بنیادی مصالحات قریب سے کؤنٹر پر رکھے تھے۔ فریج کھول کر دیکھا تو اٹلے، ڈبل روٹی، جام اور ایک مگین دودھ کی بوتل رکھی تھی۔ فریج پر نوٹ لگا تھا کہ اگر یہ چیزیں استعمال کیں تو اتنی رقم کریڈٹ کارڈ سے منہا کر دی جائے گی۔ گلاس، جگ، کافی کے مگ وغیرہ ایک دروازے میں ترتیب سے رکھے گئے تھے۔ لائڈر اور نارنج بھی موجود تھی۔ ہاتھ روم میں تویہ، صابن، شیمپو، لوٹن سب رکھے تھے۔ مائیکرو ویو میں صاف ستھرا بستر، کبل اور ٹیکے سجے تھے۔ وہاں ایک بڑی الماری میں مزید کبل اور ٹیکے رکھے تھے۔ چھوٹے کمرے میں بھی دونوں بیڈ اپنے بستر دے سے آراستہ تھے۔

غرض پورا سا بچایا گھر تھا۔ چابی سے دروازہ کھولیں اور ہمارا شروع کریں۔

نرسین جب کچن دیکھ رہی تھی تو میں اس دوران کالج کا کھل جائزہ لے چکا تھا۔

وہ اور سعد یہاں آ کر بہت خوش لگ رہے تھے۔ سعد اپنے ساتھ کچھ منسوبے بھی لایا تھا۔ وہ کھلونے ریل کو آپس میں لڑا رہا تھا۔ نرسین نے وہ کھانے فریج میں رکھے جو بنا کر

میں نے اس سے پوچھا۔ ”سینڈیکس کچا ہیں لے جا کر تین چار گھنٹے بعد واپس لا سکتے ہو؟“

اس نے بڑی نفاس سے جواب دیا۔ ”گھر میں فون ہے۔ کیب کچنی کو کال کرو گے اور میں آ جاؤں گا، وہ زیادہ دور بھی نہیں ہے۔“ اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”کچا پر چھوڑ بھی آؤں گا، جس نام کا کوڈ لے آؤں گا اور اگر وہاں کے اسٹور سے فون بھی کر لو گے تو تمہارے وقت کے مطابق کچا جاؤں گا۔“

مجھے اس سے زیادہ پوچھنے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ ہم نے سامان اٹھایا اور سامنے کی چند سڑکیاں چڑھ کر کھڑکی کے ایک چھوٹے سے برآمدے میں کھڑے ہو گے۔ برآمدے میں تین پلاسٹک کی کرسیاں رکھی تھیں۔ اس سے زیادہ کی گنجائش بھی وہاں نہ تھی۔ کوڈ مارک لاک کھولا اور دروازہ اندر کی جانب کھلی کر ہم تینوں کھڑکی کے بے فرش پر جا کھڑے ہوئے۔

قدموں تلے قائلین کا ایک چھوٹا سا کھڑا تھا اور سامنے کچن کا کؤنٹر تھا۔ کؤنٹر کے پیچھے دو کھڑکیاں جو پیچھے جھیل کی جانب کھلتی تھیں۔ کچن کے سامنے اور ہماری بائیں جانب لیوگ روم جہاں صوفے اور کافی ٹیبل تھی۔ نوٹے میں چھینیں اچ کا ایک ٹی وی فریج پر رکھا تھا اور ٹی وی کے ساتھ اس کی ریوٹ کنٹرول ایک سفید رومال پر پڑا تھا۔ کافی ٹیبل پر کچھ میزین بھی رکھے تھے۔ کچن کا کؤنٹر کے نیچے چار برز کا چولہا، ساتھ میں پٹیلیں دھونے کا سبک تھا۔ کؤنٹر کے ایک کونے میں مائیکرو ویو اور ساتھ ایک قد آدم سے بھی بڑا فریج رکھا تھا۔ ہمارے دائیں جانب دو کمرے تھے اور ان دونوں کے نیچے تھوڑا سا کمرہ تھا۔ مائیکرو ویو پیچھے تھا جہاں سے ایک بڑی کھڑکی جھیل کی سمت کھلتی تھی۔ دوسرے کمرے میں دو چھوٹے بیدر تھے اور ایک چھوٹی کھڑکی گھر کے دائیں جانب درختوں میں کھل رہی تھی۔ بائیں جانب کونے میں لائڈری روم تھا۔ لیوگ روم اور کچن کے نیچے چار کرسیوں سے گھری گول بریک فاسٹ ٹیبل تھی۔ ہم نے سامان کافی ٹیبل پر رکھا۔ نرسین نے پہلے کچن کا مائیکرو ویو دروازوں میں دیکھا، فریج، کیتیاں، کچا، پٹیلیں غرض کھانے پکانے کی ہر چیز موجود تھی۔ کوک اسٹل اور برتن دھونے کے لیے ڈش سوپ بھی موجود تھا۔ ٹوسٹر، بنیادی مصالحات قریب سے کؤنٹر پر رکھے تھے۔ فریج کھول کر دیکھا تو اٹلے، ڈبل روٹی، جام اور ایک مگین دودھ کی بوتل رکھی تھی۔ فریج پر نوٹ لگا تھا کہ اگر یہ چیزیں استعمال کیں تو اتنی رقم کریڈٹ کارڈ سے منہا کر دی جائے گی۔ گلاس، جگ، کافی کے مگ وغیرہ ایک دروازے میں ترتیب سے رکھے گئے تھے۔ لائڈر اور نارنج بھی موجود تھی۔ ہاتھ روم میں تویہ، صابن، شیمپو، لوٹن سب رکھے تھے۔ مائیکرو ویو میں صاف ستھرا بستر، کبل اور ٹیکے سجے تھے۔ وہاں ایک بڑی الماری میں مزید کبل اور ٹیکے رکھے تھے۔ چھوٹے کمرے میں بھی دونوں بیڈ اپنے بستر دے سے آراستہ تھے۔

غرض پورا سا بچایا گھر تھا۔ چابی سے دروازہ کھولیں اور ہمارا شروع کریں۔

نرسین جب کچن دیکھ رہی تھی تو میں اس دوران کالج کا کھل جائزہ لے چکا تھا۔

وہ اور سعد یہاں آ کر بہت خوش لگ رہے تھے۔ سعد اپنے ساتھ کچھ منسوبے بھی لایا تھا۔ وہ کھلونے ریل کو آپس میں لڑا رہا تھا۔ نرسین نے وہ کھانے فریج میں رکھے جو بنا کر

میں نے اس سے پوچھا۔ ”سینڈیکس کچا ہیں لے جا کر تین چار گھنٹے بعد واپس لا سکتے ہو؟“

اس نے بڑی نفاس سے جواب دیا۔ ”گھر میں فون ہے۔ کیب کچنی کو کال کرو گے اور میں آ جاؤں گا، وہ زیادہ دور بھی نہیں ہے۔“ اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”کچا پر چھوڑ بھی آؤں گا، جس نام کا کوڈ لے آؤں گا اور اگر وہاں کے اسٹور سے فون بھی کر لو گے تو تمہارے وقت کے مطابق کچا جاؤں گا۔“

مجھے اس سے زیادہ پوچھنے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ ہم نے سامان اٹھایا اور سامنے کی چند سڑکیاں چڑھ کر کھڑکی کے ایک چھوٹے سے برآمدے میں کھڑے ہو گے۔ برآمدے میں تین پلاسٹک کی کرسیاں رکھی تھیں۔ اس سے زیادہ کی گنجائش بھی وہاں نہ تھی۔ کوڈ مارک لاک کھولا اور دروازہ اندر کی جانب کھلی کر ہم تینوں کھڑکی کے بے فرش پر جا کھڑے ہوئے۔

قدموں تلے قائلین کا ایک چھوٹا سا کھڑا تھا اور سامنے کچن کا کؤنٹر تھا۔ کؤنٹر کے پیچھے دو کھڑکیاں جو پیچھے جھیل کی جانب کھلتی تھیں۔ کچن کے سامنے اور ہماری بائیں جانب لیوگ روم جہاں صوفے اور کافی ٹیبل تھی۔ نوٹے میں چھینیں اچ کا ایک ٹی وی فریج پر رکھا تھا اور ٹی وی کے ساتھ اس کی ریوٹ کنٹرول ایک سفید رومال پر پڑا تھا۔ کافی ٹیبل پر کچھ میزین بھی رکھے تھے۔ کچن کا کؤنٹر کے نیچے چار برز کا چولہا، ساتھ میں پٹیلیں دھونے کا سبک تھا۔ کؤنٹر کے ایک کونے میں مائیکرو ویو اور ساتھ ایک قد آدم سے بھی بڑا فریج رکھا تھا۔ ہمارے دائیں جانب دو کمرے تھے اور ان دونوں کے نیچے تھوڑا سا کمرہ تھا۔ مائیکرو ویو پیچھے تھا جہاں سے ایک بڑی کھڑکی جھیل کی سمت کھلتی تھی۔ دوسرے کمرے میں دو چھوٹے بیدر تھے اور ایک چھوٹی کھڑکی گھر کے دائیں جانب درختوں میں کھل رہی تھی۔ بائیں جانب کونے میں لائڈری روم تھا۔ لیوگ روم اور کچن کے نیچے چار کرسیوں سے گھری گول بریک فاسٹ ٹیبل تھی۔ ہم نے سامان کافی ٹیبل پر رکھا۔ نرسین نے پہلے کچن کا مائیکرو ویو دروازوں میں دیکھا، فریج، کیتیاں، کچا، پٹیلیں غرض کھانے پکانے کی ہر چیز موجود تھی۔ کوک اسٹل اور برتن دھونے کے لیے ڈش سوپ بھی موجود تھا۔ ٹوسٹر، بنیادی مصالحات قریب سے کؤنٹر پر رکھے تھے۔ فریج کھول کر دیکھا تو اٹلے، ڈبل روٹی، جام اور ایک مگین دودھ کی بوتل رکھی تھی۔ فریج پر نوٹ لگا تھا کہ اگر یہ چیزیں استعمال کیں تو اتنی رقم کریڈٹ کارڈ سے منہا کر دی جائے گی۔ گلاس، جگ، کافی کے مگ وغیرہ ایک دروازے میں ترتیب سے رکھے گئے تھے۔ لائڈر اور نارنج بھی موجود تھی۔ ہاتھ روم میں تویہ، صابن، شیمپو، لوٹن سب رکھے تھے۔ مائیکرو ویو میں صاف ستھرا بستر، کبل اور ٹیکے سجے تھے۔ وہاں ایک بڑی الماری میں مزید کبل اور ٹیکے رکھے تھے۔ چھوٹے کمرے میں بھی دونوں بیڈ اپنے بستر دے سے آراستہ تھے۔

غرض پورا سا بچایا گھر تھا۔ چابی سے دروازہ کھولیں اور ہمارا شروع کریں۔

نرسین جب کچن دیکھ رہی تھی تو میں اس دوران کالج کا کھل جائزہ لے چکا تھا۔

وہ اور سعد یہاں آ کر بہت خوش لگ رہے تھے۔ سعد اپنے ساتھ کچھ منسوبے بھی لایا تھا۔ وہ کھلونے ریل کو آپس میں لڑا رہا تھا۔ نرسین نے وہ کھانے فریج میں رکھے جو بنا کر

میں نے اس سے پوچھا۔ ”سینڈیکس کچا ہیں لے جا کر تین چار گھنٹے بعد واپس لا سکتے ہو؟“

اس نے بڑی نفاس سے جواب دیا۔ ”گھر میں فون ہے۔ کیب کچنی کو کال کرو گے اور میں آ جاؤں گا، وہ زیادہ دور بھی نہیں ہے۔“ اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”کچا پر چھوڑ بھی آؤں گا، جس نام کا کوڈ لے آؤں گا اور اگر وہاں کے اسٹور سے فون بھی کر لو گے تو تمہارے وقت کے مطابق کچا جاؤں گا۔“

مجھے اس سے زیادہ پوچھنے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ ہم نے سامان اٹھایا اور سامنے کی چند سڑکیاں چڑھ کر کھڑکی کے ایک چھوٹے سے برآمدے میں کھڑے ہو گے۔ برآمدے میں تین پلاسٹک کی کرسیاں رکھی تھیں۔ اس سے زیادہ کی گنجائش بھی وہاں نہ تھی۔ کوڈ مارک لاک کھولا اور دروازہ اندر کی جانب کھلی کر ہم تینوں کھڑکی کے بے فرش پر جا کھڑے ہوئے۔

قدموں تلے قائلین کا ایک چھوٹا سا کھڑا تھا اور سامنے کچن کا کؤنٹر تھا۔ کؤنٹر کے پیچھے دو کھڑکیاں جو پیچھے جھیل کی جانب کھلتی تھیں۔ کچن کے سامنے اور ہماری بائیں جانب لیوگ روم جہاں صوفے اور کافی ٹیبل تھی۔ نوٹے میں چھینیں اچ کا ایک ٹی وی فریج پر رکھا تھا اور ٹی وی کے ساتھ اس کی ریوٹ کنٹرول ایک سفید رومال پر پڑا تھا۔ کافی ٹیبل پر کچھ میزین بھی رکھے تھے۔ کچن کا کؤنٹر کے نیچے چار برز کا چولہا، ساتھ میں پٹیلیں دھونے کا سبک تھا۔ کؤنٹر کے ایک کونے میں مائیکرو ویو اور ساتھ ایک قد آدم سے بھی بڑا فریج رکھا تھا۔ ہمارے دائیں جانب دو کمرے تھے اور ان دونوں کے نیچے تھوڑا سا کمرہ تھا۔ مائیکرو ویو پیچھے تھا جہاں سے ایک بڑی کھڑکی جھیل کی سمت کھلتی تھی۔ دوسرے کمرے میں دو چھوٹے بیدر تھے اور ایک چھوٹی کھڑکی گھر کے دائیں جانب درختوں میں کھل رہی تھی۔ بائیں جانب کونے میں لائڈری روم تھا۔ لیوگ روم اور کچن کے نیچے چار کرسیوں سے گھری گول بریک فاسٹ ٹیبل تھی۔ ہم نے سامان کافی ٹیبل پر رکھا۔ نرسین نے پہلے کچن کا مائیکرو ویو دروازوں میں دیکھا، فریج، کیتیاں، کچا، پٹیلیں غرض کھانے پکانے کی ہر چیز موجود تھی۔ کوک اسٹل اور برتن دھونے کے لیے ڈش سوپ بھی موجود تھا۔ ٹوسٹر، بنیادی مصالحات قریب سے کؤنٹر پر رکھے تھے۔ فریج کھول کر دیکھا تو اٹلے، ڈبل روٹی، جام اور ایک مگین دودھ کی بوتل رکھی تھی۔ فریج پر نوٹ لگا تھا کہ اگر یہ چیزیں استعمال کیں تو اتنی رقم کریڈٹ کارڈ سے منہا کر دی جائے گی۔ گلاس، جگ، کافی کے مگ وغیرہ ایک دروازے میں ترتیب سے رکھے گئے تھے۔ لائڈر اور نارنج بھی موجود تھی۔ ہاتھ روم میں تویہ، صابن، شیمپو، لوٹن سب رکھے تھے۔ مائیکرو ویو میں صاف ستھرا بستر، کبل اور ٹیکے سجے تھے۔ وہاں ایک بڑی الماری میں مزید کبل اور ٹیکے رکھے تھے۔ چھوٹے کمرے میں بھی دونوں بیڈ اپنے بستر دے سے آراستہ تھے۔

غرض پورا سا بچایا گھر تھا۔ چابی سے دروازہ کھولیں اور ہمارا شروع کریں۔

نرسین جب کچن دیکھ رہی تھی تو میں اس دوران کالج کا کھل جائزہ لے چکا تھا۔

وہ اور سعد یہاں آ کر بہت خوش لگ رہے تھے۔ سعد اپنے ساتھ کچھ منسوبے بھی لایا تھا۔ وہ کھلونے ریل کو آپس میں لڑا رہا تھا۔ نرسین نے وہ کھانے فریج میں رکھے جو بنا کر

میں نے اس سے پوچھا۔ ”سینڈیکس کچا ہیں لے جا کر تین چار گھنٹے بعد واپس لا سکتے ہو؟“

اس نے بڑی نفاس سے جواب دیا۔ ”گھر میں فون ہے۔ کیب کچنی کو کال کرو گے اور میں آ جاؤں گا، وہ زیادہ دور بھی نہیں ہے۔“ اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”کچا پر چھوڑ بھی آؤں گا، جس نام کا کوڈ لے آؤں گا اور اگر وہاں کے اسٹور سے فون بھی کر لو گے تو تمہارے وقت کے مطابق کچا جاؤں گا۔“

لائی تھی۔ ہاتھ روم میں جا کر کپڑے لٹکائے۔ میری جانب دیکھ کر بولی۔ ”تم فریش ہو جاؤ۔ میں نے رات کا تمہارا سوٹ اور ٹوٹھ پیسٹ ہاتھ روم میں رکھ دیئے ہیں۔“

میں نے پوچھا۔ ”میرے بیک سے نکالے ہیں؟“

بولی۔ ”نہیں تو میں خود لائی ہوں۔“

ہر بار کی طرح اس دفعہ بھی مجھے وہ حیران کر رہی پھر بولی۔ ”میں جانے بناتی ہوں۔“

میرے منہ سے یہی نکلا۔ ”بہت بہتر مہاراج۔“ یہ میں نے اردو میں کہا تھا اور وہ مطلب پوچھنے لگی۔

میں نے اپنا سیٹ اٹھایا اور چھوٹے کمرے میں چلا گیا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے آگئی۔ کہنے لگی۔ ”تم ماسٹر بیڈ میں سجدے کے ساتھ سو جاؤ۔ میں اسی کمرے میں سو جاؤں گی۔“

پوچھا کیوں تو بولی۔ ”اس کمرے میں جھیل کی جانب کھڑکی کھلتی ہے۔ جھیل یہ مناظر اچھے لگتے ہیں۔ صبح اٹھ کر اسے دیکھنا بہت اچھا ہوگا۔“

”صبح اگر جھیل نہ دیکھی تو یہ آنکھیں دیکھ لوں گا۔ ایک ہی طرح کا منظر دکھتا ہے۔“ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے میں بولا۔

”صبح کب رہے ہو؟“

”ہاں۔“

”صبح اٹھ کر سب سے پہلے تمہیں اپنی آنکھیں دکھلاؤں گی۔“

”ہاں ضرور مگر غصے سے نہیں پیارے۔“

”تم ماسٹر بیڈ میں سو جاؤ۔ میں یہاں آرام سے سو جاؤں گی۔“ وہ اپنی بات پراڑی ہوئی تھی۔

”انجینی گھر میں تمہارا کیلے سونا چھانٹیں ہے۔“

”اکیلی کہاں ہوں۔ تم بھی تو ہوناں۔“

”اسی لیے تو کہہ رہا ہوں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اپنے ہوتے تو مجھے اکیلا نہ کرتے پھر مجھے چلے بھی جاتا ہے۔“

اس کے دونوں ہاتھ میرے کندھوں پر تھے اور سر میرے سینے پر۔ میں نے اپنے دونوں بازو اس کی گردن کے گرد محال کیے اور بولا۔ ”تم اب کہیں نہیں جا رہی ہو۔“

یہ سن کر وہ تڑپ کر الگ ہوئی اور حیرت سے میرے چہرے کی جانب دیکھنے لگی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ شکایتی نظروں سے دیکھتی ہوئی بولی۔ ”مذاق کر رہے ہو؟“

”نہیں مذاق نہیں میں نے بہت سوچ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔“ میں اس کی آنکھوں میں تنبیہ کی سے دیکھتے ہوئے بولا۔ حالانکہ اس وقت بھی میرے اندر ایک جنگ جاری تھی۔

”مجھے یقین نہیں آ رہا۔“ وہ میرے چہرے اور آنکھوں میں چائی دیکھتے ہوئے بولی۔

”تو یقین کرلو۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں آہستگی سے کہا۔ ساتھ ہی ساتھ اپنے آپ کو دلا سا بھی دیتا جا رہا تھا۔

”پھر بھی نہیں آ رہا۔“ اب اس کی نظروں میں بے اعتباری اور اظہار دونوں کے سامنے تھے۔

”آخر کی بار ہی کرلو۔“ میں نے مسکرا کر اسے اپنی جانب دوبارہ کھینچ لیا۔

”ایسا تم کبھی آخری بار نہیں آخری دم تک کروں گی۔“ وہ مجھ سے لپٹی اور اپنی گرفت مضبوط کر کے خوشی سے بولی۔

”تفصیلی بات میں بعد میں بتاتا ہوں۔ میں شاور لے کر آتا ہوں۔ تم جانے میرے لیے بنا دو۔“ میں نے اسے علیحدہ کیا اور دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھتے ہوئے بولا۔

”نہیں میری آنکھوں میں دیکھ کر پھر سے ایک بار بولو۔“ اب اس کی آنکھیں اداس اور نیناک تھیں۔

”تم اب یہی نورتنو میں رہو گی۔ ایرانی بھائیوں سے ملنے جاسکتی ہو مگر ہوگی یہاں۔“ میں بار بار اسے اپنی بات کا یقین دلا رہا تھا۔

”تو پھر؟“ وہ اس طرح سے بول رہی تھی کہ جیسے اپنے سارے فیصلے میرے سپرد کر چکی ہو۔

”تو پھر یہ کہ تم نے آگے پڑھنا ہے اپنے آپ کو ثابت کرنا ہے کہ کیلے تم سجد کی پرورش کر سکتی ہو اور میں تمہارے ساتھ ہوں اور تم بھی وعدہ کر دو کہ میرے کہنے پر عمل کرو گی۔“ میں نے جو مختصر اس کے بارے میں سوچا تھا بتا دیا۔

”جو کہو گے کروں گی۔ بس تم ایک وعدہ کر دو کہ کسی حوالے سے بھی کسی رشتے ناٹے ہی کبھی میرے ساتھ رہو گے۔ باقی کے سارے وعدے مجھ سے لے لو۔ بس یہی ایک وعدہ تمہارا۔“ یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں سے آنسو چمک پڑے۔

میں نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور اس نے دونوں ہاتھوں سے تمام لیا۔ خوشی سے اس کی آنکھوں میں موتی تھے۔ میں اس کی یہ خوشی دیکھ کر خوش تھا۔ میں نے ایک لاکھ عمل اپنے ذہن میں بنالیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر کم سن و عمر اس پر عمل ہو گیا تو انشاء اللہ اس کی گھر کی زندگی کو تر آرا جائے گا۔

میں شاور لے کر باہر نکلا تو کافی ٹھیل پر جائے کالنگ اور اس پر چھوٹی پلیٹ پڑی تھی۔ ساتھ سینڈوچ اور خشک میوہ رکھا تھا۔ میں صوفے پر بیٹھا تو اندر ہی وضعت چلا گیا۔ سجد کا اس سے پوچھا تو بولی۔ ”ابھی وہ شاور لے گا اور کپڑے چنچ بھی کرتے ہیں۔“ وہ اب چٹکتی اور مسکراتی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

وہ مجھے کچھ ہنسی ہنسی لگ رہی تھی۔ وہ سارا راستہ سوئی بھی نہ تھی۔ رات کو وہ در تک بیٹھا کچھ نہ کچھ بتاتی بھی رہی تھی جسے آتے ہی فریق میں بھر دیتا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

”تم سجد کو شاور دلا کر ڈیڑھ دو گھنٹے آرام کرلو۔ اسے میں سنبھال لوں گا۔“

”وہ تمہیں تنگ کرے گا۔“

”وہ تو تم بھی کرتی ہو۔“

”یہی تو زور رہتا ہے۔ کہیں مجھ سے تنگ نہ آ جاؤ۔“

اب وہ شوخی سے بات کر رہی تھی۔

”صرف انہی سے تنگ ہوتا ہوں، جنہیں آسانی سے چھوڑا جاسکتا ہے۔ جن کے جانے کا دکھ نہیں ہوتا۔“ میں نے کہا۔

”میں چلی گئی تو دکھ ہوگا؟“ وہ مجھے لفظوں میں شاید آواز ہی تھی۔

”جن کو جانے کا کہہ کر اداسی ہو کر جانے کا کہوں تو سکون ہو۔ اس کے ہمیشہ چمچنے کا شوق ہو جی ہی کیوں؟“

میں نے آسان سا جواب دیا تو پھر وہ کہنے لگی۔ ”کسی کے چلے جانے کا کبھی دکھ ہوا؟“

”ہاں بہت ہوا تھا۔ بہت رونا تھا۔ مینوں بھٹکتا رہا مگر اب جا کے معلوم ہوا ہے چھوڑنا ہی بہتر تھا۔ وہ خود پسند تھی۔ جب کسی کا پیار جان بھی لے لے تو پروا نہیں پر بد دعا دے تو جان چلی جاتی ہے۔“ میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

”اسے پیار کر کے چھپتا رہے ہو؟“ وہ سوالیہ لہجے میں بولی۔

”نہیں مجھے کھو کر وہ چھپتا رہی ہو گی۔“ میں نے جواب دیا۔

اسی دوران سجد کمرے سے ماما بابا کہہ کر چلائے لگا۔

”شاید اس نے شاور لے لیا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ اندر چلی گئی اور میں کمرے میں چائے کے چھوٹے چھوٹے ٹھونٹ بھرنے لگا۔ میری نظریں سامنے کھڑکیوں کے پار تھیں۔ ایک ٹل کھاتا راستہ گھر کے ڈیک سے نیچے جھیل تک جا رہا تھا۔ اس پگھلڈی کے قدموں تلے درختوں کی شاخیں رکھ کر اسے پاروں میں چلنے کے قابل بنا دیا گیا تھا۔ جہاں یہ پگھلڈی اختتام کو پہنچتی تھی وہیں ٹل جھیل اس سے آگئی تھی۔ مجھے اگر اس منظر میں کوئی رات دن بھی بٹھا دے تو خوشی جڑ جاؤں۔ دن بھر دیکھتا رہوں اور شب بھر محسوس کرتا رہوں۔ ایسے رومانس پالنا مجھے ہمیشہ سے اچھا لگتا ہے اور اس بھی رکھتا ہے۔

سجد تیار ہو کر زیادہ کھڑا آیا تھا۔ رنگت اور نقوش ماں سے لیے تھے۔ دو ٹوٹا آیا اور چھلاک لگا کر میرے ساتھ آ بیٹھا۔ نرسن سے میں نے کہا۔ ”اسے کوئی ہلکی جینٹ پہنا دو۔ ہم دونوں دوست جھیل تک جائیں گے۔“

نرسن بولی۔ ”تو میں کیا کروں گی؟“

میں نے کہا۔ ”یہ میرے اور میرے اس دوست کی ٹینک ہے۔ ہم کسی دورے کو اپنے ہمراہ نہیں لے جاتے۔“ میں نے اس کی مسکراتی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تو اب ذرا آرام کریں۔ ہم اس دوران محوم کر آتے ہیں۔“

اس کی آنکھوں میں تشکر تھا۔ شاید مدتوں بعد کسی نے اس کا خیال کیا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”ہم پیچھے ڈیک والے دروازے سے جائیں گے۔ آگے والا دروازہ بند رکھنا۔“ میں نے اپنے جاگزیلے۔ جینٹ کندھے پر ڈالی۔

سجد کو بھی ماں نے اپنے تئیں خوب تیار کیا تھا۔ ہم دونوں باہر نکلے اور اس نے ابھی تک اپنی پھرتی کو اسی گرفت سے پکڑ رکھا تھا۔

ہم دونوں ڈیک پر لگے دروازے سے باہر آئے۔ دروازہ سلائیڈ کر کے میں نے دوبارہ اسے اپنی جگہ پر سرکا دیا۔ ڈیک پر ایک پلاسٹک کی گول میز اور چار کرسیاں اسی کے ارد گرد رکھی تھیں۔ میز کے بیچ ایک بڑے سورخ میں چھتری لگا دی گئی تھی۔ ساتھ باربی کیو کی گرل رکھی تھی۔ مالک مکان نے ہر ضرورت کا پورا انتظام کر رکھا تھا۔ یہ جگہ ایک رات رہنے کی نہ تھی۔ یہاں چند دن رکنا ضروری تھا تاکہ اس مقام کو اپنے دل و دماغ میں پورا بسایا جاسکے۔

اور نیچے چھلانگیں لگانے لگا۔
پھر میں ان پھولوں کو دیکھنے لگا جو کھلے بھر کو کھم کر پھر
سے لہرانے لگے تھے۔ ہوائیں پھر سے چلنا شروع ہوئی تھیں
اور سورج ایک بادل کے پیچھے چھپ کر اپنی کریمیں منکس کر
کے اس کے کناروں پر چمکنے لگا تھا۔
میں نے ایک بزرگ سے پوچھا تھا کہ ”کیا بچہ بھی
دعا نہیں دیتے ہیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ ہاں۔ جب وہ
آپ کی بات پر مسکراتے ہیں تو وہی دعا ہوتی ہے۔“
اور آج مجھے بہت ساری دعائیں دے رہا تھا۔
میں کچھ دیر وہاں بیٹھا رہا اور پھر مجھے اس جگہ سے پیار
ہو گیا۔ وہ جگہ اپنی اپنی کٹنے لگی۔ آس پاس کے درخت مجھے
اپنے دیرینہ دوست کٹنے لگے۔ پھول باہر نکلے، مسکرا کر
چھپڑتے اور دوبارہ چھپ جاتے۔ میں نے ایک ٹکڑے جھیل کی
سطح پر لڑکایا اور جھیل نے مجھے جواب لہروں کی صورت دیا جو
پھیل کر میری جانب بڑھیں۔ درختوں پر بیٹھے پرندے پہلے
تو خاموش تھے اور جاکم وہ نفیس نکلتانے لگے۔ اپنی توجہ
مذہل کرانے کے لیے شاخ سے شاخ پرواز پھر نے لگے۔
میں وہاں سے اٹھا اور سعدا اس اشارہ سمجھ کر اٹھ گیا۔

دل چاہتا تھا کہ کنارے کنارے جمیل کا پتھر لگاؤں
مگر اس کا ہر حصہ کسی کی ملکیت تھی۔ یہ ممکن نہ تھا کہ یہاں کوئی
کسی کی پر اپنی دل میں لگانے کے لیے گھومتا پھرے۔
میں نے سعد سے پوچھا: ”دوست! یہ جگہ کیسی گلی
آپ کو؟“
وہ جھٹری کھول کر معصوم چہرے سے مجھے دیکھتے
ہوئے بولا: ”یہ والی جگہ ہے۔“ اس نے جمیل کی جانب
اشارہ کیا۔
”ہاں!“ میں نے جواب دیا۔
”ماما! کتنی بچی ہیں کہ انھیں گلی میں بہت پسند ہیں۔“
وہ بولا۔
”آپ کو کیسی گلی؟“
”ماما! تو کبھی اچھی لگتی ہیں۔ انہیں بلاؤں۔“ وہ اٹھاتو
میں نے پکڑ کر پھر اشارہ کیا۔
میں نے کہا: ”بیٹہ جاؤ! ابھی ماما آرام کر رہی ہیں۔“
”وہ اس وقت پہلے تو کبھی نہیں سوئیں۔“
”وہ آج تھک گئی ہیں ناں۔“
”پہلے تو وہ بھی نہیں تھکتی تھیں۔ آج کیا بہت تھک گئی
ہیں؟“

راست بل کھاتا نیچے جمیل تک اترتا جا رہا تھا اور سورج نصف
النتہار چمک رہا تھا۔

جمیل یہاں سے ڈیڑھ دو سو گز دور ہو گیا۔ اس کے
پاؤں پر چلتے سورج کے لشکارے تھے۔ نظریں نہیں ٹھہرتی
تھیں۔ راستے کے دونوں جانب دور تک جاتے ہری بھری
اور ملائم گھاس کے قطبے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ گھاس کو
کل ہی تراشا گیا ہو۔ گھاس میں کہیں کہیں سرو کے درخت
اپنے سائے ڈھونڈ رہے تھے۔ چیز کے پودے بے تحاشا نظر
آ رہے تھے۔ جمیل کنارے درختوں کے چمڑے تھے اور وہاں
کی سرسراہٹ تھی۔ ہم نیچے اترتے چلے گئے۔ جمیل کے
قریب راستہ دائیں جانب اچانک مڑا اور پھر بائیں جانب
جمیل کنارے رک گیا تھا۔ وہیں لکڑی کے بیج رکے تھے۔
لوہے کی میز اور آگ جلانے کی جگہ بنی تھی۔ ایک درخت
کے نیچے جلانے کی لکڑی ترتیب سے اوپر نیچے رکھی تھی اور
قدموں تلے چمک کی طرح سبز گھاس بچھی تھی اور اوپر بہت
سے پھول بھرے درخت تھے۔ میں بیج پر بیٹھ گیا۔ سعد ساتھ
بیٹھا پانی پھرتی رکھو لٹا اور بھر بند کر رہا تھا۔

وہ جمیل کوئی آدھے میل کے قطر میں ہو گیا۔ پانی مہرا
نیلا شفاف تھا۔ وہ ایک نیم گول دائرے میں ساری کی
ساری جگہ یہاں سے نظر آ رہی تھی۔ اس کے کناروں پر
درختوں کے بیج تھے جو اپنے سائے جمیل کنارے ڈالتے
تھے۔ سب درخت سفید اور گلابی پھولوں سے لدے تھے۔
ہوا درختوں سے چٹکی ہو کر جمیل کی سطح کو مارتی کر رہی تھی۔
پانی اتنے شفاف کہ مجھے کناروں پر جمیل کی سطح نظر آ رہی
تھی۔ جمیل کے ارد گرد گھر تھے اور عینوں کی اپنی کشتیاں
کناروں سے بندھی تھیں۔ سفید موٹر بوس دور دور قریب
سے بہت بھلی لگ رہی تھیں۔ کتنے خوب صورت احساسات
ہوں گے جب یہ اپنی کشتی کو جمیل کے درمیان لاکر بیٹھ جاتے
ہوں گے۔ شام کا منظر یہاں کتنا سہانا ہو گا جب سورج اپنے
تمام تر رگوں سمیت اپنا عکس نیلے پانیوں پر ڈالتا ہو
گا۔ کناروں پر لگے، خورد و پھول گھاس سے سر نکالے آہستہ
آہستہ ہوائے لہر آ رہے تھے اور ایک مکمل خاموشی چھا رہی تھی۔
درختوں، پھولوں کا شفاف عکس ہر جانب پانیوں میں نظر آتا
تھا۔ پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو ایک پہاڑی پر ہماری رہائش
خاموش ٹھہری تھی اور درمیان میں وہی گھاس، درخت اور
ہوائیں تھیں۔ جس طرف بھی نظر اٹھی وہاں ایک علیحدہ منظر
تاجورج کے اندر تک جذب ہوتا جا رہا تھا۔

”معلوم نہیں۔ وہ سو کر اٹھیں تو پوچھ لیتا۔“
”انکل ہم کیا ماما کے ملک ایران واپس جا رہے ہیں؟“ آپ کی بارہوا اپنے ذہن کی بات سامنے لے آیا۔
”تم نہیں جانا چاہتے؟“ میں نے پوچھا۔
”نہیں میرا یہاں اسکول ہے۔ آپ بھی تو ہیں ہاں، میں نہیں جاؤں گا۔“ وہ مصحوبیت سے مجھے بتلا رہا تھا۔
”اگر ماما چلی جائیں تو آپ میرے پاس یہاں رہیں گے؟“ میں نے پوچھا۔
”تو آپ بھی ساتھ چلیں۔“
”اچھا یہ بتاؤ اگر ہم سب ٹورنٹو میں رہیں تو کیسا لگے؟“
”یہ تو بہت اچھا ہوگا۔ میں بھی نہیں جاؤں گا۔“ پھر جاکر بولا۔ ”آپ ماما کو سمجھائیں وہ مجھے بار بار کہہ رہی ہیں۔“
میں نے اسے گلے لگا لیا اور سننے سے لگائے اس سے۔
”آج آپ کی ماما کو ہم دونوں مل کر سمجھاتے ہیں۔“
وہ خوش ہو گیا اور مجھ سے اپنے آپ کو چھڑا کر بیچ رہا تھا۔

فروری 2018ء کے
گلاب موسم میں سنسنی کی دلکش جھلک

نویسہ صوفیہ کائنات کا مجموعہ

سنسنی کا مجموعہ

داستانہ

مزید

عظیم ترین مضمون

محفل شعر سخن

اور

ملک صفدر رقیات کی جنت

وارث

جوز میں پراکٹر کر چلتے تھے ایک ہی ٹھوکر سے منہ کے بل گر پڑے..... یہی خدا کی قدرت ہے۔ آخری صفحات پر اسماعیل قادری کے خیالات کی پرواز

ہفت دھرم

خصوص عہد کے خاص رنگ..... چنگیز خاں کی عورتوں کے چال چلن پر ایک گہری نظر..... ابتدائی صفحات پر علی اختر کی کاوش

رنگ آسمان

رقابت کی آگ میں جلتے اور محبت کی پھوار میں سیکتے مخالف اذہان کا ادراک و شعور..... اے آرا جیوت کا اگا پڑاؤ

وقت

کبھی غم کبھی خوشی کی مثل..... وقت اپنے ہی لگائے ہوئے گھاؤ پر کبھی خود ہی مر رہا بن جاتا ہے..... حسام بٹ کے قلم کی روانی

تتویر ریاضہ محمد یاسر اعوان۔ ثمر عباس۔ شاکر لطیفہ محمد الیاس اور انجمن فاروقی ساحلی کی تحریروں آپ کی منتظر

اس کے علاوہ

چکڑالہ کا نقوی البخاری قبیلہ

ضلع میانوالی کے قدیم ترین مردم خیز گاؤں چکڑالہ کا نقوی البخاری قبیلہ نقوی عالمی شہرت یافتہ ہے جنہوں نے اس گاؤں کی علمی، ادبی، صحافتی، دینی، مذہبی، سیاسی، سماجی، تہذیبی، ثقافتی تعمیر و ترقی میں ایک فعال و نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ان کے مورث اہلی حضرت سید محمد حسین بخاری تیرہ پیر ابن حضرت اولیاء سید محمد شریف جو اوجی بلوٹ شریف ڈیرہ اسماعیل خان سے بغرض عبادت و تبلیغ گوشہ جہان کی لیے تشریف لائے تھے چکڑالہ نام تجویز کر کے آباد کیا۔ آپ مجدد عالم دین اور صاحب کرامت بزرگ تھے۔ حضرت مخدوم اعظم سید شیر شاہ جلال الدین حیدر سرخ پوش بخاری م۔ 1291 ب۔ 1199ھ۔ اوجی شریف بہاول پور کے فرزند دوم حضرت سید علی مرست کے فرزند ارجمند حاجی سید بہاول حلیم کی نسل مبارک سے تھے۔ اس خاندان کو علمی و ادبی و مذہبی و دینی حلقوں میں عزت و احترام و قاروا کرام حاصل ہے۔ پنجاب کے اس معروف گاؤں میں نقوی البخاری قبیلہ کو ان کے علم و فضل و ذہن نقوی کی وجہ سے ایک اہم اور خاص مقام حاصل ہے۔ چکڑالہ علمائے کرام اور اولیاء اللہ کی سر زمین اور سچوں کا گاؤں ہے۔ دینی مدارس بھی کافی تعداد میں ہیں۔ روز و شب درس و تدریس کا سلسلہ صدیوں سے جاری و ساری ہے۔

مرسلہ: سید امتیاز حسین بخاری۔ سرگودھا

گرفت کو شاید سدا پناہ دل دے بیٹھا تھا۔ بچہ ہو یا بڑا جس پر ال آجائے اس پر اپنی گرفت چاہتا ہے۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ”اس کا کوئی میں کوئی قصہ، گاؤں یا شہر کچھ تو ہوگا۔“

ڈرائیور نے سکرا کر میری جانب دیکھا اور بولا۔

”جنگ میں آپ لوگ کا کوئی کے قصہ بکٹن ہی میں ہیں۔“

میں نے پوچھا۔ ”کیا ہم سینڈ ٹینکس پار جاتے ہوئے بہمن کے مرکز ہی سے گزریں گے؟“

وہ بولا۔ ”نہیں وہ صرف گزر جانے کی جگہ بھی نہیں ہے۔ آپ کو وہاں اتر کر دو تین گھنٹے لگانے چاہئیں ورنہ آپ اسے مس کر دیں گے۔“ اس کے کہنے کا صاف مطلب یہ تھا کہ اگر بکٹن کا بازار نہیں دیکھا تو کچھ بھی نہیں دیکھا پھر مجھ سے پوچھا۔ ”داہنی کب ہے؟“

میں نے جواب دیا کہ کل پانچ بجے شام کی فٹل لگی ہے۔

وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ”اگر آپ کل بارہ بجے تک نکل جائیں تو میں آپ کو یہاں کے دو اہم اور خوب صورت مقامات دکھلا سکتا ہوں۔ ایک تو سامنے پہاڑ پر جمیل ہے اور دوسرا بکٹن کا ڈاون ٹاؤن (مرکزی علاقہ)۔“

میں نے گھوم کر نسرین کی جانب دیکھا کہ اس کی رائے بھی لے لوں۔ تو ڈرائیور ہنس کر بولا۔ ”بیوی سے پوچھنا ہی ضروری ہوتا ہے۔“

میں نے دائیں ہاتھ سے اپنے سر کے بال پکڑ لیے اور نسرین نے ہنسی دہانے کے لیے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

میں نے ڈرائیور سے کہا۔ ”داہنی پر تم کو بتائیں گے اور ہو سکتا ہے کہ ان دو مقامات پر جائیں۔“

ہم نہایت ہموار، صاف ستھری اور بل کھاتی دو دروہ مرکز پر سے گزر رہے تھے۔ ایسے کہ ہم پانی کی تار پر کسی بجزی جہاز میں سفر کر رہے ہوں۔ ہمارے دونوں جانب جنگلات تھے۔ اچھے گھنے کہ ان کے اندر جا کر شام کا ماحول ملتا ہوگا۔ آسمان نیلا اور چمک واد تھا۔ سفید اور پھورے بادلوں کے ٹکڑے ہواؤں کے ساتھ اپنی من موجیاں کر رہے تھے۔ پیچھے پہاڑیاں ہی تھیں جن پر جنگلات تھے۔

ڈرائیور نے اس کے بارے میں بتایا تھا کہ اس پہاڑ پر جمیل ہے۔ پہاڑ پر جمیل میرے لیے عجیب بات تھی کیونکہ ارد گرد تک نہ کوئی دریا تھا اور نہ کوئی بلند برفانی پہاڑ جو اس جمیل کو پانی سے بھر رہے۔

میری نظریں آس پاس اور سامنے کے مناظر پر تھیں

جاری تھی۔ میں نے پوچھا۔ یہ تمہارا بھی تم لے آئیں۔ اتنا سامان لانے کی کیا ضرورت تھی۔“

کہنے لگی۔ ”خود ہی تو ایک بار بولا تھا کہ اگر چائے نہ ملے تو میں چڑچڑا ہوا جاتا ہوں لڑتا ہوں۔“

”تو پھر۔“ میں نے وضاحت مانگی۔

”پھر یہ کہ تمہارے دماغ کو ہر وقت میں ہر سکون رکھنا چاہتی ہوں۔“ وہ میرے چہرے پر نظریں رکھے بولی۔

نسرین کا اتنا زیادہ خیال رکھنا مجھے خوف میں مبتلا کر رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اتنی زیادہ چاہت کا میں مستحق ہرگز نہیں ہوں۔ میری بیوی جو میرا خیال رکھتی تھی تو وہ میرے رشتے میں آچکی تھی۔ اس کے پاس وہی دلیل تھی کہ یہ اس کا حق ہے یا فرض ہے۔ میں بھی اگر کچھ اسے لونا تو ایک حق کے ناطے لونا تھا۔ اور نسرین تھی جو کسی ان دیکھے کچے دھاکے سے بندھی وہ سب کرنی جاری تھی جو میری اوقات سے باہر تھا۔ نہ وہ حق جنگلاتی اور نہ کچھ مطالبہ کرنی تھی۔ میں گہری رفاقتوں سے آج تک فرار حاصل کر رہا تھا اور یہ آہستہ سے مجھے ہاندھ رہی تھی۔ میں ایک عام آدمی تھا اور عام آدمی کی طرح خوب صورت ساتھ مجھے بھی اچھے لگتے ہیں۔ میں آج تک اپنی مرضی سے زندگی گزارتا چلا آ رہا تھا اور مجھ پر اپنی بھینوں کا فرض چڑھانی چلی جاری تھی۔ اس کی قربت میں قنات تھی اور اس کی دوری میں سندھروں جیسی اداسی۔ میں اس کے پیار کے آگے بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔

اسے وہ سب کچھ دینا چاہتا تھا کہ آگے جا کر وہ اس پر فخر محسوس کر سکے۔ اس کے پیار کا بس مجھے بے چین کر گیا تھا۔

وہ میرے چہرے پر نظریں رکھے کھڑی تھی اور میں نے بڑھ کر اسے اپنی ہانہوں کے گھیرے میں لے لیا۔

کیب ڈرائیور وہی تھا جو ہمیں یہاں چھوڑ گیا تھا۔

میں نے اس سے کہا کہ ہمیں سینڈ ٹینکس پارک جانا ہے اور غروب کے رنگ دیکھ کر ہم فوراً وہاں سے نکل پڑیں گے۔

کہنے لگا کہ چندہ منٹ کا قافلہ ہے۔ ہمیں وہاں چھوڑ کر شام کے وقت دوبارہ لینے آجائے گا۔ میں نے اپنا کریڈٹ کارڈ نمبر اس کو دیا اور ساتھ ہی کچھ ڈرائیور کا اسے ٹپ بھی دے دی جو اس نے شکر کے ساتھ قبول کر لی۔

ہم کسی میں بیٹھے اور وہ پورس کر کے سڑک پر لایا تو دائیں ہاتھ مڑ گیا۔

میں اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ ہاں اور بیٹا پیچھے بیٹھ گئے۔

بیٹے نے ابھی تک وہ چھتری تھامی ہوئی تھی۔ چھتری پر

ہاتھوں سے اپنے بال ٹھیک کرتے ہوئے نکلی۔ ننگے پاؤں تھی اور گہرے براؤن کھڑی کے فرش پر اس کے سفید جھپٹے نازک پاؤں دک رہے تھے۔ مجھے جھپٹے بناتے دیکھ کر میرے پاس چلی آئی اور بولی۔ ”سعدی جانب سے بے فکری تو گہری نیند آگئی۔“ پھر مجھ سے بولی۔ ”تم بھوس چائے بنا دیتی ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”اپنا یہ تکلف بند کرو۔ چائے بن چکی ہے۔ بیٹھو میں لاتا ہوں۔“

وہ فریج کی جانب تھی اور ایک لفافے سے سموے لٹالے اور پھر مائیکرو ویو میں گرم کرنے لگی۔

میں نے پوچھا۔ ”یہ سموے کہاں سے لائی ہو؟“

جواب دیا۔ ”پاکستانی گروسری شاپ میں عام ملتے ہیں۔ اتنا حیران ہونے کی کیا ضرورت ہے۔“

ایک چھوٹی ڈائنگ ٹیبل بھی کچن میں رکھی تھی۔ میں دو کپ چائے کے بنا کر ٹیبل کے گرد بھی ایک کرسی پر آ بیٹھا۔ وہ سموے لے کر صوفے پر جا بیٹھی اور بولی۔ ”بہنیں بیٹھے ہیں۔“ میں نے اپنے کندھے اچکا اور صوفے پر آ بیٹھا۔

سعدی پانی ماں سے بولا۔ ”انکل بھی کنارے پر خاموش بیٹھ کر مچھلیاں گھنٹے رہے۔ میں نے بھی بہت ساری نکلیں۔“

میں بولا۔ ”یہ بچہ اب شرارتی ہوتا جا رہا ہے۔ تمہارے قابو میں آنے والا نہیں۔“

وہ بولی۔ ”مجھے معلوم ہے تم ہی اسے قابو میں رکھنا۔“

معلوم نہیں وہ غیند لے کر مطمئن تھی یا میری یقین دہانیوں سے۔ میں خود اسے مطمئن دیکھنا چاہتا تھا۔ ہاں بیٹے کو مسرور دیکھ کر میں نسرین سے زیادہ مطمئن تھا۔ ہر چیز ویسے ہو رہی تھی جیسا میں چاہتا تھا۔ اس کا انجانا خوف ختم کر کے میں اسے خود اعتمادی دینا چاہتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ مرحلہ بھی زیادہ دور نہیں۔

سموسوں کے ساتھ گرم چائے کا لطف دو بالا ہو گیا تھا۔ میں نے نسرین سے کہا کہ وہ تیار ہو جائے اور اتنی دیر میں، میں کیب کو فون کرتا ہوں۔ میں ڈوسے سورج کا منظر سینڈ ٹینکس سچ پر سے دیکھنا چاہتا تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ ایسا حسین منظر پورے اوشار یوٹیل اور نہیں دیکھتا۔

جتنی دیر میں ہم تیار ہوئے اتنی دیر میں کیب گھر کے سامنے ڈرائیو دے پر آرکی۔

نسرین نے ضروری سامان پک کر کے بیک میں ڈال دیا تھا۔ وہ تمہارا بھی اٹھالائی جس میں وہ چائے لے کر

ٹرلر سے تاریں اور پائپ نکال کر ان سے منسلک کر دینا کافی ہے۔ ٹرلر میں پاور اور پانی آ جاتا ہے۔ نہ بجلی جاتی ہے اور نہ پانی ختم ہوتا ہے۔ ٹرلر والے کرسیاں نکال کر باہر رکھ دیتے ہیں اور دو چار دن گزار کر واپس گھروں کو سدھار جاتے ہیں۔ اسی طرح سے ٹینٹ لگانے والے اپنی مخصوص جگہوں پر ٹینٹ لگاتے ہیں۔ ساتھ میں کھانا بنانے کے لیے چولہے بنے ہوتے ہیں۔ سامنے صاف ستھرے ہاتھ روم ہیں۔ قریب کوئی نہ کوئی پھیل ہوتی ہے۔ پیدل چلنے کے لیے واکنگ ٹرل بنے ہیں اور آٹھ ڈالر ایک رات کے لیے کرائے پر ٹینٹ لگانے کی جگہ مل جاتی ہے۔

اس پارک میں پانچ سو ٹرلر کی کیمپنگ کی سہولت موجود ہے۔ اور سینکڑوں ٹینٹ کیمپنگ کے مقامات پر ہیں۔ یہ بھی نہیں کہ ایک ٹینٹ دوسرے کے سامنے لگا ہے۔ دو ٹینٹ کے درمیان پرائیویسی کے لیے پچاس پچاس فٹ سے زائد کا کم از کم فاصلہ ہوگا بلکہ ان کے درمیان کئی بلند درخت بھی ہوں گے۔

امریکا اور کینیڈا میں ہر ملک کے اندر کئی ہزار کیمپنگ سائٹس ہوں گی اور تمام میں ہر طرح کی سہولت موجود ہوں گی۔ گرمیوں میں روزانہ ہزاروں ٹرلر کسی نہ کسی کیمپنگ کی طرف رواں ہوتے ہیں۔ گرمیوں کے تین ماہ میں تو جگہ بھی بھٹک لیتی ہے۔ اس کے علاوہ ہر کیمپنگ میں کھڑکی کے مابین بھی جنگل میں بنے ہوتے ہیں۔ یہاں لاکھوں لوگ گرمیوں میں کیمپنگ کے لیے نکلتے ہیں۔ سو ڈالر میں پورا گھرانہ چند دن کے لیے تفریح حاصل کر لیتا ہے۔

اتنی زیادہ تفصیل سے مجھے یہ بتانا مقصود تھا کہ اپنے پاکستانیوں کو اپنے حقوق کے بارے میں آگاہی بھی مل جائے اور معلومات بھی مل جائیں۔ مجھے یہ معلومات اس طرح سے ملی ہیں کہ میں نے ان ممالک میں بہت زیادہ کیمپنگ کی ہے۔ جہاں میں آج آیا ہوں یہ میرا کسی کیمپنگ پارک میں آنے کا پہلا موقع تھا اور میں حیرت سے اس قدر مختلف پارک کو دیکھ رہا تھا۔

ہم ہیریز کر اس کے اندر داخل ہوئے۔ ایک بڑی پارکنگ میں ہماری کیب رکی۔ ہمیں شام سات بجے ادھر ہی ملنے کا ڈرائیور نے کہا۔ ہم اترے اور وہ مڑ کر واپس چلا گیا۔ ٹرین کے پاس ایک بیگ تھا۔ اسے میں نے لے لیا۔ اٹھایا تو بھاری تھا۔ میں نے حیرانگی سے پوچھا۔ ”اس میں کیا ڈالا ہوا ہے؟“

میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کا کچھ حصہ مخصوص کر کے وہاں کلرورٹس اور دوسری تفریحی سرگرمیاں مہیا کر دی جاتی ہیں۔ ان میں میلوں، میسجی، آئس کریم ہوتی ہیں۔ جنگلی حقوق آزادانہ کھوتی ہیں۔ بلے اسٹون یہاں ایک ٹینٹس پارک ہے۔ سینکڑوں میل لمبی تو اس میں سڑکیں ہیں۔ کھیتوں اپنی پاور فل گاڑیوں پر سفر کرتے جاتیں مگر یہ جنگل اور بیابان ختم نہ ہوگا۔ کچھ پارک صوبائی حکومت کی نگرانی میں ہوتے ہیں۔ ان کا قریبی پچاس سو میل سے کم نہیں ہو گا۔ ہم جس پارک میں اب داخل ہوئے تھے۔ وہ صوبائی پارک تھا۔ سینکڑوں پارک بھی کئی میل میں پھیلا ہوا ہے۔ دو بڑی جھیلیں ہیں جو سینکڑوں میل لمبی اور چوڑی اونٹاریو جھیل سے منسلک ہیں۔ ان میں جزیرے ہیں اور جزیروں پر لوگوں کے مکانات ہیں۔ صوبائی پارکس کے بعد کاؤنٹی پارکس آتے ہیں۔ کاؤنٹی پارکس کو میں ایسے بیان کرتا ہوں کہ جو میرے گھر کے ساتھ ہے وہ بھی کم از کم میں مرغ میل میں پھیلا ہوا ہے۔ پھر شہر کے پارکس ہوتے ہیں اور وہ بھی اکثر میلوں میں.... پھیلے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہاں گھاس پر کوئی بھی بیٹھنا پسند نہیں کرتا کہ گھاس خراب ہوتی ہے مگر لوگوں کے لیے جگہ جگہ چٹک، میوز، واش روم، پارکنگ ہر چند بچوں کے درمیان پارٹی کیوں ایک شہی موجود ہوتی ہے مگر ہم دیسی لوگ عموماً گھاس پر چار دیوڑ بچھائے بیٹھنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

ہر قسم کے پارک میں اتنے جنگل ہوتے ہیں کہ ان کے اندر جانا بھی مشکل ہوتا ہے۔ جو لوگ جنگل کی زندگی کو پسند کرتے ہیں تو ان کے لیے چار پانچ میل لمبے لمبے مختلف پارک ٹرل بنائے جاتے ہیں۔ ہر موڑ پر نشان لگے ہوتے ہیں۔ راستے میں واش روم موجود ہیں۔ کوئی تھک جائے تو ان کے لیے جنگل کناروں پر بیچ ہوتے ہیں پھر یہاں جنگلوں کے درمیان ایک حصہ کیمپنگ کے لیے مخصوص کر دیا جاتا ہے۔ کسی کے پاس کمبر یا ٹرلر ہو تو ان کے لیے علیحدہ جگہ مخصوص ہوتی ہے۔ جن لوگوں نے ٹینٹ لگانے ہیں تو ان کے لیے سائٹ مختلف جگہ پر ہوتی ہے۔

کمبر یا ٹرلر کیا ہوتا ہے ایک چلتا پھرتا چھوٹا سا گھر۔ جس میں ایک دو کمرے، لیوگ روم، ہاتھ روم اور کچن ہوتا ہے۔ صوفے رکھے ہوتے ہیں اور ٹی وی بھی ہوتا ہے۔ ہر ٹرلر اپنی مخصوص جگہ پر جنگل کے اندر پارک کیا جاتا ہے۔ بجلی اور پانی کے کنکشن وہاں زمین میں لگے ہوتے ہیں۔

ہے۔ وہ بولا۔ ”انیسویں صدی میں یہاں.....“
تینکے پر میں نے اس کی بات کائی۔ ”شب کچھ اور ہوتا تھا؟“
میری بات کا اس نے بہت لطف لیا اور بولا۔ ”نہیں نہیں اس وقت تو نہیں نہانا بھی نہیں آتا ہوگا۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ بہت لمبی لمبی گھاس ہوا کرتی تھی۔ یہ گاؤں اور نگرہوں کی بہت بڑی چراگاہ تھی۔ پھر لوگوں نے یہاں کے جنگل کاٹ ڈالے اور کیتی گاڑی شروع کر دی۔“
میں نے کہا۔ ”مگر جنگلات تو اب بھی ہیں یہاں پر؟“
وہ بولا۔ ”یہ حکومت کینیڈا نے بیسویں صدی کے شروع میں دوبارہ لگائے تھے۔“

میں دو دور تک میلوں پھیلے جنگلات دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ سو سال پہلے حکومت نے درخت لگائے ہوں گے اور آج یہ پورا علاقہ خوشحال ہو گیا ہے۔

مجھے سوچنے کی زیادہ ضرورت نہ تھی کیونکہ سامنے پارک کا ہیریز نظر آ رہا تھا۔
کچھ کاریں تھیں چند کیمپنگ ٹرلر تھے اور بہت سی بڑی موٹر ہائیکس بھی لائن میں کھڑی آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھیں۔ ہم بھی ہیریز سے گزرے اور جانے کے لیے معمولی سی فیس ہوتی ہے جو آٹھ دس ڈالر سے زیادہ نہیں ہوتی۔

یہاں پارک کا تصور پاکستان کے پارکوں سے انتہائی مختلف ہے۔ جو لوگ یورپ یا تاتھ امریکا میں آتے جاتے رہتے ہیں یا ان علاقوں میں رہتے ہیں وہ بہتر جان سکتے ہیں۔ یہ پارک اس طرح کے نہیں ہیں کہ آپ وہاں جائیں، گیٹ پر رکن ہے، پارکنگ بے ترتیب اور جا بجا غلطیے والے نظر آرہے ہیں۔ لوگ دریاں، بچھا کر جلی اور سوکھی گھاس پر بہت سارا کھانے پینے کا سامان اپنے سامنے رکھے خوش و غرم بیٹھے ہیں۔ کچھ جھولے جن پر پتے پھل اچھل کر چڑھتے ہیں اور بے تحاشہ شور ہوتا ہے۔ پہلے تو ڈسٹ بن ہوتے نہیں اور اگر مہیا کر بھی دیئے جائیں تو کوئی ہی شاید استعمال کرتا ہوگا۔ میں پاکستانی پارکس کی حیثیت کم نہیں کر رہا ہوں بلکہ میں تو ان جگہوں پر زیادہ تفریح حاصل کرتا ہوں اور یہ بھی دیکھا ہے کہ پچاس ایکڑ کے پارک مشکل سے رہ گئے ہوں گے۔ اگر کوئی اتنا بڑا پارک مل جائے تو لاکھوں کی آبادی میں چند ہی ہوں گے اور اسی لیے ہزاروں افراد چھٹی کے دن وہاں کا رخ کر لیتے ہیں۔

مغربی ممالک میں کچھ ٹینٹس پارکس ہوتے ہیں۔ یہ مکمل جنگل کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ سینکڑوں میل کے رقبے

بات جیسے اپنے ریوا اور میں کو ذکر میرے پیچھے میں اتار دی۔ ”بہت پہلے نیوڈج ہوا کرتی تھی۔ ساحل پر مرد و زن کسی کو بھی پڑنے کیا جھگڑے پہننے کی بھی اجازت نہ تھی۔ سب قدرتی لباس میں نہاتے تھے، چٹک بھی نہاتے تھے۔ لپکاتے بھی اور کھاتے پیتے بھی تھے۔“ میری آنکھیں پھٹی کی پٹی رہ گئیں۔ ٹرین منہ پر ہاتھ رکھے اپنی سیٹ پر پیچھے جا گئی۔ میں لالچل پڑنے لگا۔ میں اس جگہ پر بھی نہیں آتا اگر گرمیوں کے دن ہوتے۔ مجھے اندازہ تھا کہ ابھی یہاں ہے اور فضا خشک تھی۔ اس موسم میں لوگ صرف آتی جاتی لہروں میں چہل قدمی کرتے ہیں۔ نہانے کا موسم ابھی آگے آنا تھا۔ میں پارسانی کا دعویٰ تو بھی کر ہی نہیں سکا مگر دیکھوں میں عورت کو بلوس دیکھنا میرے بس کی بات نہیں۔ اس بار تو میرے اندازے کے مطابق نہانے کے لباس میں کوئی مرد یا عورت موجود نہ تھی مگر اسکے سال میں ڈرائیونگ کرتے ہوئے اونٹاریو کے شمالی علاقوں سے اپنے ایک مہمان کے ہمراہ گزر رہا تھا۔ ہم ایک بیچ میں جھیل کے کنارے کو دیکھنے کے چکر میں گئے تھے۔ نرم ریت پر اپنی سیدی عورتوں کو ہم پھلاکتے ہوئے گئے تھے۔ میں نے قریب سے بخور معائنہ کیا تو مجھ کھلا کہ انہیں کپڑوں میں دیکھنا زیادہ مناسب ہے کیونکہ بہت سے عیب پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اس کے بعد میں نے ایسی جگہ جانے کی بھی تمنا ہی نہیں کی اور آج لکھتے ہوئے میں بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کے بعد مسندروں کے ساحلوں کو میں نے بہت زیادہ انجوائے بھی کیا ہے مگر بچوں کی طرف نہیں گیا۔

ڈرائیور ہمارے رومل سے ذرا احتیاط ہو گیا تھا کہنے لگا۔ ”ہم خود قد امت پسند لوگ ہیں۔ تھذیب بگاڑنے والے ہر معاشرے میں ہوتے ہیں۔ یہ بے حیائی ہم سے بھی برداشت نہیں ہوتی۔ ارب پتی لوگ ہر وقت آپے سے باہر رہتے ہیں۔“

میں نے پوچھا۔ ”اب کیا معاملہ ہوتا ہے؟“
وہ بڑے تقاریر پر لپکے میں بولا۔ ”اب تو ہر لڑکی نے کپٹی پہنی ہوئی ہے۔ سینکس گاڈا عربیائی کے دن چلے گئے۔“

میں نے پھر مدبرانہ انداز میں اپنا سر لایا اور وہ مجھے ستائی نظروں سے دیکھنے لگا۔

جنگلات گھنے ہوتے گئے اور یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ کئی میلوں میں پھیلا پارک شروع ہوا ہی چاہتا



پرتوج کہانیوں اور دلچسپ سلسلوں سے سجالا نو 2018ء کا گزشتہ شمارہ

لیکن

شیریں حیدر اور رفعت سراج کے دل پر ناول اپنے کلاگس کی طرف گامزن

حیا بخاری کی خوب صورت تحریر..... محبت لفظ ہے لیکن

زندگی کے حقائق سے پُر..... موثر مکالمہ نگاری کا حامل نسرین جمیل سیال کا مکمل ناول..... پل صراط

اسما قادری کی بے حد پُر اثر تحریر..... حد

نوفیہ کلیدی دوشیزہ کے لطیف احساسات کی داستان.....

میں خود کو کہیں رکھ کر بھول بیٹھی ہوں..... رخ جوهدری کے قلم سے

نئے سال کے لیے مایہ ناز اسٹار غزالہ رشید کا خصوصی تحفہ..... انہیں شکایت ہجران

دکھ احساسات اور دلنشین انداز بیان کا استخراج لیے نزہت جبین ضیا
کا پر لطف ناول حیات جاوداں تو ہے.....

انٹرنیٹ کا بڑھتا ہوا جاب جاسٹہ مال اور اس کے نتائج جاننے کے لیے پڑھیے سیمیا رضا ردا
کی انوکھی اور تکی کی تحریر..... سائنس ان..... سائنس آؤٹ

ایک نیا ناول

ثمر کاظمی، غزالہ عزیز، سلمیٰ غزل، عائشہ تنویر، بشری ماہا،

اسما طاہر و دیگر مہمند قلم کاروں کی دلچسپ اور سبق آموز کہانیاں.....

اس کے ساتھ ساتھ بڑے مستقل معلوماتی تقریبی سلسلے جس میں خوش ذائقہ کہانیاں، احساسات سے پُر شاعری،
ادبی لطائف اور سوچ و فکر کو وسعت دینے والے دلچسپ مراسلات.....

بولی۔ ”سب سامان جو ضرورت پڑ سکتا ہے۔“
پھر ہاتھ بڑھا کر بولی۔ ”مجھے دے دو اگر تمہیں ہماری لگ رہا ہے۔“
میں نے ہنس کر اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا۔ ہم پارک انتظامیہ کے سیاحتی سینٹر کے سامنے بیٹھ گئے تھے۔ انہوں نے مجھے پارک کا نقشہ ہاتھ میں تھا دیا نقشہ پر ٹریل کے نقشہ ساری چٹوڑ کا کل وقوع اور بہت ساری معلومات درج تھیں۔ ساتھ ایک شاہد علی بھی۔ کوئلہ ڈنگس اور مختلف اقسام کے جوس انہوں نے سامنے کاؤنٹر پر سجائے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا کہ پینے کا... پانی اور جوس لے لوں۔ میں کاؤنٹر تک گیا تو نرسرین نے کہی پکڑ کر مجھے پیچھے کھینچ لیا۔ میں نے پوچھا۔ ”اب کیا بات ہے۔“
وہ بولی کہ اگر پانی، جوس یا کچھ کھانے کو لے رہے ہو تو وہ میں پہلے ہی سے بیگ میں ڈال کر لے آئی ہوں۔ میں نے پوچھا۔ ”تو جو وزن اٹھائے تم محکم رہی ہو۔ وہ ان اشیاء سے بھرا ہے؟“
وہ بولی۔ ”جب ارزاں ملتا ہے تو کیا ضروری ہے کہ ان کی مہنگی چیزیں خریدیں۔“
سعد چمٹتی تھامے ہم دونوں کو سر اٹھائے باتیں کرتے سن رہا تھا دنیا جہان کی مصیبت اس کے چہرے پر تھی۔
یہاں متعدد پتھر تھیں۔ ایسٹ لیک بیچ، ویسٹ لیک بیچ، آؤٹ لیک وغیرہ وغیرہ۔ مگر ہمارے سامنے اس وقت سینڈ بیگس بیچ تھی۔ ہمارے اور جمیل کے درمیان ریت ہی ریت تھی۔ جہاں ریت ختم ہو رہی تھی وہاں درخت تھے۔ کچھ لوگ درختوں کے نیچے چادریں بچھائے ریت پر لیٹے تھے۔ کچھ پانی میں اپنی پینٹ کے پانچے اوپر چڑھائے چلنے نظر آ رہے تھے۔ یہ موسم وہ نہ تھا کہ وہ جمیل کے پانیوں میں گھس جاتے۔ یہاں جمیلیں اونٹار پو لیک کی فلیج میں تھیں۔ تین جانب کاؤنٹی کے پارک نے انہیں گھیر رکھا تھا اور جنوبی سمت میں یہ اونٹار پو جمیل سے مل کر کسی سمندر کی تصویر بن رہی تھی۔ شفاف پانیوں میں نیلا آسمان جمیل کے پانیوں کو بھی نیلا کر رہا تھا۔ میں جب جمیلوں کو نیلا کہتا ہوں اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ آسمان نیلا اور چمک دار تھا۔ لیک اونٹار پو کا دوسرا کنارہ نظر نہ آتا تھا۔ اس کے پار امریکا تھا۔ ساحل پر جہاں اڑاتی لہریں ایک ٹرین آتیں اور مختلف سُر میں واپس چلی جاتیں۔ آسمان پر کہیں کہیں بادل تھے اور بادلوں سے مختلف پرنندوں کے جھنڈ چلی پرواز کر رہے تھے۔

میں نے اس کے گالوں پر اپنے ہونٹ رکھے اور کہا۔
”تم بات شروع کرو پھر میں بھی کہتا ہوں۔“

وہ دوبارہ سے کھٹکا ہوا ماں کے پاس جا بیٹھا۔ نرسرین بغور یہ دیکھ رہی تھی، مجھ سے بولی۔ ”یہ تم سے کیا کہہ رہا تھا؟“

استے میں مدد نے اپنے دونوں ہاتھ ہاتھوں کے کھٹکوں پر رکھے اور بولا۔ ”انگل کہتے ہیں کہ میں تمہاری ماما کو کچھائوں گا کہ وہ ایران واپس نہ جائے۔“ پھر ماں کی

انہیں اچھل کر چھوٹا چاہتا تھا۔ اسنے سارے تو میری کلاس میں کسی نے نہیں دیکھے ہوں گے۔“

وہ جوش میں بہت کچھ بتا رہا تھا۔ میں نے بڑھ کر اسے اٹھالیا اور اس سے کہا۔ ”تمہاری ماما تو کہہ رہی تھیں کہ سعد اتنے پرندے دیکھ کر ڈر گیا ہوگا مگر میں نے کہا میرا دوست تو بہت بہادر ہے۔ وہ کسی سے نہیں ڈرتا۔“

وہ مجھ سے کہنے لگا۔ ”آپ ماما کو یہ بھی سمجھائیں کہ میں بڑا ہو گیا ہوں۔ مجھے ڈر نہیں لگتا۔ ڈرنا تو ماما کو خود لگتا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ آپ کی ماما کو یہ بھی سمجھا دیں گے کہ سعد بڑا ہو گیا ہے۔“

پھر مجھ سے کہنے لگا۔ ”مجھے نیچے تاروں میں بڑا ہو گیا ہوں۔“ ہم واپس اسی جگہ آئے جہاں بیٹھے تھے۔ دھوپ ریت پر چمک رہی تھی۔ فرین نے پوچھا۔ ”کچھ کھانا ہے؟“

میں نے انکار کیا تو بولی۔ ”صبح سے ایک سوسہ کھایا ہے۔ کچھ تو لے لو۔ اس وجہ سے تمہارا وزن بھی گر گیا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”شام کے بعد مگر جا کر کھاؤں گا۔ اب ٹریک پر چلتے ہیں۔“ ہم چادر پر بیٹھے تھے۔ اس نے زبردستی چائے کا کپ اور ایک سینڈویچ مجھے تھما دیا۔

ہم اپنا سامان بیچ چادر پر چھوڑ آئے تھے۔ یہاں نہ کوئی آپ کا سامان چوری کرتا ہے اور نہ ہی اس کے قریب پھنکتا ہے۔ اگر کوئی چیز گری پڑی لے تو پہلے وہ اسے اٹھائے گا ہی نہیں اور اگر اٹھایا تو سیدھا سیاحتی سینٹر کو جائے گا۔ یہ بھی نہیں کہ کوئی چوری چکاری نہیں ہوتی۔ میں صرف عموں بات کر رہا ہوں۔

وہ زیادہ لمبا ٹریک تھا۔ غالباً ڈیڑھ دو کلو میٹر طویل ہو گا۔ پیدل آنے جانے کا راستہ تھا تھا۔ ہم تینوں اس پر چلتے جا رہے تھے۔ سعد بھی چھتری سنبھالے ہمارے پیچھے چلتے تھا۔ ٹریک پر درخت بھی تھے اور آس پاس کہیں نہ کہیں بڑے بڑے درخت تھے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ میرے لیے وہ ایک عجیب منظر تھا۔ میں خود ریگستانی علاقوں کا رہنے والا ہوں مگر کسی صحرا کے پہلو میں بیٹھے پانیوں کی سینکڑوں میل لمبی کوئی جھیل نہیں دیکھی تھی۔ میں نے گلستان میں چشمہ اور سمجھور کے درخت تو دیکھے تھے مگر جنگل زرد اور گلابی پھولوں بھری نہ دیکھی تھی۔

خطے پانیوں سے ٹکرا کر اٹھنے والی ہوا شادابی سے جلتی تھی۔ ہماری جانب آتی تھی۔ ہم کیا پھول بھی مگر رہے تھے۔ پاؤں ہمارے ریت میں دھسنے اس لیے نہ تھے کہ چلتے والوں نے ریت کو بھی دبا دیا تھا۔ راستے میں ایک لمیلے کے اوپر جگہ

ہمارے بائیں جانب ریت کے اونچے اونچے ٹیلے تھے۔ یہ کسی صحرا کا نقشہ پیش کرتے تھے۔ ایسا صحرا جس میں درخت بھی ہواؤں سے جھومتے تھے۔ مجھے کسی نے بعد میں بتایا کہ جب تیز ہوائیں چلتی ہیں تو اس صحرائیں بگولے بن جاتے ہیں۔ مجھے یہ اشتیاق رہا کہ کسی لمبی جھیل اور لمبی بگولوں کی ایک ساتھ میں تصویر کشی کروں۔ جھیل کا

کے ساحل حصہ ان ریتیلے ٹیلوں کی وجہ سے آنکھوں سے چھل تھا۔ درمیان میں اونچے اونچے ٹیلے تھے۔ اچانک لوں کے پیچھے سے جڑاروں پرندے ایک ساتھ آسمان کی

اب بلند ہوئے۔ ان کے پروں کی سرسراہٹوں سے لہروں کی گونج بھی دب گئی۔ ایسا لگتا تھا کہ آسمان سیاہ ہو گیا ہو۔۔۔

کینیڈین پکس (مرغا پیاں) تھیں۔ جنوبی امریکا کے ملک ہٹائن اور چلی سے لاکھوں کی تعداد میں پرندے ہجرت کر

تے امریکا اور کینیڈا پہنچتے ہیں۔ ان کے آنے کا موسم شروع ہوتا تھا۔ اتنی زیادہ مرغایوں کو دیکھ کر اور ان کی کیس کیس کا

ورن کر ہم دونوں دم بخود تھے۔ تاہم وہ ہمارے اوپر سے گزرتے تھے۔ کسی اور جگہ بیٹھنے کے لیے گزرتے رہے۔

اب سماں انہوں نے باغ دیا تھا۔ وہ اب چلی پرواز کر رہے تھے۔ جیسے ہمارے سروں پر سے گزر رہے ہیں۔

ان کے پروں کی چمپ چمپ ہمارے کانوں کے قریب بھی اور پیچھے میں چھوتے تھے۔ ان کا ٹھیک جھیل کے شرمی اور

پانیوں میں پرواز کرتا نظر آتا تھا۔ لہروں کی زبردست کے ساتھ ان کی پرواز ایک حلاطم کی طرح دھنکی تھیں۔ فرین نے

پتھر تو گھبرا گئی اور مڑ کر سعد کو تشویش سے دیکھنے لگی۔ وہ ڈر گئی تھی کہ کہیں ڈانٹا سارے پرندوں کی طرح اسے اچک نہ لیں۔

میں نے اسے تسلی دی کہ کسی جراثیم پارک میں نہیں بلکہ لہو انسانوں سے بھری ایک جھیل کے ساحل پر ہیں۔ اس کی تسلی نہ ہوتی تھی۔ وہ میرا ہاڈ پکڑ کر بولی۔ ”پلیز واپس

چلتے ہیں سعد ڈر رہا ہوگا۔“ ہم انہی لہروں پر چلتے ہوئے واپس ہوئے۔ اس کی

حال میں تیزی تھی۔ بیٹے کی وجہ سے اس کا دل دہل رہا تھا۔ ہم واپس پہنچے تو سعد دور سے ہمارا جھانک رہا تھا۔

اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وہ لمبے لمبے سانسوں میں چیخ کر بتا رہا تھا۔ ”آپ لوگوں نے یہ پرندے دیکھے ہیں؟“

پھر نے اس کو لے میں بتایا تھا۔ یہ کینیڈین مرغایاں تھیں۔ یہ کینیڈا کا قومی پرندہ ہے۔ یہ تو بہت سارے تھے۔

میں اپنے دوستوں کو بتاؤں گا۔ یہ تو بہت اچھے تھے۔ میں

بتا تھا مگر اس کی محبت اتنی شدید تھی کہ میں موم بن گیا۔ میں ان لہروں کا اپنی کیفیت کا کوئی جواز نہیں دوں گا۔ میں

اعتراف کرتا ہوں کہ اس نے مجھے توڑ دیا تھا۔ میں اتنا مضبوط تھا جتنا جھٹکتا تھا اور نہ ہی مجھے اتنا مضبوط بن کر دکھانا

تھا۔ میں ایک کمزور انسان تھا اور کمزور رہی رہتا چاہتا تھا۔ میں اپنے اندر سے مطمئن تھا نہ مجھے کوئی اعتراف گناہ تھا اور نہ

احساس ثواب۔ میں ایک سرشاری کے عالم میں تھا اگر یہاں ہم تھا

ہوئے تو میں اسے اپنے لگا لیتا۔ اسے اپنی روح میں اتار لیتا۔ وہ جو مجھے دیکھ کر اپنا جود ہی بھول جاتی تھی۔ اسے

اپنے پر اختیار نہ رہتا تھا۔ میں کیسے اسے نظر انداز کر دیتا۔ ہماری خاموشیوں نے اختا کچھ کہہ ڈالا کہ ہمیں سننے سنانے

کی ضرورت ہی نہ رہی۔ میں دوبارہ سے خاموش لیٹ گیا۔ اس کے چہرے پر

شگوفے پھوٹتے تھے۔ اس کے چہرے پر سورج کی کرنیں منعکس ہوتی دکھائی دیتی تھیں۔ اس نے میرے لیے

تھرما سے چائے ایک گنگ میں اڑائی۔ ایک پلیٹ میں چند سینڈویچ دیئے۔ میں چائے پیئے لگا۔ چائے ابھی تک

گرم تھی۔ میرا کچھ کھانے کا دل نہ کرتا تھا۔ پلیٹ میں نے اسے واپس کر دی۔ اس نے ایک سینڈویچ سعد کو دیا اور دوسرا

واپس رکھ دیا۔ ہم تینوں نیچے پاؤں ساحل پر آئے۔ لہریں مجھ سے

ٹکرائیں تو ریت پاؤں تلے گدگدی کرنے لگی۔ سعد ایک اور لمبی کے بچوں کے ہمراہ ریت پر کچھ جانور اور مگر بنانے

لگا۔ اس لمبی کے گورے مرد نے مجھ سے کہا۔ ”آپ لوگ واک کریں میں آپ کے بیٹے کا خیال رکھتا ہوں۔“

جھیل کی لہروں کا پانی خشک تھا۔ خشک میرے پاؤں سے پورے جسم میں پھیل رہی تھی۔ ہمارے بائیں جانب تاحد

نظر نیلے پانی تھے اور ان پر رواں کشیاں۔ لوگ چلی کے شکار کے لیے دور دور جھیل میں نکل جاتے ہیں۔ جہاں جھیل کا افق

اور آسمان آپس میں مدغم ہو رہے تھے ہمیں وہاں بڑی جہاز نظر آ رہے تھے۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ یہ کسی جھیلیں ہیں جہاں

بڑی جہاز بھی چلتے ہیں۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا تھا کہ یہ تجارت کا پرانا راستہ ہے۔ لیگ اوتار یوسے لارڈ دریا اور پھر یہ دریا

مکراویا نوس میں جا کر گرتا ہے اور یہ سمندر تانہ امریکا اور یورپ کے بیچ ہے۔ یورپ سے اوتار یوس تک کی تجارت اسی

راستے سے ہوتی ہے۔

گردن میں بازو جھانک کر رہا ہوا ہوا۔ ”ماما اب انکل بھی کہہ رہے ہیں پلیز مت جائیں ناں۔“

فرین نے سعد سے کہا۔ ”مجھے کیا معلوم کہ تمہارے انکل مجھے جانے سے روک بھی رہے ہیں؟“ پھر میری

جانب دیکھ کر بولی۔ ”انہوں نے مجھ سے تو نہیں بولا۔“ اس کے ہونٹوں پر لمبی سی مسکراہٹ تھی۔

میں تیزی سے اٹھا اور اپنے ہاتھ بڑھا کر اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے اور بولا۔ ”پلیز اب تو مت جاؤ۔ تم

چلی گئیں تو سعد کے انکل بہت اداس ہو جائیں گے۔“ وہ گھبرا گئی۔ بولی۔ ”ہاتھ تو چھوڑو۔“

میں نے کہا۔ ”پہلے وعدہ کرو۔ تب چھوڑوں گا۔“ آہستہ سے بولی۔ ”سعد کیا کہے گا؟“

میں نے اسی آہستہ سے کہا۔ ”پہلے وعدہ دو۔“ اس نے سعد سے کہا۔ ”میں نہیں جاؤں گی مگر

تمہارے انکل کو پہلے ایک وعدہ دینا ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”کوئی بھی وعدہ لے لو۔“

بولی۔ ”وہی ایک ہی وعدہ۔“ میں نے پوچھا۔ ”کون سا؟“

سعد جواب تک تالیاں بجا رہا تھا۔ اس کی جانب محوم کر بولی۔ ”اگر یہ وعدہ کریں کہ ہمیں کبھی نہیں چھوڑیں گے۔۔۔ تب۔“

اپنا ہاتھ میرے ہاتھوں تلے سے نکال کر میرے ہاتھوں پر رکھ دیا اور بولی۔ ”تو کیا تم وعدہ دیتے ہو؟“

اس معصومی حرکت نے میرے اندر طوفان سا اٹھا دیا۔ بیوی بیچے ذہن کے کیوس پر ابھر آئے۔ بڑی مشکل

سے میں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ کے نیچے سے نکال کر مضبوطی سے اس کے نرم و نازک ہاتھوں پر رکھ دیا اور بولا۔

”ان لہروں، ہواؤں، آسمان، بادلوں اور پرندوں کو گواہ بنا کر وعدہ کرتا ہوں۔ کبھی نہیں چھوڑوں گا۔“ پھر مجھے ایسا لگا

کہ قصا ختم کی ہو، ہوا میں ٹھہری ہوئی۔ نظریں پتھر بن گئی ہوں۔ پرندے رک گئے ہوں۔ درخت ساکن ہو گئے ہوں اور کس گرفت میں بدل گئے ہوں۔

پھر جیسے فضا میں ارتعاش پیدا ہوا، ہوا میں چل پڑیں۔ نظریں کچھ اٹھیں اور کچھ جھک گئیں۔ پرندوں نے

پروازیں بھریں، درخت پھر سے جھومنے لگے اور گرفت چاہت میں بدل گئی۔ ہم دونوں کچھ نہ بھی کہتے ہوئے بہت

کچھ کہہ رہے تھے۔ میں فرشتہ نہیں ایک انسان تھا۔ میں پتھر

ماہنامہ مفسرگزشت



شاعر

سلمیٰ اعوان

برصغیر کے پہلے نوبل انعام یافتہ شاعر پر ایک مختصر
سی تحریر دلپذیر کہ اس شاعر میں ایسی کیا خوبی تھی
جس نے اسے ممتاز بنایا۔

دیگر زبان کے ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک تحفہ

راہنہ رناتھ ٹیکور سے میرا پہلا تعارف پانچ جولائی
1960 کی اس شب ہوا جس کی دوپہر کو میں ڈھاکا یونیورسٹی
کے گریجویٹ ہال میں بورڈر ہوئی تھی۔ آؤ بیورو میں ان
کا رانا چتر انگدا آج ہو رہا تھا۔ ہم جم جم کر باتیں کر رہے تھے اور
ان کی شاعری کے سنگت ڈھاکا یونیورسٹی اسٹوڈنٹس کی یہ پیش
کش حد درجہ کمال کی تھی۔

بنگالی زبان سے! میں نے اردو میں جیسو کی اردو
راہنہ رناتھ ٹیکور سے میرا پہلا تعارف پانچ جولائی
1960 کی اس شب ہوا جس کی دوپہر کو میں ڈھاکا یونیورسٹی
کے گریجویٹ ہال میں بورڈر ہوئی تھی۔ آؤ بیورو میں ان
کا رانا چتر انگدا آج ہو رہا تھا۔ ہم جم جم کر باتیں کر رہے تھے اور
ان کی شاعری کے سنگت ڈھاکا یونیورسٹی اسٹوڈنٹس کی یہ پیش
کش حد درجہ کمال کی تھی۔

راہنہ رناتھ ٹیکور سے میرا پہلا تعارف پانچ جولائی
1960 کی اس شب ہوا جس کی دوپہر کو میں ڈھاکا یونیورسٹی
کے گریجویٹ ہال میں بورڈر ہوئی تھی۔ آؤ بیورو میں ان
کا رانا چتر انگدا آج ہو رہا تھا۔ ہم جم جم کر باتیں کر رہے تھے اور
ان کی شاعری کے سنگت ڈھاکا یونیورسٹی اسٹوڈنٹس کی یہ پیش
کش حد درجہ کمال کی تھی۔

دیکھتے رہے تو مجھے بہت اچھا لگا تھا۔
وہ خاموش ہوئی تو میں نے کہا۔ ”آگے کہو۔ مجھے
تمہارا یہ سب کہنا اچھا لگ رہا ہے۔“
اس نے بات آگے بڑھائی۔ ”میں بہت سرور
ہوں۔ سب اچھا لگ رہا ہے۔ عادی نہ تھی پر وہ بھی ہو
جاؤں گی اگر تم نے مجھے ساتھ رکھا تو.....“
”تم کیا ایسے راستوں پر میرے ہمراہ چل سکو۔
گی؟“ میں نے سوال پوچھا۔
”جہاں لوں گی اگر نہ چل سکی تو فٹ رکھنے کے لیے جم
جوان کر لوں گی اور پھر بھی نہ چل سکوں تو بے شک مجھے
ساتھ نہ رکھنا۔“ اس نے اپنا عزم ظاہر کیا۔
میں بولا۔ ”وعدہ تو پہلے ہی لے چکی ہو۔“
بولی۔ ”وعدہ پہلے ہی ہو کر بار بار سننا کیوں اچھا لگتا ہے؟“
میں نے کہا۔ ”بیار کے اہڑائی دلوں میں ایسا ہی ہوتا
ہے۔ ایک ہی بات تمہارا پھر اکھٹوں میں لکھی جاتی ہے اور
پڑھی بھی جاتی ہے۔ وعدہ ساتھ رہنے کا ہو تو اس سے خوب
صورت جملہ کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ اب وعدے لے رہی ہو
اور دیکھنا کل کو وعدے یاد دلاؤ گی۔ تم نے تو پہلے کوئی پیارا
نہیں کیا مگر میں اس دشت کا پرانا مسافر ہوں۔“
یہ کہہ کر میں خود ہنس پڑا۔ پھر اسے رنجیدہ دیکھ کر کہا۔
”آج تمہارے ساتھ ہوں اور کل کا وعدہ کیا ہے۔ بس میری
اس بات پر بھروسہ کر دو کہ وعدہ پہلے ایک بار تو اٹھا مگر اب
بالکل نہیں۔“

وہ بولی۔ ”میں رنجیدہ نہیں بلکہ سنجیدہ ہوں۔ تمہارے
لیجے کی مضبوطی بتاتی ہے کہ تم پر بھروسہ کر کے میں نے بالکل
ٹھیک کیا ہے اور میں نے بولا تھا تاں کہ تم ایک وعدہ کرو اور
بانی کے سب وعدے میں کروں گی تو میرا تم سے یہ وعدہ ہے
کہ کبھی بھی تم کو تمہارا وعدہ یاد نہیں دلاؤں گی۔“
اب اس کے لیجے کی مضبوطی مجھے چونکا گئی تھی۔ اس کی
آنکھوں اور لیجے میں بلا کا اعتماد تھا۔ یہ اعتماد مجھے اتنے بڑے
گورکھ دھندوں میں اٹھا دے گا اس کا پتا نہ تھا۔ انسان کی
زندگی کتنی بے اعتباری ہے اس کا پتا اب چل رہا تھا کہ انسان کیا
کچھ نہیں سوچتا۔ کیسے کیسے پروگرام بناتا ہے مگر قسمت کی چال
سب پر بھاری ہوتی ہے۔ اس کا ادراک کچھ ہی دن میں ہو گیا
تھا۔ اس وقت نرسن کے پہلو میں بیٹھا بہت کچھ سوچ رہا تھا اور
قسمت اپنی چال چلنے کی تیاری میں تھی۔
(جاری ہے)

کو پختہ کر کے بیچ پر رکھ دیئے گئے تھے، جن کا چہرہ جمیل کی
جانب تھا۔ ہم تقریباً سو فٹ سے زیادہ کی اونچائی پر ہوں
گئے۔ نرسن بولی۔ ”کچھ دیر کو سنا لیں؟“
میں نے فوراً کہا۔ ”کیوں نہیں، ذرا آرام بھی ہو جائے
گا اور یہاں سے منظر بھی بہت خوب صورت نظر آ رہا ہے۔“
وہ ہنستے ہوئے بیچ پر بیٹھ گئی۔ میرا رخ جمیل کی جانب
تھا۔ اونچائی سے اس کا نظارہ اور بھی دلکش تھا۔ لہروں کا شور
نہ تھا مگر ساحل سے جھاگ اڑانی لہریں دور سے بھی دھکی
تھیں۔ ساحل کے ساتھ ساتھ پرندوں کے غول تھے جو چھٹی
پر داز کر رہے تھے۔ سورج زوال کی جانب رواں تھا۔
دھوپ کی شدت مدھم پڑ گئی تھی۔ ہوا کی خشکی پہلے سے زیادہ
تھی اور اسی لیے نرسن نے سجد کو جیکٹ پہنا دی تھی۔ ٹیلا
شخاف آسمان، بادلوں، برندے، جمیل اور اس کی لہریں اور
کناروں سے ٹکراتی جھاگ یہ منظر مجھے تادیر باندھے رکھتا
اگر میں نرسن کو نہ دیکھتا جو اپنی تکی دبانے سرخ ہو رہی تھی۔
میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”کیا ہوا ہے؟“
اس نے لفٹی میں سر ہلایا کہ کچھ نہیں ہوا۔
”کچھ تو کہو، اتنی ہی کیوں آ رہی ہے تاکہ میں بھی
نہیں سکوں۔“ میں نے تنبیہ کی اس سے کہا۔
وہ بولی۔ ”نہیں کچھ نہیں، کہیں تم خفا نہ ہو جاؤ۔“
میں نے کہا۔ ”بتا دیا تو غصہ نہیں آئے گا اور کچھ نہ بتایا
تو پھر غصہ تو آئے گا۔“

بولی۔ ”میں نے زندگی میں سوچا بھی نہ تھا کہ ریت
کے ٹیلوں پر میں بھی چلوں گی۔ ایسے پرندوں اور بادلوں کو
دیکھوں گی۔ میں یہی سوچ رہی تھی کہ نہ جانے تمہارے
ساتھ مجھے کیا کیا دیکھنا پڑے گا۔ لہذا مجھے ہنسی آگئی۔“
”کیا تم بور ہو رہی ہو؟“ میں نے پوچھا۔
وہ بولی۔ ”ہرگز نہیں، میں نے کبھی اتنی فراغت نہیں
دیکھی کہ ساحلوں پر مناظر دیکھنے چلی آؤں۔ جب آئی تھی تو
عجب لگ رہا تھا۔ مگر دیر سے دیرے اچھا لگنے لگا۔ خاص
کر جب تم پرندوں کو اتنی چاہت سے دیکھ رہے تھے۔
تمہارے بیویارک جانے سے دو دن پہلے جب ہم جمیل
کنارے ایک پارک میں بیٹھے تھے۔ تم مجھ سے زیادہ
نظاروں میں محو تھے۔ مجھے برا نہ لگا تھا۔ مجھے ادراک ہو
گیا تھا کہ یہ سب کچھ تمہارے لیے لکھا ہی ہے۔ پھر ہم ہمہر
پارک گئے تو وہاں بھی تمہاری ایسی ہی حالت تھی اور جب تم
میرے اپارٹمنٹ میں آ کے اور تادیر کھڑی کھولے باہر چاند کو

راہبندر ناتھ ٹیگور ایک نظر میں

پیدائش: 7 مئی 1861ء کلکتہ

موت: 7 اگست 1941ء کلکتہ

معروف مجموعہ: گیتا گنجی

نوبل پرائز: 1913ء

دینی: گہائی کار، شاعر، موسیقی کار، ڈراما نگار، معصوم

مادری زبان: بنگالی

اہم تصانیف: گیتا گنجی، گورا، گھرے باہرے، جن

کمن سن، راہبندر شکتی، آمار شور نار بنگلو وغیرہ۔

ہیری: مرنائی دیوی (1883-1902)

بچے: پانچ (دو بچنے میں مر گئے)

راہبندر ناتھ ٹیگور کی نظم "جن کمن سن" کو بھارت کا

قومی ترانہ بنایا گیا۔ "آمار شور نار بنگلو" امی تو مائے بھالو

پاشی" کو بنگلہ دیش نے قومی ترانہ بنایا۔ شری لکا کا قومی

ترانہ بھی ٹیگور کی نظم سے اخذ کیا گیا۔

محسوس کرتے ہوئے وہ بولی۔ "راہبندر ناتھ ٹیگور چودہ بہن

بھائی تھے اور وہ تھا گھر گرانے کا آخری بچہ تھا۔"

فنی اپنے سامنے ایک موٹا سارسالہ کھولے پڑھتے

ہوئے چوکی تھی۔

"تو اس میں کون کی تعجب کی بات ہے؟ میری نانی کے

گیارہ بچے تھے۔ پرانے وقتوں میں بچوں کا یہی حساب کتاب

ہوتا تھا۔ ہاں تم ٹیگور کو پڑھ رہی ہو۔"

"ہاں آسانتھ بھائی ہے۔"

میری دلچسپی دیکھتے ہوئے اُس نے بلند آواز میں پڑھنا

اور بتانا شروع کر دیا تھا۔ مہینہ بیکار تھا۔ تاریخ سات اور سال

1861ء کلکتہ شد بد گری اور جس کی لپیٹ میں ہے۔ شہر کے

قدیمی علاقے جوڑا سا کوئی ایک معزز شخصیت دیپندر ناتھ شاکر

کے گھر چودھواں بچہ پیدا ہوا ہے۔ اس نے رسالے کا ایک صفحہ

کھولتے ہوئے میری آنکھوں کے سامنے کیا۔ "یہ ہے وہ

گھر۔"

ایک عظیم الشان دو منزلہ کلاسیکل طرز تعمیر کی حامل

عمارت جس کی بلند و بالا کمر بندیوں کی لمبی آہنی سلاخوں اور چوٹی

پٹوں نے بڑی انفرادیت دے رکھی تھی۔ درختوں اور پھول

پتوں سے گھری کشادہ آئینہ دار والی شاخاں پاؤں۔

ٹوپی اور کمار پٹی والا صبر دار مغلیہ اسٹائل کا کفر اک پہنے

دیپندر گھر سے تعلق کے باوجود لاہور سینما میں چلنے والی ہر فلم

کے پہلے شیش سہیلیوں کے ساتھ گھر میں میلا دمی کی محفل،

قرآن خوانی کی کسی تقریب میں شرکت کے بھانے ہلے ہونے

میں مشہور۔ نتیجاً کئی سال بچے اور میری بھانے کا پر سرے اتر کر

گلے میں چھوٹا۔

قواب جب روک ٹوک ہی کوئی نہ تھی تو فاختہ سے چار

قدم آگے ہی چلنا تھا۔ تھی تو فنی بھی ایسی ہی مگر پڑھائی پر سمجھوتا

نہیں کرتی تھی۔

"چنڈا لیکا" وہ ڈراما تھا جس کا شمار پورے دودن کی

جیز لٹنے کی صورت میرے دل و دماغ پر چھایا رہا۔

"میری بات سنو۔"

کچھ نہیں اُگے کنول کی کوئی ذات نہیں ہوتی ہے۔ بیک

مگر اڈھ میں ٹیگور کی ایک نظم کے مصرعے سے شروع ہونے

نے ازلے ڈرامے کا مرکزی خیال چھوٹ چھوٹ کے نظریے کی

مہارت اور پیار و محبت آفاقی جذبہ ہے جیسے پیغام کا طبردار تھا۔

کمال کی پیشکش تھی۔

"کال مر گیا۔" ڈرامے کی پیشکش جین ناتھ ہال کے

اسٹوڈنٹس کی طرف سے اوپن ایئر میں ہوئی تھی۔ "ڈاک گھر"

اور "ملکا دھارا" دونوں ٹیلی ایڈیٹی میں دیکھے۔

راہبندر شکتی کے مقابلے جب جب ہوتے۔ فنی

فنانی اور چل پڑتی۔ ٹیلی ایڈیٹی میں ہی میری ملاقاتیں ڈاکٹر

لطف النساء سے بھی ہوئیں جس نے ٹیگور پر ڈاکٹریت کی بھی

اور جو بھائی ڈاکٹر تھے۔

ٹیگور کے بارے میں اُس نے کسی ایک سے کسی ایک

وقت میں نہیں بلکہ مختلف اوقات میں مختلف لوگوں سے مختلف

گھروں میں سنا۔ میں انہیں لکھتی تھی۔ یہی لکھے ہوئے کاغذ

ڈھاکا یونیورسٹی سے فارغ ہونے کے بعد میرے ساتھ لاہور

چلے آئے تھے۔ انہی سنبھالے ہوئے گھروں کو میں نے کھولا

ہے۔

7 نومبر 1969ء

ہوا میں ہلکی ہلکی ہنسی کا دھیرے دھیرے اضافہ ہو رہا

ہے۔ اوپر تلے کی کلاسوں نے تھا دیا ہے۔ میں نے بیڑ پر شرم

دھار ہوتے ہوئے چادر کو اپنے اوپر ڈال لیا اور آنکھیں ڈرا

کام کی غرض سے سو نہی ہیں۔

بھی فنی کی "باپ دے باپ" کی آواز نے چوٹ کا دیا

ہے۔

"کیا ہوا؟" میری آنکھوں میں استغما یہی علامات

فضاؤں میں سردوں کے راز کھولتی تھیں۔

مجھے محسوس ہوا تھا پوکر (تالاب) کا بکھورے لیتا پانی

جیسے ہواؤں میں بکھرے ستر گیت کی قسم کی پروچرے دھیرے

بہتر تر کر رہا ہو۔ کیسا موہ لینے والا منظر تھا جو بندے کو بل بھر

میں تھکیت کر کسی ظلمی دنیا میں لے جاتا ہے۔ بنگال کو جس

فطرت کی سر زمین، گیتوں کی دھرتی، سردوں کی دنیا ایسے تو نہیں

کہا گیا۔ یہی جادو ہے بنگال ہے۔ سحر آفرین گیت کے بول،

اس کی غنائیت، آواز کا کوچ اور اس جیسے میرے اندر اتر کر

میرے ریشے ریشے میں اُٹھل سا جاتا تھا۔

طلعت کی خواہش سورت مستورہ جو ایک تلے والے

میرے طور پر دم نمبر 28 میں رہتی تھی۔ مٹی سے اتر کر میرے

پاس آئی۔ آتے جاتے میری اس سے ابھی پیلو ہائے رہتی

تھی۔ بنگالی گیت میں میری اپنی دلچسپی اور انہماک دیکھ کر اس

نے پہلے انگریزی میں مجھے اس کا ترجمہ بتایا۔ بتایا کیا ابھی

طرح سمجھا پھر لکھتے ہوئے ایک اور گیت گایا۔

جودی تو رڈاک سے کیوندا آئے

تو بے لکھا چولہ لکھا چولہ لکھا چولہ

اس کا بھی مطلب سمجھا اور ساتھ ہی میں نے جانا کہ یہ

ٹیگور کے گیت ہیں۔ یوں ان تین ماہ میں مجھے بنگالی کی کچھ شہ

بدھ ہوئی تھی۔

اب میری شاہیں اکثر و بیشتر پوکر کنارے گزرنے

لگیں۔ لڑکیوں سے ٹیگور اور نڈرل اسلام کے گیتوں کو سننے،

بحث مباحثہ کرتے، اپنے کمرے میں ٹرانسکرپٹ پر بھی لکھی

بدھم آواز میں ان گیتوں سے محفوظ ہوتے اور کامن روم میں

ٹی وی پر پرشش چہرہ کو ان شاعروں کے منتخب کلام کو سناتے

دیکھتے میں دونوں شاعروں میں فرق سمجھنے لگی تھی۔ ٹیگور کی

شاعری میں موسیقیت کے جوہر پر سے رواں رہتے تھے وہ

اپنے سامع کو اپنے ساتھ بھانے پر مکمل قدرت رکھتے تھے۔

ٹیگور سے محبت، اس کے بارے میں جاننے اور اس کی

شاعری سے واقف ہونے، اس کے ڈراموں اور نظم

ڈراموں کا شوق بھی مجھے اسی زمانے میں ہوا۔ فنی اور فاختہ

دونوں نے اس شوق کو ہمیز دی۔

فاخرہ ڈراموں کی بھوک تھی۔ چوٹی ٹیلی ایڈیٹی یا

کبیں اوپن ایئر میں ٹیگور کا کوئی ڈراما سناجھ ہونے کی ہنک اس

کے کانوں میں پڑ جاتی۔ بس لٹنی (بے چینی) لگ جاتی۔ اب

کوئی ٹیٹ ہے۔ کوئی آسانتھ دینی ہے۔ وقت کم ہے۔

کوئی فکر نہیں۔ لٹنی تھی پوری۔ میں اس سے بھی بڑی لٹنی کر

ہے۔ پٹ سے آنکھیں کھولیں۔ میری روم میٹ حبیب فاطمہ

جو فنی کے نام سے پکاری جاتی تھی۔ اپنی رائیگ نیکل پر چھوٹا

سائرسسٹر رکھے اس میں سے نکلتے بولوں میں ڈوبتی ہوئی

تھی۔ پوچھنے پر جانا کہ ٹیگور کی نظم ہے۔ کانے والی کلکتہ کی کوئی

گلوکار ہے۔ تھوڑا سا مطلب بھی جانتی تھی۔

آسمان کے سوا چھبیں اے سورج

اور کون اپنا سکتا ہے

میں تو تمہارا سہارا دیکھ سکتی ہوں

خدمت نہیں کر سکتی

فنی میں اکیس سال کی انتہائی شوخ و شگ، لا آباہی سی،

بہنو لڑکی جو فاختہ کی طرح بنگالی ادب میں ایم لے فاضل میں

تھی۔ دونوں کلاس فیوٹھیں۔

اکثر و بیشتر فنی کمرے میں چلتے پھرتے گنگنا کرتی

باگلا مانی

باگلا جل

امار شور نار بنگلو

ای تمہارے بھو پاشی

یعنی بنگال کی مٹی، بنگال کا پانی، میرا سہرا بنگال، مجھے

تجھ سے محبت ہے

مجھ جی لڑکی مطلب جان کر محفوظ ہوتی۔ یوں بھی

ریڈیو، کبھی ٹی وی پر بھی ایسے فنی جنہیں راہبندر شکتی کہا جاتا

ہے سننے کو ملتے۔ یہ دل کے ساتھ ساتھ روح کو بھی مسرور کر

دیتے۔ تاہم اس پیاس کو اس وقت سے بڑھا دیا تھا جو مجھے

آخر اکتوبر کے ایک دن پیش آیا۔

اس فصول خیزی و صحتی شام کے منظر نے میرے

قدموں کو ساکت کر دیا تھا کہ میں اتفاقاً تقریر ہال کی مرکزی

عمارت کے صحنی لان میں بیٹے پوکر (تالاب) کی جانب نکل

آئی تھی۔ تقریباً تین ماہ سے ایر آلود آسمان اور دھواں دھار

بارشوں کے نظاروں کی عادی آنکھوں کو اب ڈھاکا کے آسمان

کو گھرا ہوا دیکھنا جہاں ایک جانب پھولتی شفق کے لال لکھال

رنگوں نے آگ سی سلا دی تھی۔ ڈھنکی طلائی کروں کی دم

توڑتی فضاؤں میں نہاتے، ہستے، مسکراتے سانولے سلونے

چہروں والی لڑکیاں جن کے گھٹاؤں جیسے کھلے آوارہ ہال،

کبیں اُن کے سینوں، کبیں بازوؤں اور کبیں پشت پر بکھرے

رہتے اور شیش ناگوں کا سا تاثر ابھارتے تھے۔ آدمی آجیوں

والے بلاؤز میں پھنے بازو چند ہاتھوں میں تھاے

نوکا (شٹی) کھیتے تھے۔ سترم آواز میں گیتوں کی صورت

ماہنامہ معرگزشت

چودہ سالہ خوبصورت لڑکا بھی فتنی نے دکھا دیا تھا۔

گھر میں رابندر ناتھ کی بجائے رانی (سورج) کے نام سے پکارا جانے والا یہ بچہ بچپن ہی سے بڑا متحرک اور عجیب سی عادات کا حامل تھا۔ بچے کی حرکات و سکنات بتاتی تھیں کہ ذہانت و فطانت میں غیر معمولی ہے۔ روایتی تعلیم سے اسے کوئی رغبت نہ تھی۔ اسکول داخل کر دیا تو بھاگ کر گھر آ گیا۔ سرے سے ہی منکر ہو گیا کہ اسکول تو جانا ہی نہیں۔ میرا تو وہاں دم گھٹتا ہے۔ مجھے تو مٹی ہوتی ہے۔ اور نیشنل سینیاری کے بعد ریگال اکائی کی اور پھر مشہور زمانہ سینٹ زیوڑس میں بھیجا گیا مگر کسی جگہ بھی یہ فطنت بچہ نکلنے کا نام نہ لے رہا تھا۔

کیسا بچپن تھا جو کھلونوں سے محروم تھا۔ کھلونوں سے کھیلنے ہی نہیں دیا گیا۔ سارا دن گھر کی چار دیواری میں رہتا۔ باہر نکلنے کا تب نہ رواج تھا اور نہ اجازت ملتی تھی۔ ٹیکور گھرانے کے اصول بڑے پختہ اور سخت تھے۔

فتنی نے میری طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔ ”کیا یہ غیر فطری نہیں کہ آپ ایک بچے سے اس کا بچپن ہی جچیں یس؟“

میں چپ تھی، کہیں خیالوں میں ڈوبی کچھ سوچ رہی تھی۔

فتنی نے سلسلہ گفتگو پھر جوڑ دیا۔ اس بچے کے لیے باہر کی دنیا سے کٹاؤ کیسا محسوس ہوتا ہوگا۔ بڑے کمرے کی گھڑی سے باہر راگبیروں کو چلتے پھرتے، پھیری والوں کو سودے کے لیے بھاگتے لگاتے دیکھتے اور سننے، گاڑیوں کو دوڑتے بھاگتے، آسمان پر اڑتے پرندوں، بادلوں کو جھومتے، راتوں کو گھر کی چھت پر چاند اور ستاروں کو دیکھتے، اُن سے باتیں کرتے وہ سوچ و فکر کی کن دنیاؤں میں رہتا تھا۔ اُس کا احساس صرف اُسے تھا۔

یقیناً یہ اس کے احساسات ہی تھے کہ جب اس نے بچوں کے لیے انظمیں لکھیں تو Bichitr saadh بھی نظم میں ایک چھوٹے سے طالب علم کے جذبات و احساسات میں اُن کا بچپن ہی تو بولا ہے کہ جہاں بچہ نہیں پھیری والا، نہیں بارش کا مالی اور نہیں پہرے دار بننے پر چلتا ہے کہ یہ سب کردار اپنی مرضی کے مالک اور کسی کے پابند نہ تھے۔ ذرا ایک بند دیکھیے۔

ایک پھیری والا سر پر اپنی ٹوکری لیے دیتا ہے صدائیں چوڑیاں لیتا اس کا دل جہاں جانا چاہے جاتا ہے وہ

ماہنامہ سرگزشت

لوٹ کر بھی اپنی مرضی سے گھر آتا ہے وہ اس کو کیا پروا گھڑی میں دس بجیں یا ساڑھے دس اس کو جلدو دیر سے کیا، اس کو کسی پیش دہش ایسے میں دل چاہتا ہے سلیٹ اپنی پھینک دوں پھیری والا بن کے گلیوں میں بوٹی پھرتا رہوں ہم دونوں ہلکھلا کر بس بڑی تھیں۔ سچ تو تھا کہ ایک عظیم انسان کے بچپن کے اس پہلو نے نکتہ سرور کیا تھا؟

فتنی ابھی کچھ اور بڑھنے، بچنے سنانے اور ٹونگ کرنے کے موڈ میں تھی۔ مگر ہر اس کے نام کی پکار تھی۔ دریاں لڑکا کہتا تھا۔ ”آیا آپ کا کوئی بڑا“ وہ ساڑی کا پلو ٹھیک کرنی اور چپل کھینچ کر باہر نکلی۔

15 نومبر 1969ء

اس وقت ذرا بڑھ چکا ہے۔ ڈیڑھ گھنٹہ سے واپس آ کر ابھی میں نے کمرے میں کتا نہیں اپنی مٹی میز پر رکھی ہیں کہ جب قاخرہ کی آواز سنائی دیتی ہے۔ گھر بڑھ رہی ہیں کھڑے کھڑے اُس نے دروازے کا کٹ ڈراما کھول کر اندر جھانکتے ہوئے پوچھا ہے کہ مجھے کھانے کے لیے جانا ہے کیا؟

میں نے ساڑی بدلنے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے اس کے ساتھ چلنے کو ترجیح دی ہے۔ لیے کو بیڈروم میں چلے ہوئے اس نے بتایا ہے کہ آج گیارہ کے بچپن پر ایک کتاب اُسے لاہری سے ملی ہے۔ اتنی دلچسپ ہے کہ لاہری میں بیٹھے بیٹھے اُس نے آدمی سے زیادہ بڑھ گئی ہے اور اُسے ایٹو کروا کے لے بھی آئی ہے مکالم کی گئی تھی۔

اور جب ہم دونوں بھات ماچھ (پھل چاول) کھاتی تھیں۔ وہ بولی تھی۔ گہرا دکھ اور تاسف اس کے لہجے میں گل گل کر باہر نکلتا تھا۔

”اب کون آج کی اندھا تعصب رکھنے والی اس بیگالی نسل کو سمجھائے کہ وہ جو بیگالی ادب کا باپ ہے جس کی عالمانہ عظمت اور شاعری کا اعتراف ایک دینا نے کیا۔ اُسے عربی فارسی پر کتنی دسترس تھی اور وہ حافظ کا کتا بڑا عاشق تھا؟ نہ صرف وہ بلکہ اُس کا باپ دیپندر ناتھ بھی اپنی مادری زبان بیگالی کے علاوہ، انگریزی، عربی، فارسی اور سنگرت میں غیر معمولی دسترس رکھتے تھے۔ حافظ شیرازی کے دلدار تھے۔ ان کی بیگالی سوانح عمری میں حافظ کے اشعار جا بجا موتیوں اور گینوں کی طرح سے نظر آتے تھے۔

یوں بھی ٹیکور خاندان لباس، آداب، نشست و برخاست اور بود و باش میں مسلمانوں، اُن کی تہذیب، اُن

فروری 2018ء

138

کے فنون لطیفہ سے متاثر اور بہرہ ور ہونے کے ساتھ ساتھ ایک خصوصی نسبت اور تعلق رکھتا تھا۔ اُس گھرانے کی ایسی ہی وجوہات پر ہندوانوں کو ”دھریوں“ اور ہندو متا مسلمان سمجھتے اور کہتے تھے۔

باپ نے اپنا کمال فن بٹے کو چھوٹی عمر میں ہی دینا اور اُسے مشرقی علوم میں طاق کرنے کا کام شروع کر دیا تھا۔ بلوغت تک آتے آتے اُسے ان زبانوں پر دسترس حاصل ہو چکی تھی۔

پہلی مسور کی دال والی پلیٹ اٹھا کر قاخرہ نے منہ سے لگائی۔ دو تین گھونٹ بھرے اور دھکی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”اب ذرا تھکی جا تو۔ تو۔ حب اور اب کا۔ وہ اگر انقلاب کا زمانہ تھا تو یہ وقت کیا ہے رختا نکت کو اپنے اندر سمیٹے اور وہ تھیں دینے کا تھیں؟ وہ کیا بیگالی نہیں تھے؟ تھے مگر صاحب ظرف تھے اور یہ بنگلہ کے پرستار جو اردو کا گلا گھونٹ دینے کے متحمل ہیں۔ Son of the Soil کے نعرے لگاتے ہیں اُن کا منہ چاہے قصورورہ گیا ہے۔“

شام کو پوکر کنارے میں اُس سے ”میرا بچپن“ کے بارے میں رہی تھی۔

میں پہلی بھر پوری یاد جس رخ سے سامنے آتی ہے وہ شہر ہے کلکتہ شہر کا قدیم ترین حصہ جہاں شاعر نے نظم لیا تھا۔ جہاں بس موزوں ڈی، فرائم کچھ بھی تھا۔ چمکے سارا دن گرد و غبار اڑتا اور گھوڑوں کی گنگی بیٹنیوں پر کچھوان تازہ توڑ چاکوں سے جلے کرتے تھے۔ غور توں کا انداز باہر جانام گھٹا دینے والی پالکیوں میں ہوتا۔ اگر کوئی عورت احبابک غیر مرد کے سامنے آ جاتی تو اس کا گھونٹ فوراً آدھ لڑنے لگتا آ جاتا۔ گھر کی ڈوبڑی پر بیٹھا دریاں پورے گھر کی گھبائی کرتا۔ ان کرداروں کی تفصیل بڑی دلچسپ تھی۔

شہر میں نہ گیس تھی نہ بجلی۔ جب مٹی کے تیل سے روشنی ہوتی تو پہلے پیکل اسے بھی دیکھ کر ہراساں ہوتی۔ جب گھروں میں نوکر رانڈی کے تیل کے دیے جلاتے۔ جس کمرے میں ہم پڑھتے وہاں دو تیلوں کا ایک دیاد دیوت پر جگمگا

ماسٹر صاحب ٹھٹھائی روشنی میں ”پہلی کتاب“ کھولنے کا کہتے۔ پہلے تو میری جھانپاں شروع ہوتیں۔ پھر آنکھیں کبھی بند ہوتیں اور کبھی کھلتیں۔ اب ماسٹر صاحب کی چونکا دے دے لفظوں میں اس کا فلاں شاگرد پڑھائی میں اتنا ہوشیار فلاں لکھنے میں اتنا تیز تھا۔ فلاں کو بتا (شاعری) پڑھنے میں سوتا۔ ایسی سب باتیں میرے سر پر سے ہوا کے کسی جھوکے کی طرح

ماہنامہ سرگزشت

139

گزر جاتیں۔

ان یادوں کا ایک اہم کردار بروجیو بڑے دلچسپ انداز میں سامنے آتا ہے۔ ٹیکور کی زبان میں کہ وہ منظر اعزاز بچوں کی دیکھ بھال یعنی کھانے، پہنانے اور ہمارے دیگر جملہ امور کی نگرانی کے لیے لایا گیا تھا۔ اس کی طبیعت بڑی لالچی تھی۔ ہماری تھالیوں میں بھی کھانا پر دس کر نہ رکھتا۔ جب کھانے کو بیٹھتے تو ایک ایک پوری کو دور سے ہاتھ میں گھماتا ہوا دیتا اور پوچھتا کہ ”اور چاہیے۔“

یہ ”اور چاہیے“ جس لب و لہجے میں کہتا اُس کا ایک ہی مطلب ہوتا۔ بس کروا۔

میں تو بالعموم یہی کہتا۔ ”نہیں اور نہیں چاہیے۔“

میرے دو دھ کے کٹورے پر بھی اس کی حریصانہ نظریں... منڈلائی ہی رہتیں۔

یہ کم کھانا بھی کچھ کھائے گا سودا نہ رہا کہ زیادہ کھانے والوں سے مقابلے میں توانائی میں کمزور نہ تھا۔

اس طاقت اور توانائی کا ثبوت اس بات سے ملتا تھا کہ جب جب اسکول سے بھاگنے کو جی چاہتا۔ منصوبہ بندی میں کوئی بھی بیماری مثلاً زہر، دکام، کھاسی، بخار وغیرہ بھی ماتھے پر آنکھیں رکھ لیتیں۔ ٹھنڈا دکھائیں۔ اب انہیں بلانے کے لیے میرے طرے نشیں، گھنٹیں پانی پی بھیج دیا ہوا جوتا پہن کر دن بھر گھومتا، کانیک کے سینے میں کھلی چھت پر سوتا۔ مجال جو اُسے کچھ پڑا سا بھی رحم آ جائے۔ مجال تھا جو کچھ ہو جائے۔

کہانیوں کے سننے کا چمک اُن کی طلسماتی دنیا، میرے خواب اور سوچیں۔ پہلی بینک بروجیو کے پاس جتنی۔

رامائن سننے سننے کشوری چاٹو بے آ جاتا۔ اُس سے رامائن کھا نظم کی صورت سننی جاتی۔ اس کے گلے سے سخن کی لڑیاں جہروں کی سی اٹھکیاں اور ٹھٹھیں کرنی بہتیں۔ یہ محفل جب ختم ہوتی میں ماں کے کمرے میں جاتا۔ ماں اُس وقت اپنی کاکی کے ساتھ تاش کھیل رہی ہوتی۔ میں جاتے ہی شور مچانا شروع کر دیتا۔ وہ فوراً ہاتھ کے پتوں کو بھینکتے ہوئی کاکی سے مخاطب ہوتی۔ ”لے جاؤ اور کہانی سناؤ اُسے۔ جب تک یہ سو نہیں جائے گا اس کا نفل غلاؤ ایسے ہی رہے گا۔“

ہم لوگ برآمدے میں رکھے لوٹے کے پانی سے پاؤں دھو کر نانی کو بستر پر تھمت لاتے۔ اب دیوڑوں کی کہانی، راجگاری کی کہانی کب تک چلتی۔ میں تو کہیں خواہوں کی دنیا میں چلا جاتا۔ کہانی ہمیشہ میری کمزوری رہی۔ یہ دن میں بھی جب میں اکیلا ہوتا میرے ساتھ رہتی۔ کبھی پانگی میں، کبھی

فروری 2018ء

جاسوسی ٹیلیسٹ



فروری کے موسم کی بے خودی

جاسوسی کے شمارے کی بڑھتی روشنی

اولین صفحات

بے وفائی کے ماحول میں دقا دقا ساعتوں کی نذر ہو جانے والی خوشیوں کا نوحہ..... دہشت اور وحشت کا سسٹی خیز کراؤ..... **زویا اعجاز** کے قلم سے ان مٹ سچائی کا احوال.....

انکابے

دشمنوں کے شکنجے میں آہنی اعصاب کے مالک چیپٹن کا امتحان..... محبت اور جنگ کی نصف میں آگے بڑھتا **ظاہر جاوید مغل** کے یادگار سلسلے کی ایک اور کڑی

آوارہ گرد

چلچلاتی دھوپ میں ہر دم ایک نئی مصیبت سے برسر پیکار نوجوان کی سرگزشت..... **عبدالرب بھٹسی** کی سلسلہ دار کہانی

سروق کے رنگ

خوابوں کی سرزمین پر ایک ساتھ قدم رکھنے والے دوستوں کا انجام..... سروق کی انوکھی تحریر زہرینا کوئی پسند نہیں کرتا..... مگر زندگی کی حقیقتوں کا زہرینا ہی پڑتا ہے..... سروق پر ایک عجیبی کہانی

چینی تکتہ جینی

اُسے اپنے سینے پر رکھا
اس کا کاندل میں جھک گیا
شام ڈھلی تو میں نے دیکھا
پھول ٹٹھل حال تھا پرورد بانی تھا
ایک سے ایک بڑھ کر حسن اور خوشبو میں
تجھ میں پھول تو بہت پیدا ہوں گے
مگر میری کل چھٹی کا وقت
بہت عرصہ ہوا کہ ختم ہوا
اور اب جب کہ رات طاری ہے
گل نہیں پاس مگر درد بانی ہے
10 دسمبر 1969ء

ڈاکٹر لطف النساء سے تعارف فنی کے توسط سے ہوا تھا جس کے ساتھ میں اکثر ڈرامے دیکھنے اور گیت سننے آتی تھی۔ اس وقت دبیر کی آداس ی شام میں بلبل اکیڈمی کے ٹھنڈے ٹھار بھائیں بھائیں کرتے کرتے ایک عجیب سیاس فضا میں پھیلا رہے تھے۔ دو کمرہ میں کچھ لوگ نظر آئے تھے۔ ایک میں شاید کوئی ڈراما مارا کا سلسلہ تھا اور دوسرے میں شریعت کی محفل برپا تھی۔
خوش قسمتی ہی تھی کہ لطف النساء سے ملاقات ہوئی۔ دراصل یہاں آنے کا کوئی خاص ارادہ نہیں تھا۔ پرانے ڈھاکا کا مشہور معززین العابدین سے ملنے اور ان کا انٹرویو کرنے کی تھی۔ واپسی پر یونی ٹیگور کی ہڑک سی آگئی تھی اور اکیڈمی چلی آئی۔

لطف النساء محبت کے شیرے سے گوندھی ہوئی عورت ہے۔ اس کے اندر ویسٹ پاکستانیوں کے لیے کوئی بغض اور تعصب ہوتا ہو مگر اس کا چہرہ جیسے ممانت کی لطافت اور پیار کی نرم پھوار میں بیجا بیجا سا رہتا ہے۔ جب جب بھی ملاقات ہو۔ گندوان کے پھول کی طرح کھلی نظر آتی ہے۔
آج بھی کبھی ڈال کر لی۔ زمین العابدین سے ملنے کا سن کر خوش اور ٹیگور کے بارے میں میری کچھ جاننے کی خواہش پر مزید خوشی و مسرت کا اظہار کیا۔
رمضان میں یونیورسٹی بند ہونے اور عید پر گھر جانے کا پوچھنے پر میں نے فوراً کہا تھا۔ ”اے نہیں آپ رمضان تو ہمیں ہاسٹل میں اور عید اپنی کلاس فیلو کے ساتھ پارسیال منانے جاؤں گی۔ اپنے دیس کے اس حصے کے رمضان کی رونقیں اور عید کو بھی تو دیکھوں۔“
باتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔

چمکتے کرے اور گھر سب مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔
گھر دار عورتوں کے بچے سنورنے کے طور پر لیتے سنتے ہوئے بھی لطف آتا تھا۔ میں تو تپتی چلی جاتی تھی۔
کلی میں ”پیلے پھول، پیلے پھول“ کی صدا بھی بڑی اچھی لگتی تھی۔ موسم بہار کیا آتا یہ پھول ڈالیاں اور ان کی خوشبویں... گیوں کو مہکا دیتیں۔ گھر والیوں کے لانے پالوں کے بھاری جڑے، ان کے شانوں پر پڑے پیلے ہاروں سے سج جاتے۔ چدر سے گزرتیں خوشبویں بھیرتی چلی جاتیں۔
ہاتھ منہ دھونے سے پہلے آئینہ ہاتھ میں پکڑ کر ہالوں کو ستورا جاتا۔ گھر میں خود سے بانی ڈوری سے جوڑا باندھا جاتا۔ ناخن کانکروں میں آنے کا بھی بڑا درد آتا تھا۔ یہ بھی ایک کردار تھا۔
میرے بچپن میں چاکلیٹ نہیں ہوتی تھی۔ گلابی ریوڑیاں، خوشبو میں بے تل سے لدے پسندے چھنی کے ڈھیلے، کس مزے کے ہوتے جیسے ہوئے ساک والے ٹھونکے، وہ سستا سا حل والا کجا۔ برف کی ہانڈی میں کئی کلفیاں۔ جب پھیری والا آواز لگتا۔ ہائے دل کیسا آٹھل پٹھل ہونے لگتا۔

”ہائے ٹیگور کے بچپن کی کچھ چیزیں تو معاشرت کے فرق کے باوجود ہمارے بچپن جیسی بھی تھیں۔“ بچوں جیسی خوشی نے میری آنکھوں سے جھمکتے ہوئے گویا کہا تھا۔

انیسویں صدی کی آخری تین دہائیوں کے ہندوستانی ریگال کی تہذیبی معاشرت کی جھلکیوں کی خوبصورت اور دل کش تصویر نے دل شاد کیا تھا۔ شام بہت مزے کی گزری تھی۔ کیا مزے کا بچپن تھا۔

27 نومبر 1969ء

آج رقیہ ہال میں ہندو عرواح فیٹ Feast ڈے تھا۔ لڑکیوں نے سر شام ہی ڈاننگ روم کے گرد منڈلا شروع کر دیا تھا۔ کاسن روم میں بھی رش تھا۔ فاخرہ اور میں بھی انہی لڑکیوں میں شامل تھیں۔ نی دی ریگیٹوں کا پروگرام چل رہا تھا۔ دفعتاً ایک دلکش چہرہ اپنی دلکش آواز کے ساتھ نمودار ہوا۔ یہ فرودی تنگ تھیں۔ یورو پو پاکستان یا یورو ریگال کی مہترم آواز، گیت جو وہ جھگڑاتی تھی وہ ٹیگور گیت تھا۔
اُف ایسا لگا تھا جیسے سارا ماحول ایک انوکھے سے سر میں بہتا شروع ہو گیا ہے۔ فاخرہ گیت کا ساتھ ساتھ ترجمہ کے جاتی تھی۔

اے دنیا میں نے صبح کے بنگاموں میں تیرے باغ سے ایک پھول توڑا

پیدل، کبھی کسی اڑن کشتوں پر، کبھی جنگلوں میں، کبھی دریاؤں پر۔

مج تو یہ ہے کہ بچپن کی یہ تصویر اتنی سر بڑے ہو کر دنیا کے اسفار کی صورت میں مجھے نصیب ہوئی۔ گھر سے باہر نکلنے کی پابندی نے سفر کرنے کی خواہش کو ابھار لگائی تھی۔ بچپن کی تہائی، جوانی اور اوجیز عمری میں دوستوں کی صحبت میں نئی دنیا میں دیکھنے کی مٹی بھی جس کی کھیل بہت احسن طریق سے ہوئی۔

”کہانیوں کی دنیا میں کھونا مجھے بہت پسند تھا۔ شاید نہیں بقیہ کہانیاں افسانے اور ناول اسی شوق اور تجسس نے لکھوائے۔“

فاخرہ سے میں نے کسی ناول کے بارے پوچھا جو اس نے پڑھا ہو۔

”ارے ایک دو۔ میں نے تو کئی پڑھے ہیں۔ افسانے بھی بہتر۔ ناولوں میں مجھے گھورے بائیرے، جوگا جوگا، دوئی بون اور گورا بہت پسند ہیں۔“

کہیں کابلی والے کا ذکر آیا تو مجھے یاد آیا۔ یہ افسانہ میں نے پڑھا ہے۔ ذہن میں جزئیات بھی اُبھر آتی تھیں۔
”چلو اب سنو۔“ فاخرہ نے پھر پڑھنا شروع کر دیا تھا۔

”کہانی کے جلد ختم ہونے پر بھی مجھے ہمیشہ اعتراض ہوتا۔ خوف، ڈر، بے قراریاں، اضطراب سب میرے اندر سے نکل کر ہونٹوں پر رسوا جواب کی صورت بھدکے۔ جہاں کہیں کہانی میں سسٹی خیز موڑ آتا۔ اضطراب میں ڈوبا ہوا جملہ ”پھر کیا ہوا“ فوراً بول پڑا جاتا۔

ایک اور کام کرنا بھی میرا معمول تھا۔ وہ تھا میری ماشری، میری اُستادی۔ گھر کے سارے ستون مجھے میرے شاگرد ہوتے۔ میں انہیں خوب لاناؤتا، خوب مارتا۔ نہیں پڑھو گے تو نالائق تو بڑے ہو کر ملی، نوگے۔ ان کی خوب خوب پٹائی کرتا۔

یہ منظر میرے پسندیدہ منظر میں سے ایک تھا کہ جب گھر میں مہمان آتے۔ گھر کی ڈیوڑھی کے سامنے بڑی بڑی کھیاں آکر رہتیں۔ مرکزی دروازے پر بڑے بھائیوں میں کوئی ایک مہمانوں کے استقبال کے لیے ضرور موجود ہوتا۔ نوکران پر گلاب دانیوں سے گلاب پاشی کرتے۔ ہاتھوں میں پھولوں کے دستے تھاتے۔ بھائی بھد عزت و احترام انہیں اوپر لے جاتے۔ خاطر مدارات کا سلسلہ، روشنیوں سے

قسط طنطنیہ

قطنطنیہ دنیا کا نہایت اہم اور عظیم الشان شہر ہے جس کا ایک قطنطنیہ آباد ہے یہاں پر پانی زہتم نانی ایک چھوٹا سا شہر تھا جسے خان بدوش قبیلے نے آباد کیا تھا۔ اس شہر بہت سے حادثات گزرے ہیں۔ بعد از 327ء میں قطنطنیہ اول نے اس شہر پر حملہ کیا اور پھر اسے آباد کیا جس کی وجہ سے اس کا نام زخم سے قطنطنیہ بن گیا جسے بعد میں قطنطنیہ کہا جانے لگا۔ مسلمانوں کے عہد میں بخاری سے فتح کیا۔ اسی جنگ میں حضور کے صحابی حضرت ابوالباب انصاری شہید ہوئے اور اسی شہر کی فصل کے پھل ہوتے۔ اس شہر کے صلیبی دور بھی ایک تاریخ نویس کا گیارہ سو سال تک یہ عیسائیوں کا دار الحکومت رہا اور پھر سلطان محمد فاتح نے یہاں سلطنت کا خاتمہ کر کے اسلامی دار السلطنت بنایا۔ جب خلافت اسلامیہ کا خاتمہ ہوا تو ترکوں کی مسلم حکومت نے انقرہ کو دار الحکومت بنایا مگر قطنطنیہ کی اہمیت اور شان و شوکت مسلم دنیا میں ایک مایہ ناز حیثیت رکھتی ہے۔

مرسلہ: عبدالجبار رومی انصاری۔ جنگ لیے کھیل تماشے جیسی ہی بات تھی۔ باتیں کرتے کرتے چٹکے چھوڑنا بھی اُسے بہت پسند تھا۔ وہ بیگلی وغیرہ بیگلی تعصب سے بالا بڑی خاص قسم کی چیز تھی۔ فنی جیسی لڑکیاں ہزار لڑکیوں کے ہاشل میں بس دو تین ہی ہوں گی شاید۔

10 فروری 1970ء

جنوری بڑا معروف مہینہ تھا۔ عید کے بعد سیکڑ نم شروع ہونے والی تھی۔ مننے پلنے فروری آگیا تھا۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ ہم کمرے میں آگئی تھیں۔ اُس نے ٹرانسفر کی نوب بند کرتے ہوئے کہا۔

”اگر آپ آج نوب جے نہ سو جائیں تو ہاتھیں ہو سکتی ہیں۔“ فنی، نیگور پر بات کرنے کے لیے نیند جیسی چیز کی قربانی کی کیا حیثیت ہے؟

جیسے اس عظیم شخصیت کی ازدواجی زندگی کا بھی رخ دیکھ لیں۔ لیکن کا نام بھوتارینی۔ تیرہ سالہ کم بڑھی کبھی عامی لڑکی تھی۔ نینی ماحوب رائے چودھری کی بیٹی تھی۔ ڈیڑھ سال وقت کوئی تیس برس کا تھا۔ عمر میں دس سال چھوٹی کہ معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ دنیا کے کتنے انسان کی بیوی بن رہی ہے لیکن

گیت ہے۔ اُس بچی کا گیت جو چھوٹی سی ہے۔ شاعر کہتا ہے۔ میں انگ بار بار اُس کی کو دیکھتا ہوں محبت سے لبریز آنکھوں والی بچی میری کسی سفر پر چل پڑے گی اور بچی بھی اپنا کام پورا کرے گی وہ مجھے نہیں جانتی

میں اُسے نہیں جانتا مگر میں سوچتا ہوں وہ کسی نامعلوم مہم جو اور نامعلوم اجنبی گھر میں۔ لیکن بن کر جائے گی پھر ماں بنے گی

اور پھر سب کچھ ختم ہو جائے گا نیگور کا یہ گیت تھی چینی اور کڑی حقیقت پر ہے۔ نیگور کے نزدیک انسان خدا کا پتو ہے۔ ہر ایماندار، نیک اور جفاکش انسان میں خدا پنہاں ہوتا ہے۔ اسے خفاخا ہوں، مہجول اور مندروں میں محسوس کرنے والوں سے وہ کہتا ہے۔

یہ عبادت (پجاری) تین خونی چھوڑ دوڑا رہے ہندو کے خفاخا کے دیران آجڑے گوشے میں ٹوکس کی پوجا کر رہا ہے؟ آنکھیں کھول اور دیکھ خدا تیرے سامنے ہے وہ کہاں ہے؟

وہاں جہاں کسان سخت زمین میں مل چلاتا ہے جہاں مرکز کی تعمیر کرنے والے پتھر کوٹتے ہیں دھوپ اور بارش میں کام کرتے ہیں

خدا تو ان کے پاس ہے گیتا بچی کی زیادہ نہیں اور گیت چھریہ اور مٹا جاتی ہیں۔

اپنی عبادت اور پیر کی باعث اس کے ہاں یہ پختہ نقین ہے کہ موت کے بعد جو زندگی ملے گی وہ بہتر اور اچھی ہوگی۔ حسن فطرت سے اُسے عشق ہے۔ یہ بیج شام موسوں کے بدلتے رنگوں کے ساتھ کہے پرانے پیر میں اتار کر لے جاتی ہے۔ اُن پرانے اور نئے رنگوں میں حسن و عرائشوں کے جلوے اس کے دل کی دنیا تھوڑا لاکر کرتے ہیں۔

اُن کی ازدواجی زندگی کے بارے کچھ سننے اور کچھ جاننے کی بھی بڑی خواہش تھی۔ یہ تینا فنی نے ہی پوری کی کہ اس کا تھیںس تھا ہی نیگور پر۔ یوں ہی وہ بہت پڑھا لکڑی تھی۔ جھٹ سے اعتراض پھٹ سے لفظ چینی کر دینا بھی اُس کے

نتقوں میں کھس کھس کر عجیب سی کیف اور مستی کے جذبات پیدا کر رہی تھیں۔ عطر پڑھوا میں دل کے تار تار بھجورے جاری تھیں۔ جب اُس نے گیتا بچی (بھار کا گیت) اٹھائی۔ کاپی قلم پکڑا اور ترجمہ کرنا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ کاپی ختم ہوگئی تو اُسے جیب میں ڈالی اور لندن جانے کے لیے بکری جہاز میں سوار ہو گیا۔ جہاز میں رونگٹا نہ بھی سوار تھا۔ اس نے بعد اصرار ترجمہ دیکھنے کی خواہش کی۔ پڑھ کر تو وہ حیران رہ گیا۔ یہی کاپیاں اس نے آئینس yeats کو بھجوا دیں۔ وہ بھی پڑھ کر رنگ سارہ گیا۔

آئینس نے گیتا بچی کا پیش لفظ لکھا اور کہیں چھوٹی موٹی اصلاح کی۔ ”گیتا بچی اس کی لافانی شاہکار تخلیق ہے۔ آئینس yeats لکھتا ہے۔ یہ ترجمہ ہر جگہ میرے ساتھ جاتا۔ بسوں، ٹرینوں، ریسٹورنٹوں میں۔ میں ہر جگہ اس کا تذکرہ کرتا اور اسے سراہتا ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ ایک زمانہ وہ آئے گا جب راستہ چلنے والے آئینس راہ میں ٹکنا نہیں گئے۔ کشتیوں پر ملاح آئینس کا نہیں گئے۔ عاشق اپنے معشوق کے انتظار میں، مجبور اپنے چاہنے والے کے انتظار میں، خدا سے محبت کرنے والے اس کے حوالے دیں گے۔“

ڈبلیو، آئینس جیسے انگریزی ادب کے عظیم شاعر کا یہ خراج تحسین یقیناً نیگور کے لیے بڑا امتیاز تھا۔ نیگور کی یہی عمر کاری اُسے متاثر کرتی ہے۔ مترنم سادہ سا اسلوب منفرد کرتا ہے۔ سندھانگیت (شام کا نغمہ) سے اس کی غنائی شاعری کا آغاز ہوتا ہے۔ آغاز میں سادیت کا بھی غلبہ رہا۔ مگر یہ وقت جلد گزر گیا۔ پر بھارت سنگیت (صبح کا نغمہ) میں ڈرا دیکھیے صبح کی روپوشی دھوپ میں پھیلی ہوئی زندگی اس کے لیے کتنی دلا آور ہے۔

میں اور کچھ نہیں چاہتا بس اگر چاہتا ہوں تو اتنا سا اسے دیکھتا رہوں مسکور ہوں پھر جیز بھول جاؤں تم سہم ہوں نامی (محبوب) کو پڑھیں تو شاعری فنی پختگی کا نقطہ کمال محسوس ہوتا ہے۔

”اے بار پھر اور سوئے“ (اس بار مجھے لوٹا دو) اُس کی ایسی ہی ایک شاہکار نظم ہے۔ اسی طرح ”لافتا ہی راستہ“ کا

عظیم اور لافانی شخصیت جن کی شاعری، مصوری، افسانہ، ناول، ڈراما، موسیقی، مقالہ نویسی، غرض کہ کون سی صنف ایسی تھی جس کے وہ شہسوار نہ تھے۔ قلم اُن کا وہ ساگی تھا جو کبھی اُن سے جدا نہ ہوا اور زندگی کا وہ کون سا ایسا گوشہ تھا جس پر انہوں نے نہ لکھا۔ ادب، فلسفہ، تاریخ، تصوف، مذہب، سیاست، اخلاقیات، سماجیات جسے پکڑا اُس کے اندر یوں اُترے کہ وہ تحریر جادواں ہوئی۔ جولفٹ چننا اُسے مستیز کر دیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اچھی شاعری کی بنیاد شدید محسوس کی جذباتیت اور تیز حیات کی مہر و منت ہوتی ہے۔ نیش کی رنگینی اور زبان کی سادگی جس شاعر کے ہاں ملے گی وہی حقیقی اور سچا شاعر کہلائے گا۔ ہم دیکھتے ہیں نیگور کے ہاں خیالات کی جدت ہے۔ تیز رفتار نیش کی جولانیاں ہیں۔ رنگینی ہے، جذبات کی شدت اور احساسات کا تیز بہاؤ ہے۔ خیالات میں گہرائی اور رنگینائی ہوئی سادہ زبان۔ اُس کے انہی اوصاف نے اُسے ایک عظیم شاعر بنا دیا۔

یہ حقیقت ہے کہ جب اُن کی شہرہ آفاق تصنیف گیتا بچی کا انگریزی ترجمہ یورپ میں پڑھا گیا تو ایک تہلکہ مچ گیا۔ دنیائے اُسے کس کس اعزاز میں تحفیم دی۔ کسی نے کہا۔ نیگور شاعر کا نہات ہے۔ کسی نے کہا وہ بیسویں صدی کے عظیم ترین شعرا کی قطار میں سب سے آگے ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ اس کی شاعری نے نئی نئی چیزوں کو نئے نئے اعزاز میں دریافت کیا اور وہ نئے نئے راستوں پر چلی۔ شاعری کی مروجہ برائی ریت و روایتیں اور تنگ راستے سکھوں سے اُس نے اپنے انھنق و واسطہ نہ رکھا۔

ایگزینڈر سرگورویوچ شکسن کی طرح جس نے روسی زبان کو اپنی بے مثال شاعری سے مالا مال کیا اور یورپی زبانوں کے مقابل لاکڑا کیا۔ نیگور نے بنگلہ زبان کو وہی درجہ دیا کہ وہ نیگور کی شاعری کی بدولت ارتقا کی بلندیوں کو چھونے لگی۔

انگریزی ترجمے نے اُس کی شہرت چاروں اٹک پہنچا دی تھی۔

”آپا پیر ترجمہ کس نے کیا تھا؟“ ”اے کس نے بھی نہیں اُس نے خود کیا تھا۔ دیکھو تو ڈراپا نہیں وہ کیوں اس احساس کمتری میں مبتلا تھا کہ اُس کی انگریزی اچھی نہیں۔ ہمت ہی نہیں کرتا تھا۔ ایک دن عجیب سی بات ہوئی۔“ ”یہ چیٹ کے دن تھے۔ آموں کے پور کی خوشبوئیں

15 مارچ 1970ء

علامہ سید محمد باقر ہندی چکڑا الہی (1881ء-1966ء)

ممتاز سید عالم دین چکڑا الہی ضلع میانوالی میں علامہ سید گل محمد نقوی کے علمی وادبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ 1909ء میں عربی فاضل کا امتحان اوشمل کالج لاہور میں دیا۔ اول آئے گولڈ میڈل کا اعزاز پایا۔ علامہ سید شریف حسین خان رئیس اعظم جہانوں سے اسباق پڑھے اور اوشمل کالج لاہور میں پروفیسر تعینات ہوئے۔ بعد ازاں 1912ء میں خوزہ علیہ نجف الاشرف عراق میں انساب علم کیا۔ درجہ اجتہاد پر فائز ہو کر مہمند ہوئے۔ 1915ء میں سند حاصل کرنے کے بعد وطن مالوف چکڑا الہی ضلع میانوالی تشریف لائے اور پہلے دینی مدرسہ کی بنیاد 1916ء میں اپنے برادر بزرگ علامہ سید طالب حسین نقوی کے ساتھ لگ کر رکھی۔ دس سال کے عرصے کے بعد 1926ء تک چک نمبر 38 فن آرٹ کالج لاہور میں پھر تعلیمات محمد اور احمد پھیلاتے رہے۔ 1946ء سے 1966ء تک بدھ رجبان تحصیل شورشک جھنگ میں علوم محمد و آل محمد کے دریا بہاتے رہے اور جلیل القدر جدید علمائے کرام پیدل کیے۔ علمی وقار بلند کیا۔ آپ زبدۃ العارفین قدوة السالکین حضرت پیر سید فضل حسین شاہ نقوی البخاری کے ہم عصر تھے۔ آپ مہمدم اعظم حضرت سید شیر شاہ جلال الدین حیدر سرخ پوش بخاری (پ، بخارا 595ھ 1199ء م اوج شریف بہاول پور 690ھ 1291ء) کے دوسرے فرزند ارجمند حضرت سید علی سرمست اور ان کے فرزند جلیل حضرت حاجی سید بہاول حلیم کی نسل مبارک سے بانی چکڑا الہی ضلع میانوالی حضرت سید محمد حسین بخاری نہرو پور اکین اولیاء سید محمد شریف آف بلوٹ شریف ضلع ڈیرہ اسماعیل خان کی اولاد ایجاد ہیں۔ آپ قبیلہ نقوی البخاری کے قابل فخر ختم و چراغ تھے۔ 9 جون 1966ء کو کھارڈکلاں ضلع جھنگ میں انتقال فرمایا۔ آپ کا حجاز مبارک ارباب علم ادب کے لیے زیارت گاہ و مرجع خلائق ہے۔ پاکستان میں آج جو علم کی پابلی جہل ہے خصوصاً پنجاب میں وہ سب آپ کی مرہون منت ہے۔ آپ کے ہزاروں شاگردان رشید ہیں جو آپ کے مشن پر کار بند ہیں۔

مرحلہ: سید امتیاز حسین بخاری۔ سرگودھا

اس ضمن میں جس اور نمایاں شخصیت سے میری بھرپور بات چیت رہی وہ ڈھاکا یونیورسٹی کے وائس چانسلر ابو سعید چوہدری تھے جو بعد میں بنگلہ دیش بن جانے پر ملک کے صدر بھی بنے۔ ان کے ساتھ ملاقات بڑی دلچسپی کی حامل تھی۔ ان دنوں ہاتھ کی لکیروں سے میرا عشق جنون کی حدوں تک پہنچا ہوا تھا۔ یہ شخص اتفاق ہی تھا کہ وی سی ہمارے ڈپارٹمنٹ کی ایک تقریب میں آئے۔ فیکلٹی ممبران کے ساتھ کھڑے تھے جب میں ان کے پاس گئی۔ میں نے ان کا ہاتھ پکڑا اور بنگلہ میں کہا۔

”سر مجھے آپ کا ہاتھ دیکھنا ہے۔ وقت آپ نے بتانا ہے کہ کب آپ کے پاس آؤں؟“

انہوں نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔ ”سر میں بہت اچھا ہاتھ دیکھتی ہوں۔ حسینہ واجد کا ہاتھ بھی میں نے دیکھا ہے۔ میرے پاس اس کے ہاتھ کے پرنٹ بھی ہیں۔ اس وقت میرے تن پر آبی رنگی منجمل کی خوبصورت ساڑی تھی۔ شانوں پر گھنے سیاہ بال لہراتے تھے۔ سائونڈ رنگت کے ساتھ میں مکمل طور پر ایک بنگالی لڑکی نظر آتی تھی۔“

میرے ہیڈ سرنے مسکراتے ہوئے پہلے مجھے اور پھر انہیں دیکھا اور میرا تعارف ویسٹ پاکستانی اسٹوڈنٹ کی حیثیت سے کروایا۔

یونیورسٹی لیول کے اساتذہ اور اسٹوڈنٹس کے درمیان ہونے والی لطیف سی چیچر چھاؤ اور جملہ بازی والے ماحول کے درمیان بالآخر میں نے انہیں رضامند کر لی لیا۔

ہاتھ دیکھنے، پرنٹ لینے اور اس کے نتائج کو ایک طرف کیجیے کہ اس خوبصورت سلسلے سے اس کا تعلق بس اتنا سا ہے کہ ان ملاقاتوں کے بعد میں نے انہیں اخبار خوانین کے لیے انٹرویو بھی کر لیا۔ انٹرویو میں ایک صاحب علم شخصیت میرے سامنے آئی تھی۔ جنہوں نے ٹیگور کی شاعری کے کئی اور نمایاں پہلوؤں پر تفصیلی گفتگو کی۔ انہوں نے کہا کہ میرے خیال میں چکی چیز شاعری کا بے ساختہ پن ہے۔ آنکھ سے نکلنے والے کسی بے اختیار رویے تا ب آنسو کی طرح، ہوشوں پر اپنے آپ ہی کھر جانے والی کسی مسکراہٹ کی طرح۔ ٹیگور کی شاعری ان کے گیت، سر پہلے اور نغمہ بار ہیں، اپنے آپ میں مکمل، ان کی شخصیت کے عکاس، فکر و نظر میں آزاد۔

ٹیگور کی ذات مذہب، فرقہ بندی، قوم و ملت کی

تخلیق آمد کا نزول ہو گیا اور وہ آنے کی بجائے تخلیقی عمل میں مصروف ہو گئے۔ کیسی صابر بشا کر عورت تھی کہ پیشانی پر خفیف سی سلوٹ لائے بغیر ادھر ادھر کے کاموں میں مصروف ہو جاتی۔ ان کے کاموں میں مداخلت کرنا اس کے لیے گناہ کے برابر تھا۔ کھانا تب پروتی جب وہ اس کا اذن دیتے۔ رات اکثر دیر تک کام میں مصروف رہتے۔ صبح دم بھی جلد اٹھتے۔ غسل، عبادت، ناشتا، لکھنے کی میز، اس کی صفائی سہرائی۔ سردیوں گرمیوں کے کپڑے سب کا دھیان رکھنا تو کر کے ساتھ ساتھ وہ اپنی قلمداری بھی چھیٹی۔“

ٹیگور فطرتاً ہی بدواہ تھے۔ تخلیقی عمل سے فارغ ہوتے تو کابلی اور سستی درآتی۔ بھول جاتے کہ جو کچھ تخلیق ہوا اور لکھا گیا ہے اسے سنبھالنا بھی ہے۔ تاہم یہ مریا دیوی بھی کہ جو ان کی چھوٹی سے چھوٹی تحریروں کو پلے پلتے سے سنبھالتی۔

ٹیگور نے مریا کو چھنے خط لکھے۔ اس نے ان کی جی جان سے حفاظت کی۔ ایک خوبصورت منقش صندوقچے میں محفوظ کرتی۔ شوہر کو اس کے اپنے لکھے ہوئے خطوط کا شراپ ادنیٰ نظر سے دیکھتا تھا۔ ہاں البتہ کہا جاتا ہے کہ دراندیشی مشہور کہانی استری پتھر میں مریا کی ذات کے کچھ کس لئے ہیں۔ آخری عمر میں زبان بند ہو گئی تو رابندر نے لکھا۔

اتنی فرصت نہ ملی یہ بھی ممکن نہ ہوا کہ تم دل کی آخری باتیں کہہ جاتیں خاموش رخصت جبر کا ورد لے

میں چاروں اور فضول تسکین کی تلاش کرتا رہا“ ایک جگہ اور دیکھیے وہ مریا کے جہر میں کیا کہتے ہیں؟ تم ابتادہ اچھا لگنا میری آنکھوں میں نقش کر کے میری آنکھوں میں اپنی نگاہ رکھ گئی ہو آج میں اکیلے ہی دونوں کا دیکھنا کچھ ہا ہوں تم میرے سن میں برج رہی ہو میری آنکھوں کی پتلیوں میں اپنی نگاہ شوق کی لکیر بنا کر

میری زندگی میں تم جے جاؤ جے جاؤ میرے دل کے دریلے سے اپنی مراد مانگو تاکہ میں دل میں جھجھکوں کہ تمہاری پوشیدہ طور سے تم آج مجھ میں ”بن“ کر رہی ہو میری زندگی میں جے جاؤ جے جاؤ

وقت نے بتایا کہ اس نے خود کو اس اعزاز کا اہل ثابت کیا۔ ٹیگور نے جوانی کا کچھ حصہ شیلانی داہ اور شہزاد پور اپنی زمینداری پر اور کچھ وقت بیرون ملک کے دوروں اور سیاحتوں میں گزارا۔ یہ وہ وقت تھا جب اپنی بیوی کے ساتھ ان کی ملاقاتیں کم رہیں۔ مگر دونوں کے درمیان خطوط کا تبادلہ ضرور رہا۔

فنی کی جملہ بازی اس موقع پر بھی ہوئی۔ تاہم یہ ہندوستانی معاشرت کا ایک حصہ تھا اور زمانہ کافی آگے بڑھ جانے کے باوجود آج بھی ایسی ہی صورت حال کسی حد تک ہے۔ میرے ذہن اور جواب نے اس نٹ کھٹ کو چپ کروا دیا تھا۔

شوہر نے جو نام دیا وہ مریا اپنی دیوی تھا۔ اس نام کا بھرم رکھنے کے لیے اس کم عمر لڑکی نے لکھنا پڑھنا سیکھا۔ دو بیٹوں اور تین بیٹیوں کی ماں بننے کے باوجود دوسری زبانیں سیکھیں۔ ادب، موسیقی اور آرٹ کی باریکیاں جانیں۔ اپنے شوہر کے مقام اور مرتبے سے آگاہ ہوئی۔

رابندر ناتھ کو اس منزل تک پہنچانے میں مریا کے ہاتھ کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

بھی شوہر کے کاموں میں مداخلت نہیں کی۔ کبھی کسی چیز کی فرمائش نہیں۔ شانتی ظہین میں جب کھلے آسمان تلے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا تو کہیں سے مدد نہ ملی۔ ایسے میں وفا شعار بیوی نے سب زیورات قدموں میں ڈھیر کر دیئے۔ یہ اور بات ہے کہ ٹیگور نے اسے پسند نہ کیا لیکن جب وٹو بھارتی (یونیورسٹی) قائم کرنے کا ارادہ کیا تو بیوی کے پیہم اصرار پر یہ بددعوت لے کر راضی ہو گئے۔

تاہم یہ بات فنی کے لیے خاموشی سے بتانے پر مرکوز نہیں تھی۔ اس کے ساتھ اس کے جہرے نما اعتراض بھی تھے۔ آخر مریا اپنی کا ذکر ٹیگور کی تحریر میں کیوں نہیں ملتا؟ کبھی کوئی چیز اس کے نام سے منسوب کیوں نہ ہوئی؟ کیوں آخر؟ اس نے آنکھیں میرے چہرے پر جمادیں اور جیکھے لہجے میں بولی۔

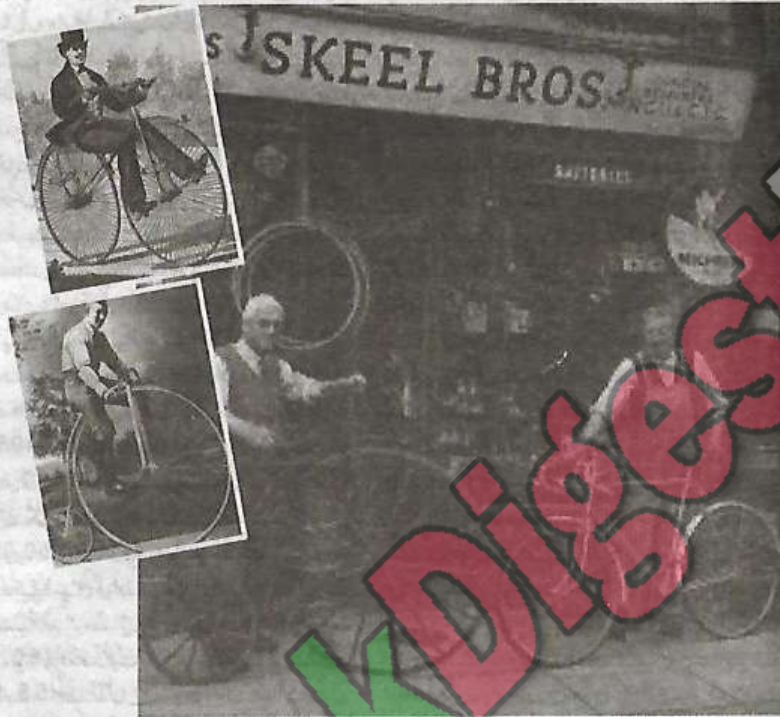
”ایسی وفا شعار بیوی۔ ٹیگور جب کبھی باہر سے آتے تو وہ ان کے لیے بہت اہتمام سے کھانا بنواتی۔ ٹیگور سادہ کھانے کو ترجیح دیتے۔ مسالوں اور تیل کی زیادتی پسند نہ کرتے۔ مریا ان سب باتوں کا دھیان رکھتی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ بہت چاؤ سے دسترخوان سجاتی۔ انہیں کھانے کے لیے آنے کا کہتی۔ اب انتظار میں دیدہ دل بجھائے بیٹھی ہے اور ٹیگور پر

بائیسکل

شکیل صدیقی

گھوڑے کی سواری کا نعل بدل تلاش کرتے کرتے سائیکل ایجاد ہو گئی لیکن اس ایجاد نے کیسی کیسی شکل اختیار کی یہ بھی جاننا ضروری ہے۔

ایجادات کی کہانی کا پس منظر



ہوں کہ بائیسکل وجود میں کیسے آئی، اس نے کیسے کیسے رنگ تبدیل کیسے رنگ سے مراد ہے اس کی ہیئت میں کیسی تبدیلیاں ہوئیں لیکن ہمیں اس سے پیشتر فرانس میں ہونے والی بائیسکل ریس "ٹور دی فرانس" کا ذکر ہو جائے تو بہتر ہے

بائیسکل کا قصہ آئے اور پطرس بخاری کے مرزا نہ یاد آئیں یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ان کے لازوال مضمون کا نام "مرحوم کی یاد میں" تھا۔ جنھوں نے اس مضمون کو پڑھا ہے یقیناً اس سے محظوظ ہوئے ہوں مگر اس وقت میں آپ کو یہ بتانا چاہتا

جملہ سے رہے ہیں
اسی لیے میں سمجھتا ہوں
یہ دنیا عالم خیال کے بے کراں سمندر
کی موجوں پر ناچتا ہوا ایک کنول ہے
میں سمجھتا ہوں
میں اسی کا پیغام ہوں
میں اس کے گیت کی تان ہوں
میں زندگی میں روح زندگی ہوں
میں ظلمات کے سینے کو چاک کر کے
نکلنے والے آس

رقصاں ٹوکی درخشاں کرن ہوں
میرے لیے یہ امر بھی کچھ عجیب لگتا تھا کہ ابو سعید چوہدری اقبال، حافظ اور مولانا مدنی سے بھی بڑے متاثر تھے۔ اقبال کو ٹیگور کے لیے کا شاعر بناتے تھے۔ ان کی نگاہوں میں دو تین بار ٹیگور کا ان تین بڑی شخصیات کے ساتھ موازنہ بھی سامنے آیا۔ ٹیگور کے عاشق ایلس آرونسن کے ہائے یوں باتوں نے میرے اوپر فکر و آگہی کے نئے دروازے کھولے۔ آرونسن ایک بے چین، مضطرب، علم کی پیاسی روح، تلاش حق کے لیے جھٹکتی کبھی جرمنی کبھی فرانس ٹیگور کے ناول Home and the world سے متاثر شاعری تھیں آج بھی جہاں انہوں نے انگریزی ادب پڑھنا شروع کیا تھا۔ یہاں آرونسن کی ایک تحریر ٹیگور کی شخصیت کے ایک اور پہلو کی عکاسی کرتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہماری ملاقات جب بھی ٹیگور سے ہوئی۔ مجمع میں یا تنہائی میں، وہ باتیں کر رہے ہوں یا خاموش ہوں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ بنیادی طور پر وہ ایک تنہا آدمی ہیں جو اپنے خیالوں میں غرق رہتا ہے۔ گیتوں کو گانے والا۔ خوابوں کا بننے والا۔ وہ مجمع کے لیے کوئی پیغام رسانی نہیں ہے۔ جس کی آس میں مجمع اکٹھا ہوتا تھا۔

کیسا شاعر تھا جسے رکشا چلانے والا اور پتھر کو نٹنے والا اگر گاتا تھا تو وہیں سکرانوں کی آنکھوں کا بھی تارہ تھا۔ دلی کی سیاحت کے دوران اندرا گاندھی میموریل دیکھنے گئی تو ان کی اسٹڈی میں جو نظم موجود تھی وہ ٹیگور کی ہی تھی۔

جہاں ذہن میں ڈر اور خوف نہ ہو

جہاں انسان مر بلند ہو کر جئے

جہاں علم کا حصول ہر خاص و عام کے لیے ہو

جہاں یہ ہماری دنیا مکڑوں میں بٹ کر تقسیم نہ ہو

ہندو کو توڑتی ہے۔ انسان کو انسان سے جوڑنے کی ترغیب دیتی ہے کہ ٹیگور نے انسان میں انسانیت کے خدا کو دیکھا ہے۔ اسی لیے وہ اس کی توہین پر وراثت نہیں کرتا۔ ان کے یہاں کوئی مخصوص نظریہ یا نمایاں فلسفہ حیات نہیں ملتا۔ مذہب ٹیگور کا تعلق برہمن سماج سے تھا۔ یہ فرقہ صرف بنگال میں ہے۔ بنگال کی بیشتر عظیم ادبی و سیاسی شخصیات کا تعلق اسی طبقے سے تھا۔ برہمن سماج صرف وحدانیت خداوندی کا قائل ہے۔ ٹیگور کی فنکارانہ زندگی کے تحت اشعار میں یہ تصور ہمیشہ قائم رہا کہ ان کا مرکز مسرت بس تخلیق ہی ہے۔ وہ ہر ممکن طریقے سے اسی کا اظہار کریں۔

ایک بار انہوں نے کہا کہ میں ان سب لوگوں سے جو مجھے مسند پر بٹھانا چاہتے ہیں کہتا ہوں کہ مجھے نیچے زمین پر ہی بیٹھنے دیں۔ وہ جو کھیل کے قواعد وضوابط ملے کرتا ہے اُس نے میرے لیے کوئی بڑا مزہ برائے سا کردار نہیں چنا۔ میری زندگی کا رس جو قدرت نے مجھے بخشا ہے وہ اسی مٹی، اسی دھرتی اور اسی کھاس پر ہی چڑھنا چاہیے۔ وہ سب لوگ وہ جو دھرتی پر پہلا قدم اٹھاتے ہیں اور پھر اسی کی گود میں پلے جاتے ہیں۔ میں ان کا دوست ہوں۔ میں شاعر ہوں۔ میں کوئی ہوں۔

ان کے ہاں مسائل حیات کے تعمیری پہلو، تہذیب نفس، کردار کی پاکیزگی، حق گوئی و بیباکی کے لیے ایک دائمی پکار ملتی ہے۔ اس کے لیے وہ اپنے ساتھیوں کو آواز دیتے ہیں۔ کوئی نہیں ملتا تو کہتے ہیں۔

جب تیری پکار پر کوئی نہ تیرا ساتھ دے

تجربا ہی چل تو آئیلا سی چل

گیتا بھی زیادہ زیر بحث رہی۔ بہت زیادہ پڑھی گئی۔ انگریزی ترجمے نے دنیا میں گھمادی۔ نوبل انعام یافتہ ٹھہری۔ کوئی شک نہیں کہ وہ ایک شاہکار ہے۔ مگر میرے نزدیک "بلا کا" اس سے بھی بڑا مجموعہ ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ گیتا نکلے کے پیچھے دب گئی اور یوں ابھر کر سامنے نہ آئی جیسے اُسے آنا چاہیے تھا۔

یہ شعری مجموعہ محبت، انسان، خدا اور انسانیت کے گرد گھومتا ہے۔ ٹیگور نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ دشمنیت کو دشمن اور برہمن کو برہمنوں کے چنگل سے نکالنے کی ضرورت ہے۔ مسیحیت کو مجھو۔ اسلام کا مطالعہ کرو۔ محبت لا فانی ہے جو خدا اور بندے کے درمیان ہونی چاہیے۔

شبم سے بھیج دو صبح کا یہ منظر کیسا حسین ہے

درخت سورج کی کرنوں میں

جو فرانس اور اس سے ملحقہ ممالک میں ہوتی ہے۔ میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ موٹر سائیکل، اسکوٹر اور زرعی سائیکل کی ایجاد کے باوجود اس کی اہمیت کم نہیں ہوئی ہے۔ خاص طور پر ہر سال جولائی کے مہینے میں بائیکل ریس ہوتی ہے جس کی ساری دنیا میں بہت اہمیت ہے۔

یہ ریس یکم جولائی 1903ء میں اب سے 114 برس پہلے شروع ہوئی تھی۔ سال نو 2017ء میں 104 ویں ریس ہو چکی ہے۔ دونوں عالمی جنگوں کے دوران اس کا سلسلہ منقطع ہو گیا تھا۔ یہ ریس تین ہفتوں تک ہوتی ہے اور اس کے 21 مرطلے ہیں۔ ایک روز میں ایک مرحلہ طے کیا جاتا ہے۔ اس میں صرف فرانس ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کے کھلاڑی حصہ لیتے ہیں۔ جن کی میں یا بائیس ٹیم بنائی جاتی ہیں۔ ہر ٹیم میں نو سائیکل سوار ہوتے ہیں۔ ریس کا اختتام پیرس میں ہوتا ہے اور تقریباً 3500 کلومیٹر فاصلہ طے کیا جاتا ہے۔ جیتنے والے کھلاڑی کو پیلرنگ کی جرسی پہنائی جاتی ہے اور انعامات سے نوازا جاتا ہے۔ پہلی جرسی اس لیے کہ لا آؤ اخبار پیلرنگ کے کاغذ پر شائع ہوتا ہے۔

ریس کا آغاز مسند جھنڈا لہرا کر کیا جاتا ہے۔ کھلاڑیوں کو ایک دوسرے سے متفوق کرنے کی اجازت ہے، وہ ایک دوسرے کو زبردستی کی بنا پر چھو بھی سکتے ہیں، لیکن دھکا نہیں دے سکتے۔ دھکا دینا غیر اخلاقی حرکت ہے۔

پہلے سال میں جیتنے والے کھلاڑی کو 20,000 فرانک دیے گئے تھے۔ اس کے بعد انعام کی رقم بڑھادی گئی اور جیتنے والے کو ایک فلیٹ بھی رہائش کے لیے دیا جانے لگا۔ 1988ء میں جیتنے والے کو ایک کار، رہائش کے لیے فلیٹ اور 500,00 فرانک دیے گئے۔ جب پورو (مسک) لین دین میں استعمال ہونے لگا تو جیتنے والے کھلاڑیوں کو 450,000 پورو انعام میں دیے جانے لگے۔

ریس کا یہ سلسلہ فرانس کے دو بڑے اسپورٹس کے اخبارات متفقہ کرتے ہیں جن میں لی ویلو (اشاعت 80,000) اور لا آؤ (اشاعت 25,000) جو بڑھ کر 65,000 ہو گئی شامل ہیں۔ پانچ سال بعد ان دونوں اسپورٹس اخبارات کی اشاعت لاکھوں تک پہنچ گئی ہے۔ یہ ریس کاروباری افراد اور صحافیوں کے تعاون سے ہوتی ہے۔

ابتدا میں یہ ریس رات میں بھی ہوتی تھی، لیکن تین برس بعد صرف دن میں ہونے لگی، کیونکہ جج صاحبان نے رات کو بیٹھنے سے انکار کر دیا تھا۔

فرانس کی یہ ریس سائیکل کی دھن منت ہے۔ اگر سائیکل ہی نہ ہوتی تو لوگ ریس کا آغاز کیسے کرتے؟ تو ہم آپ کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ سائیکل کیسے عالم وجود میں آئی۔ بائیکل کا مطلب ہے دو پہیوں والی سواری جس میں توازن برقرار رکھنے کے لیے ایک ہینڈل لگا ہوتا ہے۔ 1818ء میں فرانس میں سب سے پہلا سائیکل چلانے کا مظاہرہ ایک میدان میں کیا گیا۔ اس سائیکل میں کڑی کے فریم کے ساتھ صرف دو پہیے تھے۔ کڑی کے فریم کو تاقو کرتے ہوئے زمین پر پاؤں رکھ کر اسے چلایا جاتا تھا۔ یوں کچھ نیچے کر ہینڈلوں کی جگہ ایک تختہ لگا ہوا تھا۔ لوگوں نے اس سائیکل کو دیکھ کر توبہ لیا، لیکن کوئی اس سے متاثر نہیں ہوا۔ کسی نے سائیکل چلانے والے سے یہ پوچھ لیا کہ اس کی جگہ گوارا نہیں کی کہ یہ کبھی اپنی اور اس کی لگات آئی گویا اسے دو خوراکتائیں سمجھا گیا۔ سائیکل چلانے کا مظاہرہ کرنے والے کا نام کارل فون در پاس تھا۔ وہ جرمنی کا سول مرشد تھا۔ سائیکل اس کے نزدیک کھوڑے کا تہاں تھی۔

اسے یہ نیک خیال اس لیے آیا کہ کھوڑے بیمار بھی پڑ جایا کرتے تھے اور سفلے کی کے باعث موت کا شکار ہو جایا کرتے تھے۔ جب کہ سائیکل چارہ نہیں کھاتی اور نہ وہ لپٹیاں جھاڑتی ہے۔ اس سائیکل پر موٹہ لے ایک گھنٹے میں آٹھ میل کا سفر طے کیا تھا۔

اس سائیکل کا وزن 22 کلو گرام تھا جس کے میل بیڑک میں ہینڈل کے پیش لگے ہوئے تھے۔ اس کے اگلے پہیے میں بریک بھی لگایا گیا تھا۔ کچھ افراد کو یہ سواری پسند آئی، مگر ناپسند کرنے والوں کی تعداد زیادہ تھی۔ وہ کہتے تھے کہ اسے چلانے سے ناگوں پر زور پڑتا ہے۔ چونکہ سائیکل پر قابو پانا آسان نہیں تھا، اس لیے سڑکوں پر حادثات بھی ہونے لگے۔ کچھ لوگوں نے آواز بھی اٹھائی کہ اس پر پابندی عائد کر دینا چاہیے۔

سائیکل ابھی پوری طرح متعارف بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس کی وجہ سے حادثات بھی ہونے لگے۔ گلاسگو نیوز پیپر نے 1842ء میں یہ خبر شائع کی جو آج بھی عجیب گھر میں موجود ہے۔ کہ ایک عجیب و غریب چیز جسے بائیکل کہا جاتا ہے ایک نامعلوم شخص نے ایک چھوٹی لڑکی سے کرا دیا، جس سے اسے چوٹ لگی۔ پولیس نے اس شخص پر پانچ شلنگ جرمانہ عائد کر دیا۔

ایک فرانسیسی شخص میچوکس نے 1860ء میں اسے

سائیکل میں تبدیلی کی اور اس میں پیڈلوں کے ساتھ کریمک شافٹ کا اضافہ کیا۔ جس کا سامنے کا پہناکانی بڑا تھا۔ بہر حال 1868ء میں پہلی بار لوگ اس کے نام سے روشناس ہوئے کیونکہ ڈبلیو نیوز میں اس پر تفصیلی مضمون شائع ہوا تھا۔

1886ء میں ایک جینی بن جیم نے دوسری سائیکل ایجاد کی۔ تیسری سائیکل کی ایجاد کا سر اوٹیس جانسن نامی شخص کو جاتا ہے جس کا تعلق لندن سے تھا۔ اس نے دونوں پہیوں کا باہم شلک کرنے کے لیے کڑی کے تختے کی جگہ ایک لہری دار پٹی لگائی تھی۔ اس سائیکل کے پہیے بڑے تھے۔

ایک لوہار نے داغ سوزی کر کے نئی سائیکل ایجاد کر ڈالی، جس کا پچھلا پہنا اگلے سے بڑا تو تھا ہی مگر دونوں پہیوں کے وسط میں ایک سلاخ لگا کر انہیں باہم جوڑ دیا گیا تھا۔ جب کہ اگلے پہیے کے وسط سے دو سلاخیں ویلڈ کر کے اس میں ہینڈل بھی لگا دیا گیا تھا۔

1887ء میں کچھ پیش رفت ہوئی اور ایسی فولادی سائیکلیں بھی ایجاد کی گئیں جن میں تین یا چار پہیے لگے تھے۔ لیکن اسے لوگوں نے مسترد کر دیا، اس لیے کہ یہ سائیکلیں بھاری تھیں اور انہیں چلانا دشوار تھا۔

کچھ وقت گزرنے کے بعد گلاسگو میں دوسرے لوہار کیون ڈبلیو نے سائیکل میں چند تبدیلیاں کیں اور ایک آرام دہ سیٹ دونوں پہیوں کے وسط میں جوڑ دی۔ جس سے سائیکل پر بیٹھنا آسان ہو گیا۔ وہ کپڑا فروش بھی تھا، لہذا اس نے سائیکل پر کپڑا رکھ کر دروازے علاقوں کا دورہ کیا اور اپنے کاروبار کو فروغ دیا۔ اس کی سائیکل کا نمونہ اب بھی گلاسگو کے عجائب گھر میں محفوظ ہے۔

1889ء میں ٹامس میک کال نے جو کھلاڑیوں کوک (فرانس) میں رہتا تھا سائیکل کے ڈیزائن میں تبدیلی کی اور دونوں پہیوں کے درمیان میں ہینڈل جوڑ دیا جس سے سائیکل چلانے والے کی ناگوں پر زور پڑنا بند ہو گیا۔ اس کی ایجاد بہر حال لوگوں میں مقبول ہوئی اس لیے کہ اس کا فولادی فریم ہلکا تھا اور سائیکل چلانے میں دقت نہیں ہوتی تھی۔ تاریخ کے مطابق اس کی ایجاد کی ہوئی سائیکلیں مارکیٹ میں فروخت ہوئیں۔

بعد کے برسوں میں سائیکلیں ایجاد ہوئیں اور ان میں پہلے سے زیادہ تبدیلیاں بھی ہوئیں، لیکن دونوں پہیوں کے درمیان رابطہ کے لیے چین (زنجیر) نہیں لگائی گئی

تھی۔ اسی دوران نیو یارک کی ایک کمپنی نے خواتین کے لیے ایک سائیکل ایجاد کی جس کا فریم بڑے حد تک اور سبک تھا۔ اسے چلاتے وقت ناگوں پر زور نہیں پڑتا تھا۔ یہ سبب جد آرام دہ سائیکل تھی، لہذا خواتین میں مقبول ہوئی۔ اس میں دونوں پہیوں کے درمیان فولادی پائپ بھی نہیں لگا تھا، کیونکہ یہ خاص طور پر خواتین کے لیے بنائی گئی تھی۔ تیز رفتاری سے چلاتے وقت اندیشہ تھا کہ خواتین دوسری سوار یوں سے نہ ٹکرائیں گی۔ چنانچہ موٹہ لے اس کی دائیں ہینڈل پر ایک گھنٹی بھی لگادی۔ 1890ء میں فضا کھیتوں کی آواز سے سرخس ہو گئی۔ کچھ خواتین کو اس کا سفر بے حد دل چسپ لگا۔ اسی لیے چند خواتین نے پیرس سے ایوگون تک سائیکل چلانے کا مظاہرہ کیا اور یہ سفر آٹھ دنوں میں طے کیا۔ ان کا یہ سفر گویا ایک کارنامے کی حیثیت رکھتا تھا، اس لیے اس کی خوب تحسین ہوئی اور اخبارات نے ان کی تصاویر بھی شائع کیں۔

سائیکل پہلے بار (سانپ نما) چونکہ فولاد کے بھرت سے بنا تھا، اس لیے اس کے ٹوٹنے کی شکایات عام ہوئیں۔ اس اثنا میں میخاؤس (MICHAUX) کمپنی نے مضبوط فریم کے ساتھ ایک سائیکل مارکیٹ میں متعارف کی جو عوام میں مقبول ہوئی۔ میخاؤس نے اپنے اس اقدام سے مارکیٹ پر قبضہ جمالیا اور اس کمپنی کی بنائی ہوئی سائیکلیں خوب فروخت ہوئیں۔

امریکا کے لوہار اس معاملے میں پیچھے نہیں تھے۔ ایک موٹہ لائٹ نے فولادی پہیوں پر ٹھوس ربوڑ چڑھا دیا اور پہیوں کے وسط میں ہال بیڑک کا استعمال کیا، جہاں سائیکل کی تیلیاں آکر جڑتی تھیں۔ سائیکل کے موٹہ نے تو اسے بہتر بنانے کی پوری کوشش کر ڈالی لیکن امریکا میں سائیکل اتنی مقبول نہیں ہوئی جتنی کہ یورپ میں، اس کی وجہ یہ تھی کہ یورپ کے مقابلے میں امریکا کی سڑکیں خراب تھیں۔ چنانچہ سائیکل چلانے والوں کو دقت پیش آتی تھی۔ برطانیہ کی سڑکیں بہت بہتر تھیں اس لیے وہاں یہ سواری تیزی سے مقبول ہوئی۔ فضا میں تینوں کی آواز کو بجھنے لگی۔

1891ء میں یوین میئر نے ایسی سائیکل ایجاد کی جس کا تعلق فرانس سے تھا۔ اس نے سائیکل کا فریم بے حد ہلکا کر رکھا اور زیادہ فاصلہ طے کرنے کے خیال سے اگلا پہنا بڑا رکھا۔ اس کے پہیوں میں تیلیوں کی تعداد معمول سے زیادہ تھیں۔ جس سے مضبوطی پیدا ہو گئی۔

نڈلا سکا۔ 25 فروری کو کانگریس نے بغیر کسی الٹیشن کے شیخ عبداللہ کو سری نگر کے تخت پر مسلط کیا تو 25 فروری 1975ء کو ڈاکو القطار علی بھٹو نے پاکستان اور آزاد قزاقستان کشمیر میں بروز جمعہ المبارک مکمل ہڑتال کی کال دی۔ زبردست اور تاریخی ہڑتال ہوئی اور سری نگر کے لال چوک میں کشمیری عوام نے ایک مرتبہ پھر ہڑتال پر جم لہرایا۔ بھارت نے 4 مارچ 1975ء کو بائیس ہجری بھارتی لوک سبھا اور راجہ سبھا سے اس معاہدہ کی توثیق کروائی۔ پاکستان نے اقوام متحدہ سے احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ یہ اقوام متحدہ کی قراردادوں اور شملہ معاہدے کے مندرجات کی خلاف ورزی ہے۔ 1981ء میں جب ریاستی اسمبلی کے انتخابات کا اعلان کیا گیا تو تمام کشمیری سیاسی جماعتوں نے ایک مشترکہ پلیٹ فارم کے ذریعے الٹیشن لڑنے کا فیصلہ کیا۔ مسلم متحدہ محاذ کے رہنما ڈاکو نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ الٹیشن جیت کر ہندوستان کے ساتھ الحاق کی اس قرارداد کو ریاستی اسمبلی میں نامزد قرار دیں گے۔ حریت کانفرنس کے موجودہ سربراہ سید علی گیلانی اور جہاد کونسل کے صدر سید صلاح الدین نے بھی ان انتخابات میں حصہ لیا۔ 23 مارچ 1987ء کو ریاستی اسمبلی کے انتخابات میں مسلم متحدہ محاذ کی واضح اور فیصلہ کن فتح کو دیکھ کر ہندوستان کے ذریعے شکست میں تبدیل کر کے ہندوستان نے کشمیری عوام کی بڑا سونے سے تبدیلی لانے کی خواہش کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا۔ یہی وہ نقطہ آغاز تھا کہ جمہوری طریقے سے جدوجہد کرنے والے اور انتخابات میں حصہ لینے والی قیادت مسلم جدوجہد شروع کرنے پر مجبور ہوئی۔ شیخ عبداللہ جس نے کشمیریوں کے دلوں پر برسوں حکومت کی اور شیر کشمیر کا لقب پایا۔ وہی شیخ عبداللہ اندرا عبداللہ ایکارڈ کے بعد صدر کشمیر قرار پایا۔ دہلی کی تہذیبوں میں شہید کشمیر مقبول ہٹ نے اپنے خون سے جس انقلاب کی بنیاد رکھی۔ اسے کشمیر اور پاکستان حریت پسندوں نے اپنے خون سے آج تک جاری رکھا ہوا ہے۔ ہندوستانی سرکار کے اعصاب شل ہوئے تو حریت پسندوں کی تلاش میں مگر مگر تلاشی، کرک و ڈاکو اور خواتین کی عصمت دری معمول بن گئی۔ جس کے رد عمل میں کشمیر سے پہلے درجنوں پھر سینکڑوں اور بعد میں ہزاروں افراد کے قاتلانہ لشروں لائن کو عبور کر کے آزاد کشمیر پہنچنا شروع ہو گئے۔

مرسلہ: فاروقی خان۔ مظفر گڑھ

پانچ فروری کے یوم بھتیجی کی اہمیت کیا ہے یہ جاننے کے لیے تحریک آزادی کشمیر کے پس منظر کو جاننا ضروری ہے۔ کشمیری عوام کی تحریک آزادی اسی روز سے شروع ہوئی تھی جب انگریزوں نے گلاب سنگھ کے ساتھ بدنام زمانہ معاہدہ امرتسر کے تحت 16 مارچ 1846ء کو کشمیر کا 75 لاکھ روپے ٹانگ شلای کے عوض سودا کیا۔ 13 جولائی 1931ء کو سری نگر جیل کے احاطے میں کشمیریوں پر وحشیانہ فائرنگ کے نتیجے میں 22 مسلمان شہید اور 47 شدید زخمی ہو گئے۔ اس واقعہ پر بلا ہو میں آل انڈیا مسلم لیگ نے مسئلہ کشمیر کو اجاگر کرنے کے لیے کشمیر کمیٹی قائم کی اور شاعر مشرق علامہ اقبال کو اس کمیٹی کا سربراہ مقرر کیا۔ نومبر 1931ء میں تحریک الاحرار نے غیر مسلح جدوجہد اور سول نا فرمانی کے ذریعے جوں کشمیر کو آزاد کرانے کا مطالبہ کیا۔ گلیٹین کمیٹی قائم کیا گیا۔ 1934ء میں پہلی مرتبہ ہندوستان میں کشمیریوں کے ساتھ اظہار بھتیجی اور ڈاکوہ راج کے مظالم کے خلاف ملک گیر ہڑتال کی گئی۔ 1946ء میں قائد اعظم نے مسلم کانفرنس کی دعوت پر سیرنگ پور کا دورہ کیا جہاں قائد کی دوراندیش نگاہوں نے سیاسی، دفاعی، اقتصادی اور جغرافیائی حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے کشمیر کو پاکستان کی شہریت قرار دیا۔ مسلم کانفرنس نے بھی کشمیری مسلمانوں کی تمنا سنبھال کر دے ہوئے 19 جولائی 1947ء کو سر دارا ابراہیم خان کے گھر سری نگر میں باقاعدہ طور پر قرارداد الحاق پاکستان منظور کی لیکن جب کشمیریوں کے فیصلے کو نظر انداز کیا گیا تو مولانا فضل الہی وزیر آبادی قیادت میں 23 اگست 1947ء کو یلایٹ کے مقام سے مسلح جدوجہد کا باقاعدہ آغاز کیا۔ 15 ماہ کے مسلسل جہاد کے بعد موجودہ آزاد کشمیر آزاد ہوا۔ چوتھوں نے اقوام متحدہ پہنچ گئے اور بین الاقوامی برادری سے وعدہ کیا کہ وہ ریاست میں رائے شماری کے ذریعے ریاست کے مستقبل کا فیصلہ مقامی عوام کی خواہشات کے مطابق کریں گے۔ سلامتی کونسل کی ان قراردادوں میں کشمیریوں سے وعدہ کیا گیا کہ انہیں رائے شماری کے ذریعے اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق دیا جائے گا لیکن اپنے وعدے کو پورا کرنے کے بجائے ہندوستان نے مسلم شخص کو قتل کرنے کے لیے کشمیر کے وقت ساڑھے تین لاکھ کشمیریوں کو بھوں میں شہید کیا لیکن 13 نومبر 1947ء کو شیخ عبداللہ نے اندرا گاندھی کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جو تاریخ میں (اندرا عبداللہ ایکارڈ) کے نام سے موسوم ہے۔ دہلی ایکارڈ شیخ محمد عبداللہ کو اس کی خواہش کے باوجود 1953ء کی پوزیشن

شروع کر دی۔ 1920ء میں اسے بچوں کا کھلونا کہا گیا۔ 1940ء میں چھٹی سائیکل امریکا میں تیار ہوئیں وہ صرف بچوں کے لیے تھیں۔ جب کہ یورپ کے بیشتر ممالک میں سائیکل ریس ہونے لگی تھیں اور بالغ افراد کو یہ ہلکی پھلکی سواری اس لیے پسند تھی کہ کاروں کی نسبت اس کی سڑکیں علیحدہ تھیں اور اس میں بیڑوں نہیں ڈلوانا پڑتا تھا اور اس کی بیڑی بھی ڈسپارچ نہیں ہوتی تھی، بلکہ اس میں سرے سے بیڑی کا استعمال ہی نہیں ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ آٹو اور موٹر سائیکل کی ایجاد کے بعد بھی لوگوں کا میلان اس کی طرف رہا۔ برطانیہ میں فلیس، ہرکلیس اور گریمپ کے بڑے کارخانے تھے جو ہر برس لاکھوں کی تعداد میں سائیکل تیار کرتے تھے۔ 1920ء میں چھ ہندوستانیوں نے دنیا کے گرد چکر لگایا اور 71000 کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا۔ دوسری جنگ عظیم میں فوجیوں نے بھی سائیکل کا استعمال کیا۔ بیسویں صدی میں سائیکل نے مقبولیت حاصل کر لی اور اس کے دس لاکھ ماڈل فروخت ہوئے۔ سائیکل کے ٹھوس پہیوں کی جگہ ٹائر اور ٹیوب استعمال کیے جانے لگے جو فولادی فریم پر چڑھائے جاتے تھے۔ اس سے فولادی پہیوں کی ٹوٹ پھوٹ میں کمی واقع ہوئی۔ البتہ سفر

ساری دنیا کا چکر لگایا اور خوب شہرت پائی۔ حیرت انگیز بات ہے کہ اس نے اپنے دنیا کے سفر میں آپس جیسے پہاڑ کو بھی سائیکل پر بیٹھ کر عبور کیا تھا۔ خاتون خاص طور پر سائیکل پر بیٹھنے وقت اپنے اسکرٹ کی بنیاد پریشان ہو جاتی تھیں۔ بیڈل پر پاؤں مارنے وقت وہ اٹھ جاتا تھا یا اس وقت جب کہ ہوا تیز چل رہی ہوتی تھی، چنانچہ ان کے لیے خاص قسم کا اسکرٹ بنایا گیا جس کے نیچے حصے میں لاسٹک لگی ہوئی تھی جو اسکرٹ کو نیچے سے چپکا لیتی تھی اور اڑنے نہیں دیتی تھی۔ سائیکل کے ڈھانچے پر مزید توجہ دی گئی اور اسے اسٹیل کے پائپوں سے بنایا جانے لگا۔ مضبوط اور پائیدار، پھر دھنچے میں دل کش، ہر پرزہ خوبصورت میں پہنا جاتا تھا۔ بریک سسٹم بہتر ہو گیا تو حادثات میں کمی واقع ہوئی۔ برطانیہ نے اس صنعت کو اتنا فروغ دیا کہ 1895ء میں نیدر لینڈ میں 85 فی صد سائیکل برطانیہ کی استعمال ہوتی تھیں۔ برطانیہ اور یورپ کے دوسرے ممالک میں سائیکل سے لوگوں کو دلہانہ عہد ہو گیا تھا، لیکن 1900ء سے 1910ء تک امریکا میں اس کا رجحان ختم ہونے لگا۔ اس کی بجائے لوگوں نے آٹو موپائل کی طرف توجہ دینا

ماہنامہ مسرگوشٹ

تھا، اس لیے سائیکل کی طرف کوئی توجہ نہیں دے رہا تھا مگر برطانیہ میں اس صنعت کو خوب فروغ حاصل ہوا۔ جن لوگوں کو یہ سواری بھائی تھی وہ اس کا پیچھا پھوڑنے پر آمادہ نہیں تھے۔ کوئٹہ، آکسفرڈ، برمنگھم اور مانچسٹر سائیکل کے مراکز بن گئے۔ وہ ممالک جو انگریزوں کے غلام تھے، وہاں سائیکل کو فروخت کرنا آسان ہو گیا۔ 1892ء میں سائیکل کے دونوں پہیوں کو چین (زنجیر) سے باہم منسلک کر دیا گیا۔ اس خیال سے کہ چین ٹانگوں کو گڑھ پر چنچا دے اسے چین کے کور سے ڈھانک دیا گیا۔ اس کے دونوں پہیے تقریباً برابر تھے۔ یہ آجکل کی سائیکل سے بہت حد تک مشابہ تھی۔ اسے وہی نام ہی ملا جو آج تیار کیا تھا۔ اسی برس آئزک جانسن نے جو افریقی، امریکی تھا، نے اپنی سائیکل کو پیڈل کر لیا جس کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ درمیان سے فولڈ ہو جاتی تھی، اس طرح سے اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے اور لے آنے میں سہولت ہو جاتی تھی۔ سائیکل چلانے کا شوق بتدریج بڑھتا جا رہا تھا۔ 1895ء میں ایک خاتون اپنی لندنی نے اپنی سائیکل پر

چند برس بعد برطانیہ کے جیمز اسٹارلے نے ٹھوس فولادی ڈھانچے کی جگہ فولادی پائپ استعمال کیے جن سے ڈھانچا مزید ہلکا ہو گیا۔ سائیکل ہوا سے تھیں کرنے لگی۔ جیمز اسٹارلے کو سائیکل کی صنعت کا باوا آدم سمجھا جانے لگا۔ اس کی ایجاد کردہ سائیکل کا اگلا پہنچا بہ حال بڑا تھا اور اس کا قطر ساٹھ انچ کے قریب تھا۔ سائیکل کو مقبولیت حاصل ہوئی، لیکن اتنی نہیں جتنی کہ ہونا چاہیے تھی۔ لوگ اب بھی کھڑے دوڑانے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ سائیکل ایک وہابیات سواری ہے۔ اس پر کوئی معزز شخص سواری نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ ان کے پیش نظر سائیکل سے ہونے والے حادثات بھی تھے۔ جب سائیکل کی رفتار تیز ہوتی تھی تو سوار اگلے پیسے سے گر پڑتا تھا اور اسے چوٹیں آتی تھیں۔ سوار جب بریک لگاتا تھا تو سائیکل سے گر پڑتا تھا اور اس کی کلائی کی ہڈی ٹوٹ جاتی تھی۔ یوں تو ملکہ برطانیہ کے پاس بھی ایک سائیکل تھی مگر اس بات کا کوئی ثبوت اب تک نہیں ملا کہ انہوں نے بھی سائیکل چلائی ہو۔ فرانس ان دنوں ایران سے جنگ کرنے میں مصروف

کے دوران یہ خیال ضرور رکھنا چاہیے تھا کہ ہائرس میں مطلوبہ ہوا کی مقدار دینے کے نہیں۔ بریکنگ سسٹم کو مزید درست کیا گیا اور اسے ہینڈل کے ساتھ لگا دیا گیا کہ سائیکل سوار جب چاہے اسے ڈبا سکے۔ ذات کو مفر کرنے والوں کے لیے اس کے سامنے کٹر رخ پر ہیڈ لیمپ لگایا گیا جو چھوٹے سے جزیئر سے روشن ہوتا تھا۔ سائیکل کے پچھلے پہلے کے ساتھ اسٹینڈ لگا دیا گیا تاکہ سائیکل کو اس کے سہارے سے گھرا لیا جاسکے۔

چین نے 1948ء میں آزاد ہونے کے بعد سائیکل کا بڑے پیمانے پر استعمال کیا۔ حکومت نے جو سائیکل متعارف کرائی اس کا نام پرواز کرتا کبوتر تھا۔ پالیسی میکرز کا کہنا تھا کہ ایک تو ہمارے ملک میں پیٹرول کا خرچ کم ہوگا، دوسرے یہ کہ عوام الناس سائیکل چلائیں گے تو ان کی ٹانگوں کی ورزش ہو جائے گی۔ تیسرے یہ کہ فضا آلودہ نہیں ہوگی۔ موٹر گاڑیوں کی بہتات سے فضا میں کاربن اور جلے ہوئے پیٹرول کی آلودگی پیدا ہوتی ہے۔ لوگوں نے اپنے رہنماؤں کی گفتگو کو مد نظر رکھتے ہوئے سائیکل خریدیں۔ جس کے نتیجے میں پہلے برس میں تیس لاکھ سائیکل فروخت ہوئیں۔ اگلے برسوں میں ان کی تعداد میں مزید اضافہ ہوا۔ چین کے بعد اٹلی میں بڑے پیمانے پر سائیکل بننا شروع ہوئیں (جن کی تعداد موٹر سائیکل بننے کے بعد بہر حال کم ہو گئی)۔

1980ء میں سویڈن کی کمپنی "ایئرا" نے پلاسٹک کی سائیکل بنائی۔ مگر لوگوں نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ انہیں معلوم تھا کہ فولادی سائیکل کے مقابلے میں پلاسٹک جلد ٹوٹ پھوٹ جائے گا۔ ایسی سائیکل خریدنے کے بعد وہ خود کو کوسنے کے سوا کیا کر سکیں گے۔ البتہ اس سائیکل کو ترجیح دی جو پیپر سے تیار کی گئی تھی۔ اس کی رفتار سے چلتی تھی اور اس میں ٹانگوں کی طاقت بھی کم خرچ ہوتی تھی۔ سڑک اچھی ہو اور سائیکل سوار کی ٹانگوں میں طاقت بھی ہوتی تھی۔ سائیکل چھاپی سلیٹ کی گھنٹی کی رفتار سے بھی چلائی جاسکتی ہے جیسا کہ سائیکل چلانے کے انعامی مقابلوں میں ہوتا ہے۔

البتہ جب اسپورٹس سائیکل مارکیٹ میں آنے لگیں تو لوگوں نے اس کا بڑھ چڑھ کر استقبال کیا۔ ان سائیکلوں کا ڈھانچا بہت مضبوط تھا اور اس کے ہینڈل مڑے ہوئے تھے، تاکہ سوار کو ایسے موڑنے میں آسانی ہو۔ ہائرس سویت سے پائیدار تھے تاکہ وہ طویل سفر کر سکیں۔ پھر پہاڑوں پر چلانے والی سائیکل متعارف ہوئیں جن کے ہائرس ضرورت کے مطابق ڈھانچے رکھے گئے تھے۔

وہ سائیکل جو ریس کے مقابلوں میں حصہ لیتی ہیں ان میں بریک نہیں لگائے جاتے اس لیے کہ ریس میں حصہ لینے والوں کے ٹریک علیحدہ ہوتے ہیں اور انہیں ایک ہی سمت میں جانا ہوتا ہے۔ پھر یہ کہ سائیکل سوار نہایت آسانی سے سائیکل کی رفتار دہشتی کر سکتا ہے، اس لیے کہ ان سائیکلوں میں گیزر نہیں ہوتے ہیں اور فری ویل نہیں ہوتا جبکہ فری ویل کے بغیر سائیکل کار کرنا ممکن نہیں۔ چنانچہ جب پچھلا پیتا گھومتا رہتا ہے کہ بریک بھی گھومتا رہتا ہے۔ سائیکل کی رفتار دہشتی کرنے کے لیے سوار پیدلوں پر دباؤ ڈالتا ہے، جو بریکنگ سسٹم کا کام کرنے لگتے ہیں۔ بہر حال یہ اتنے موثر نہیں ہوتے جتنے کہ سامنے کے پہلے رکھے ہوئے بریک۔

2000ء میں سائیکلوں میں کمپیوٹر لگایا جانے لگا اور سادے گیزر کی جگہ الیکٹرونک گیزر استعمال ہونے لگے۔ اس کے علاوہ اسے رکھنے کی جگہ کی بجائے اور سائیکل کو ایک مقام سے دوسرے مقام تک لے جانے کے لیے جو ہولت درکار ہوتی ہے، اس کے لیے سائیکل کے دو حصے کو دبے گئے ہیں اور درمیان میں قبضے لگا دیے ہیں جس سے سائیکل کو درمیان سے فولد کیا جاسکتا ہے۔ اس کے لیے علیحدہ سے کوئی دامن نہیں ہوتا۔ بہت سے ریلوے اسٹیشنوں پر سائیکل پارک کرنے کی جگہ مخصوص کر دی گئی ہیں۔ جہاں کوئی کرانہ بھاڑ نہیں لیا جاتا۔ سائیکل کی دکانیں کھلے ہوئے کافی عرصہ گزر چکا ہے جہاں سے آپ سائیکل کرائے پر لے کر اپنا کام ختم کرسکتے ہیں۔

ابتداء سے لے کر اب تک سائیکل بنانے کے میٹرل میں کافی فرق آچکا ہے۔ ابتدا میں سائیکلوں میں جو میٹرل استعمال ہوا وہ ہوائی جہازوں میں استعمال ہوتا تھا، تاکہ اس کا وزن کم رہے مگر مصنوعی اور پائیداری اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی ہو۔ 1930ء میں سائیکلوں کے فریم اور فورک ٹیوب میں بھرت استعمال کیا گیا۔ پھر 1980ء میں اس کا فریم اسٹیل کے بجائے آلومینیم کا بننے لگا۔ جبکہ کچھ سائیکلوں میں کاربن فائبر استعمال ہونے لگا۔ کاربن فائبر اتنا ہلکا ہوتا ہے کہ سائیکل کا مکمل فریم صرف 2.2 کلو گرام کا بن جاتا ہے۔ بہت سی سائیکلوں میں ایک ڈیجیٹر استعمال ہوتی ہے جو سوار کی ٹانگوں کی طاقت کو پچھلے پہلے تک نیکھ کر بتاتی رہتی ہے۔

جہاں تک گیزر کا تعلق ہے تو اس وقت جبکہ سائیکل کسی پہاڑی سے نیچے اتر رہی ہوئی ہے تو اس میں طاقتور گیزر استعمال ہوتے ہیں، لیکن ہموار سطح پر میڈیم گیزر اور پہاڑی پر چڑھنا تو کم طاقت کے گیزر استعمال ہوتے ہیں۔

سفر کرنے والی سائیکلوں میں ایسا اہتمام کیا جاتا ہے کہ جن میں سامنے اور پیچھے کے رخ پر چھوٹے بریک لگے ہوتے ہیں، فیڈر اور ڈیڈ گاؤڈ لگے ہوتے ہیں۔ ان میں سفری بیگوں کے علاوہ پانی کی بوتلیں رکھنے کی سہولت بھی ہوتی ہے۔ جب سائیکل پانی سے گزرتی ہے تو ڈیڈ گاؤڈ اور فیڈر سوار کی پانی سے حفاظت کرتے ہیں۔ جبکہ چین گاؤڈ سوار کے کپڑوں کی حفاظت تیل سے کرتے ہیں، مبادا اس کے پڑے پھین سے رگڑ نہ کھا جائیں۔

سائیکل میں اسٹینڈ بھی لگا ہوتا ہے تاکہ جب اسے سیدھا کھڑا کرنا ہو تو اس سے مدد لی جاسکے۔ چوری سے حفاظت کے لیے اس میں تالا بھی لگایا جاسکتا ہے۔ آگے اور پیچھے ہاسٹ بھی لگی ہوتی ہیں تاکہ ان میں سامان رکھا جاسکے۔ بچوں کے بیٹھنے کے لیے اس میں پیچھے کی طرف ایک سیٹ لگی ہوتی ہے۔

اب سائیکلوں میں کمپیوٹر بھی لگائے جاتے ہیں تاکہ اس کی رفتار چیک کی جاسکے، سوار کے دل کی دھڑکن کو جانچا جاسکے۔ اس کے علاوہ سائیکلوں میں روشنی کرنے کا انتظام بھی ہوتا ہے تاکہ سوار کو رات میں پریشانی نہ اٹھانا پڑے۔ ریفلکٹر، آئینے اور گھنٹی بھی لگی ہوتی ہے۔ پانی کی بوتل لگانے کا انتظام بھی ہوتا ہے جس سے سوار سفر کے دوران پیا سا ہوتا پانی کے چند گھونٹ تعلق سے اتار سکے۔ سواروں کے لیے اب سیٹ بھی بنائے جا رہے ہیں تاکہ حادثے کے وقت یا سڑک پر پھسلنے کی بنا پر اسے چوٹ نہ لگے۔

چمچر لگانے کے لیے سائیکلوں کے ساتھ اب اوزاروں کا جھنڈا بھی دیا جانے لگا ہے، جس میں مختلف قسم کے لیورز، سینڈ پیپر (تاکہ چمچر ہونے کی صورت میں ٹائز کو رگڑ کر صاف کیا جاسکے) کبر سلوشن اور چمچر لگانے کے لیے ربر کے گول گلاس وغیرہ ہوتے ہیں۔

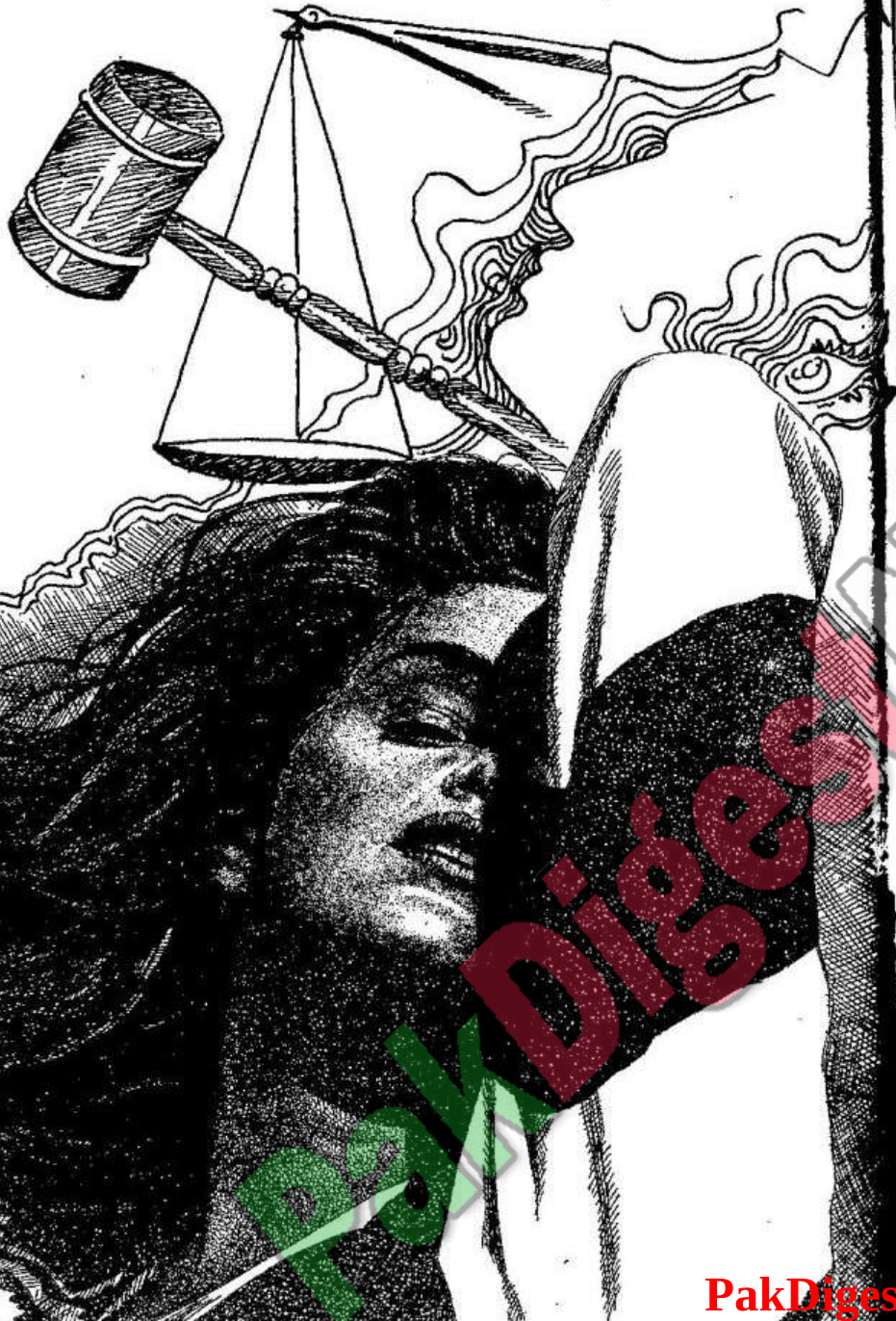
سائیکل چلانے کے دوران چونکہ اس کے اسکرپٹرز ڈھیلے ہونے کا احتمال ہوتا ہے، لہذا فول ٹیکس فراہم کیا جاتا ہے جس میں پتلا سارنچ ہوتا ہے، اس کے علاوہ بال بیئرنگ، اسکرپٹرز اور نیو اور چین ٹول بھی ہوتا ہے۔

سائیکل سے خاص طور پر مصافحاتی علاقوں میں آدھ رقت میں آسانی ہو گئی ہے۔ گھوڑا گاڑی کی جگہ سائیکل نے لے لی ہے۔ پھر رفتار میں بھی فرق پڑا اور کم وقت میں کام ہونے لگا (سائیکل کی جگہ اب موٹر سائیکل اور اسکوٹر نے لے لی جس سے مزید وقت بچنے لگا ہے)۔ سائیکل کی افادیت

بہر حال برقرار ہے۔ ابتدا میں جب کارخانے رہائشی علاقوں سے دور ہوا کرتے تھے تو محدود سائیکلوں پر ہی کام پر جایا کرتے تھے (اس زمانے میں موٹر سائیکل نہیں چلتی تھیں)۔ برطانوی حکومت نے مزدوروں کو سہولت دینے کے لیے اس پر ٹیکس نہیں لگایا۔ سائیکل مارکیٹ میں آنے کے بعد نیو لینڈ کی حکومت نے ریلوے پر فری پارکنگ لاٹ بنانا شروع کر دیے، اس کے علاوہ سائیکلوں کی مرمت کے لیے بھی دکانیں کھولی گئیں۔ لوگوں کو ترغیب دی گئی کہ وہ سائیکل چلائیں تاکہ دوپہر کا فائدہ حاصل ہو۔ جسمانی ورزش ہو جائے (ایک میل سائیکل چلانے سے 22 کیلو ریزیا حرارے خرچ ہوتے ہیں) اور وہ کم وقت میں کام پر پہنچ سکیں۔ غریب اور مفلس افراد نے جب سامان لے جانے اور لے آنے کے لیے سائیکل استعمال کرنا شروع کیں تو..... مجموعی طور پر ان کی غربت 35 فیصد کم ہو گئی۔ ابتدا میں امریکا اور برطانیہ میں خواتین نے احتجاج کیا کہ لیے اسکرٹ کی وجہ سے انہیں سائیکل چلانے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے، لہذا انہیں کم لمبا اسکرٹ پہننے کی اجازت دی جائے (ان کے اسکرٹ کی لمبائی عدالت کی طرف سے مقرر کی)۔ انہیں چھوٹا اسکرٹ پہننے کی اجازت دے دی گئی۔ جب سائیکل بڑے پیمانے پر بننا شروع ہوئیں تو کارخانوں میں کام بڑھ گیا اور مزدوروں کو زیادہ سے زیادہ روزگار ملنے لگا۔ ایران میں خواتین کے لیے اسلامی سائیکل بننا شروع ہو گئی ہیں جو عباہ پہننے والیاں بہ آسانی چلا سکتی ہیں۔ 2009ء تک دنیا میں 130 ملین سائیکل فروخت ہو رہی ہیں۔ جن میں سے صرف چین میں 60 فیصد بنتی ہیں۔

سائیکل چونکہ کچھ بھی بھٹکی ہوتی ہے، چنانچہ اس کی چوری کے واقعات میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ دنیا میں سائیکل چینی ہیں اس کی بچاس فیصد چوری ہو جاتی ہیں۔

دنیا کی سب سے بڑی سائیکل بنانے کا شرف جنوبی آسٹریلیا کو حاصل ہے جو 135.10 فٹ لمبی ہے، جسے چار افراد کر چلائے ہیں۔ موٹر سائیکل کے ایجاد ہونے کے بعد سائیکل کا مستقبل تاریک نہیں ہوا ہے۔ مصافحاتی علاقوں میں اب بھی سائیکل استعمال ہوتی ہیں۔ کمپیوٹر کے چھوٹے موڈ پر بڑے تو اس میں لگ ہی رہے ہیں، الیکٹرونک کے پڑے لگانے کے بعد یقیناً اس کی افادیت اور مانگ میں اضافہ ہوگا۔



قسط نمبر: 13

ناسور

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

وہ ایک سیدھا سادہ معصوم فطرت نوجوان تھا اور اس کے گرد سازشی ذہنیت والوں کا انبوہ تھا۔ ایسے سازشیوں کے لیے وہ ترنوالہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ان کے پھیلائے ہوئے تار عنکبوت میں پھنسا چلا جا رہا تھا کہ اسے احساس ہوا کہ اب مفر کی کوئی راہ نہیں ہے۔ اسے بھی ان کا جواب دینے کے لیے خم ٹھونکنا ضروری ہے اور پھر اس نے کمر کس لی۔ انہی کے لہجے میں انہیں جواب دینے کی کوشش کی۔

ایک ایسی طویل کہانی جس کا ہر باب ایک نئی کہانی ہے

رانا بٹیکر کی بیوی کا کل ہوا کیا تھا اور اس میں آیا تھا جو میں نے اس جرم میں اسے پھانسی ہوگئی۔ اس جرم میں کا بیان اسی ایک دو تیسرے کے ساتھ مل کر قاتل کو دھوڑنے کے لیے کوکھ کر کے لگا۔ اسی دوران رانا بٹیکر اپنی بیوی کے ساتھ نعمان کے دروازے پر پہنچا۔ وہ مٹائی ہاتھ آیا تھا کیسے اب اسے بھی لگ رہا تھا کہ قاتل کوئی اور ہے۔ نعمان ایک لاری ڈالنے کی پوچھ میں اسے ایک ہی صدمہ میں صدمہ میں کیا تھا۔ کچھ لوگ چاہے گئے کہ یہ ادا ختم ہوئے اور اس کی زمین پر عمارت بنا کر فروخت کیا جائے۔ اس سلسلے میں کچھ لوگ میری سے کام کر رہے تھے لیکن ان کی یہاں اٹھانی اسی رات دینا دیا بھی وہ اس سلسلے پر غور کر رہی رہا تھا کہ رانا بٹیکر کی بیوی نے اسے ایک ڈائری دی وہی جوتھوڑی کی تھی جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ قاتل کی اور ہے۔ نعمان ان دونوں سسٹوں پر کام کر رہی رہا تھا کہ ایک دن اس کے بھائی بیہم نے اس سے کہا کہ میں آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ بلا کہ ہم ایک جواں بہن کے بھائی بھی ہیں اس کے لیے کچھ سوچنا ہے پھر اس نے کہا کہ میں نے بہن کو اکثر مات میں کسی سے فون پر بات کرتے دیکھا ہے۔ باتوں سے لگا کہ وہ کسی کو پھنسا کر گئے ہیں۔ بیہم کے جانے کے بعد میں سوچ میں ڈوب گیا تھا کہ فرمان کا بیٹھ آگیا کہ اسے ڈائری کا پارت ٹول گیا ہے۔ اگلے دن تو میرے ساتھ میں فرما کے گھر گیا تو ڈائری کے واقعات سے جس نے رفت تھل کے دوائے کو میرا بھائی تھا اس دن میں اڑے پر بیٹھا تھا کہ کچھ لوگ آگئے۔ اس میں عزت مرغان بھی تھا جس کو اکثر کی بہن فوٹو کی کشش کا ذمے دار سمجھا جاتا تھا۔ میں نے مزید غائب سے کہا کہ آپ سے مل کر خوش ہوئی ہے۔ میں خوشی کا چاہتا ہوں کہ کاروباری حضرات کو بھی سمجھ لے لیکن میں چاہتا ہوں کہ یہ معاملہ باختر میں ہو لیکن ان لوگوں نے منع کر دیا۔ ان کے جانے کے بعد میں سسٹا تھا کہ کالیا کاٹوں آگیا۔ اس نے بتایا کہ عارف چھنڈر جیل سے فرار ہوئے ہونے لگا آگیا۔ یہ خبر سنی تھی میں الجھ گیا۔ گورڈن رپورٹ کی کڑیاں اس کی شرد ہوئی تھیں۔ سسٹو بھائی نے اطلاع دی تھی کہ گورڈن کی آڑ میں فلیٹ کا کاروبار ہوتا تھا۔ سسٹو کو رخصت کر کے میں بیٹھا تھا کہ کالیا آگیا۔ اس نے بتایا کہ میری عزت مرغان ہو چکی ہے اور مجھے گرفتار کرنے کے لیے اسے راج ڈیولادور خان آ رہا ہے۔ میں اس کے ساتھ باہر نکلا اور اس کی ہانگ پر بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ کالیا کے اڑے پر بیٹھا تھا کہ بہن کا فون آگیا۔ اس نے بتایا کہ پولیس گھر پر آئی تھی اور بیہم کو لٹکی ہے۔ مجھ پر اس نے گرفتاری دے دی۔ وہاں مجھ پر تشدد بھی ہوا۔ میں عجلات میں بیٹھا تھا کہ ایک سہاوی نے اسے ایک ایک اخلا دیاب۔ اخبار میں کسی خبر دیکھ کر میں پریشان ہوا تھا کہ بیہم کے قہقہے نے مجھے ہلکا دیا تھا۔ وہ قہقہہ دیکھ کر باہر نکل گیا تھا۔ میں اڑے پر بیٹھا تو وہاں صوبیہ کے کل میں ٹوٹ پڑ گیا۔ میں اس کے دفتر میں بیٹھا تھا اور ان سے صوبیہ کے متعلق پوچھا۔ وہ مجھ پر افشاں میں نے کہا کہ یہ سوال پولیس بھی پوچھتی ہیں اور وہاں سے اٹھ آیا تھا تاہم کہ ہاں بیٹھا تھا میں نے گرفتار یا جیوری کو غلامی کر دی جس کے ٹوک نے وہ ذمہ کی کاروبار کیا تھا۔ گھر آیا تو کافی لٹے آگیا جیوری بہن کو چاہتا تھا۔ وہ اچھا دیا تھا۔ وہ اچھا دیا تھا کہ بہن پریشان ہو گیا۔ پھر اسی رات کالیا کے ساتھ میں بیٹھ ستار کے پٹلے میں داخل ہوئے۔ وہاں روزی نام کی لڑکی بھی تھی۔ سسٹو ستار نے کہا کہ اس نے میری بہن کو ایک جگہ چھوڑ رکھا ہے بھی بلوانا ہوں کہہ کر اس نے کسی کو فون کیا کہ لڑکی کو لے کر آجائے۔ سبھی روزی نے کہا کہ سسٹو ستار صحت یوں رہا ہے۔ اس نے لڑکی کو فون دیا۔ میں نہیں کہیں اور رکھا ہے پھر اس نے بتایا کہ میں بیٹھ ستار سے اپنی بہن کا بدلہ لینے کے لیے اس کے ساتھ ہوں۔ بعد میں اس کا کچھ لکھا۔ اس کے آدیں نے مجھے بھی ڈنگی کر دیا۔ اس وقتوں سے نہت کر میں نے بیٹھ سے اٹھ کر اس کا سسر کو کہاں رکھا ہے اسے باحالت نکال لایا پھر روزی کے پارت میں بیٹھا۔ یہاں سے اس کی نکلی کا قلیت تھا۔ ہم اس سے بات کر رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ پھر ہمارے آواز آئی۔ "کھیل ولاء ملے کر آج ہوں۔" روزی نے دروازہ کھولا تو کھیل والے دو دھکا دے کر وہاں شخص اندر آگئے۔ اس سے نہت کر میں نے اپنے کچھ کامران کو فون پر کہا کہ روزی کی حفاظت کے لیے وہ پولیس والے بھیج دو۔ پھر میں اور کالیا کے ساتھ باہر آگیا۔ اسے کچھ کامران کی معرفت کہی ایک گرفتار کر لیا پھر تیرہ وے کے گھر بیٹھا۔ پھر ضروری باتیں کر کے میں باہر نکلا تھا کہ ایک جیسی پر نظر پڑی۔ میں اسے نظر انداز کرنا کہ میں کسی میں بیٹھا ایک شخص آکر ذمہ کے دروازے پر پہنچا۔ میں ہوشیار ہو گیا اور بھانسا ہوا تیرہ وے کے پڑوس والے گھر میں داخل ہو گیا اور صحت کے ذمہ و تیرہ وے کے گھر میں آکر ایک لمحہ اسی وقت مجھے سے کوئی بٹلے کی آواز آئی اور ایک لڑکی اٹھتی جی ستائی دی۔ جب تک میں بیڑ میں سب کچھ چکا تھا۔ اندر سے ذمہ و متول تھا تیرے دمکیا دیتی ہوئی تھی۔ اس کے پیچھے جلد بھڑکری آتی تھی میں۔ میں نے ذمی پر قابو پا کر نکال دے دی لائے کہہا۔ میں باہر سے دروازہ دھڑ دھڑا گیا۔ مجھے ٹوک آگئے تھے کہ وہ بعد پولیس بھیجی تھی۔ اسے پولیس کے حوالے کیا اور وہاں سے جلا رہا وہی گھر آگیا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اسے اسے بتایا کہ کہ فیمل میں ہے۔ میں اسے پہنچا بیٹھا بیہم نے بتایا کہ کچھ لوگ اس پر پناہ بند کر رہے تھے۔ اس کی ان تین بھی کاٹ دی تھیں۔ سسٹو ستار لگ کالیا کو فون کر کے پناہ ہوا تھا کہ کچھ لوگ وہ کچھ قتل کا بدلہ لینا چاہ رہا تھا۔ استاد بھانسا نے مشورہ دیا کہ خود کو چھپا کر کھوں کی بیک لاری کا کچھ بی بی لے کر میں ہوشیار ہو گیا کہ ہم نے میک اپ کیا اور اسے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچے تو اندر میں موجود تھے۔ ہم نے ان پر قابو پا لیا پھر اگلے روز جب اڑے پر بیٹھا تو انور شاد نے بتایا کہ حاجی مران آیا تھا اور میں لگیا دے کر گیا ہے۔ میں اسے دوست فرقان کے دفتر میں جو بندہ رکھ دیا واقع سے وہاں بیٹھا تو میں رات سے سامنا ہو گیا۔ اس کا کچھ کرنا ہوا میں کیشیروں کے درمیان بیٹھا تو کسی نے مجھے مارنے کے لیے کینٹرنگ گرایا۔ میں تو آج ایک ٹھیک دوسرا شخص دہ کر ہلاک ہو گیا۔ اگلے دن تیرہ وے میرے سامنے اخبار پڑھا دیا جس میں خبر تھی کہ کوئٹہ کے گھر والے دیت پر راضی ہو گئے ہیں۔ میں کالیا کے ساتھ اس کو پڑ چلا جا رہا تھا کہ کھسے پانی میں اس کو ڈالت گئی۔ تبھی ایک گاڑی بھی گئی میں آگئی۔ اس سے ہم پر فائر ہوئے۔ ہم ساکت بڑے تھے کہ کسی کی آواز آئی، لگتا ہے دونوں گھر کے پھر میری سے وہ درجے آئے ہم نے حملہ کر دیا اور پھر میں دشمنوں کی تاب نہ لاکر بے ہوش ہو گیا۔ ہوش آیا تو پہنچل میں تھا۔ صحت یاب ہونے کے بعد میں سامنے والے کے ساتھ میرے بھٹل میں بیٹھا۔ وہاں بزرگ کے تین آدے نظر آگئے جو میرے جھڑ کرنے کے لیے بے ہودہ تھے۔

(اب آگے بیڑھیں)

پختگی ہوئی چاندنی میں میری طرف بڑھتے ہوئے ان کا ہیولے بڑے بڑے پراسرار نظر آرہے تھے۔ میرا اور ان کا یہ دم گھٹنا چلا جا رہا تھا۔ اس نیتوں کے مقابلے میں یارو مدگار اور ہتھیار تھا۔ اس پر مستزاد میری آنکھیں نے کی وجہ سے چلن کا بھی شکار تھیں، میں آنکھوں کو سل سکتا تھا، ایسی صورت میں مزید میری آنکھیں خراب اور جو توڑا بہت مجھے نظر آرہا تھا میں اس سے بھی وحاشا۔ وہ جب بھی کسی کی میرے ہاتھ کچڑ زدہ ہو رہے تھیں اس کی حالت تو بیلے ہی پچھڑے تر تھی۔

رات کے دم بہ خود سناٹے میں اس کے حلق سے یہ آواز
 اُٹھتی تھی جیڑی خوفناک محسوس ہوئی۔ عقبہ والے پہلے
 سے وہ علیا تو اس کے ساتھ والا حملہ آور کی طرف پلٹا کر
 ایک نمودار ہونے والے چوہے نے اس کے پیٹ میں
 اپنی پوسٹ کر دیا۔ وہ بھی اپنے ساتھی کی طرح ایک دل
 چاہنے والے کے ساتھ جیڑی میں گرا۔ تجا نے یہ کون میرا نجات
 تھا جو اس مشکل اور نازک وقت میں میرے کام آ رہا

”سائیں دادا“
 رفتا میرے ٹھکے ہوئے ذہن میں ابھرا تھا۔ اس خوش
 حال سے ہی میرے دھڑکنے والے دل کی لہر دوڑ گئی۔
 سے آنے والا سبز آدمی اپنے دونوں ساتھیوں کا صحبت
 باجم دیکھ کر فوراً ہی غلط ہو گیا اور مجھ سے توجہ ہٹا کر اس
 ہاتھ میں پکڑا ہوا نوکیلا سر کھڑا میرے نجات و ہندو کی
 در سے اچھال دیا۔ اس کا نوکیلا سر انہیں الٹے اس کی

میرا نجات دہندہ کرنے کے بعد پھیل کر اٹھنے کی کوشش میں تھا کہ میں نے اس غیبی سب آدنی کو خوشخوار خراہٹ کے ساتھ اس پر چبھتے دیکھا۔ جو شیطانی تلے میرا بھی بڑا خال تھا، میں نے بھی یہی حرکت کی اور اسے عقب سے دبوچا۔ اس کے بال میرے ہاتھوں میں آ گئے۔ وہ نجات دہندہ کے ساتھ حکم ختم تھا کہ میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کی ٹھوڑی اور سر کے پچھلے حصے کو پکڑ کر جھٹکے سے گھما دیا۔ اس کا منکا ٹوٹ گیا اور وہ دوں کچڑ میں غرق ہو گیا۔

”سائیں دادا! میرے دوست“ میں خوشی سے چیخا اور اسے سنبھال لایا۔ ”تم ٹھیک تو ہونا میرے یاد“ وہ ہنسنے لگا۔ بولا۔ ”ختم..... تم تو ٹھیک ہونا؟“

”میں ٹھیک ہوں۔ لال..... لیکن مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ ہم نے اس پراسرار مخلوق پر فتح حاصل کر لی ہے مگر تم کہاں رہ گئے تھے؟“ میں نے ایک گہری تشویش سے اس سے پوچھا۔

”مجھ پر انکی کے کسی سامھی نے اچانک عقب سے حملہ کیا تھا اور پرے سے گھج کر لے گیا تھا۔“ اس نے جواب دیا۔

”کیا تمھیں پتا نہیں چلا تھا؟“

”نہیں دوست! میں تو کافی آگے نکل گیا تھا، میں یہی سمجھ رہا تھا کہ تم میرے پیچھے چلے آ رہے ہو۔“ میں نے جواب دیا۔

”آگے بڑھو، ہم خطرے میں نکلے ہوئے ہیں۔“ وہ بولا۔

”ظہرہ!“ میں نے کہا اور گرنے ہوئے سبز آدمی کی لاش کا جائزہ لینے لگا۔ جلد ہی مجھے اعوانہ ہو گیا کہ وہ سبز آدمی کے بہرہ میں سب کوئی عام انسانی ہی تھا۔

”یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں؟“ میں درباب بڑبڑایا۔

سائیں داد بھی ہونٹ بیچنے کچھ سوچ رہا تھا۔ اسی لمحے میں بولا۔
 ”بہروپے تلتے ہیں یہ لوگ، کسی خاص مقصد کے لیے
 ہی انہوں نے یہ حیثیت بھروسہ رکھا ہوگا۔“

”آگے بڑھو۔“ دو بولا۔ میں نے اسے سنبھالا دیا۔ وہ تھوڑا دُخی نظر آ رہا تھا۔ ہم ایک دوسرے کو سہارا دیے کنارے کی طرف آگے اور پھر اس منحوس دلدل سے باہر نکل آئے۔

ہمارے اطراف میں گہرا اور دم بخود سا ساٹا ٹھاندی تھا۔ آسمان صاف اور تاروں بھر نظر آ رہا تھا۔ چاندور کہیں جھکا ہوا تھا مگر اس کی خیاباںیاں ارد گرد کے ماحول کو منور کیے ہوئے تھیں۔ جنگل میں دل دھڑکا دینے والی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

ذرا ستانے کے بعد ہم دونوں آگے بڑھنے لگے۔
ہمارے بائیں جانب دلدل کا پاٹ چڑا ہوتا جا رہا تھا۔ تھوڑا
اور آگے بڑھے تو ایک جمیل کا منظر پیش کرنے لگا، اس کے
بعد بائیں جانب گھومتے ہی ہمیں ایک خاصے چوڑے پاٹ کا
کھلا نظر آیا۔ سائیں داد نے ذرا رک کر اس کا جائزہ لیتے
ہوئے بتایا۔

”یہ کتنا ہے اور پاس کے سمندر سے نکلا گیا ہے۔ میرا خیال ہے یہ آگے جا کر ایک بڑی سی نہر کی صورت اختیار کر لے گا۔“

اس کا خیال درست ثابت ہوا، وہ آگے جا کر ایک بڑی شہر کی شکل میں آگیا اور تب ہی ہم ٹھیک کر کر گئے۔ چند فرلانگ کے فاصلے سے ہمیں سامنے ہی اس کے کنارے پر جہر کی جہازوں اور درختوں کے درمیان کوئی چمکتی ہوئی سی شے دکھائی دی۔

”آگے بڑھتے رہو نو! ہماری منزل قریب ہے۔“
 اچانک سائیں داو نے جوش تلے کہا اور ہم نے پھر آگے بڑھنا
 شروع کر دیا۔ جلد ہی ہم فلوادی کسی چمک دیتے ہوئے اس
 شے کے قریب پہنچ گئے جو اب ایک بڑی سی لالچ کی شکل میں
 نظر آ رہی تھی۔

”یہی وہ لالچ ہے جس کے بارے میں ہمیں شانوکھو جانے بتایا تھا۔“ سائیں داد بولا اور میں متحیرانہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

”الہیر“ لالچ میری دم بہ خود نظروں کے سامنے تھی۔
 لالچ ایک طرف سے جھکی ہوئی مٹی اور اس کے متبادل بھی
 گرے ہوئے نظر آتے تھے۔ اس کی ہاڈی کوڑمک اور لونڈ کھا
 چکا تھا۔ ایک سائڈ سے پانی کے اندر جھکے ہوئے ہونے کے

باعث لالچ کے اندر خاصا بانی بھر چکا تھا۔ چاند کی طلسمانی روشنی میں ایک طرف کو جھکی گئی لالچ کا منظر خاصا سرا برہر نظر آتا تھا۔ کچھ گوشے اب بھی تاریکی میں غرق تھے۔ صرف بیرونی حصے صاف نظر آرہے تھے۔ عرشے کی ریٹنگ بھی ایک طرف سے ٹوٹ کر نیچے جھول رہی تھی۔ ہم نے احتیاط سے قدم آگے بڑھاتے ہوئے عرشے کا رخ کیا اور کسی طرح اس پر چڑھ گئے۔ اب ہم الہیہ لالچ کے عرشے پر تھے۔ ہمارے ارد گرد جنگل تھا اور ایک طرف بانی۔

آواز میں ہمیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ قریب کسی دھبے پر نظر پڑی تھی، جو اپنے حلق سے عجیب سی آوازیں خارج کر رہا تھا۔ ایک طرف کو جھکا تھا۔ کوئی پھٹی پانی کی سطح ابھری اور چڑھنے لگی تھی۔

”عرشے میں تو کوئی نظر نہیں آ رہا۔“ محاسنین داد نے نیچی آواز میں مجھ سے کہا۔ ”ہمیں اس کے کہیں اور پار بردار حصے کی طرف جانا ہوگا۔“

”سین بچے اور اندر اندر میرا ہے۔ ہماری ٹانگہ میں
نہیں رہیں۔ تاریکی میں بھلا ہم کیا اور کیسے کچھ دیکھ پائیں
گے؟“ میں نے کہا۔

”تم ادھر ہی ادا پر رکھو میں نیچے جنریٹر روم میں جا کر دوسری کابینہ دست کرتا ہوں۔“ وہ بولا۔

”ہائیں، تم کہیں نہیں جاؤ گے۔“ میں نے فوراً اس سے کہا۔ ”روشنی کی صورت میں کوئی بھی ادھر متوجہ ہو سکتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ یہاں دو مخالف پارٹیوں کے آدمی پہلے ہی سے

فخفیہ طور پر اس لالچ کی گھرائی پر مامور کیے گئے تھے۔ پہلے والے کوئی اور تھے اور دوسرے بنز آدمیوں کے بہروپ میں کوئی اور..... وہ اب ختم ہو چکے۔ لہذا اب مامور ہی اہمیت مان سے بیٹھ کر مریج ہونے کا انتظار کر سکتے ہیں اور روشنی پھیلنے ہی اندر کا جائزہ لیں گے۔“

سائیں داد کو میری بات پر صا د کرتا پڑا۔ اس کے بغیر اور کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ ہم وہیں ایک صاف سی جگہ پر پشت ڈاکر بیٹھ گئے۔ ہر سوسناٹا چھایا ہوا تھا۔ کانٹی زدہ سی جنابت کی بو

فضائی کی اور مرطوبی سے غرا رہی تھی۔ فضا کی ہلکی اور مرطوبی کی ہلکی خضکا کا احساس بھی ہونے لگا۔ ہم بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک موقع پر اور سرگوشیوں میں باتیں کرتے وقت بتانے لگے، ایک موقع پر میری آنکھ ہی لگی تھی، یہ تو شکر ہو کہ سائیں داد کی بروقت آنکھ کھل گئی، اسی نے ہی مجھے چکا تھا۔

”اٹھو دوست! صبح کاذب کی روشنی پھیل چکی ہے۔“

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ آسمان پر صبح کا ذب کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اب کافی کچھ دیکھنے میں آ رہا تھا۔

میں نے سب سے پہلے عرشے کے وسط میں آکر اندر دھکا جاتہ رہا اور پھر ہم کیتھول کی طرف بڑھ گئے۔ اندر آکر کٹر کڑیاں اور پورٹ ہوئے کھلے تھے۔ ان سے اندر روشنی پڑ رہی تھی۔ لاج پظاہر ہم سالم ہی نظر آ رہی تھی۔ اندر جا جا کر پھر اور نجانے کیا کیا بلا بھلا ہوا تھا کافی عرصہ ایک ہی جگہ ایک ہی حالت میں ٹنگر انداز رہنے کے باعث اندر کا نظام مادی اور دھرم بھرم نظر آ رہا تھا۔

ایک دو کہیںوں میں تو کوئی قابل ذکر سے دکھائی نہ دی
تھی البتہ جب ہم سب سے ٹھیکہ لین میں سے تو وہاں کچھ
ہو یا یاں ایک دوسرے کے اوپر بکھری پڑی نظر آئیں، ہم نے
ان کا جائزہ لیا تو اس میں کئی سڑکیاں بنائی اور فروٹ بھرے
ہوئے تھے، فروٹ بھی کچل کر ملا تھا۔ جن سے بڑی ناقابل

ہر دوست بدلو کا کھ رہی تھی۔ دوسری اجناس کی سی ہیں تو
 پاپونڈی لگ گئی تھی۔ میں نے انہیں ہاتھ لگانے سے اجتناب
 ہی رہتا تھا اور سائیں داد کو بھی اس کی ہدایت کر دی۔

”میرا خیال ہے شاو نہم سے سمجھوٹ بولا ہے یہاں تو ایسا کچھ نہیں نظر آرہا۔“ بالآخر اس آخری اور غلطے کو دامن نہ کر سکیں کی تلاشی کے بعد سائیں داد مایوس ہو کر بولا۔

”لیکن اسے جھوٹ بولنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟“
 میں نے پرسوج لہجے میں کہا۔

”ہوسکتا ہے اس کا کوئی اور مقصد ہو، وہ ہمیں اس
دورانے میں قتل کروانا چاہتا ہو، جیسا کہ تم نے دیکھا ہماری ان
سے ملے بیٹھ بھی ہو چکی ہے۔ وہ ضرور اسی کے ساتھی ہوں
گئے۔“

”نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا، شانو سے ہماری کوئی وجہ نہیں ہے، وہ فقط ہم سے اپنا کام نکلوانا چاہتا ہے اور بدلے میں ہمارا کام اس کے ذمے ہے۔“

”دیکھ لو نومی! میں تمہارے ساتھ ہوں، مزید تلاش کی بات تو
 قبلے لیتے ہیں۔“ سائیں داد بولا۔

”تم ایک کام کرو سائیں دادا“ بالآخر میں نے کچھ بچے ہوئے اس سے کہا۔

”یو لود دوست!“ اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔
”تم ایک بار پھر اس سے اوپر والے کیمین کا ذرا اچھی

طرح سے اور ٹھوک بجا کر جائزہ لو میں تب تک ایسی کمینہ کو دوبارہ دیکھتا ہوں۔“ وہ میری بات سن کر چلا گیا۔ میں نے اسے دانستہ اس کمینے سے نکالا تھا کیونکہ میں دیکھ رہا تھا وہ اس بدبودار کمینے سے کٹر ارا تھا اور جب تک وہ یہاں موجود رہتا، یہی رٹ لگاتے رکھتا کہ ہمیں یہاں کچھ نہیں ہٹنے والا جبکہ مجھے جانے کیوں شک ساہو رہا تھا کہ اسی کمینے میں مجھے مطلوبہ اشیاء مل سکتی ہے۔

اس کے جانے کے بعد میں نے دل کڑا کیا۔ یورپوں کو
ادھر ادھر کر رہا ہوا، چاک سیری انفراس کی تہہ میں پڑی تو میں
چونکا۔ یورپوں کے نیچے پٹیاں رکھی ہوئی تھیں۔ میں نے کچھ
اڈا راتھا رکھے تھے جو ایک پرانے ڈبک آلودہ ٹول بکس سے
ملے تھے۔ وہ میں نے ایک چٹنی پر آڑے اور ایک چٹنی کھول
دی۔ اس کے اندر سے تیلیاں برآمد ہوئیں، جسے بڑی مہارت
سے سر بمبر کیا گیا تھا کہ وہ کھلنے نہ پائیں۔ میں نے دھڑکتے
دل کے ساتھ ایک حلیے کو تیز دھار والے اوڑار سے چیرا تو اندر
سے سفید پاؤڈر گر نہ لگا۔

میرے ذہن میں ابھر اٹھا۔ اسی طرح میں نے چند اور تعلیمات اور دوسری چٹنی کو کھولا تو اس کے اندر سے بھی مختلف قسم

لی غیثات برآمد ہوئیں۔ میں رنگ رہ گیا۔ شادابی بات درست ثابت ہوئی (جس کا مجھے یقین تھا کہ وہ کہو جھوٹ نہیں بول سکتا تھا) لیکن اس کے ساتھ ایک اور چونکا دینے والی بات بھی وقوع پذیر ہوئی۔ انہی ہفتیوں کو اوپر ادھر کر کے اتر کو کھولنے کے دوران مجھ نے اس کے پیچھے سے بھی ایک اور چٹائی کی جھلک

دکھائی دی۔ میرے چونکنے کی وجہ یہی تھی۔ ان کا سائز اور
 ہیب ان پٹنیوں سے مختلف تھا اور رنگ بھی، نشیات والی
 پٹنیاں عام کٹڑی کی قمیص اور ان کی چوڑائی انٹر میڈیٹ ڈوڈل
 تھی، لمبائی بھی کم و بیش اتنی ہی تھی۔ یوں سمجھ لیں بارہ تیرہ

گلو کے آم کی پتی کی طرح جبکہ آخر الذکر پتی کی لمبائی لگ بھگ چار سے پانچ فٹ اور چوڑائی ڈھائی سے تین فٹ تھیں اور ان کی کٹری بھی عام نہیں تھی۔ وہ مضبوط اور ہنگی والی نظر آتی

تھی۔ پہلے تو میں یہی سمجھا تھا کہ ان میں ضرور منشیات ہی ہوگی لیکن دل میں کھٹک سی جا گی کہ اسے بھی کھول کر تصدیق کر لینے

میں کیا حرج ہے؟ ایسی بیٹیوں کی تعداد اگرچہ منشیات والی بیٹیوں سے کم ہی تھی مگر آٹھ دس سے زیادہ نہیں تھیں اور اول

الذکر چینیوں کے فیچے دینی ہوئی تھیں۔ میں نے کوشش کر کے ایک لمبی پٹی کو نیچے سے کھینچا چاہا تو میں حیران رہ گیا۔ میں

اسے مشکل چند رات ہی اپنی جگہ سے کھسکا سکا۔ وہ مقابلہ بھاری نہیں۔ انہی میں کچھ سوچ رہا تھا کہ اچانک مجھے عقرب سے کسی کی آہٹ سنائی دی، میں یک دم پیچھے ہٹا اور بے اختیار میرے حلق سے گہری سانس خارج ہوئی۔ وہ سانس داد تھا۔ مجھے اس کے اتنی جلدی آنے کی توقع نہ تھی۔ وہ شاید دوسری بار سرسری سہاوی جائزہ لینے کے بعد لوٹ آیا تھا۔

میں نے اسے سب بتا دیا تو وہ حیران ہو گیا۔ اس کے بعد ہم دونوں نے ہی ٹی کر وہ مخصوص ساختہ چوٹی پٹی پیچھے سے کھینچ کر لٹکائی اور سین کے فرش پر لے آئے۔ اس کے بعد دھڑکتے دل کے ساتھ میں نے اوزاروں کے ذریعے اسے کھولا اور جیسے ہی ڈھکن اٹھایا میں سرتاپا لرز گیا۔

☆.....☆

ہم دونوں پچھلی پچھلی نظروں سے کھلی پڑی چٹنی کو دیکھ رہے تھے۔ میری سانسیں تیز تیز چلنے لگی تھیں۔ دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ چہروں پر سناٹوں کی سی کیفیات ثبت تھیں۔

”نن..... نئی! بھاگ چلو۔“ معافی میرے ساتھ دم بہ خود سے کھڑے سانس دا کی لرزتی ہوئی آواز ابھری۔ ”مم..... مجھے تو یہ کوئی بہت ہی خطرناک چکر لگ رہا ہے۔“

”انس! داد! تم نے جانا ہے تو جاؤ میں اس راز سے پردہ چاک کرنے کی غرض سے ہی آیا ہوں اور اسے پایہ تکمیل تک ہی پہنچانے کا عزم رکھتا ہوں۔“ میں نے گھنٹی ہوئی سنجیدگی کے ساتھ سانس دا سے کہا۔ ”تمہاری مہربانی کہ تم نے یہاں پہنچنے میں میری مدد کی۔“

میری بات سن کر وہ بے چارہ ذرا شرمسار سا ہوا اور اسی لہجے میں بولا۔

”معاف کرنا یاد میں ڈراؤر سا گیا تھا۔ میں بھلا تمہیں یہاں اکیلا کیسے چھوڑ کر جا سکتا ہوں لیکن مجھے تو یہ نشیات سیے بھی اونچا پس لگتا ہے۔“

یہ جو بھی ہے سارا ہی اونچے درجے کا معاملہ ہے سانس داوا۔“ میں نے کہا اور پھر کھلی چٹنی کی طرف متوجہ ہو کر اس پر جھکا۔

چٹنی کے اندر جدید اسٹیل کی کھپ رکھی ہوئی تھی۔ جن میں خود کار ریلیں، میٹرن اور بلیٹ باکسز رکھے ہوئے تھے۔ میں نے دوبارہ اس کا ڈھکن اسی طرح اس پر چڑھا دیا۔ ہم دونوں ہی گھبراہٹ سے بے ہوش ہوئے تھے بلکہ سانس دا بے چارہ تو کچھ

گھارت فون نظر آ رہا تھا جبکہ تیسرا آدمی وہی بزرگ انسان تھا۔ اب اب ہی رنگ روپ کے باعث یہ پتا چلتا تھا کہ یہ انہی میں سے ایک تھا جن کے ساتھ میری خوف ناک مڈ بھیڑ ہو چکی تھی یا پھر یہ کوئی اور تھا۔ ہاں! ایک اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔

بھیڑ ہونے والے ان تین بزرگانوں میں سے ایک کو ہم شاید موت کے کھاتے اتار چکے تھے جبکہ باقی شدید زخمی ہو گئے تھے۔ اگر یہ انہی میں سے ایک ہوتا تو زخمی ہوتا لیکن یہ بالکل علاحدہ نظر آ رہا تھا جس کا مطلب تھا یہ ان کا ساتھی تو ہو سکتا تھا مگر ان تینوں میں سے نہیں تھا۔ تاہم اس کا اندازہ سو دہا تھا اور وہ ان دونوں کے پیچھے چل رہا تھا۔

بہر طور میں نے دیکھا یہ تینوں آپس میں باتیں کرتے ہوئے آہستہ آہستہ لوہے کی ریلنگ نما میز پر حیران اترتے ہوئے آ رہے تھے۔

”انس! انپکٹر صاحب! آپ اس کی بالکل فکر نہ کریں۔ میں نے یہاں اپنے آدمی لگا رکھے ہیں۔“ اسماٹ لڑن والا آدمی کہہ رہا تھا۔ مخاطب پولیس افسر ہی تھا۔

”میں نہیں بلکہ!“ وہ رکارڈر مینیجر انداز میں مسکراتے ہوئے ساتھ کھڑے اس لیے ترنگے سبز آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”اسے دیکھ رہے ہو ناں! انپکٹر صاحب! اسے سبز آدمیوں کی اس جگہ میں بڑی دہشت ہے۔ میں نے اسے چار پانچ آدمی چھوڑ رکھے ہیں۔ تمہارے بڑے صاحب انپکٹر صاحب سیال کے تعینات کردہ بلکار انہی کی وجہ سے ہی یہاں سے بھاگنے پر مجبور ہوئے تھے۔“

”او..... اچھا..... اچھا!“ وہ مونٹا پولیس والا مطمئن انداز میں ہنستے ہوئے اپنا سر ہلانے لگا۔ ”تمہاری ذہانت کی داد دینی پڑے گی۔“ وہ بولا۔ ”لیکن بہتر ہوگا کہ اب مال کو جلد لا جلد یہاں سے نکال لیتا چاہیے کیونکہ اگر کا یہ راز انکشاف ہونے کا خطرہ ہے۔“

”اسی لیے تو آپ کو یہاں بلا یا تھا کہ یہ سب قانونی آؤ لیکن ہو جائے تو تمہارے اس افسر سیال کو بھی کوئی کل کھلانے کا موقع مل سکے جس پر ہر وقت ایمان داری اور فرض شناسی کا دعوت سوار رہتا ہے۔“ شلوار قمیص والے آدمی نے کہا۔

”میرا خیال ہے اس کام کو پھر آج شام تک پایہ تکمیل تک پہنچا دینا چاہیے۔“

”بالکل! انپکٹر سانس! اوڈے سانس کا بھی یہی کہنا ہے۔“

”تو بس پھر آج پانچ بجے میں اپنے چند آدمیوں کے

رے کے ذریعے عرشے سے نیچے اترے اور گھٹنوں گھٹنوں پانی میں چلنے ہوئے دوسری طرف کے کنارے پر پہنچے۔ وہاں سے ذرا نکلی میں آتے ہی ہم نے تیز قدموں سے چلنا شروع کر دیا۔

مہم کی متوقع کامیابی کے جوش تلے میرے اندر جیسے ایک نئی طاقت سا گئی تھی۔ شلیات اور اسلحہ کی بھاری کھپ کو یہاں سے پار لگانا اور اس کے بعد ملک و قوم پر اس کے اثرات کیا پڑنے والے تھے اس کا اندازہ ہر ذرے دار اور چپ وطن آدمی بہ خوبی لگا سکتا تھا۔

فران سے مجھے یہی نظر آتا تھا کہ حاجی مہران خان کے آدمیوں نے ایک راشی پولیس افسر کی مدد سے اس غیر قانونی مال کو پار "لگانے کا پابند و بست کر دیا تھا۔

ہم دونوں جیسے تھے اور گرتے پڑتے تھر کے اس خطر جنگل کی حدود سے باہر نکل آئے۔ وہاں سے میں نے کسی میربحر کی جھوٹیڑی میں جا کر اپنی حالت بہتری اور منہ ہاتھ دھو کے کپڑے دھوئے اور گیلے پائین کر باہر آگئے کہ دھوپ میں یہ خود ہی سوکھ جائیں گے، پھر وہاں سے میں نے ایک قریبی ہی سی او جہاں ایزی لوڈ بھی ہوتا تھا، تیرہ کو کال کی۔ میں نے اسے اشاروں کنایوں میں اپنی مہم کی کامیابی کے بارے میں بتایا اور اساتھی کہا۔

"کسی طرح مجھے ٹھنڈے کے انپکڑ و جاہت سیال ملنے کا وقت لے کر ایک ملاقات اس سے کروانے کا بندوبست کر دو لیکن ذرا جلدی۔"

میں نے اسے پی سی او کا نمبر دے دیا اور وہیں بیٹھ گئے۔ ایک گھنٹے بعد ہی پی سی او والے چھوکرے نے بتایا کہ میرافون آیا ہے، میں دھڑکتے دل کے ساتھ کہیں میں گھس گیا اور کال ریسیدو۔ وہ تیرہ ہی کی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ میں جہاں موجود ہوں وہاں کا پتا بتا دوں، انپکڑ اپنے آدمی ہمیں لینے کے لیے روانہ کر دے گا۔

میں نے اسے پتا بتا دیا۔ بہ قول تیرہ کے اپنے ایک جاننے والے پولیس انپکڑ سے اس کا پتا لیا تھا اور ملاقات کا وقت بھی۔

تھوڑی دیر بعد ہی ایک کار ہمیں لینے آن پہنچی۔ مجھے حیرت ہوئی اس میں صرف ایک ہی شخص بیٹھا تھا وہ بھی ڈرائیونگ سیٹ پر۔ وہ نیچے اتر آیا۔ ہم تک پی سی او کے باہر آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ کار کی نمبر پلیٹ کریں ٹکری بھی اور اس میں سندھ گورنمنٹ لکھا ہوا تھا۔ وہ کار سے اتر کر اندازے

سے ہماری طرف بڑھا تو ہم نے اسے بتا دیا کہ ہم ہی وہ اس کے مطلوبہ افراد تھے۔

"میرا نام خادم حسین ہے، انپکڑ صاحب نے مجھے تم دونوں کو ہی لینے کے لیے بھیجا ہے۔" اس نے کہا اور پھر ہم اس کے ساتھ کار میں سوار ہو گئے۔ ڈرائیور بعد کار فرمائے بھرتی ہوئی ایک پوش کالونی میں پہنچ کر ایک کشادہ مکان کے سامنے رک گئی۔ ہم کار سے اتر آئے۔ گیٹ پر ایک چوکیدار قمار آدمی موجود تھا۔ یہ جنگل نما گھر تھا اور جس کے بڑے سے ہتھی گیٹ پر گولڈن براس کی نیم پلیٹ پر ایس ایچ او جاہت سیال کا نام درج تھا۔ ہمیں اندر ایک اوطاق نما کمرے میں بٹھا دیا گیا۔

"کیا انپکڑ صاحب گھر پر ہی موجود ہیں؟" میں نے اسی آدمی سے پوچھا تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"نہیں، وہ پولیس اسٹیشن گئے ہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "میں نے انہیں بتا دیا ہے وہ چھپنے والے ہیں۔"

تھوڑی دیر بعد ایک ملازم ہمارے لیے چائے اور بسکٹ لے آیا۔ ہم نے پانی منگوا لیا۔ پھر چائے پیئے۔ لگے لگے ایک ہفتے کے باہر بھی کسی کی کہیں باہر کی گاڑی کے رکنے کی آواز سنائی دی۔ اس کے چند جانیوں بعد ہی اسی دروازے سے جو بنگلے کے باہر بھی نکلتا تھا، ایک مضبوط قوتش کا بارعب شخص اندر داخل ہوا۔ اس کے جسم پر پولیس انپکڑ کی وردی تھی۔

وہ ایک نوجوان شخص تھا۔ رنگت سانولی تھی۔ قد برابر تھا اور جسمانی ساخت بھی۔ چہرے پر باریک مونچھیں تھیں۔ وہ بڑی خوش اخلاقی سے ہم سے ملا۔ اس کے بعد ہمارا گہری نظروں سے جائزہ لیتا ہوا سامنے والی ایک نشست آرام دہ کر سی پر براعتان ہو گیا۔

میں نے اپنا تعارف کر دیا اور اس کے بعد سائیں داد کا۔ نیز اس سے ساری باتیں راز میں بھی رکھنے کی درخواست کی۔ پھر میں نے گفتگو کی ابتداء حاجی مہران خان اور اس کے بیٹے عزیر خان سے شروع کی وہ ایک پُر جوش و دلچسپی سے میری تمام باتیں سنتا جا رہا تھا جس کی میں نے اپنی مذکورہ مہم کے بارے میں بھی آخری تفصیلات دینے کے بعد اختتام کیا تو اس کا چہرہ اچانک جوش سے سرخ ہو گیا۔ اس نے اسی جوش کے ساتھ اپنی جگہ چھوڑ کر ہمیں گلے سے لگا لیا اور بولا۔

"تم لوگ جھوٹ نہیں بول سکتے اس لیے کہ تمہاری باتوں میں ذرا بھی مغالطہ محسوس نہیں ہوا ہے مجھ سے جس پولیس والے کا تم نے ذکر کیا ہے وہ ہمارے ہی تھا نے میں ایک سب انپکڑ ہے۔ اس کا نام دل مراد ہے۔ اس کے

بارے میں سب کو معلوم ہے کہ وہ ایک راشی پولیس افسر ہے۔ پھر تمہارے بتانے ہوئے طریقے سے تو یہی لگتا ہے وہ..... باقی ہم خود ہی آج شام پانچ بجے چھاپہ مار کر دیکھ لیں گے۔ میں ایک طویل عرصے سے اس لا لاج کی تلاش میں تھا۔"

ہم نے چٹوٹھے وہیں آرام کر کے گزارے اس کے بعد شام چار بجے ہی انپکڑ سیال پولیس کی بھاری نفری کے ہمراہ گھر کے ان ساحلی جنگلات کی طرف روانہ ہو گیا۔ پولیس کی تین موٹر گاڑیاں اور ایک جیپ میں وہ خود تھا اور ہم دونوں گاڑیوں میں تھے۔

چھاپہ کامیاب پڑا۔ حاجی مہران خان ہی نہیں بلکہ وہ راشی سب انپکڑ دل مراد اور اس کا خاص آدمی جسے سائیں داد بھی جانتا تھا۔ ولی داد بھی گرفتار ہوا، انہی میں میر محمد کے آدمی تھے۔ ہماری تعذیب کے بعد ہی چھاپہ کامیاب قرار پایا تھا۔

گھر انپکڑ سیال نے ہمیں ان کے سامنے ظاہر نہیں کیا تھا۔ اس کامیابی کے بعد ہم نے ایک تیز رفتار کوچ کے ذریعے کراچی کا رخ کیا۔ سائیں داد کو میں نے طیر اس کے گھر روانہ کر دیا اور خود وہاں کالیا کی طبیعت کا میں نے سب سے پہلے پوچھا تو

پتا چلا وہ کافی بہتر تھا۔

"اے بھگری!" تھوڑی دیر بعد میری زبان کی گزشتہ کارگزاری کی رپورٹ سننے کے بعد وہ ایک دم حیران ہو کے اپنے مخصوص لیجے میں بولا۔

"کمال کر دیا تو نے بھگری! سب کو کھڈے لگا دیا تو نے۔"

"ہاں کالیا! اس بار حاجی مہران خان اور میر محمد نہیں بچیں گے۔" میں نے زہر خند لیجے میں کہا۔ "مہران خان کا دست راست لاڈلہ سائیں بھی بڑی طرح نرٹے میں آجائے گا۔ انپکڑ و جاہت سیال نے میر محمد اور لاڈلہ سائیں کی گرفتاری کے لیے وی آئی جی سے بھی خاطر خواہ مدد لی ہے۔ معاملہ حساس اور قومی نوعیت کا تھا اسی لیے فوری ایکشن لیا جا رہا ہے۔"

"واہ بھگری! دل خوش کر دیا تو نے۔ سب کو ہی اندر کر دیا۔ مان گئے تھے استاد!" کالیا خوش ہو کر بولا۔ "آخر تیرا ہی شاگرد ہوں میرے بار کالیا!" میرے لیجے میں اپنے اس بارے بدل کے لیے ستائش تھی۔ وہ ہنسنے لگا اور بولا۔

"اپنے اس کانے سینٹھ ستار کا کیا حال ہے؟" "ختم چاٹ رہا ہے۔" "لوں کون رہ گیا؟" "شاہ میر..... میر اصل دشمن!" میں نے کہا۔

"ہم!" کالیا نے ایک ٹرسوچ بھکاری خارگ کی۔ "یہ بہت قد آور دشمن ہے۔ نوی بہت احتیاط سے اس پر ہاتھ ڈالنا ہوگا لیکن تو بتا رہا تھا کہ لکیر لا لاج والے معاملے میں کسی کو بڑے کے بن راند اور راہگی نرٹے میں آسکتے ہیں۔"

"ہاں! ان کے خلاف ثبوت تیار کیے جا رہے ہیں۔" میں نے کہا لیکن مجھے اپنی آواز گھٹی سی ہی معلوم ہوئی تھی جو فوراً ہی محسوس کرتے ہوئے کالیا نے میرے چہرے پر نظر لیں جاتے ہوئے کہا۔

"تمہیں اس سلسلے میں کوئی شک ہے؟" "ہاں یا راکالیا، کچھ ایسا لگتا ہے کہ بن راند پر پولیس کا ہاتھ ڈالنا ابھی اتنا آسان نہیں ہوگا۔"

"یہی میں بتانا چاہ رہا تھا تمہیں بھگری!" کالیا ایک دم بولا۔ "بن راند صاف کر جائے گا کہ وہ کسی کو بھی نہیں جانتا۔"

"ہم!" "اسے پھانسنے کے لیے تجھے میر کے جنگل جیسی مہم جوئی اختیار کرنا پڑے گی۔" وہ منہ کر بولا تو میں بھی منہ دیا۔ خوشی کے اس موقع پر ہماری گفتگو ایک بار پھر پاپی کی طرف جانے لگی تو کالیا اسی طرح ہی اسے ختم کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ مجھے اس کی یہ عادت پسند تھی۔

"من بھگری! اپنے سمدو بھائی کی معلومات اور تیری اس روزی کی بندرگاہ والی مہم کے مطابق اگر کار اور بن راند رگتے ہاتھوں پکڑے جائیں تو تیرا بڑا اور اصل دشمن میر بھی نرٹے میں آسکتا ہے اسی لیے ان دونوں کو اپنی نظروں سے ذرا بھی اونچل مت ہونے دینا۔"

کالیا نے بڑے پتے کی جوابات کی تھی وہ میرے ذہن میں بھی تھی لیکن ابھی مجھے فوری طور پر ایک اور ضروری کام منانا تھا۔ کالیا کو ابھی کچھ روز بیڈریسٹ کی ہدایت تھی اسی لیے میں نے خود ہی اسے نرٹانے کا فیصلہ کیا تھا، وہاں فہیم بھی موجود تھا اور اپنے معذور بھائی کی طرف میں جب بھی دیکھتا تھا میرے پورے وجود میں کرب اور رگوں میں ہولناک و ابن کر دوٹنے لگتا تھا۔ ایسے میں میری نظروں کے سامنے بار بار بے رحم اور سفاک شاہ میر کا چہرہ گردش کرتے لگتا تھا۔ میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ اس مردود اور جلا دصفت انسان نے میرے بھائی کے

ساتھ جو ظالمانہ اور انسانیت سوز سلوک کیا ہے وہ ہی میں اس کے اکلوتے جوان بیٹے شہزادہ کے ساتھ کروں گا لیکن اس سے پہلے مجھے فرحانہ سے ایک ملاقات کرنا تھی۔
مجھے دیکھنا یہ تھا کہ فرحانہ اور شیر ایک دوسرے میں کس حد تک ”انوالو“ ہیں؟

میں وہاں سے اپنی ویسٹ اسکوٹر میں ایڈووکیٹ ذنیرہ کے ہاں پہنچا۔ عاصمہ بہن مجھے دیکھ کر خوش ہوئی۔ میں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر ذنیرہ کے ساتھ بن راندا اور شاہ میر کے سلیسے میں مشورہ کرنے بیٹھ گیا۔

باتوں باتوں میں جب عاصمہ میرے لیے چائے وغیرہ بنانے کے لیے کچن میں چلی گئی تو میں نے ذنیرہ سے کہا۔

”میں عاصمہ بہن کو یہاں تمہارے پاس بہت خوش اور مطمئن دیکھ رہا ہوں۔ اس کے لیے میں تمہارا تہ دل سے مشکور ہوں ذنیرہ!“ میری بات پر وہ مسکرا کر بولی۔

”مشکور تو مجھے تمہارا ہونا چاہیے نوئی! عاصمہ کی صورت میں مجھے ایک بہن مل گئی ہے۔ بہت دل بہلائی ہے میرا۔ بہت اچھی ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ بہت کھڑ بھی ہے۔ میرے منہ کرنے کے باوجود گھریلو کاموں میں مصروف رہتی ہے۔ مجھے منت نئی دیشیں کھلا کھلا کر اس نے خاصا سونا کر ڈالا ہے اور میں بھی ہوں کہ اس کے لذیذ کھانے کے آگے دل ہار جاتی ہوں اور ہاتھ ہی نہیں رکھتا میرا۔ خالہ نجو سے بھی اس کی بڑی دوستی ہو گئی ہے۔“ میں اس کی بات سن کر ہنس پڑا اور بولا۔ ”عاصمہ ہے ہی ایسی محبت کرنے والی اور کامی لڑکی۔ اسے گھریلو کاموں میں بہت مزہ آتا ہے۔ گھر میں بھی اسی کی وجہ سے بڑی روٹی لگی رہتی تھی مگر انیسویں اسب تو شاید وہ آشنانہ ہی گھبرا۔“ یہ کہتے ہوئے میں منہم سا ہو گیا اور مجھے اپنا گھر یاد آنے لگا۔ فضا کو لوار ہوئے ہی ذنیرہ نے مجھے اٹنی ٹیم دے ڈالا۔

”خبردار! نو پینکی بینکی، سب کچھ اللہ کے فضل سے ٹھیک جا رہا ہے۔ ہر کوئی اپنی جگہ بہت خوش اور محفوظ ہے۔“

”ہاں! یہ تو تمہاری بات صحیح ہے ذنیرہ!“ میں نے خفیف سی مسکراہٹ سے کہا۔

”لیکن میری خواہش ہے کہ ہم تینوں بہن بھائی ایک بار پھر ساتھ اور اکٹھے ایک چھت تہے رہیں۔ اپنے گھر جا کر، میرا خیال ہے اس کا وقت آ گیا ہے۔ میں اب اپنے گھر کا رخ

کر لینا چاہیے۔“

”ہرگز نہیں۔ تمہاری جنگ ابھی ختم کہاں ہوئی ہے نوئی!“ ذنیرہ نے کہا۔ ”تمہارے دشمن ایک سے بڑھ کر ایک خطرناک اور ظالم ہیں۔ موقع ملنے ہی انتقامی کارروائی کرنے سے گریز نہیں کرتے اسی لیے میرا مشورہ یہی ہے کہ جو جہاں ہے اسے ابھی وہیں رہنے دو تو اچھا ہے۔“

میں کچھ کہنے والا تھا کہ اچانک ذنیرہ نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

”نوئی! میں ایک بات سوچ رہی تھی عاصمہ سے متعلق۔“

”ہاں، ہاں! کوئی نئی بات؟“ میں نے پوچھی تو اس کی بڑی بہن کی طرح ہو۔

میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

وہ کچھ سنجیدہ ہو کے مجھ سے بولی۔ ”عاصمہ کے بارے میں تم نے کچھ سوچا ہے؟ میرا خیال ہے کہ میں اب تک اس کے فرض سے سبکدوش ہو جاتا چاہیے۔“

اس کی بات پر میں نے ایک گہری سانس لی اور کہا۔ ”ہاں، ذنیرہ! ہمیں واقعی اس بارے میں سوچنا چاہیے لیکن حالات ہی ہمارے، اچانک کچھ ایسا رخ اختیار کر گئے کہ سب کچھ اور وارہ گیا اور نہ تو تمہیں کاشف کے بارے میں علم ہے ہی۔“

”ہاں! میں نے اسی لیے ہی تو یہ بات چھیڑی ہے۔“ وہ بولی۔ ”کاشف نے مجھ سے بات کی تھی فون پر۔“ اس نے بتایا اور میں اس کی بات پر چونک سا گیا اور اسی لمحے میں بولا۔ ”ارے کیا واقعی؟ اس بدھو نے بھلا تم سے کیسے رابطہ کر لیا؟“

”ہش..... بدھو کیوں کہتے ہو اس بے چارے کو، تمہارا ہونے والا بہنوئی ہے وہ۔“ ذنیرہ نے مجھے ٹوکا تو میں ذرا خفیف سا ہو کر مسکرا دیا، بولا۔ ”میرا مطلب تھا کہ وہ ایک سیدھا سادہ اور معصوم سا نوجوان ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ عاصمہ بہن سے غلط ہے۔“

”باتوں باتوں میں عاصمہ سے میری اسی سلیسے میں بات ہوئی تھی۔ اسی نے ہی مجھے بتایا تھا کہ کاشف روز اسے فون کرتا ہے اور وہ بے چین بھی رہتا ہے آج کل۔ لگتا ہے دونوں کے دلوں میں پیاری آگ ہے برابر کی لگی ہوئی۔“ ذنیرہ کہتے ہوئے میری طرف دیکھ کر محنتی خیز انداز میں مسکرائی تھی۔ آگے بولی۔ ”پھر عاصمہ نے ہی مجھے بتایا کہ وہ مجھ سے بات کرنا چاہتا ہے، مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا میں نے

اجازت دے دی تو عاصمہ نے اپنے ہی سیل فون سے میری اس سے بات کرانی اور خود شرا کے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ کاشف مجھے باہمی جان کہہ کر مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگا کہ اس کے والدین جلد ہی اس کی شادی کرنے والے ہیں اور چونکہ وہ اپنے ماں باپ کو اپنی پسند سے آگاہ کر چکا ہے اس لیے یہ کہہ رہا تھا، وہ تمہارا بھی پوچھ رہا تھا۔“

”ہاں!“ میرے منہ سے نکلا۔ ”تمہارا خیال ہے وہ ملنا چاہتے ہیں؟“

”ہاں! مگر تم سے!“ ذنیرہ نے مسکرا کے کہا۔ میں ہونٹ بھیج کر کچھ سوچتا بن گیا۔

”کیا سوچتے ہو؟“

”یہی کہ موجودہ حالات میں یہ اہم ذمے داری کس طرح نٹاؤں؟ ایسے میں جبکہ بھائی نہیں تھی۔“ کہتے کہتے میں رک گیا۔ میرا دل بھر سا آیا تھا۔ ذنیرہ فوراً کھٹکی دیتے ہوئے مجھ سے بولی۔

”کیوں آرزو ہوتے ہو نوئی! ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ عاصمہ میری بہن کی طرح ہے۔ مجھے خوشی ہوگی اگر یہ سارا انتظام اور بندوبست اسی گھر سے کیا جائے۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ میں کاشف سے کہہ دوں گی کہ وہ کل ہی اپنے والدین کو ادھر لے آئے۔ تم فہیم بھائی کو بھی یہاں لے آنا۔ بات کر لیتے ہیں پوری تلی کے ساتھ ان لوگوں سے۔“

”لیکن ذنیرہ! اس اہم گفتگو کے لیے ہم بہن بھائیوں کا اپنے گھر میں ہونا ضروری تھا۔“ میں نے کہا۔

”تم کون سا لڑکے کا رشتہ کر رہے ہو؟“ وہ بولی۔ ”ایسا وہی لوگ سوچتے ہیں جو بی بی کے بجائے بی بی کا رشتہ طے کر رہے ہوں کہ آخر ان کی بیٹی شادی کے بعد کہاں رہے گی، عاصمہ تو خیر سے رخصت ہو کے اپنے گھر جائے گی لیکن تمہیں ہے گھر تو تمہارا ہے، کہہ دو یا مرمت وغیرہ کا کام ہو رہا ہے۔“

”وہ تو لازماً ہوگا۔ گھر تو بہت مرمت طلب تو ہے، ابتدائی باتیں یہاں طے ہو جائیں۔ یوں بھی ہم اب تینوں بہن بھائی اپنے گھر میں شفٹ ہو سکتے ہیں۔ اب کوئی ایسا خطرناک مسئلہ نہیں رہا۔“ میں نے بھی کچھ سوچے ہوئے کہا۔ ”مگر یہاں کیا کیا باتیں گئے ان لوگوں کو کہ یہ کس کا گھر ہے؟ اور تمہارا کیا رشتہ ہے، وغیرہ؟“

میری اس آخری بات پر ذنیرہ کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گر گیا۔ پھر بولی۔

”تم کہہ دینا، میں تمہاری دور کی رشتے دار لگتی ہوں

بس!“

”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ابھی ان لوگوں کو تھوڑا انتظار کرنے کا کہہ دیں، تب تک میں گھر میں رنگ و روغن کا کام کر والوں تو پھر وہیں سب کچھ کر لیا جائے؟“

”نہیں نعمان! اس طرح لڑکے کے گھر والے خواہواہ ہی شکوک و شبہات میں پڑ جائیں گے۔ بہتر یہی ہے کہ انہیں بلا دو۔“ ذنیرہ تنبیہی سے بولی۔ ”کچھ بات تو آگے بڑھ جائے تاکہ ان کی بھی تسلی ہو جائے۔ لڑکی کا معاملہ ہے جس قدر جلد ممکن ہو نمٹا لیا جائے اور پھر کاشف اور عاصمہ ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے ہیں۔ یوں لڑکے کے گھر والے بھی اپنے بیٹے کی پسند پر رضامند ہیں۔“

میں نے کچھ سوچنے کے بعد ذنیرہ سے کہہ دیا کہ وہ انہیں کل شام جائے پر بلا لے۔

☆.....☆

میں ذنیرہ سے رخصت ہو کر گھر صیدھا لاری آؤے پہنچا۔ وہاں کے تھوڑے بہت معاملات نمٹائے اس کے بعد فائزہ کو فون کیا کہ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ میری بات سن کر کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی۔

”نعمان صاحب! کیا ابھی ضروری ہے ملاقات؟“ وہ کہیں باہر اور مصروف جگہ پر تھی کیونکہ پس منظر میں موزوں اور گاڑیوں کے شور کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔

”ہاں!“ میں نے کہا۔ ”ملاقات تو ضروری ہے لیکن آپ اگر کہیں باہر ہیں تو میں انتظار کر لیتا ہوں۔“

”کون ہے بھئی کہہ دو نا پاور کہیں مصروف ہو۔“ اچانک مجھے ایک مردانہ آواز سنائی دی، یوں لگا جیسے کوئی اس کے بالکل قریب بیٹھا ہو، وہ شاید کار میں سوار ہو رہے تھے یا ہونگے تھے۔ اچانک میرے ذہن میں اس مردانہ آواز پر ایک خیال جھمکے کی طرح چمکا۔ کہیں یہ شیر تو نہیں تھا؟

”ہاں! میں باہر ہی ہوں۔“ فرحانہ کی آواز ابھری۔ ”اچھا تمہیک ہے میں تھوڑی دیر بعد تمہیں کال بیک کر کے بتاتی ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کر دیا اور میں پُرسوج انداز میں اپنے ہونٹ بھیج کر رہ گیا۔

چند لمحوں کے بعد پوچھنا کہ اور پھر ایک فیصلہ کر کے میں نے لاری آؤے میں ہی منگو کر لیا اور پھر ویسا پر سوار ہو کر سیدھا بھائی کے پاس پہنچا۔ اسے میں نے کچھ ہدایتیں دیں اور اپنے ساتھ چلے گا کہا۔ تھوڑی دیر بعد ہم دونوں اپنی اپنی پارکس

پاکفشن روانہ ہو گئے۔

آتش زدگی والے واقعے کے بعد سے دونوں باپ بیٹی اپنے طارق روڈ والے گھر سے کٹھن والے بچکے میں شفقت ہو گئے تھے۔

مذکورہ بچکے کے قریب پہنچ کر میں نے سدو بھائی سے کہا کہ وہ اپنے تیل فون کی طرف سے الرٹ رہے، ہو سکتا ہے میں اسے کال نہ کر سکوں تو کوئی اہم نتیجہ ضرور کر سکتا ہوں۔ اس نے میرا اشارہ سمجھ کر اپنے سر کو آبشاری جنبش دی۔

میں اپنی دلچسپی کو آگے بڑھا لے گیا اور سیدھا فاخرہ کے گھر کے گیٹ کے سامنے روک دی۔ اسٹینڈ پر لگا کر میں نیچے اتر اور گیٹ کی جانب بڑھا ہی تھا کہ ایک سفید رنگ کی ٹویونا کرولا وہاں آ کر کی۔ میں نے اس طرف دیکھا اور چونک گیا۔ میرے چونکنے کی وجہ سے ڈرائیونگ سیٹ پر موجود فاخرہ نہیں تھی بلکہ اس کے برابر والی سیٹ پر براجمان ایک خوب رو جوان تھا۔ اس کی چھبیر پوری پوری اپنے باپ سے ملتی تھی اس لیے میں ٹھیک ٹھیک طور پر یہ اندازہ لگا لے میں کامیاب رہا تھا کہ یہ جوان میرے اڑی دکن شاہ میر کا وہی بیٹا شیر شاہ تھا جس کے بارے میں کچھ دن پہلے ہی مجھے سدو بھائی بتا چکا تھا کہ اس نے شاہ میر کے بیٹے شیر کو فاخرہ کے ساتھ دیکھا تھا۔ مجھے اس نے اس کی تصویر بھی دکھا رکھی تھی۔ تاہم آج اس سنبولے کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہا تھا۔

اپنے دشمن کے بیٹے کو دیکھ کر میری چشم تصور میں اپنے بدقیب بھائی فیہر کی کئی ہوئی ناخنیں محوم کیں اور میرا اندر نفرت و انتقام کی آگ ایک بھڑک اٹھی۔

”خون کے بدلے خون اور ہاتھ کے بدلے ہاتھ!“

یہی ایک گردان میرے اندر بار بار ہونے لگی۔

فاخرہ نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا، وہ کچھ پریشان سی نظر آنے لگی۔ تاہم اس نے کار میں بیٹھے بیٹھے ہی میری طرف دیکھ کر خیر مقدمی انداز میں اپنا ایک ہاتھ ہلا دیا تھا۔ اس کے بعد وہ کار گیٹ کی طرف بڑھا لے گی جسے چوکیدار کھول چکا تھا۔ فاخرہ نے چوکیدار کو میرے سلسلے میں اشارہ کر دیا تھا اسی لیے مجھے بھی اندر داخل ہونے سے اس نے روکنا نہیں تھا۔

کار و سٹیج پورچ میں جا کے رک گئی اور فاخرہ جلدی سے نیچے اتر آئی۔ اسی دوران وہ جوان بھی نیچے اتر آیا تھا اور میری طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک ملازم دوڑی چلی آئی تھی اور فاخرہ اسے کار سے سامان و فیہر اتارنے کی ہدایات دے رہی تھی، تب تک میں بھی ان کے قریب پہنچ گیا۔

”ہائے نوی! ان سے ملو یہ مسٹر شیر شاہ ہیں۔“ فاخرہ نے اس نوجوان کا تعارف کراتے ہوئے مجھ سے کہا۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔

”اور یہ ہیں نعمان۔“ اس نے میرا بھی نام کی حد تک تعارف کر دیا۔ میں نے جبری مسکراہٹ کے ساتھ شیر شاہ کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو وہ مجھے بڑی خوت سے نظر انداز کرتا ہوا اپنی گردن موڑ کر ملازمہ سے مخاطب ہو کے بولا۔ ”ڈرائیونگ سے وہ شوشیں نکالنا میڈا بہت نازک ہے۔“

”وہ“ کہتے ہوئے وہ جان بوجھ کر اس طرف بڑھ گیا تھا۔ وہ مجھے اپنے باپ کی طرح ہی سمجھتی اور مفرور لگا تھا۔ اس کی مجھے نظر انداز کرنے کی حرکت پر میرا اندر سے خون کھول اٹھا تھا۔ میں نے اپنا بڑھا ہوا ہاتھ نہایت خجالت کے ساتھ گرا دیا تھا۔ تاہم سوچنے لگا تھا کہ کیا مجھے اپنے باپ کے دشمن کی حیثیت سے جانتا تھا یا پھر اس کا حراج ہی اتنا اٹھ چکا تھا۔

ایسے میں فاخرہ مسکرائی ہوئی مجھ سے بولی۔ ”آئیے نعمان صاحب! اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔“

وہ سب خبر میرے توجہ سے ہٹ گئی۔ ”پاپا بھی اندر ہی ہیں۔“ رانا شیر کی بھی اندر موجودگی کا سن کر میں تھوڑا بڑبڑکا تھا۔ پھر وہ گردن موڑ کر شیر کی طرف دیکھنے لگی۔ ”آ جاؤ گی! یہ سب لے آئے گی، تم فکر نہ کرو۔“

”یہ تھوڑا سبزی ہے نوی! تم پاپا اس کے کسی روئے کا براحت منانا، دراصل راستے میں اس کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ کسی کار والے نے غلط سائیڈ سے آ کر ہماری کار کو ٹکرا مارنے کی کوشش چاہی تھی۔ یہ یہاں کی ٹریفک سے سخت ٹالاس رہتا ہے، مجھے بھی ڈانٹ دیتا ہے اکثر۔“ وہ مجھ سے یہ سب کہتی ہوئی میرے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی اندر آ گئی۔ اس نے غالباً شیر کی میرے ساتھ بے دردی بھانپ لی تھی۔

”آپ میری آمد پر کچھ پریشان سی ہیں۔ میں تو آپ کے فون کا ہی انتظار کرتا رہ گیا۔ اس لیے خود ہی چلا آیا۔“ میں نے شکایتی انداز میں کہا تو وہ ڈرا خفیف سی ہو کے بولی۔ ”سو ری نعمان صاحب! دراصل شیر میرا بوائے فرینڈ ہے۔ آج پہلی بار میں اسے پاپا سے ملوا رہی تھی۔ مجھے اس کی بات پر ایک جھٹکا لگا تھا۔ گویا رانا شیر بھی اپنے دشمن کے بیٹے کو جگ جگ باری دیکھنے والا تھا۔ تو کیا وہ اسے پہچان لیتا یا پھر آگے کیا معاملہ ہونے والا تھا؟ یہ سوچتے ہوئے مجھے اپنے اندر دشمنی کا احساس ہوا۔ خیر ہم دونوں ایک آرامت ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ فرحانہ نے مجھے ایک صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور

تھوڑی دیر میں لوٹنے کا کہہ کر اندرونی گوشے میں کھٹنے والے ایک دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

میں صوفے پر بیٹھ گیا اور کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ اترق روڈ کی رہائش گاہ سے یہاں کٹھن والی جگہ آ کر بسا ان دونوں باپ بیٹی کا پرانا خواب تھا۔ آتشزدگی والے واقعے کے بعد وہ انہوں نے جلدی اپنے اس خواب کو مکمل جامہ پہنایا تھا۔ دونوں ڈائریاں بسم ہو چکی تھیں اور میں جان چکا تھا کہ یہ کس کی حرکت تھی اور یہ کئی کہ رفعت خانم مرثویہ کی اصل مجرم کون تھا۔ جانتا تو رانا شیر بھی تھا لیکن اس پر صرف شبہ تھا مگر اب شاہ میر سے ٹیل فونک اور اس کے نمائندے بن رانا سے ایشاف ملاقات اور گفتگو کے بعد سے اسے بھی یقین ہو چلا تھا کہ کون اس کی بیوی کا قاتل ہو سکتا تھا۔ دیکھنا اب یہ تھا کہ رانا شیر ان حقائق کے بعد کون سا قدم اٹھائے والا تھا جبکہ میں سمجھتا تھا کہ رانا شیر میرے لیے شاہ میر کی قبر کھودنے کے لیے آخرین معاون ثابت ہو سکتا تھا یا نہیں؟ نیز ان سارے مہم کموں میں اب فرحانہ کا کردار کیا ہو سکتا تھا؟ یوں میں بالکل ایک وقت پر پہنچا تھا اور دیکھنا چاہتا تھا کہ رانا شیر کب سے کس تک واقف ہے؟ جبکہ یہ سب مجھ سے واقف نہیں تھے کہ میں اندرون خانہ کیا کچھ جان چکا تھا۔ دیکھنا یہ بھی تھا کہ آیا شیر نے یہاں اپنی پہچان کس حیثیت سے کروا رکھی تھی اور رانا شیر میری اصلیت سے کس حد تک واقف تھا۔ یوں گویا میرے سامنے دو دھ کا دو دھ اور بانی کا بانی ہونے والا تھا۔ چنانچہ اب دیکھنا یہ تھا کہ اس پر وہ نگاہی کے پیچھے سے اور کیا کچھ سامنے آئے والا تھا۔

اچانک کمرے میں آہٹ ابھری، میں نے دیکھا شیر اس ملازمہ سیما کے ساتھ سامان کے بڑے بڑے شاورز اٹھا لے اندر داخل ہو رہا تھا۔ میں نے اپنے تئیں چوری کوشش باہر ہٹ کر کوئی ایسا تاثر نہ دینے سے کوشش کی کہ میری طرف سے کوئی ذرا سا بھی شبہ ہو سکے۔ نہ ہی یہ بھی کہ میں نے ابھی کچھ دیر پہلے اس کی بے دردی کا برا بھی منایا تھا۔ ”جاذب میرے لیے ابھی لی جائے بنا کر لے آؤ اور یہ فرحانہ کہاں گئی؟ چلو اسے بھی بلاؤ۔“ وہ سیما سے یہ کہتا ہوا میرے دائیں ہاتھ کے صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے براجمان ہو گیا۔ اب وہ میری طرف کھڑا تھا اسے اپنی جانب دیکھنا کہ میں دانت سے لے مسکرا تھا۔ بے دردی اور خار باز و مفرور لوگ جب یہ دیکھتے ہیں کہ ان کی اس نازیبا حرکت کا کسی نے برا ہی نہیں منایا تو انہو وہ خود ہی تپ جاتے ہیں۔ یہی

فیہر کے ساتھ ہوا۔

”بڑے ہی ذہین قسم کے انسان ہوتے۔“ بالآخر وہ چڑ کر مجھ سے بولا۔ ”جب فرحانہ نے تمہیں ملے اپنے آنے سے انکار کر دیا تھا تو پھر یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی؟“

”آپ نے کچھ کہا؟“ میں دانت سے جلانے کے لیے انجان بن کر بولا۔

”نہیں دیواروں سے کہہ رہا تھا کچھ۔“ وہ چڑ کر بولا۔ ”ارے واہ کیا اس نے گھر کی دیواریں باتیں بھی کرتی ہیں انسانوں سے؟“ میں نے معنوی حیرت سے پوچھا۔

”نیا گھر! تو گویا تم کافی عرصے سے ان دونوں مال دار باپ بیٹی کے ساتھ تھی۔ کیا عزائم ہیں آخر تمہارے؟“ اس نے زہریلے طعنے کہا۔ وہ بھانپ چکا تھا کہ میں ادھار چکانے کی صورت میں اسے دق کر رہا تھا۔

”وہی جو تمہارے عزائم ہیں مسٹر شیر!“ میں نے دانت اسرار میرے لیے میں کہا تو وہ چونکا اور اسی لہجے میں متعجب ہوا۔

”کیا مطلب؟“

اسی وقت فرحانہ اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہمراہ رانا شیر بھی تھا۔

”ہیلو انکل! ہوا ہے ناکس ڈے۔“ وہ فوراً صوفے کے کھڑے ہو کر رانا شیر سے مسکرا کے بولا۔ میں بھی اٹھ کھڑا ہوا

تھا اور سر کے خفیف سے اشارے سے ہی رانا شیر کو سلام کرنے پر اکتفا کر کے دوبارہ بیٹھ گیا تھا۔ شیر کو یہ عجیب لگا تھا۔ تاہم میں نے دیکھا کہ رانا شیر مجھے وہاں دیکھ کر کچھ پریشان سا نظر آنے لگا تھا۔ کیا شک تھا کہ فرحانہ نے اسے میری آمد کے بارے میں بھی بتا دیا ہوگا۔

بہر طور دونوں باپ بیٹی میرے سامنے کے صوفے پر ساتھ ساتھ بیٹھ گئے۔

”نیا گھر مبارک ہو رانا صاحب!“ میں نے کہا۔ ”ماشاء اللہ بڑا خوبصورت ہے۔“

”انکل! یہ ہے کون؟“ گلتا تو ایسا دیا سا ہے۔ پھر قسم کا لیکن میں دیکھ رہا ہوں یہ بہت فخری لگ رہا ہے آپ کو لوگوں سے، کیا کوئی رشتہ دار ہے آپ کا؟“ شیر نے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے رانا شیر سے کہا تو میں نے شیر کو مخاطب کرتے ہوئے شیر لہجے میں کہا۔

”اے مسز! اب ذرا آگے مہ سنبھال کر بات کرنا تو دو لقیوں والا تمہارا تہا ہے مزاج سے ہی نہیں کردار سے بھی ظاہر ہو رہا ہے۔ تمہارے جیسے کم ظرفوں کو میں ان کی اوقات یاد

دلانے میں ذرا بھی دیر نہیں لگاتا ہوں۔“

”اوکم آن میرا“ ریلیکس، یہ نعمان صاحب ہمارے پرانے واقف کار ہیں۔ میری جوانی کا ردوائی نے بالآخر فرحانہ کو بولنے پر مجبور کر ہی ڈالا تھا جبکہ میرا چہرہ مارے طیش کے سرخ ہو کر دکھایا تھا۔ اس پر اس کے سرور و طغوان باب شاہ میر کی نیچے پوری پوری چھاپ محسوس ہوئی۔ وہ اسی کی طرح غصہ و راور گھنڈی نظر آ رہا تھا۔ وہ میری طرف غضب آلودہ نظروں سے گھورتا ہوا ایک دم چراغ پا ہو کر صوفے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”تم!“ وہ شدت غضب ناک لہجے میں میری جانب اپنی انگلی اٹھاتے ہوئے پکپکاتے ہوئے بولا۔

”آخر یہ سب ہو گیا رہا ہے؟“ اسی وقت رانا بشیر چلا کے بولا۔

”یہ دونوں نہ ایک دوسرے کو جانتے ہیں نہ پہچانتے ہیں تو پھر اتنا غصہ ایک دوسرے پر کیوں کر رہے ہیں بیٹی؟ معاملہ کیا ہے آخر؟ اور... اور یہ کون شخص ہے جو مجھے اتنی بے تکلفی سے اٹھل کھڑا ہے؟“

وہ فرحانہ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے تو مجھے صبح سوتوں میں اندازہ ہو گیا کہ میری بھی آج واقعی پہلی بار یہاں آیا تھا۔ ممکن تھا فرحانہ اسے آج پہلی بار ہی اپنے باپا سے ملوانے لائی تھی۔ بات واضح ہونے لگی تھی کہ کوئی بھی ایک دوسرے کی اصلیت نہیں جانتا تھا اور یہ جو کچھ ہورہا تھا اتفاق کے زمرے میں ہو رہا تھا لیکن نہیں ایک اور خیال اچانک ہی میرے ذہن طیارے میں ابھر اٹھا۔ وہ یہ کہ ممکن ہے اس میں بھی شاہ میر کی کوئی گہری چال ہو اور اس نے ضرورت پڑنے پر اس بار اپنے حواریوں کے علاوہ اپنے بیٹے کو بھی مہرہ بنا کے آگے سرکایا ہو۔

”میرا خیال ہے، فرحانہ میں بھر کسی وقت آ جاؤں گا، ابھی اس آدمی کی وجہ سے بد مزگی ہو گئی ہے، جس کا مجھے افسوس ہے۔“

میں نے دیکھا میر نے خود پر قابو پاتے ہوئے فرحانہ سے یہ کہا تھا۔

”تم بیٹھو تو سہی، میں ابھی سب ٹھیک کیے دیتی ہوں پلیز!“ فرحانہ نے کہا اور پھر اس کے ایماء پر پھر مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے بیٹھ گیا۔

ابھی تک میں صبح طور پر اس کے بارے میں یہ اندازہ قائم نہیں کر پایا تھا کہ کیا میر عا تبانہ طور کی حوالے سے مجھے

پہچان کر لیا ہو یہ اختیار کیے ہوئے تھا یا پھر اس کا مزاج ہی ایسا تند خور و گھنڈی تھا؟

فرحانہ نے اس بار خاصی متانت اختیار کرتے ہوئے قدرے شکی لگا ہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”نعمان صاحب! دراصل میر کے موڈ کے خراب ہونے کی وجہ ایک طرح سے آپ ہی ہیں۔ جب میں نے آپ سے کہا بھی تھا کہ میں آج کے دن بڑی ہوں اور آپ ملاقات کا پروگرام کل کار کھیں تو آپ نے کیوں نہیں میری بات مانی، یہی نہیں آپ یہاں بغیر بتائے چلے بھی آئے۔

درحقیقت میں آج پہلی بار میر کو باپا سے ملوانے کے لیے گھر لا رہی تھی۔ جس کا باپا کو بھی علم تھا۔“ فرحانہ کی بات پر مجھے صاف لگا تھا کہ اس نے میر کا غصہ سرد کرنے کے لیے اور اپنے باپ کے سامنے اس کا موڈ دفاع کرنے کی غرض سے یہ سب

کہا تھا۔ نیز مجھے فرحانہ کی طرف سے بھی ایسی کوئی خوش فہمی بھی نہیں تھی کہ وہ دیگر لوگوں پر بالخصوص میر پر مجھے ہی ترجیح دے گی۔ ازیں علاوہ ڈائریاں نظر آئیں ہونے کے بعد اس سے پہلے تب تک اس کی مجھ میں دلچسپی صرف اسی حد تک تھی کہ میں اس کی ماں کے اصل قاتل کو بے نقاب کرنا چاہتا تھا، جو شاید گزرتے وقت کے ساتھ اس کا مجھ سے وہ مقصد یا مشاغل بھی اب دم توڑ چکا اس لیے بھی میں اس کے لیے خیر اہم ہو چکا تھا لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کا باپ اصل قاتل کے بارے میں جان چکا تھا جس کے انکوائے بیٹے کے ساتھ وہ محبت کی پٹیلیں بڑھا رہی تھی۔

بہر کیف میں نے بڑے صبر و تحمل کے ساتھ فرحانہ کی یہ سچ اور کڑی گولی جیسی بات لی لی اور مصلحت کوٹی سے کام لیتے ہوئے اس سے بولا۔

”اٹس اوکے، مس فرحانہ! میں اپنی غلطی تسلیم کرتا ہوں۔ آپ میر کو باپا سے ملوادیں، میں تب تک خاموش ہو لیتا ہوں۔“

میں نے دیکھا رانا بشیر سوچتی ہوئی نظروں سے میری طرف نگے جا رہے تھے۔ وقت اور حالات نے پلٹا کھالیا تھا۔ پہلے میں فرحانہ کے لیے اہم اور رانا بشیر کے لیے خیر اہم تھا مگر اب اس کے برعکس ہونے لگا تھا۔ رانا بشیر کی بن راند سے ملاقات اور شاہ میر سے ٹیلی فونک گفتگو کے بعد میں اس کے لیے اہم اور میر کی انٹری کے بعد میں فرحانہ کے لیے خیر اہم ہونے لگا تھا۔ مجھے ایسا کوئی شوق بھی نہ تھا تاہم فرحانہ کی غیر دلچسپی کی بڑی وجہ اس کی ماں رفعت خانم کے اصل قاتل والا

عالمہ (فرحانہ کے لیے) ماپوس کن رہا تھا۔ اس پر مستزاد دونوں ڈائریوں کا نظر آئیں ہوتا بھی تھا گویا جو تھوڑی بہت کسر بھی وہ بھی پوری ہو گئی تھی۔ فرحانہ نے اب ممبر کر لیا تھا اور میر کے ساتھ ہی زندگی کی ابتداء کرنے کے بارے میں کوشاں تھی۔ اب انہیں کیا معلوم تھا کہ تقدیر میرا ساتھ دینے پر تکی بھی گئی کہ ابھر ڈائریاں برباد ہوئیں تو ادھر رفعت خانم مرنے سے پہلے میرے سامنے عیاں ہو چکا تھا اور اب بھی میں ان دونوں باپ بیٹی کے سامنے بہت سے رازوں سے پردہ اٹھانے کے لیے تیار ایسا تھا مگر یہ سب مجھے سوچ سمجھ کر اور غیر جذباتی ہو کر کرنا تھا۔ اسی سبب میں نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔

”اب کیا فائدہ یہاں اگر تم رنگ میں بیٹھ کر تو ڈال ہی چکے ہو۔ بہتر ہوگا کہ آپ اپنی بات کی ابتداء کر لیں۔“ فرحانہ مجھے برا سامنے بنا کے بولی۔ تب ہی اچانک رانا بشیر نے کسی گہری قسم کی زوہنی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بیٹی سے کہا۔

”اچھا بیٹا! موڈ خراب مت کرو اپنا! اچھا تو یہ ہیں وہ روبرو دار میر میاں جن سے تم نہیں ملوانا چاہتی تھیں۔“

”جی ہاں! ابھی میر ہیں۔“ وہ ہولے سے بولی۔

رانا بشیر نے بڑی فراست سے کئی کی نغصا کو فٹم کرنا چاہا تھا۔ میں بھی چپ تھا، دیکھنا چاہتا تھا کہ اب کیا دھماکا ہونے والا تھا جب میر نے بتاتا کہ وہ کس کا بیٹا تھا اور اگر چھپانے کی کوشش کرتا تو اس کا صاف مطلب ہوتا کہ یہ شخص اتفاق نہیں بلکہ دونوں باپ بیٹیوں (شاہ میر اور میر شاہ) کی ملی بھگت تھی کیونکہ میں تو اب ساری حقیقت جان چکا تھا۔

”میرا خیال ہے انکل! ایسے آپ انہیں فارغ کر دیں۔ میں پھر کسی آپ سے مل لوں گا۔“ میر نے رانا بشیر کی طرف دیکھ کر کہا۔

”ان کے ساتھ باتیں ہماری ذرا راز دارانہ نوعیت کی ہیں جو تمہاری میں ہی ممکن ہو سکتی ہیں۔“ رانا بشیر نے میری طرف ایک نظر اٹھا کے دیکھنے کے بعد میر سے کہا۔ ”تم بتاؤ کہ خود دارا کیا کرتے ہو؟ تمہارے والد صاحب کیا کرتے ہیں؟ فرحانہ بیٹی نے اکثر تمہارا ذکر کیا تھا میرے سامنے۔“

”جی انکل! میر سے باپا ایک بڑی عالمی آئل کمپنی کے ڈائریکٹرز میں سے ہیں۔ جو مشرق وسطیٰ میں آج کل ایک بڑے آئل فیلڈ کے پروجیکٹ میں مصروف ہیں۔ میں ان کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ میر نام ہے میرا۔“

وہ بول رہا تھا اور میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ رانا بشیر یک تک اس کا چہرہ نگے جا رہا تھا۔

”تمہارے باپ کا کیا نام ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”شاہ میر!“ میر نے بتایا اور میں نے دیکھا پھر جیسے ایک دھماکا ہو گیا۔ یہ نام سننے ہی رانا بشیر جسے ابتدائی گفتگو میں میر پر کچھ شبہ ہونے لگا تھا۔ شاہ میر کا نام سننے ہی وہ ایک دم اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور اسی وقت اس سے بولا۔

”میر! تم اس وقت جا سکتے ہو۔ مجھے مسٹر نعمان سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔“

میر نے متوقع مگر فرحانہ کے لیے اپنے باپ کا یہ رویہ حیران کن اور پھر سخت تکلف دہ ثابت ہوا۔ وہ اچانک کھڑے ہو کر باپ سے کچھ کہنا چاہتی تھی کہ رانا بشیر نے اس سے پہلے ہی بیٹی کی طرف دیکھ کر سخت لہجے میں کہا۔

”تم خاموش رہو بیٹی!“ اس کے بعد وہ دوبارہ حیران پریشان صوفے پر بیٹھے ہوئے میر سے مخاطب ہو کر سرد لہجے میں بولا۔

”مسٹر میر! میرا خیال ہے تم نے میری بات سن لی ہے۔“

تب میں نے دیکھا میر کے چہرے پر تکی اندی اور وہ ایک شکایتی سی نظر قریب کھڑی فرحانہ پر ڈالتے ہوئے رانا بشیر سے بولا۔

”اٹس فائن! انکل! میں جا رہا ہوں، شاید میں نے غلط جگہ کا انتخاب کر لیا تھا۔“

”بھینا۔“ رانا بشیر نے کہا اور میر غصے سے اپنا پاؤں پٹختا ہوا ہاں سے ٹھٹھا چلا گیا۔

”پاپا! آئی کاٹ بلیو، یی... یہ اچانک آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ وہ... وہ... آپ کے کہنے پر ہی آپ سے ملنے کے لیے آیا تھا۔“

فرحانہ روہانے لہجے میں بولی لیکن رانا بشیر نے ہولے سے ڈانٹ کر فرحانہ کو خاموش کرادیا تو وہ روٹی سسکتی ہوئی کمرے سے نکلتی چلی گئی۔

میں جب تک سمد بھائی کو اپنے سیل فون پر جلدی جلدی ایک میسج کرنے میں مصروف تھا۔

”تم اسے جانتے تھے نعمان؟ کون تھا یہ؟“ رانا بشیر نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔

”میرا خیال ہے پہچان تو آپ ہی تھی اسے گئے تھے۔“ میں نے انہیں اس سے سوال کر دیا۔ وہ جواباً ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

”ہاں! لیکن... تم۔“

”آپ نے یہ کیسے جان لیا کہ میں اسے پہچانتا ہوں؟“
میں نے پھر سوال کیا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کس حوالے سے یہ بات مجھ سے کر رہا تھا۔
”یونہی پوچھ لیا تھا میں نے کیونکہ تم ان کے ساتھ آئے تھے۔“
”ہم الگ الگ آئے تھے۔“ میں نے کہا اور انہیں بتا دیا۔

”اوہ اچھا۔“
”آپ تو جان گئے ہیں اسے پوچھ سکتا ہوں کون تھا یہ؟“ میں نے دائرہ تجاہل عارفانہ سے کام لیا۔ میرے اس سوال پر رانا بشیر کچھ سوچتا ہوا گیا۔ پھر ایک گہری ہرکاری خارج کرتے ہوئے بولا۔

”بات ذرا طویل ہے لیکن مجھے شاید تمہیں ساری تفصیل بتانا پڑے گی، یوں مجھ کو نعمان! مجھے تمہاری مدد کی ضرورت پڑ گئی ہے۔ میں اس نوجوان کو اپنی بیٹی فرحانہ کے ساتھ دیکھ کر سخت فکر مند ہو گیا ہوں۔“ وہ اب خاصا تشویش زدہ نظر آنے لگا۔

”میرا خیال ہے کہ آپ مجھے پوری بات بتا دیں تو بہتر ہوگا۔ رہا مدد کا سوال تو ہم ایک ہی تختی کے سوار ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ پورے خلوص سے تعاون کرنا ہمارے دیرینہ مفاد میں ہی ہوگا۔“

”یہی!؟“ وہ ایک دم بولا اور پھر چند لمحے خاموش رہتے ہوئے مناسب الفاظ کا ستارہا۔ مجھے تو سب معلوم تھا لیکن میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ مجھے کیا بتاتا ہے؟ نیز کسی مفاد کے لیے یا جھوٹے کام کے لیے یا جتنا کمر لگا کر اسے دھیرے دھیرے مجھے شاہ میر کی پوری کہانی سے لے کر اب تک سب کچھ بتا دیا تو میں نے اسرار گہری مسکراہٹ سے جب اسے یہ بتایا کہ میں پہلے ہی سے سب جانتا تھا تو رانا بشیر کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ پھر وہ اسی لہجے میں بولا۔

”کک..... کیا واقعی، تم یہ سب جانتے تھے؟“ وہ غیر یقینی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”جی ہاں! اور یہ بھی کہ شہ میر سے اور آپ کے دشمن نمبر ایک شاہ میر کا اکلوتا بیٹا ہے۔“ اسے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں یہ سب تجزیے سے جانتا تھا، میں اپنی ”سورسز“ کے بارے میں تو اسے تفصیل نہیں بتاتا چاہتا تھا تاہم اس کی سلی کی خاطر میں نے اسے کچھ مذکورہ ہوٹل میں اس کی شاہ میر کے ”نمائندے“ بن راکھ سے اس کی ملاقات اور شاہ میر کی اس

ہونے والی ٹیپ کی گئی ٹیلی فونک کال کے بارے میں بتا دیا۔ یہ معلومات مجھے سدو بھائی سے حاصل ہوئی تھیں۔ یہی نہیں جب میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ میری بن راکھ سے ایک ملاقات اس کے جہاز ”سی گورڈز“ پر بھی ہو چکی ہے، نیز اس قاتل خونی گمشتے راکھ سے بھی میں دودھ چکا ہوں تو وہ ”کک“ ہو کر رہ گیا۔

یہی وہ وقت تھا جب رانا بشیر ایک دم مجھ سے بڑے ہی ملتیانہ لہجے میں بولا۔ ”نعمان! تم ایک باہمت اور بہادر نوجوان ہو۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے نعمان! اب تو تمہیں بھی اصل حقائق کا علم ہو چکا ہے کہ اصل مجرم کون تھا لیکن شاہ میر اب میری اور میری بیٹی کی جان کا بھی دشمن بن چکا ہے، تم نے دیکھ ہی لیا ہوگا کہ وہ کس قدر خطرناک اور اثر و رسوخ والا آدمی ہے۔ وہ ایک ڈان ہے ایک ہر ڈان۔ مجھے پورا یقین ہے اس نے جان بوجھ کر میرے خلاف ایک چال چلی ہے اور میری جذباتی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے اپنے بیٹے کو میری بیٹی کے پیچھے بھی لگا دیا ہے۔“

”یہ بات ابھی ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے رانا صاحب!“ میں نے کھنڈی ہوئی غیبت سے کہا۔ ”فرحانہ اور شہ میر کی دوستی محض ایک اتفاق بھی ہو سکتا ہے اس کے لیے ہمیں فرحانہ کو اعتماد میں لیتے ہوئے حقیقت جاننے کی کوشش کرنا چاہیے۔“

”میں ابھی فرحانہ بیٹی کو بلواتا ہوں، میں نے بھی بلا دجے غصے میں اسے ڈانٹ دیا۔“ رانا بشیر بولا تو میں نے اسے منع کر دیا اور رخصت ہونے کی غرض سے صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”میں اب چلوں گا۔ میرا آپ سے رابطہ رہے گا۔ فرحانہ ہے ابھی آپ کچھ مت کہیے گا۔ میں خود اس سے بھی یہاں آ کر تفصیلی بات کر لوں گا۔ اس کے بعد آپ کو کریں مسئلہ دوں گا کہ پھر آپ اپنے طور پر اسے اعتماد میں لینے کی کوشش کیجیے گا۔“

”ٹھیک ہے پر خود رانا! میں تمہاری ہدایات پر حرف بہ حرف عمل کروں گا۔“ رانا بشیر بھی یہ کہتے ہوئے صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا اور آخر میں بولا۔ ”مجھے ڈر ہے کہ یہ معاملہ جذباتی نہ صورت اختیار کر جائے کیونکہ فرحانہ کو میں نے اکثر اس سنبولے شہ میر کی تعریفیں کرتے سنا ہے، آئی تھنک وہ اس میں پوری طرح متاثر ہو سکتا ہے۔“

”دیکھتے ہیں آگے کیا ہوتا ہے، فرحانہ بھی اتنی نادان نہیں ہے کہ اپنی ماں کے قاتل کے بیٹے کو اپنا جیون سانس بنانے کا سوچے لیکن بہر حال ابھی تو یہ سب کہنا نکل از وقت ہی ہوگا۔ چلو ہوں۔ آپ کی ضرورت پڑی تو میں رابطہ کروں گا مگر آپ بھی محتاط رہیے گا اور مجھے ایک ایک بات سے مطلع کرتے رہیے گا۔“

”ضرور!“ رانا بشیر نے فوراً اپنے سر کو اٹھاتی جنبش دی۔ میں اس کی رہائش گاہ سے نکلا اور ویسا میں سو رہا۔ اسے اسٹارٹ کر کے میں ٹھوڑی دور جا کر اس جگہ پر جا ہوا جس میں سدو بھائی کو چھوڑا تھا۔ حسب توقع وہ وہاں نہیں تھا۔ میں ٹھہر کے سلسلے میں اسے ایس ایس ایس کر چکا تھا۔ وہ بھینا اس کے تعاقب میں نکل چکا تھا۔

میں نے سبیل پر اس سے رابطہ کیا۔ وہ بایک پر ہوتا تھا تو پنڈ فری استعمال کرتا تھا تا کہ بایک چلانے کے دوران وہ فون پر بھی آسانی سے بات کر سکے۔

”ہاں سدو! کہاں پہنچے؟“ رابطہ ہوتے ہی میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

”جناب! میں شہ میر کا تعاقب کرتے ہوئے ڈینس کے فیر فائیو پر اس کی رہائش گاہ کے قریب پہنچ چکا ہوں۔ وہ اندر جا چکا ہے۔“

”اور تو کوئی اس کے ہمراہ نہیں تھا؟ میرا مطلب ہے وہ اکیلا ہی تھا؟“

”جی ہاں جناب!“ اس کا جواب اثبات میں تھا۔ آگے بولا۔ ”اس نے راستے سے ایک نوجوان کو پک کیا تھا اور اب ڈینس فیر فائیو والی اپنی کوئی پرہیز چکا ہے۔ میں وہیں کھڑا ہو گیا ہوں، ابھی پہنچا ہوں۔“

”اچھا! ذرا اس نوجوان کا ناک نقشہ بتاؤ گے؟“ میں نے یونہی پوچھا تو سدو نے مجھے اس نوجوان کا چہرہ بتا دیا۔ میں نے پُرسوج انداز میں اپنے ہونٹ کھینچ لیے۔

”اب کیا حکم ہے جناب؟“ مجھے خاموش پا کر اس نے پوچھا۔

”تم ایک کام کرو سدو! وہیں کھڑے رہو، میں پہنچ رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن ایک بات کا خیال رکھنا اگر اس نوجوان کو شاہ میر کی کوئی سے لگتے دیکھو تو اس کا تعاقب کرنا اور ساتھ ہی میری بھی رہنمائی کرتے رہنا۔ میں بھی تمہارے پیچھے آتا ہوں گا۔“

”سمجھ گیا جناب!“

اس کے بعد میں نے رابطہ منقطع کر دیا اور ٹھوڑی دیر وہاں کھڑا اس نوجوان کے بارے میں سوچتا رہا اس کے بعد میں نے بھی پنڈ فری نکالا اسے اپنے سونہاں فون کے ساتھ اٹھج کیا اسے جیب میں رکھنے کے بعد بایک کو اپنے چہرے کے قریب کر دیا اور اوپر سے ہیملٹ مہین لیا۔

ڈینس کی طرف روانہ ہوتے ہی جب میں کالا ہل پر پہنچا تو پنڈ فری پر مجھے فون کی آواز سنائی دی، میں نے ایک ہاتھ سے ہیملٹ کا شیشہ اوپر کیا اور منہ کے قریب جھونکنے بایک کو ذرا اور قریب کر لیا۔

”ہاں! پولوسدو؟“ میں نے کہا۔

”سر میں نکل پڑا ہوں، وہ نوجوان ایک ٹیکسی میں روانہ ہو گیا ہے۔ میں اس کے تعاقب میں کوئی گری روڈ پر چکا ہوں اور فی الحال میرا رخ قیوم آباد کی طرف ہے۔“ اس نے بتایا۔

”مگنا! میں بھی اسی روڈ پر ہوں آگے محمود آباد والا چوراہا آئے گا۔ میں وہاں سے آگے نکل جاؤں گا۔ اب سبیل اپنا آف مت کرنا۔ مسلسل رابطے میں رہنا اور مجھے بتاتے جانا راسخ۔“

”ٹھیک ہے سرا!“ اس نے جواب دیا۔ میں نے اپنی ویسا کی رفتار تیز کر دی۔ ذرا ہی دیر بعد سدو بھائی نے بتایا کہ وہ ایک اور ہیلڈ برج پر چکا ہے اور اب ٹیکسی کا رخ کوئی کراسنگ کی طرف ہے۔

ہم مزید ٹھوڑی دیر تک ایک دوسرے کے تعاقب میں رہے اور جب کوئی کراسنگ نزدیک آگیا تو سدو نے بتایا ٹیکسی یہاں سے سیدھے ہاتھ پر ایک رہائشی علاقے بھٹائی کالونی کی طرف مڑی ہے۔ یہ سنتے ہی میں نے اپنی بایک کی رفتار مزید بڑھا دی اور بھٹائی کالونی کوئی کراسنگ جا پہنچا۔

وہاں ای ٹیکسٹ میں ایک مکان کے پاس مجھے سدو بھائی مل گیا۔ میں نے اسے رخصت کر دیا۔ اس کے بعد اس مکان کا جائزہ لینے لگا۔ مکان کو تیسرہ شدہ لگتا تھا۔ چھ چھندوں پہلے ہی خریدا گیا ہو۔ ایک سوئیں کڑکا مکان تھا جس کا رنگ درخشاں چمک رہا تھا۔ بڑا سا کہنی گیٹ تھا۔ مکان ون یونٹ بنگلے کا منظر پیش کرتا تھا۔

میں سوچنے لگا کہ یہ نوجوان کون ہو سکتا ہے؟ کیا شہ میر کا کوئی ساتھی؟ ایسا ساتھی جو اس کا راز دار ہو؟ ایسے ہی خاخواہ یہ خیال میرے فون میں در آتا تھا۔ شاید دشمنوں کی جاسوسی کرتے کرتے اب تو ہر شے سے محتاط رہنے اور ان سے متعلق ذرا ذرا سی بات سوچنے کی عادت ہی ہو گئی تھی۔ حالانکہ مذکورہ

نوجوان شہر کا کوئی دوست بھی ہو سکتا تھا۔

میرے اندر بے چینی فقط یہ تھی کہ میں ایک بار اس نوجوان کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں۔ کون تھا یہ؟ بہر طور میں نے مکان بھر اچھی طرح ذہن نشین کر لیا اور اس کا محل وقوع بھی اس کے بعد لوٹ آیا۔

میں وہاں سے سیدھا استاد بھابھا کے آگے پر پہنچا۔ کالیا کی حالت کافی بہتر ہونے لگی تھی۔ اس نے میری ہدایت پر چند لڑکوں کو خبریں حاصل کرنے پر لگا رکھا تھا۔ کالیا نے ہی مجھے بتایا۔

عزیز خان رہا ہو چکا ہے مگر اب اس کا باپ لمبے چکر میں اندر ہو چکا۔ یہ تو کبھی پرانی خبر۔ میرے ساتھ شانو کو جا بھی گیا اندر جبکہ اصل دشمن شاہ میرے دونوں گماشتے بن راند اور راکا۔ پولیس کی تقبیل سے زبردست ہیں۔ انہیں ان کی خوبصورت لالچ سمندری شہزادی کے اندر نظر بند رکھا گیا ہے۔

”واہ یار! کالیا بڑی دھماکا خیز خبریں ہیں۔“ میں نے کہا۔

”تو چھپا رستم ہے میرے بار جگری!“ وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ ”ایک دم دھماکا رستم کتنے بڑے بڑے مگر چھوٹ کوکس مہارت سے قانون کی گرفت میں دے ڈالا ہے کہ ان کی گردنیں بری طرح پھنسن چکی ہیں۔“ اس کے لہجے میں میرے لیے ستائش تھی۔ میں نے کہا۔

”ارے میرے یار! کالیا! یہ سب میں نے تجھ سے ہی تو سیکھا ہے اور پھر تیری ہی مدد سے تو یہ سب ممکن ہو سکا ہے ورنہ ہم کتنے بڑے بڑے چکروں میں پھنس کر رہ گئے تھے۔“

”بھلا تم!“ وہ ہنسنے ہوئے بولا۔ ”ہم تو صرف مارا ماری جانتے ہیں مگر تیرا دماغ ایک اعلیٰ درجے کے ہتھیار جیسا کام کرتا ہے۔ جال بنانا اور اسے پھیلاتا تو کوئی تجھ سے سیکھے۔“ میں نے اس پر سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ ”کالیا! جب تک میرا اصل دشمن شاہ میر زندہ ہے۔ میں اسے اپنی قتل نہ نہیں سمجھتا۔“

”وہ بھی ایک دن ہماری گرفت میں ہوگا۔“ کالیا نے پر عزم ہو کر کہا۔ پھر اس نے شہر کے بارے میں دریافت کیا کہ اس کے سلسلے میں میری ہم جوتی کہاں پہنچی تھی؟

میں نے اسے آگاہ کر دیا۔ وہ حیران ہوا بولا۔ ”مجھے پورا یقین ہے کہ یہ سارا چکر وہ اپنے باپ شاہ میر کی ہدایت پر

چلا رہا ہے کیونکہ رانا بشیر اس کے لیے گلے کا پسندابن چکا ہے بلکہ اس کی تو زندگی کو بھی خطرہ لاحق ہے۔“

”میں اس صورت حال سے غافل نہیں ہوں کالیا!“ میں نے خیال انگیز لہجے میں کہا۔ ”لیکن ابھی رانا بشیر، شاہ میر کے گلے کا کھچھچھو تندر بنا ہوا ہے، جسے وہ نہ نکل پارہا ہے اور نہ ہی اگل سکتا ہے۔“

ہم کافی دیر تک آپس میں باتیں کرتے رہے۔ میں نے رات گزار دی۔ اگلے دن میں حاصمہ بہن اور ہم کو لیے اپنے گھر میں شفٹ ہو گیا۔ اس سے پہلے میں نے گھر کی اچھی طرح صفائی ستھرائی کروائی تھی۔ گلے والے بھی میری داپسی پر خوش ہو گئے تھے۔ حاجی کریم بخش سے بھی میری ملاقات ہوئی تھی۔ وہ بھی بہت خوش تھے۔ محلے میں کافی تبدیلی آئی تھی۔ محلے میں داخلے کے لیے ایک اتنی کٹ لگا دیا گیا تھا اور وہاں ہمارے بارہ گھنٹہ کی ڈیوٹی کے ساتھ دو چوکیداروں کو بھی مختلف اوقات میں تعینات کر دیا گیا تھا جو ہر آنے جانے والے کی نگرانی کرتے تھے اور کسی بھی غیر متعلقہ افراد کو تعذیب کیے بغیر اندر نہیں چھوڑتے تھے۔

محلہ کمیٹی کے اراکین نے گھر گھر سے ہر ماہ بطور ”میٹینس“ پانچ سو مقرر کر رکھے تھے۔ سب کی سیکورٹی کا معاملہ تھا اسی لیے لوگوں نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔

ہم تینوں بہن بھائی ایک بار پھر اپنی چھت تلے اکٹھے ہو کر بے حد خوش محسوس کرنے لگے لیکن فہیم کی معذوری پر حاصمہ بہن اور بانٹھو میرا دل بے حد کڑا کرتا تھا۔ میں اس کا جلد سے جلد انتقام لینا چاہتا تھا اور شہر میرا اگلا ہدف تھا۔

اس کے اگلے دن کاشف اور اس کے ماں باپ بھی حاصمہ بہن کے رشتے کے سلسلے میں بات کرنے آئے۔ انہیں حاصمہ پسند آئی تھی۔ حاصمہ نے مہمانوں کے لیے چائے پر خاصا پر تکلف اہتمام کر رکھا تھا۔ پکڑے اور سو سے اس نے گھر پر ہی تیار کیے تھے چائے کی چائ بھی بنائی تھی۔ باقی تھوڑا بہت میں بازار سے لے آیا تھا۔ اس سے بھی کاشف کے والدین کو لڑکی کے سکھڑاے کا اندازہ ہوا تھا اور انہوں نے اپنے بیٹے کی ”پسند“ کو بے حد سراہا بھی تھا۔

چاچا انور شاہ کو بھی ہم نے اس اہم نشست میں شامل رکھنا ضروری سمجھا تھا، وہ ہمارے ”بڑوں“ جیسی حیثیت رکھتے

تھے اور ان سے مشورہ کیے بغیر ہم کوئی ایسی اہم بات کو آگے نہیں بڑھا سکتے تھے۔

ساری گفتگو بڑی تسلی اور اطمینان بھرے انداز میں ہوتی رہی۔ بڑی خوش اسلوبی سے یہ رشتہ طے ہو جانے پر ہر کسی کے چہرے سے خوشیاں پھوٹی پڑ رہی تھیں کہ اجانک ایک منوع پر کاشف کی ماں جو بیگم ارشد بھائی تھیں۔ گھر کا جائزہ لیتے ہوئے پولیس۔

”بیٹا! لڑکی ہمیں پسند آگئی ہے۔ یہ ماشاء اللہ بہت نصیبوں والی ہے کہ اس نے ہمارے کاشی بیٹے کا نصیب بھی چکا ڈالا۔ اسے بہت اچھی نوکری مل گئی ہے۔“

”اچھا! تو بڑی خوشی کی بات ہے۔“ میں نے ایک نظر قریب بیٹھے کاشف کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ویسے تو یہ پہلے ہی جاب کر رہے تھے؟ کیا وہ ان کی ترقی ہوئی ہے؟“

”جی نہیں نعمان بھائی! وہ جاب میں نے چھوڑ دی ہے۔“ کاشف نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”وہ کوئی خاص نوکری نہیں تھی۔ اس بار مجھے اپنے مطلب کی اور مقابلاً اچھی جاب ملی ہے۔ یعنی نہ گھر بھی خرید کر دیا ہے۔ بالکل نیا گھر۔ اپنے ایلے لائز کے لیے اس کمپنی نے ایک سوئیں گز کے مختلف جگہوں میں پلاٹ لے رکھے تھے۔ انہی پر گھر بنوائے گئے تھے۔“

”اچھا! بہت خوشی ہوئی یہ سن کر۔ اللہ یہ رشتہ ہم دونوں خاندانوں کے لیے عزت و باہر توں والا ہو۔“

”آئیں!“ ہم سب کے منہ سے بے اختیار نکلا تھا۔ ”نیا گھر کون سے علاقے میں ہے؟“ میں نے یونہی پوچھا۔

”بھائی کالونی۔“ کاشف نے بتایا اور میں چونک پڑا۔ پھر انکا ایک سادہ بھائی کے بتاتے ہوئے اس محلے والے لڑکے کا موازنہ میں نے کاشف کے محلے سے کیا تو حیران رہ گیا۔ اندر سے بری طرح ششکا۔ میں نے جب انکا سوال کاشف سے کیا تو مجھے اپنی آواز پھنسی پھنسی ہی محسوس ہونے لگی۔

”بھائی کالونی کے کون سے سیکٹر میں ہے؟ وہ نیا گھر؟“

”جی بھائی جان! وہ میکسٹری میں ہے۔“ کہتے ہوئے کاشف نے جب اپنے منے گھر کا پتا بتایا تو میں اپنی جگہ سن ہو کر رہ گیا۔ تو گویا سادہ بھائی نے اس روز جس نوجوان کا تعاقب کیا تھا وہ یہی کاشف تھا؟ میں سوچنے لگا۔

میں نے فوراً اپنی کیفیات پر قابو پایا اور پوچھا۔

”جانب کی نوعیت کیا ہے؟“

”اکاؤنٹ اور تھوڑا بہت فیلڈ ورک ہے۔“

”کمپنی کون سی ہے؟“

”ایک بڑی آئل کمپنی ہے۔ مگلو آئل جس کی برانچ مشرق وسطیٰ تک پھیلی ہوئی ہیں۔ قطر، بحرین، امارات اور دبی وغیرہ۔“ کاشف نے بڑے فخر سے بتایا۔ میں بڑے غور سے کاشف کا چہرہ دیکھنے لگا۔ مجھے وہاں ایسے کوئی آثار دکھائی نہیں دے جس سے اندازہ ہوتا ہو کہ وہ کچھ چھپانے یا بے ظاہر کرنے کی کوشش چاہ رہا ہو کہ اسے پس پردہ حقائق کا علم نہ ہو۔ یہ بات صین ممکن ہی کہ محض اتفاق سے کاشف کو وہاں جاب ملی تھی یا پھر یہ ان دونوں باپ بیٹے شاہ میر اور شہزادہ کوئی گہری سازش کا دخل تھا۔

میں اس سلسلے میں کاشف کو مزید کریدنا چاہتا تھا مگر کچھ سوچ کر یہ کسی اور وقت کے لیے اٹھایا۔

بہر کیف کاشف کے والدین تاریخ کی کرنے کے لیے ہنستے تھے۔ مجھے بھی کوئی اعتراض نہ ہوتا لیکن اب تازہ ترین صورت حال کے گوش نظر میں نے سرسخت انہیں ٹال دیا مگر جلد تاریخ دینے کا وعدہ ضرور کر لیا۔ اس پر اس بار ارشد صاحب بولے۔

”نعمان میاں! یہ فرض جتنی جلد ہو سکے تو تمنا لو کیونکہ کاشف بیٹا کہہ رہا تھا کہ.....“ وہ اپنے بیٹے کی طرف ایک نظر ڈال کر بولے۔ ”کمپنی والے بہت جلد اسے چند مہینوں کے لیے امارت بھیجنا چاہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ حاصمہ بیٹی اس سے پہلے ہی ہماری بہن بن کر آجائے تو کاشف کے بعد میں اداسی نہ ہو۔“

کاشف کے باپ ارشد بیگ کی بات سن کر میں تھوڑا چونکا۔ بولا۔ ”تو کیا شادی کے بعد کاشف اکیلا امارت چلا جائے گا؟“ اس پر بیگم ارشد جلدی سے بولی۔ ”تو کیا ہوا؟ خدا خواستہ کوئی ہمیشہ کے لیے تھوڑی چلا جائے گا۔ چند ماہ کی بات ہے لوٹ آئے گا، اب دیکھو نا اتنی اچھی نوکری بھی تو ملی ہے جو دو روز نہیں ملتی اور پھر حاصمہ کون سا اکیلی ہوگی۔ ہم ہیں نا اس کے ساتھ تم کیوں دل چھوٹا کرتے ہو۔ نعمان بیٹے؟“

خاتون کا مجھے بیٹا کہنا اچھا لگ رہا تھا مگر میرے لیے یہ کوئی بڑی بات نہ تھی، اصل بات کچھ اور تھی۔ تاہم میں خاموش رہا لیکن تاریخ میں نے پھر بھی کی نہیں ہونے دی اور تھوڑا اٹانم مانگ لیا۔ خاتون تو تاریخ لینے پر ہنستیں اور کاشف کی بھی

دوبارہ ایسا مت کہتا مجھ سے اور نہ ہی اپنی معذوری کا ذکر کر رہی۔ میں نے تم سے محبت کی ہے، اندھی چاہت کی ہے تم سے میں نے۔

”آہ نعمان! اس قدر خوش قسمت ہوں میں کہ مجھے اتنی چاہتوں والی بے لوث و بے غرض محبت ملی ہے تمہاری صورت۔“ وہ جذبات تلے کراہ کے بولی۔ ”لیکن نعمان! ابھی کبھی میرا اندر، میرا ضمیر مجھے کچھ بھی لگا رہا ہے کہ۔“

”ہم اصل موضوع سے ہٹ رہے ہیں فوزیہ!“ میں نے اس بار سنجیدگی سے کہا۔

”تم آگے کچھ بتا رہی تھیں؟“

”بس! ابھی کچھ تھا بتانے کو اور کیا بتاؤں؟“ اس کی لرزتی آواز ابھری۔

میں ہونٹ پیچھے کچھ سوچتا رہا اس کے بعد بولا۔

”ایک بات بتاؤ کیا لڑکے کے ماں باپ نے تمہیں دیکھا ہے؟“ میرا مطلب یہ قریب ہے؟“ میری آواز حلق میں اٹکنے لگی۔ بات حساس تھی مگر فوزیہ میرا اشارہ سمجھ گئی فوراً جواب دیا۔

”ہاں! انہیں معلوم ہے کہ میں دونوں ناگوں سے معذور ہوں۔ خالہ انہیں بتا چکی ہے اور خالہ نے ہی یہ رشتہ ڈھونڈا ہے۔“

”اس کے باوجود؟“ میرے لہجے میں قدرے حرمت تھی۔

”ہاں! اس لیے کہ لڑکے کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔“ فوزیہ نے جیسے کرب ناک انکشاف کیا۔

”سنگ..... کیا مطلب؟“ وہ بھی معذور ہے؟“

”وہ جسمانی طور پر بالکل ٹھیک ٹھاک اور صحت مند ہے۔ ل۔ لیکن..... وہ ذہنی طور پر معذور ہے۔“

”سنگ..... کیا؟“ میں چیخ پڑا۔

”ہاں! اس کا جسم تو تین یا پانچ سال کا ہے مگر ذہن سات آٹھ سالہ بچے کا سا ہے۔“ اس کی آواز ڈھونڈی جارہی تھی۔

”مم..... مجھے یقین نہیں آرہا۔ ایک باپ اپنی اولاد کے لیے اتنا برا بھی سوچ سکتا ہے؟“

”انہوں نے اپنی طرف سے اچھا سوچا ہے میرے لیے۔ بھلا ایک معذور لڑکی کے ساتھ کون اپنی ساری زندگی بتا سکتا ہے۔“

”خدا کے لیے فوزیہ! یہ معذوری کی گردان چھوڑو۔“

میری تو یہ نہیں سمجھ میں آرہا ہے کہ عطا صاحب اسے سمجھاد اور وضع دار انسان ہوتے ہوئے اپنی بیٹی کی زندگی جہنم میں کیوں جھونک رہے ہیں، کچھ بھی سہی لیکن والدین تو اپنی اولاد کے لیے اچھا ہی سوچتے ہیں۔

”اس سلسلے میں بابا جانی کی اپنی ایک منطق ہے۔“ فوزیہ دھکی لکھے میں بولی۔

”کیسی منطق؟“ میں نے کھلے کھلے دل سے پوچھا۔

”وہ کہتے ہیں بیٹی! اگر میں چاہے دولت کے بل بوتے پر یا کسی ایسے غریب آدمی سے تہاوا کلاچ کروا بھی دوں جس میں کوئی بھی جسمانی نقص نہ ہو لیکن یاد رکھنا بیٹی اس کی طرف سے ایک دھڑکا ضرور لگا رہے گا کہ وہ یہ بوجھ ساری زندگی نہیں اٹھا سکتا۔ یہ بوجھ صرف ماں باپ ہی اٹھا سکتے ہیں لیکن چوں کہ بیٹیوں کا معاملہ اور ہوتا ہے اور وہ بھی میرے جیسی بیٹیوں کا تو اس میں بہت سوچ کچھ کر ایسے رشتے قائم کرنے پڑتے ہیں۔“

”تو گویا تمہارے بابا جانی نے تم سے اس سلسلے میں تمہاری مرضی بھی پوچھی تھی؟“ میرا لہجہ تڑپا ہوا جا رہا تھا۔

”ہاں!“ وہ بولی۔ ”بابا جانی مجھے اپنی طرف سے اعتدال میں لینے کی غرض سے یہ سب کہہ رہے تھے۔ انہیں بھلا میرے دل کی حالت زار کا کیا پتا تھا؟“ وہ بولی۔

”بیٹی! ہر ماں باپ اپنی اولاد کی بہتری کے بارے میں ہی سوچتے ہیں۔ تم تمہاری بہتری اسی میں سمجھتے ہیں کیونکہ اللہ نے دنیا میں ہر کسی کا جوڑا پیدا کیا ہے اور جوڑا وہی کامیاب رہتا ہے جو اپنے جیسا ہو، گل شریک کا بیٹا مسعود ذہنی معذور بھی لیکن وہ گل شیر خان کی ساری جائیداد کا اکیلا وارث ہے۔ وہ تمہارے قابو میں رہے گا۔ نوکر چاکر شاٹھ باٹھ والی زندگی گزارو گی تم۔ روز دوسرا آدمی تو بیٹی نہیں طعینیں دے دے کر ہی ادھ مورا کر دے گا۔“

”بابا جانی کی اس عجیب و غریب منطق سے میں متفق نہیں تھی مگر میں خاموش رہی۔“ وہ سنسنے لگی اور میں اندر سے جھیر جھیر ہونے لگا۔

فوزیہ میری پسند اور میری محبت تھی لیکن عام تناظر میں دیکھا جاتا تو عطا مجھ جیسے باپ اولاد کی بہتری کے نام پر اپنی بیٹیوں کو اس طرح اپنے ہاتھوں سے زندہ درگور کر دیتے ہیں۔ وہ دنیا کی آسائشوں اور آرام و سکون کو ہی سب کچھ سمجھنے لگتے ہیں۔ یہ نہیں جانتے کہ عورت ذات کے بھی کچھ ارمان اور جذبات ہوتے ہیں۔ ان کے لیے ہر شے روپیہ پیسا نہیں

ہوتا۔ وہ ایک ساتھی کی بھی تمنا رکھتی ہیں، ایک سچے ساتھی کی جو دکھ کھٹک میں اس کے ساتھ ہو۔

”روشنے سے کچھ نہیں ہوگا فوزیہ!“ بالآخر میں نے اس کی بدستور سسکتی ہوئی آوازوں کو سنتے ہوئے کھنڈی ہوئی سنجیدگی سے کہا۔ ”تمہیں اپنے باپ سے صاف صاف کہہ دینا چاہیے تھا کہ تمہیں اس رشتے سے انکار ہے۔“

”تو کیا میں انہیں تمہارا بیٹا دوں؟“ وہ ایک دم بولی۔

میں ڈراما سوچتا بن گیا پھر بولا۔ ”ابھی شاید یہ قبل از وقت ہوگا۔ تم اپنے باپ سے ایسا کہہ بھی نہیں سکتیں۔ ہاں! میں اس کے بارے میں اب سنجیدگی سے سوچتا ہوں لیکن ابھی تم فوری طور پر اس رشتے سے انکار کر ڈالو۔“

”بابا جانی سے میں اس وقت تو کچھ کہنے کی جرأت نہ کر سکتی تھی۔ تاہم انہوں نے مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت دیا ہے۔ کل جواب مانگا ہے انہوں نے ٹھیک ہے میں، انکار تو میں نے ویسے بھی کرنا ہی تھا۔ کل میں انہیں اپنے جواب سے آگاہ کر دوں گی۔“

”گڈ! اس طرح باہت یہ فوزیہ! یہ ہم دونوں کی زندگی کا معاملہ ہے۔“ میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

”ل۔ لیکن نعمان! میرا دل اب جانے کیوں ہے چین اور پریشان رہنے لگا ہے، پلیز، تم بھی کچھ قدم آگے بڑھاؤ۔“ وہ متوشل سے لہجے میں بولی۔ ”آج ایک رشتہ آیا ہے کل اور بھی آسکتا ہے۔ اس کا بھی مجھے نہیں پتا، نہیں بابا جانی اسے اپنی خدمت نہ بنائیں۔“

”میں نے کہا فوزیہ! میری جان! میں آج سے ہی اس معاملے پر غور کرنا شروع کر دوں گا۔“ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”میں سب سے پہلے چاچا انور شاہ سے کچھ مشورہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔“

فوزیہ کو کچھ تسلی ہوئی اور پھر رابطہ منقطع ہو گیا۔ میں نے سیل فون دوبارہ سامنے میز پر رکھ دیا اور پھر سوچ انداز میں اپنی پیشانی مسلتے لگا۔ حاصد، بہن کی شادی کا بھی معاملہ چل پڑا تھا ایسے میں میرا معاملہ آسان بات نہ تھی جبکہ حقیقت یہی تھی کہ میں تو اپنے اس ”معاملے“ سے بالکل ہی بے فکر تھا کہ اپنے وقت میں یہ کام ہو ہی جائے گا۔

بالآخر خاصی سوچ و چار کے بعد میں نے یہی فیصلہ کیا کہ میں اس بارے میں چاچا انور شاہ سے بات کر کے دیکھتا ہوں کہ وہ مجھے اس سلسلے میں کیا مشورہ دیتے ہیں؟ ہمارے بڑے وہی تھے۔ ہم اپنے ذاتی معاملات ان کے مشورے کے

بغیر آگے نہیں بڑھا سکتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ اس روز حاصد کے رشتے کے لیے آئے ہوئے کاشف کے والدین کی آمد پر ہم نے چاچا انور شاہ کو بھی ان کے سامنے اپنے ”بڑے“ کی حیثیت سے شامل کیا تھا۔

☆.....☆

کالیا کی حالت بہت بہتر ہو گئی تھی۔ وہ خود کو کافی ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا تھا اس کی وجہ اس نے مسکراتے ہوئے یہی بتائی تھی کہ میرے سر سے کافی بوجھ اترنے لگا تھا۔ باپانی ناسور کثیر کردار تک پہنچ چکے تھے۔ ان کی باقیات اپنے زخم چاٹنے پر مجبور تھیں۔ وہ بار بار قاتلون کی گرفت میں آتے اور چھوٹتے رہے تھے مگر اس بار میری مستقل مزاجی اور پُرعزم ثابت قدمی کے باعث وہ حمل طور پر قاتلون کی پکڑ میں آ چکے تھے اور لمبے عرصے کے لیے تیز چاٹ چکے تھے۔ اصل دشمن شاہ میرا بھی پانی تھا اور دیکھا جاتا تو وہی میرا اصل ہدف تھا اور میری زندگی کا مقصد بھی۔

اس وقت جب میں اور کالیا حیر کو اغوا کرنے کے منصوبے پر غور کر رہے تھے تو فرحانہ کی کال آگئی۔ اس نے مجھ سے فوراً ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ مجھے ایسا اعتراض ہو سکتا تھا۔ میں نے اسے کل صبح لاری اڈے والے دفتر آئے کا وقت دیا تو وہ بے چینی سے بولی۔

”تمہیں نعمان صاحب! پلیز، بات بہت ضروری ہے، میں آپ سے ابھی ملنا چاہتی ہوں۔“ میں اس کی بات سن کر متعجب ہوا۔

”فون پر کچھ بتا سکتی ہیں؟“

”نہیں۔“

”تب پھر آپ کل ہی آجائیں، آج کا پورا دن میں مصروف ہوں۔“

دوسری جانب چند لمبے پُرسوجھی خاموشی طاری رہی اس کے بعد اس کی بیٹی بیٹی کی آواز ابھری۔

”مم..... میں نے دراصل ضمیر کے سلسلے میں آپ سے کچھ دریافت کرنا تھا۔“

”ہمم!“ میرے منہ سے خیال انگیز ہرکاری خارج ہوئی۔ بولا۔ ”میرا خیال ہے رانا صاحب نے آپ کو اس کی حقیقت سے آگاہ کر دیا ہے۔“

”حقیقت کیا ہے۔ وہ میں آپ سے بھی جانتا چاہوں گی۔“ وہ بولی۔

”کیا آپ میری بات کا یقین کر لیں گی؟“ میرے

لہجے میں بلکا سا طعنے عود آیا تھا۔
”آپ سے تفصیل منگنے کے بعد ہی میں کسی نتیجے پر پہنچ سکتی ہوں تاکہ..... تاکہ.....“ وہ کچھ کہتے ہوئے رکی تو میں نے کہا۔

”جی! بولیں، کیا کہنا چاہتی ہیں آپ؟“
”میرا مطلب تھا کہ اگر میرے متعلق آپ کی اور یا آپ کی باتیں مجھے درست لگیں تو میں اس سلسلے میں خبر سے بھی بات کر سکتی ہوں۔“ میں اس کی بات پر تھوڑا چونکا اور بولا۔
”اچھا! جب آپ کو ہماری باتوں کا یقین ہو جائے گا تو اس کے بعد بھی کیا آپ یہ ضرورت محسوس کریں گی کہ میرے سے ملنے کی... کوکشن کریں؟“

”نعمان صاحب! آپ نے زندگی میں کبھی محبت کی ہے؟“ فرحانہ کے اچانک اس سوال سے میں لمحہ بھر کو بڑا سا گیبا۔ میری چشم تصور میں فوریہ کا چہرہ نمودار گیا۔ میں جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ لہذا مختصر اِثبات میں جواب دیا۔
”ہاں!“

”میری مراد بہن بھائی یا ماں باپ سے نہیں ہے۔“ وہ جیسے وضاحت طلب لہجے میں بولی۔
”میں آپ کی بات کا مطلب سمجھ چکا ہوں۔ آگے بولیں۔“

”میری مراد، کسی لڑکی سے تھی۔“
”میں نے کہا تھا، میرا مطلب بھی وہی ہے۔“
”تب پھر مجھے بتائیں آپ اگر اس لڑکی کے ماں باپ یا اس کے خاندان والے آپ کے کسی خاندان کے کسی فرد کے قاتل نکل آئیں تو کیا آپ اس لڑکی سے محبت کرنا چھوڑ دیں گے؟ اس سے آپ قطع تعلق کر لیں گے؟“

بڑا عجیب سا سوال پوچھ لیا تھا اس نے۔ مجھے اس کی وجہ یہی سمجھ میں آ رہی تھی کہ میری ماں باپ کی واپسی کے بعد دونوں باپ بیٹی کے درمیان اس اہم موضوع پر مکمل گفتگو ہوئی ہوگی۔ چونکہ معاملہ ایک بیٹی اور خطرناک اور خونی دشمن کا تھا، اسی لیے رانا شیر نے بغیر کسی لحاظ و مردت کے بیٹی کو میرے باپ سے متعلق ساری حقیقت بتا دی ہوگی۔ اتنی بڑی بات جھوٹ نہیں ہو سکتی تھی۔ رانا شیر نے بھینسا میری مہم جوئی کا بھی حوالہ دیا ہوگا۔ ایک باپ بیٹی سے جھوٹ نہیں بول سکتا تھا اسی لیے فرحانہ کو اپنے باپ کی بات پر یقین کرنا پڑا ہوگا۔

لہذا اب مجھے فرحانہ کے اس انداز کے سوال نے بادر کر دیا تھا کہ وہ کسی اور انداز سے اپنے عاشق کا دفاع

کرنے کی کوشش میں تھی۔ مثلاً باپ کا کیا بیٹا کیوں بھگتے۔ بٹے کے خیال باپ کے مجرمانہ خیالات سے مختلف بھی ہو سکتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ آیا فرحانہ کی اس سلسلے میں خبر سے کوئی بات ہوئی تھی یا نہیں۔

”آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا نعمان صاحب!“ مجھے خاموش اور سوچنا پکاروہ دوبارہ متغیر ہوئی تو میں نے ایک گہری سانس لے کر جواب میں کہا۔
”یہ انصاف کرے گا کہ بیٹا باپ کے کالے کر تو توں سے واقف ہے یا نہیں، ہے تو کیا وہ اس کی مذمت کرتا ہے؟“
”نعمان سنگ بہت اچھا جواب دیا آپ نے۔“ وہ ایک دم مکمل گئی۔

”کیا آپ کی خبر سے اس موضوع سے متعلق بات ہو چکی ہے؟“

”ہاں!“ اس نے جواب دیا۔
”کیا تاثرات اس سے آئے؟“

”اس نے یہی جواب دیا تھا کہ وہ غلطی پر ہیں تو میرا ان کے اعمال سے کوئی تعلق نہیں۔“
”غلطی پر؟“ میرا دماغ ایک دم ہوتا گیا۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ اپنے محبوب کے دفاع کے لیے ہر ممکن طریقے سے کوشاں تھی۔ کسی نے درست ہی تو کہا ہے کہ محبت خود غرض ہوتی ہے۔

”کیا بات کر رہی ہیں فرحانہ صاحب! شیر کا باپ آپ کے لیے ہی نہیں بلکہ میرے لیے بھی ایک خونی جرم کی حیثیت رکھتا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے میرے جی میں تو آئی کہ میں اپنے بھائی فہیم سے متعلق اس کی بربریت اور انسانیت سوز حرکت کے بارے میں بتا دوں لیکن پھر میں نے ارادہ بدل دیا۔ کیا فائدہ ہوتا اس کا۔ فرحانہ کی تان پھر ایک ہی بات پر ٹوٹتی۔ یعنی باپ کے کالے کر تو توں سے اس کا کوئی تعلق نہیں، بولیں وہ اپنے محبوب کو اس سے متعلق قرار دلوانے کے چکر دوں میں تھی۔
”تو آپ پھر میرے کیا چاہتے ہیں؟“ اس نے پوچھا۔ میرے لیے فرحانہ کی ان خود غرضانہ باتیں اس کے لیے بھی نفرت ابھارنے کا سبب بن رہی تھیں۔

”شیر محض یہ کہہ کر خود کو بری الذمہ قرار نہیں دے سکتا مس فرحانہ! وہ اگر آپ سے سچی محبت کرتا ہے تو اسے اپنے باپ کو کبیر کر دراتک پہنچانے کے لیے آپ کا ساتھ دیتا چاہیے کیونکہ آپ کے محبوب کا باپ نہ صرف آپ کی ماں کا قاتل ہی نہیں بلکہ میرے بے گناہ باپ کا بھی قاتل ہے۔“

اس نے جواب دینے کی بجائے فون بند کر دیا۔ مجھے فرحانہ کی اس حرکت پر بے انتہا غصہ آیا۔ میں نے ٹرپش انداز میں اپنے ہونٹ سمجھ لے لیے اور اسی وقت فرحانہ کے اسی نمبر پر کال بیک کر ڈالی۔ دوسری جانب تیل جا رہی تھی۔ خاصی دیر بعد اس نے کال ریسیو کی تھی۔

”کال کٹ گئی تھی یا آپ نے دانستہ کال دی تھی؟“
”مارے طیش کے میری سانسیں چڑھنے لگی تھیں۔ حالانکہ یہ میرے مزاج کا حصہ نہیں تھا مگر میں دیکھ رہا تھا کہ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ مجھ میں کچھ ایسی قسم کی تبدیلیاں رونما ہونے لگی تھیں۔“

”آپ نے مزید کیا بات کرنی ہے اب؟“ اس نے کہا۔ میں سمجھ گیا کہ اس نے دانستہ کال کائی تھی۔ یہ جانتے ہی جوش غیض سے میرا رواں رواں مرتعش ہونے لگا تھا۔
”مس فرحانہ! شاید آپ سچ سے خوف زدہ ہو گئی تھیں اسی لیے کال کٹ دی لیکن ایک بات کان کھول کر سن لیں اور فہیم کو بھی بتا دیں۔ میں بخلا پیٹنے والا آدمی نہیں ہوں۔ شاہ میر کے ساتھ اگر مجھے اس کے بیٹے شیر کی بھی قہر کھونٹا پڑی تو میں درپیش کروں گا۔ یہ بات میری طرف سے فہیم کو بھی بتا دینا اور تم بھی یاد رکھنا۔“
”جو اب غصے میں وہ کچھ کہنے لگی تھی مگر میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔“

☆.....☆

ایسی روز تین بجے کا شفت میرے کہنے پر لا رہی آؤے پر ان پہنچا دوست مجھ کو کوش میں کھڑا تھا کہ کا شفت نامی اس نو جوان کو کبیر حامیرے کمرے میں لے آئے۔

اب کا شفت میری میز کے سامنے والی کرسی پر براہِ جان تھا اور میری طرف کچھ اچھی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کے لیے چائے منگوائی تو وہ بولا۔ ”بس ٹھیک تو ہے ناں نعمان بھائی؟“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں! بس ٹھیک ہی ہے۔“ میں نے کہا اور غور سے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”تم شاہ میر کو جانتے ہو؟“

”جی ہاں، بالکل! وہ میرے چیف باس اور میر صاحب کے والد صاحب ہیں۔“ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ”مگر شاہ میر کو آپ کیسے جانتے ہیں؟“ اس نے بھی پوچھ لیا۔ میں بھائی ہوئی نظروں سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا اور مجھے اس کے چہرے سے ایسی کوئی بات محسوس نہیں ہوئی تھی جو میرے شکوک

کو تقویت بخشتے۔ وہ مجھے واقعی انجان لگ رہا تھا۔ یعنی وہ فہیم یا شاہ میر کا آلہ کار نہیں تھا یا پھر یہ شخص ایک اتفاق ہی تھا کہ کا شفت کو ان کی آگلی کمپنی میں ایک اچھی جاب مل چکی تھی۔ البتہ یہ الگ بات ہو سکتی تھی کہ اسے مستقبل میں میرے خلاف استعمال کیا جاسکتا تھا لیکن دیکھنا یہ تھا کہ میں کا شفت سے ان دونوں باپ بیٹوں کے خلاف کیا کام لے سکتا تھا؟ اور آیا یہ بہتر ہوتا بھی یا نہیں کیونکہ کا شفت میرا ہونے والا بیٹوئی تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ ایسے کسی حالات کا شکار ہو۔

”نعمان بھائی! مجھے پریشانی سی ہو رہی ہے، پلیز کوئی مسئلہ ہے تو ذرا مکمل کر بات کریں۔“ مجھے سوچنا ہوا خاموش پا کر اس نے کہا تو میں نے ہونے سے ٹھکھکارتے ہوئے کہا۔
”کا شفت! تم تو ہمارے حالات سے اچھی طرح واقف ہو لیکن کچھ باتیں تمہیں بھی نہیں معلوم ہیں۔ یوں بھی ان کا جانتا تھا ہمارے لیے اتنا ضروری نہیں ہے۔ تم؟“ میں اتنا کہہ کر ڈرار کا پھر لہجہ بھر کے توقف کے بعد بولا۔ ”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم شاہ میر اور فہیم شاہ سے دور ہو جاؤ؟“

میری بات اس کے لیے چونکا دینے والی ثابت ہوئی۔ بولا۔ ”نن..... نعمان بھائی! یہ..... آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ اتنی اچھی جاب کو کوش بغیر کسی وجہ کے چھوڑ دوں؟ مگر کیوں؟“ اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

”اس لیے کہ تم ان دونوں باپ بیٹے کی اصلیت سے واقف نہیں ہو۔ یہ دونوں ہائی پروفائل کریمینٹو ہیں۔“ میں نے جیسے انکشاف کیا۔

”کک..... کیا.....؟“ کا شفت کا منہ کھلا رہ گیا۔ ”میں کچھ سمجھا نہیں۔“

”تمہیں زیادہ سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں ہے، کا شفت، میاں!“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”اگر تم میرے ہونے والے بیٹوئی نہ ہوتے تو اور بات تھی لیکن اب چونکہ تم سے ہمارا رشتہ قائم ہونے والا ہے اور میں نہیں چاہوں گا کہ تمہارے کسی نقصان کی سزا اہم سب کو بھگتنا پڑے۔“

کا شفت چند ثانیے خاموش رہا پھر بولا۔ ”بہتر ہوتا نعمان بھائی آپ مجھے ان کے بارے میں تھوڑی تفصیل بتا دیتے۔“

”کیا تمہارے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ میں کہہ رہا ہوں وہ لوگ غلط ہیں؟ کیا میں تمہارا کسی قسم کا نقصان چاہوں گا؟“
”وہ تو ٹھیک ہے نعمان بھائی! لیکن.....“ وہ کچھ کہتے

کرو تو مجھے ضرور بتانا اور مجھ سے رابطے میں رہنا۔" میں نے جلدی جلدی اسے ہدایت دیتے ہوئے کہا۔

"تم ان کا تعاقب کرو گے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں!"

"ٹھیک ہے جگری! میں اور ہی بھوت بن کے چھا رہوں گا۔"

"صرف چھپے نہیں رہنا ہے، اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دونوں باپ بیٹے پر نظر رکھنا ہوگی اور ان کی باتیں بھی سنتے رہو۔"

"بے تم ہو جا جگری! ایسا ہی ہو گا۔ او۔۔۔۔۔" وہ آخر میں چونکا۔

"کیا ہوا؟" میں نے چونک کر دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"دونوں موٹے بد معاش فرحانہ کو لے کر نکل رہے ہیں تم ہی طر ہتا جگری! دونوں سٹ ہیں۔"

"بے فکر ہو، یہ بتاؤ فرحانہ ابھی تک بے ہوش ہے؟"

"ہاں۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے رابطہ منقطع کر دیا اور کار کو ذرا آگے لے جا کر پوٹرن لایا اور اوپس ہوا۔ اسی وقت میں نے شاہ میر کی کونجی کے گیٹ سے سفید ہنڈا سنی کو نکلنے دیکھا۔ اس میں مجھے صرف دو ہی افراد بیٹھے نظر آ رہے تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر تو وہی شخص تھا جسے میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی فرحانہ کی کار کو اندر لے جاتے ہوئے دیکھا تھا جبکہ دوسرا اس کے برابر والی سیٹ پر براجمان تھا۔

ان کا رخ مین روڈ کی طرف تھا۔ یہ اندازہ قائم کرتے ہی میں نے دانستہ اپنا راستہ بدل لیا تاکہ انہیں تعاقب کا شہسہ نہ ہو سکے۔

مین روڈ پر آتے ہی سٹپل آگیا اور میں رک گیا۔ جب ہی میں نے بیک دوپور میں اسی گاڑی کو دیکھا جو تین گاڑیاں چھوڑ کر میرے پیچھے کھڑی تھی۔

سٹپل گرین ہوا اور گاڑیاں تیزی سے پُرشور ہارن دیتی ہوئی آگے بڑھیں۔ میں نے بھی اپنی کار آگے بڑھائی۔ رفتار میں نے آہستہ ہی رکھی تھی۔ جلد ہی وائٹ ہنڈا مجھے کراس کر کے آگے نکل گئی۔ اس کی رفتار خاصی تیز تھی۔ میں ان کے پیچھے لگ گیا۔ سڑک پر ٹریفک کا اڑھام تھا۔ ہنڈا کا ڈرائیور کار کو فاسٹ ٹریک پر لے آیا تھا۔ میں نے بھی ایسا ہی کیا۔ فاسٹ ٹریک پر ٹریفک بسنا رواں اور سبک ہوتی ہے۔

میں نے اپنی کار گزار کر لے گیا۔ ٹھیک اسی وقت میری نگاہ بیک دوپور پر پڑی اور میں نے اپنی کار کی رفتار آہستہ کر لی۔ ایک ٹیم خیم سے آدی کو میں نے گیٹ سے نکلنے اور فرحانہ کی کار میں سوار ہوتے دیکھا۔ پھر اس کے فوراً بعد میں۔۔۔ کار کو اسٹارٹ کر کے اندر لے گیا۔ میں تب تک دائیں جانب مڑ گیا تھا۔ جانے کیوں میرا ذہن ٹھنکا تھا۔ فرحانہ کی یہاں آمد اور پھر اس کی کار کو کسی ایسی جگہ کا اندر لے جانا آخر کیا معنی رکھتا تھا؟ اس بات سے میں ٹھنک سا گیا تھا۔

میں نے قریب میں کوئی خالی جگہ دیکھ کر کار روک دی اور ابھی بچے اترتے ہی لگا تھا کہ کالیا کی کال آ گئی، جو میں نے فوراً ریسپونڈ کیا۔

"ابے لے جگری! یہاں تو اور ہی کچھڑی پک رہی ہے۔"

"دوسری جانب سے اس کی مخصوص آواز ابھری۔"

"کیا مطلب؟ جلدی بتا۔" میں نے پوچھا۔

"میں ابھی اندر ہی تھا کہ رانا بیکری کی فرحانہ وہاں آ گئی۔" وہ بتانے لگا۔ "من! اسے اغوا کر لیا گیا ہے۔ وہ بے ہوش ہے اور اب اسے اس ایک آدی کے ساتھ کھ کی اور جگہ رواں کیا جا رہا ہے۔"

میں اس کی بات سن کر بری طرح چونک گیا۔ بولا۔ "یہ بتا اندر کون کون موجود ہے؟"

"شیر اور اس کا باپ شاہ میر۔ ایک دو ٹکڑے بد معاش، جو کچھ ابھی ان کا اپنا ہی آدی ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"اس کی بیوی اور بیٹی؟" میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

"وہ نہیں ہیں، البتہ دونوں باپ بیٹوں کو میں نے ان کے بارے میں یہ باتیں کرتے سنا تھا کہ یہ کام جلدی نمٹا لو اس سے پہلے کہ کسی اور کا شہسہ آ جائے۔"

"ہاں! سنی سہما اس کی بیوی ہے جو ایک عربک خاتون ہے جبکہ کاٹھہ بیٹی ہے۔" میں نے کہا۔

"اب کرنا کیا ہے؟ جلدی بتاؤ؟" کالیا بولا۔

"تم اندر محفوظ پوزیشن میں ہو؟" میں نے لمحہ بھر سوچنے کے بعد پوچھا۔

"ہاں! یہاں کچھ زیادہ لوگ نہیں ہیں جو ہیں وہ فی الحال شیر اور شاہ میر کے نکلنے والے ہیں۔"

"ٹھیک ہے، تم اندر جیسے رہو اور محتاط رہنا۔" میں نے تیزی سے سوچتے ہوئے کہا۔ "نہیں کوئی غیر معمولی بات محسوس

میں گاڑی پر جھک گیا اور ساتھ ہی گرد و پیش پر بھی نظر ڈال لیتا تھا۔ یہ سب پھر کا وقت تھا۔ میں بھی یونٹ پر جھک جاتا اور بھی سر اٹھا کے ادھر ادھر دیکھنے لگتا۔ ایک بار جب میں یونٹ پر جھکا تو میرے کانوں سے کسی گاڑی کی آواز سنا دی۔ وہ میرے قریب ہی رکھی تھی۔ میں نے سر اٹھا کے اس طرف دیکھا اور بری طرح چونک گیا۔ کار میرے بالکل قریب کھڑی تھی اور اس میں فقط ایک ہی سوار تھا جس نے اسٹیرنگ وکیل سنبھال رکھا تھا۔

وہ فرحانہ تھی۔

میں سیدھا کھڑا ہو گیا تھا اور ایک ٹک اس کی طرف دیکھ کر جا رہا تھا۔ وہ اسٹیرنگ وکیل پر دونوں ہاتھ رکھے گردن موڑے میری جانب دیکھ جا رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ نیچے اترے گی لیکن چند سیکنڈوں بعد ہی اس نے اپنی کار ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔

میرے فرحانہ کے ساتھ گفتگوات کچھ ہو چکے تھے۔ میری یہاں موجودگی پر وہ ضرور کھٹک گئی ہوگی۔ ابھی کل ہی کی تو بات تھی کہ میں اسے شاہ میر اور شیر کے سلسلے میں جارحانہ ٹیم کی دھمکی دے چکا تھا۔ وہ ضرور یہاں شیر سے ملنے آئی ہوگی۔

میں پریشان سا ہو گیا تھا۔ وہ ضرور شیر سے ملنے ہی میری یہاں ایشیاء آئیز موجودگی کے بارے میں اسے نہ صرف آگاہ کر سکتی تھی بلکہ میری طرف سے محتاط بھی رہنے کا کہہ سکتی تھی۔

کالیا کو روانہ ہونے پندرہ بیس منٹ ہو چکے تھے۔ میں نے کالیا کو کال کر ڈالی۔ میں اسے فرحانہ کی آمد اور دیکھ لے جانے کے بارے میں آگاہی دینا چاہتا تھا مگر کالیا نے کال کاٹ دی۔ توشیش آ میز اعزاز میں، میں اپنے ہوش بھینچ کر رہ گیا۔ ایسی کسی ہم کے دوران ہم ایک بات کا خیال رکھتے تھے کہ اپنے فون کو ویل فون سے ہٹا کر وہاں بیٹھیں پر کر دیا کرتے تھے ورنہ فون بیل کی آواز دوسروں کو چونکا سکتی تھی۔

بڑی عجیب اور مشکل صورت حال ہو چکی تھی۔ پائے رفتن نہ جانے مائمن والی صورت حال تھی۔

میں تھوڑی دیر وہیں کھڑا کچھ سوچتا رہا اس کے بعد میں نے کار کا یونٹ گرا دیا اور دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ پھر کار اسٹارٹ کر کے میں نے آگے بڑھا دی۔

میرا رخ شاہ میر کی رہائش گاہ کی طرف تھا۔ جب میں اس کے بلاک والی گلی میں داخل ہوا تو ٹھنک گیا۔ رہائش گاہ کے گیٹ کے باہر مجھے فرحانہ کی کار کھڑی نظر آ گئی تھی۔ اس میں کوئی نہیں تھا۔ ایک من گھٹیا کیٹ پر کھڑا نظر آیا تھا۔ میں اس کے قریب

کہتے رک گیا۔ کچھ سوچتا رہا اس کے بعد وہ مجھے بغیر کوئی حتی جواب دے چلا گیا۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ اس بارے میں ابھی طرح سوچ کر کوئی ایک فیصلہ کر لے جو میں چاہتا تھا۔

اسے رخصت کرنے کے بعد میں استاد بھما کے آؤسے پر بچپنا اور کالیا سے ملا۔ وہ اب کافی بھلا چکا ہو گیا تھا۔

میں نے کالیا کو تیار کیا اور شیر کے اغوا کا پلان بنایا۔

"جیسا تم شاہ میر نے میرے بھائی کی ٹانگیں کاٹنے کی صورت میں مجھے دیا تھا اب وہی تمہیں اسے لوٹانا چاہتا ہوں کالیا!"

"ابے لے جگری! ہاتھ کے بدلے ہاتھ اور ٹانگ کے بدلے ٹانگ۔۔۔۔۔ دیکر کس بات کی ہے۔" شیر کو اغوا کرنے کا میرا مقصد جان لینے کے بعد وہ فوراً اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔

"یہ بتا شیر کو اغوا کر کے لے جانا کہاں ہوگا؟ جہاں ہم اس کی دونوں ٹانگیں کاٹ سکیں۔" میرے لہجے میں سفاکی تھی۔ حالات بد کر گئے تھے مجھے بھی دشمنوں کے خلاف سفاکانہ اقدام اٹھانے پر مجبور کر دیا تھا۔

"جگری! اس انتقام کے بعد ہم نے ایک اور انتقام بھی شاہ میر سے لینا ہوگا۔ ہم پر تلے گا۔" وہ بولا۔

"اس کے بیٹے والا حساب چکنا کرتے ہی ہمارا اگلا قدم شاہ میر پر حملہ کرنا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "شاہ میر پر میں بے درپے حملے کر کے اسے بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگر وہ ہم پر اپنے غنڈوں کے ذریعے حملے کروا سکتا ہے تو ہم بھی اس کا جواب دے سکتے ہیں۔"

"شیر کو اغوا کر کے صفورا والے مکان میں لے چلیں گے۔ میں بھی کونوں کر دیتا ہوں۔"

شاہ میر کی رہائش گاہ میں نے دیکھ رکھی تھی۔ ہم دونوں استاد بھما کے آؤسے سے پرانے ماڈل کی خیمہ کار لے کر روانہ ہو گئے۔

ڈیفنس فیئر فائیک علاقہ نسبتاً ویران ہی ہوتا تھا۔ کار ایک خالی پلاٹ پر کھڑی کر کے اس کا یونٹ ہم نے اوپر اٹھا دیا۔

"تو گاڑی پر جھکا رہے، یہی تاثر دینا کہ اس کی خرابی دور کرنے کی کوشش میں مصروف ہے۔" کالیا نے کہا۔ "میں اندر نقب لگانے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس کے بعد اپنے سٹل پر چھ سے رابطہ کروں گا۔" وہ یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ یہاں سے شاہ میر کی کونجی چند فرلانگ کے فاصلے پر تھی۔

مجھ سے آگے دو گڑیاں اور تجھ اور اس کے بعد مطلوبہ کار۔
کار کے تعاقب کے دوران میرے اندر دھڑکنی پکڑی چلی
ہوئی تھی۔ مجھے ان دونوں باپ بیٹے سے اس قدر جلد فرحانہ
کے سلسلے میں یہ انتہائی قدم اٹھانے کی بالکل بھی توقع نہ تھی۔
تاہم اس سے ظاہر ہو گیا تھا کہ دونوں باپ بیٹے ملے ہوئے
تھے جس کا مجھے پہلے ہی اندازہ تھا۔ ایک خیال اور میرے
ذہن میں کلک ہوا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ فرحانہ یا رانا بشیر کے
ساتھ غیر کا اصل چہرہ بے نقاب ہو گیا تھا اور اس لیے انہوں
نے جلد ہی یہ خطرناک قدم اٹھالیا ہو۔
کار کا رخ ناوری طرف ہو گیا تھا۔

”سی کوڈیرا“ میرے ذہن میں ابھر ا۔ تو کیا فرحانہ کو
بن راند کی لالچ میں پرغالب بنا کر رکھا جائے والا تھا؟ یہ سوچتے
ہی میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ بندرگاہ کا خیال آتے ہی
میرے ذہن میں غفور سے کے باپ کی موت کا دردناک منظر
سامنے آ گیا۔ اس بوڑھے غریب مزدور سے بھلا میرا کیا رشتہ
تھا مگر اس کا دل کتنا بڑا تھا کہ اس نے میری زندگی بچانے کے
لیے خود کو دردناک موت کے سپرد کر دیا تھا۔ کس قدر اذیت
ناک موت سے دوچار ہوا تھا وہ بوڑھا۔ راکا کے اس پر بلندی
سے بھاری بکس گرانے سے اس بوڑھے غریب کی تو ہڈیاں
سر نہ بن گئی ہوں گی۔ یہ خیال آتے ہی راکا کے لیے میرے
وجود میں سخت نفرت اور غیظ و غضب کی لہر اٹھی تھی۔ اس
بوڑھے کا راکا جیسے جلا وطن انسان سے انتقام لینا میرا مقصد
بن گیا تھا۔

میں نے بھی پکا تجویز کر رکھا تھا کہ دشمن اگر تاریک
راہوں میں اپنی سیاہ کاری میں مصروف عمل تھے تو میں نے بھی
انہیں اسی انداز میں جواب دینے کا عزم کر رکھا تھا۔ یوں میرا
ٹارگٹ راکا تھا۔ میں بھی اسے تاریک راہوں کا امیر بنا کے
جہنم واصل کرنا چاہتا تھا۔

میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ کار بندرگاہ پر رکھی تھی اور
وہاں سے بیک یاڑ کی طرف مڑ گئی۔ گیٹ پر جانے انہوں
نے کیا پکڑ چلا یا تھا کہ انہیں اندر جانے دیا گیا تھا جبکہ میں نے
اپنی کار پارہی کھڑی کر دی اور اندر داخل ہو گیا۔

فرحان سے میرا ملنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ ہاں البتہ اس
بد نصیب بوڑھے کے بیٹے غفور سے سے ضرور ملنا تھا۔ یوں
میں یہاں آنے کا کوئی جواز تو بنانا تھا۔ اس دردناک واقعے
کے بعد وہاں مجھے اکثر مزدور بچا گئے تھے۔ ایک نے مجھے
اس کے بارے میں بتایا۔ وہ تین برس تک یاڑ میں تھا۔ میں

اس کا شکر یہ ادا کرتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔
بندرگاہ کی فضا خاصی سلیٹن زدہ ہو رہی تھی۔ میرا رخ
”سی کوڈیر“ (سندری شہزادی) کی طرف تھا۔ یہاں بڑے
بڑے کنٹینرز لگے ہوئے تھے، میں انہی کی آڑ لیتا ہوا مطلوبہ
مقام تک پہنچ کر کار کو تری طرح ٹھک گیا۔

بن راند کا شپ سی کوڈیر جو کچھ دن پہلے جیٹی نمبر نو میں
نظر انداز تھا وہاں دوسری لالچ کھڑی ہوئی تھی۔ یہ ایک عام
سے چھوٹی اور مقامی مسافر لالچ تھی جو لوگوں کو سیر و تفریح کی
غرض سے جزیروں کی سیر کروا کر اپنی جیبی گھر اس وقت وہ بھی
خالی ہی اس کے اندر تھے۔ دشمن ہی خلاصی نظر آئے تھے۔

سی کوڈیر کو غائب پاکر میری کنپٹیاں سائیں سائیں
کرتے لکھیں۔ کیا بن راند اور راکا کا چکے تھے؟ یا پھر کوئی بدل
لی تھی۔ دفعتاً ایک خیال پریش ہو چکا۔ مجھے ان دونوں افراد کو
حلاش کرنا تھا جو میرے خیال کے مطابق فرحانہ کو پرغالب بنانے
یہاں لانے والے تھے لیکن وہ کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ میں
پریشان ہو گیا۔ فرحانہ کے لیے میرا اتنا شوق تو وہ اور فکر مند ہونا
قسطی بات تھی۔

بعض حقائق کے آشکارا ہونے کے بعد رانا بشیر اب مجھ
سے مکمل تعاون کرنے پر آمادہ ہو چکا تھا اور ایسے نازک وقت
میں مجھے اس کے تعاون کی ضرورت بھی تھی جبکہ فرحانہ میرے
عشق میں اندر مچی تھی اور اس کا فضا زدہ ہونے والی تھی۔ چنانچہ یہ
بات اب یقینی تھی کہ فرحانہ پر غور اور ان دونوں سطحوں باپ
بیٹیوں کی اصلیت بے نقاب ہوتے ہی اس کی محبت نفرت میں
بدل سکتی تھی۔ شاہ میرے خلاف یہ دونوں باپ بیٹی میرے کام
آ سکتے تھے لیکن یہ ایسی صورت میں ممکن ہوتا جب ایسا ہوتا
کیونکہ سر دست تو وہ خود خطرے میں تھی اور میری نظروں سے
اوجھل بھی۔ اس تناظر میں یہ سب سوچتے ہوئے مجھے رانا بشیر
اور فرحانہ کی اہمیت کا احساس ہونے لگا تھا۔

شام چمکنے لگی تھی اور میں پریشان تھا۔ نہ وہ آدمی
نظر آ رہے تھے نہ ہی مطلوبہ لالچ۔ میں اب ہر احتیاط کو بالائے
طاق رکھتے ہوئے یہاں سے وہاں ان دونوں افراد کو تلاش پھر
رہا تھا مگر وہ تو جیسے گدھے کے سر سے سیب کی طرح غائب
تھے۔

”سائیں! کس کو ڈھونڈ رہے ہو؟“ ایک شناسا آواز
میرے کانوں سے مگرانی اور میں پلٹا۔ آواز عقب سے ہی آئی
تھی۔ میں اسے دیکھ کر بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رو
گیا۔ وہ غفور تھا۔

میں جلدی سے اس کی طرف بڑھا۔ میری سانس
نجانے اس بھاگ دوڑ سے یا پھر جوش کی وجہ سے پھولی ہوئی
تھی۔ بہر کیف میں نے اپنی کیفیات پر قابو پایا اور اس کی
طرف بڑھا۔ اس سے ایک نہایت گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور
بولاً۔ ”کیسے ہو غفور بھائی؟ میں تم سے ہی ملنا چاہتا تھا۔“

”ہاں مجھے ابھی خادم حسین نے بتایا تھا کہ تم مجھے
ڈھونڈتے پھر رہے ہو، خیریت تو ہے ناں سائیں؟“ اس نے
کہا۔ خادم حسین شاید وہی شخص تھا جو آخر میں مجھے ملا تھا اور بتایا
کہ غفور تین برس کی گڈی میں تھا۔

”تم بتاؤ، تمہارے باپا کے کس کا کیا بنا؟“ میں نے
دھڑکتے دل سے پوچھا، میری مستفسر اند نظریں اس کے
چہرے پر جمی ہوئی تھیں جہاں میرے سوال پر ایک رخ اور
تکلیف دہی مسکراہٹ ابھری۔

”وہی ہوا سائیں! جو مجھے جیسے گریبوں کے ساتھ ہوتا آیا
ہے۔“

”کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔“

”سائیں! سارا پیسے کا چکر ہے اور بڑے لوگوں کی
باتیں ہیں، ہم گریب لوگ بھلا کس کھاتے میں ہیں۔ ہم اینٹوں
کو تو کچھ نہیں سکتے، غیروں سے تو ہمارا جیسے دم لگتا ہے۔“
وہ بولتا جا رہا تھا اور اس کا تجربہ اس کے لفظ لفظ سے
عیاں ہوتا تھا۔ اس کے لہجے سے ہی نہیں چہرے سے بھی
لاچار کی، مایوسی اور کمزوری کا احساس نمایاں طور پر ہوتا تھا۔

”تم کہتا کیا چاہتے ہو غفور بھائی؟ ذرا مکمل کر کو ناں
تا کہ میں تمہاری بات سمجھ سکوں اور یہ اس اماراتی کا شپ کہاں
گیا؟“

”سائیں! ہم گریب لوگ تو صاف اور سچی بات کہتے
ہیں، بتائیں آپ کو کیوں نہیں سمجھ میں آ رہی ہے۔“ وہ بدستور
اسی طرح دہکی اور غصہ سے لہجے میں بولا۔

”باقی سائیں! وہ جہاز تو آج صبح ہی برآمد ہو گیا کہ یہ
چلا گیا تھا۔“ اس نے آخر میں بتایا تو میں نے جلدی سے کہا۔

”گیارہ بجے کچھ گھر پر؟“

”وہ تو بھٹ آئی لینڈ کے پاس ہے۔“

”میں نے وہاں تک جانا ہے، ابھی اسی وقت۔“ میں نے

کہا۔ میں اب ایک لمحہ ہی ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”سائیں! اس کے لیے تو آپ کو کسی لالچ پر بیٹھ کر جانا
پڑے گا لیکن اب کیا فائدہ؟ پولیس نے اس جہاز کے دونوں
اماراتی باشندوں کی نظر بندی ختم کر دی تھی۔“ وہ بولا۔

2018

183

فروری 2018

PakDigestNovels.Com

2018

183

فروری 2018

PakDigestNovels.Com

2018

183

فروری 2018

PakDigestNovels.Com

2018

183

فروری 2018

PakDigestNovels.Com

2018

183

فروری 2018

PakDigestNovels.Com

2018

183

فروری 2018

PakDigestNovels.Com

2018

183

فروری 2018

PakDigestNovels.Com

2018

183

فروری 2018

PakDigestNovels.Com

2018

183

فروری 2018

PakDigestNovels.Com

2018

183

فروری 2018

PakDigestNovels.Com

2018

183

فروری 2018

PakDigestNovels.Com

2018

183

فروری 2018

PakDigestNovels.Com

2018

183

فروری 2018

PakDigestNovels.Com

2018

183

فروری 2018

PakDigestNovels.Com

2018

183

فروری 2018

PakDigestNovels.Com

2018

183

فروری 2018

PakDigestNovels.Com

2018

183

فروری 2018

PakDigestNovels.Com

2018

183

فروری 2018

PakDigestNovels.Com

2018

183

فروری 2018

PakDigestNovels.Com

2018

183

فروری 2018

PakDigestNovels.Com

2018

183

فروری 2018

PakDigestNovels.Com

2018

183

فروری 2018

PakDigestNovels.Com

2018

183

فروری 2018

PakDigestNovels.Com

2018

183

فروری 2018

PakDigestNovels.Com

2018

183

فروری 2018

PakDigestNovels.Com

2018

183

فروری 2018

PakDigestNovels.Com

2018

183

فروری 2018

PakDigestNovels.Com

2018

183

فروری 2018

PakDigestNovels.Com

2018

183

فروری 2018

PakDigestNovels.Com

2018

183

فروری 2018

PakDigestNovels.Com

2018

183

فروری 2018

PakDigestNovels.Com

2018

183

فروری 2018

PakDigestNovels.Com

2018

183

فروری 2018

PakDigestNovels.Com

2018

183

فروری 2018

PakDigestNovels.Com

2018

183

فروری 2018

PakDigestNovels.Com

2018

183

فروری 2018

PakDigestNovels.Com

2018

183

فروری 2018

PakDigestNovels.Com

2018

183

فروری 2018

PakDigestNovels.Com

2018

183

فروری 2018

PakDigestNovels.Com

2018

183

فروری 2018

PakDigestNovels.Com

2018

183

فروری 2018

PakDigestNovels.Com

2018

183

فروری 2018

PakDigestNovels.Com

2018

183

فروری 2018

PakDigestNovels.Com

2018

183

فروری 2018

PakDigestNovels.Com

2018

183

فروری 2018

PakDigestNovels.Com

2018

183

فروری 2018

PakDigestNovels.Com

2018

183

فروری 2018

PakDigestNovels.Com

2018

183

فروری 2018

PakDigestNovels.Com

2018

183

فروری 2018

PakDigestNovels.Com

2018

183

فروری 2018

PakDigestNovels.Com

2018

183

فروری 2018

PakDigestNovels.Com

2018

183

فروری 2018

PakDigestNovels.Com

پیت پازنی

قارئین

نیلوفر شاہین..... اسلام آباد
تیری جذباتیت مرے جذبات
ذہل گئی دھوپ رہ گئی سائے
(نور عین کوثر دینہ جہلم کا جواب)
ڈاکٹر ادیب عبدالغنی ٹکیل..... ملتان
رکھتے ہیں جو اوروں کے لیے پیار کا جذبہ
وہ لوگ بھی ٹوٹ کے بکھرا نہیں کرتے
(نازیہ تبسم کا جواب)
امیر حمزہ اشرف..... ملتان
ٹوٹ کر گر جائیں وہ پتے نہیں ہیں ہم
ان آنکھوں سے کہہ دو اپنی اوقات میں رہیں
(ناعمیہ تحریم کا جواب)
مریم بنت کاشف..... حیدر آباد
حیات مختصر کا ہے بس اتنا ہی افسانہ
جلی خود شمع لیکن دوسروں کو روشنی دے دی
(ہادیہ ایمان ماہا ایمان فورٹ عباس کا جواب)
حیات مرزا..... لطیف آباد
منزل کی جستجو تھی نہ ہیر کی تھی تلاش
ہم خاک ہو کے گرد مہیں کارواں رہے
عبدالبارودی..... قصور
مست و خرام دور سے جو تم ملے آتے ہیں
محبت کا ہی جام لی کے اپنا دل بہلاتے ہو
(شکلفہ یاسین کراچی کا جواب)
انتر شاہ عارف..... جہلم
اک مدت سے ہے میرے رجحان کا مشغلہ
دیکھنا ماہتاب کو پھر تیرا چکر سوچنا
(علی قربان فیصل آباد کا جواب)
احمد بابر پوری..... کراچی
وہ اچانک جو شعری نظر آگئے
اشک پینا پڑا مسکراتا پڑا

(آفتاب احمد نصیر اشرفی کراچی کا جواب)

سیف اللہ..... ملک وال
یاد کرنے کی ہم نے حد کر دی
بھول جانا تیرا کمال سہمی
غفتر عباس مرزا..... اسلام آباد
زندہ ہوں اس طرح کہ غم زندگی نہیں
چلا ہوا دیا ہوں مگر روشنی نہیں
(نوشین عابد لاہور کا جواب)
عبدالحکیم شہر..... کراچی
لوٹ جانی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجیے
اب بھی دکش ہے تیرا حسن مگر کیا کیجیے
(علی صفت باغ (اے کے) کا جواب)
سدرہ بانو ناگوری..... کراچی
دے دیا تھی ہوئی دھوپ کے صحر کا سفر
میں نے خوشبو کی رفاقت کا سفر مانگا تھا
(نوشین عابد لاہور کا جواب)
ہادیہ ایمان، ماہا ایمان..... نورٹ عباس
دھبہ نالہ تجھے دے کر مبادا ظالم
تیرے چہرے سے ہو ظالم غم نہاں میرا
(نوشین عابد لاہور کا جواب)
شیر شاہ..... گلڈبرج کشمور
روکا ہوا ہے عجب دھوپ چھاؤں کا موسم
گزر رہا ہے کوئی دل سے یادوں کی طرح
(عشا عباس جہلم کا جواب)
رفیق احمد ناز..... ڈی جی خان
سورج ڈھلا تو دل میں عجب کیگ چھا گیا
وعدہ حکمن نہ آیا اور رات آگئی
(اظہر الدین کراچی کا جواب)
سدرہ بانو ناگوری..... کراچی
تتنا وہ تننا ہے جو دل ہی دل میں رہ جائے
جو مر بھی نہ ہو پورا اسے ارمان کہتے ہیں

اور ہر کسے دل کے ساتھ کالیا کی کال اینڈ کی۔
”اے لے جگری!“ دوسری جانب سے کالیا کی مخصوص
آواز ابھری۔ ”یہ اپنا شاہ میر تو دوسری جگہ جا رہا ہے۔“
”کیا؟“ میرے منہ سے نکلا۔ ”کب؟ کیوں؟“
”کیوں کا تو وہی بتا سکتا ہے اگر میں اس سے پوچھوں
تو.....“ وہ بذلتہ نچی سے بولا۔ ”لیکن یہ بتا تو ان سسرروں کے
تعاقد میں کہاں تک پہنچا ہے؟ سب فیک تو ہے ناں؟“
”اس بات کو ابھی چھوڑ بعد میں بتانا ہوں۔ پہلے مجھے تو
وہاں کی صورت حال بتا۔ کوئی بات کوئی مشکوک گفتگو؟“
”ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے ماں بیٹی گھر پہنچے ہیں۔ شاہ
میر کی روادگی کا پہلے سے ہی پروگرام تھا۔ وہ بتانے لگا۔
”دونوں باپ بیٹا بھی باتیں کر رہے تھے کہ وہ اب فرحانہ کو
زیادہ دیر تک بے وقوف نہیں بناسکتے تھے، اسی لیے انہوں نے
یہ انتہائی قدم اٹھایا ہے۔ اس کے ذریعے سے وہ رانا بشیر سے
اپنا کوئی مطالبہ منوانا چاہتے ہیں۔ ابھی وہ مزید اس سلسلے میں
گفتگو کرنا چاہتے تھے کہ کئی صداد اور کافخہ آگئیں اور شاہ میر
رواگی کی تیاری کر رہا ہے۔ اب بول کیا کرتا ہے؟“
میں ہونٹ نیچے چند تھاپے کچھ سوچتا رہا اس کے بعد
بولا۔
”شاہ میر کو ابھی پورٹ چھوڑنے کو ن جا رہا ہے؟“
”خیر۔“ کالیا نے جواب دیا۔ ”وہ باپ کو ابھی پورٹ
چھوڑ کر واپس گھر لوٹ آئے گا۔“
”کالیا! تم ایک کام کرو گے؟“
”واپسی میں خیر پر ہاتھ صاف کرتا ہے۔ وہ بخادر
میری بات کا مطلب سمجھتے ہوئے عینی خیر لے جے میں بولا۔
”اکیلے یہ کام آسانی سے کرو گے نا؟“ میں نے
پوچھا۔
”اے لے جگری! یہ کوئی کام نہیں۔ تم بے فکری سے اپنا
کام منشاؤں میں اپنا منشاؤں ہوں، میں اس سنبولیے کو ابھی پورٹ
سے واپسی پر ہی چھاپ لوں گا اور سیدھا صفورا والے مکان
میں لے جاؤں گا، بعد میں تم بھی وہیں آ جانا اور اپنا حساب اس
سنبولیے سے چکا کر لیا۔“ اس نے کہا۔
”ہالو۔۔۔ سائیں!“ اچانک مجھے غفورا کی آواز سنائی
دی۔ ”لاچ آ رہی ہے۔“ اس نے بتایا اور میں چونک پڑا۔
”ٹھیک ہے کالیا! میں فون بند کر رہا ہوں، بڑی
ہوشیاری اور احتیاط سے اپنا کام منشاؤں۔“
”غے غے ہوا جگری! کالیا کی کوئی بات نہیں کھیلنا ہوا۔“
(جاری ہے)



میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام..... ہے۔

نام:.....

پتا:.....

انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی □ سپنس □ پاکیزہ □ سرگزشت □ بھجوا جائے
کسی ایک پر ☒ کیجیے۔

کوچن کے محلہ اپنے جہاںات مورخہ 28 فروری 2018 تک علی آزمائش 145 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں

اگر آپ کو

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

ماہنامہ سپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت

کے حصول میں وقت پیش آرہی ہے یا آپ کو اپنے علاقے کے بک اسٹال سے کوئی شکایت ہے اور آپ کے علاقے میں برقت پرچ نہیں پہنچ رہا تو

شکایت فیکس کریں

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

35802552-35386783-35804200

سرکولیشن منیجر

فیکس نمبر 35802551

جاسوسی ڈائجسٹ ہیلی کیشنز

63-C نیشنل انٹیلیجنس ایجنسی ہاؤس، انٹرنیشنل بین روڈ، کراچی

فون: 35895313 فیکس: 35802551

مقابلہ بیت بازی

قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ ”بیت بازی“ شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کر سکتے ہیں۔

نام:.....

پتا:.....

محترم! مقررہ..... کے شعر کے جواب میں شعر ارسال کر رہا ہوں اسے شامل اشاعت کر لیں (شعر الگ کاغذ پر ہے) 107

مقابلہ بیت بازی

پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی، 74200

ندرت فیضان..... احمد پور
ابرو کا گھٹا شہر ہو گیسو کی جلی ہو
تم ایسی ہوا ہو جو گھٹا لے کے چلی ہو
ناصر اشرف..... ملتان
اک تماشا بن گئے تھے بھیر میں باہر سے ہم
اس لیے بہتر ہوا خود ہٹ گئے منظر سے ہم
سلیم اللہ..... لاہور
اپنی ناداری و افلاس پہ رو دیتا ہوں
چھیر دیتے ہیں وہ جب تاج محل کی باتیں
(رضا احمد انوان دریا خان کا جواب)

ذیشان حسن..... لہ
یہ کیا مقام تیری محبت میں آسمیا
آنکھیں ہیں اشک بار غزل کہ رہا ہوں میں
عباس علی..... میر پور
یہ کھلے ہال یہ دزدیدہ نگاہوں کا نسوں
ہوش مستی بھری راتوں کے اڑا دے نہ کہیں
سیما علی..... لاہور
یہ جھپتی ہوئی ہنسی ہوئی گاتی ہوئی آگ
نرم نیندوں کے شبستانوں میں وصل جانے گی
(احمد جاوید ڈی جی خان کا جواب)
مریم بنت کاشف..... حیدر آباد

محسن چمن کو اپنی بہادوں پہ ناز تھا
وہ آگے تو ساری بہادوں پہ چھا گئے
(سردار بانو ناگوری کراچی کا جواب)
منشی محمد عزیز مئے..... لڈن
یوں بے خودی شوق میں حد سے گزر گئے
ہم بے خبر رہے وہ بیٹھیں سے گزر گئے
عبدالجبار رومی..... قصور
یہ امید پیہم کہ وفا ملے ہمیں کبھی
تو سمجھو دوتی ہی وفا ہے سوداگری اور

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر شعر ارسال کریں۔

توفیق احمد..... جہلم
یوں ترا نام ذہن میں آیا
جس طرح مژدہ وصال آئے
(خیلوفر شاہین اسلام آباد کا جواب)
نزاہت افشار..... مہرور فتح جنگ
ایسا نہیں ہے کہ سرکار مجھ میں کوئی عیب نہیں ہے
پر سچ کہتا ہوں مجھ میں کوئی فریب نہیں ہے
(انیس الرحمن لاہور کا جواب)
سید امتیاز حسین بخاری..... سرگودھا
ماتا کہ چھپیں مجھ سے بہت سخت ہے نفرت
پھر یاد میری دل سے بھلا کیوں نہیں دیتے
ہادیہ ایمان، ماہا ایمان..... فورٹ عباس
مبارع لوح و قلم چمن گئی تو کیا غم ہے
کہ خون دل میں ڈبوئی ہیں الکیاں میں نے
(رفیق احمد ناز ڈی جی خان کا جواب)

محمد محمود..... حیدر آباد
یاد ماضی کے وہ افسانے بھلا ڈالوں گی
تیری تصویر ترے خط کو جلا ڈالوں گی
شفیق احمد سلطان..... ملتان
یہ پھلتے ہوئے جذبے یہ دھڑکتے ہوئے دل
کفر و ایمان کی پیچان نہ جانے کیا ہے
(منشی عزیز مئے لڈن کا جواب)
عنایت مسیح..... کراچی
یاد رکھیں کہ بھول جائیں ہم
یہ بھی مشکل ہے وہ بھی مشکل ہے
اشرف جہانگیر..... لہ
یہ ستم ہے ترا یا کرم مجھ کو اس کی کہاں ہے خبر
تو نے اپنا بنا کر مجھے مجھ کو خود سے جدا کر دیا
(ناہید سلطانہ بشار کا جواب)

عبدالحکیم شمر..... کراچی
راستے میں رک کے دم لوں یہ میری عادت نہیں
لوٹ کر واپس چلا جاؤں میری فطرت نہیں
(خیلوفر شاہین اسلام آباد کا جواب)
شفیق احمد..... فیصل آباد
اللہ رے زندگی کی پریشاں خیالیاں
دل کو حریف زلف پریشاں بنا دیا

ماہنامہ سرگزشت

داره

علمی آزمائش کے اس مفروضے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے مکمل پہنچائیے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہانہ سرگزشتہ مسابقہ میں ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہانہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ”یک صبحی سرگزشت“ کے عنوان تلخ مغز انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بخوبی کیسے کیسے پڑھیے اور بکھرسوچے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوہن پر درج کر کے اس طرح سپردِ ذاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 31 جنوری 2018 تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

18 مئی 1922ء میں وزیر کوٹ میں پیدا ہوئے۔ ان کے خاندان کو تاج برطانیہ کی جانب سے 1750 ایکڑ زمین ملی تھی۔ لاہور گورنمنٹ کالج سے ماسٹر ڈگری حاصل کی اور پنجاب کالج سے پئی ایچ ڈی، اردو ادب کے بڑے معماروں میں شمار ہوتا ہے۔ تنقید میں بڑا نام پیدا کیا۔

علمی آزمائش 143 کا جواب

انتظارِ حسین کے 1952ء سے لے کر 2004ء تک افسانوں کے 9 مجموعے آئے۔ 1953ء سے لے کر 1995ء تک پانچ ناول شائع ہوئے۔ مختلف اخبارات میں کالم بھی لکھے۔ میرٹھ سے 1946ء ایم اے کر کے پاکستان آئے۔ اردو ادب کا ایک بڑا نام۔

انعام یافتگان

- 1- سحرش بٹ، لاہور 2- نعیم الحق، کوئٹہ 3- جعفر حسن خان، جہلم
4- امیر الاسلام، کراچی 5- زریاب، راولپنڈی

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے خادم حسین، رضیہ مسعود، عبدالبہار رومی، جلیل احمد جعفری، عبدالحکیم شمر، وجاہت وکیل عثمان خان، محمد یونس جان، صفیہ انسر، نامہ تحریم، وردہ بتول، ارشد علی، اکبر علی ریسائی، اسرار احمد، نواب خان، خادم حسین، تبسم عرفان قریشی، سلیم کھوکھر، فرحین شیر، مولانا بخش، تنویر حسین، بارون محمد، عطیہ نورین، نسرین عزیز، پروین بیگم، مہوش علی خان، فیروز رحمانی، لاہور سے حنفیہ اویس، یاسمین فرحت، قاضی حسین رضوی، نعیم عباس، سنجین نقوی، علی نواز، اعجاز علی اصغر، صابر

خان، نوید حسن، اقبال، اصغر، مصباح، الرضا، عبدالخالق، احمد علی بیٹ، نواز میر، سلمان احمد، تاثیر احسن، نذر احمد، ذیشان خان، تقدیر علی پاشا، نازش سلطان۔ ملتان سے عبرتین چشتی، محمد سرفراز منغل، عرفان احمد شاہ، محمد معین چشتی، احمد یار خان، قیام الدین گردیزی، نصیر شاہ، وردہ فاطمہ، خالق حسین، نسیم احمد، فوزیہ اختر، فیروز اختر، اکبر علی خان، قصور سے عثمان علی، نزہت جمیل، عنایت اللہ۔ جہلم سے اختر شاہ عارف، ثناء احمد۔ سرگودھا سے سید امتیاز حسین بخاری چکرا الوئی، احمد وحید، شفیق سیال، نور احمد نور، آفتاب احمد خان، نفس اللہ خان، صالح باو، انصافی حسن، نذیر احمد خان۔ حیدر آباد سے محمد یاسین اندوری، طہ یاسین، حدیف، مریم بنت کاشف، احمد یار خان، قیام الدین گردیزی، کاشف علی کاشف، اکبر علی رند، اررار مصطفیٰ، خالق حسن، وردوان حسن، صباحت مرزا، نعمان صدیقی، نواز علی خان، نیاز مسکی۔ سکھر سے ممتاز حسن، زبیدہ بیگم۔ میرپور خاص سے طاہر الدین بیگ۔ راجن پور سے ملک محمد مظفر اللہ، ملک محبوب احمد۔ لیہ سے نذیر احمد گجر، اشرف جھنگلی، عباس ڈڈیال، اشرف علی۔ راولپنڈی سے ڈاکٹر سعادت علی خان، توصیف حسن، نعیم اختر، مسعود اطہر، افتخار حسن، بشیر احمد، ارشد بانو، محمد ذیشان، خالد عثمانی، ماہ مجبین فاطمہ، عزیز احسن۔ اسلام آباد سے غضنفر عباس مرزا، ارشد بانو، ماہ مجبین فاطمہ، عزیز احمد، نصرت جاوید۔ بہادر پور سے حمیرا کوکب واسطی، بخت بانو، اختر عباس، عرفان سلیم واسطی۔ میانوالی سے افتخار حسین شاہ پیلاں، حفیظ اسد۔ ساہیوال سے زین الامیان احمد قریشی، ثناء اسدی، حافظ نعمان اثرنی۔ حافظ آباد سے محمد ابراہیم مستری، لیاقت علی خان۔ ڈیرہ غازی خان سے محمد جاوید احسن، رفیق احمد ناز، زیب النساء، جاوید احسن۔ کھاتاں سے سلیم کامریڈ۔ گدو بیراج سے شبیر شاہ، اسفر خان، یونس خان، محمد حنیف، عبد الجبار۔ مردان سے ام انور، ہادی چم ہوتی۔ سکھر سے ثناء محی، اشفاق خان۔ واہ کینٹ سے ثناء احمد، ثاقب علی۔ پشتاور سے سردارسون سنگھ، زریاب اپجڑی، نادر حسن ذوی، نادر خان، امیر حسن، مساعد فرحت، باقر رضی طوروی، ضحیت طوروی، انور حسن خان، فرحت اللہ، دارود خان، گلشنہ، حبیب الرحمن۔ ڈسکہ سے طاہر سلیم۔ میرپور مچھیل سے اسرار علی، وسع الدین احمد نیاز، میرپور اے کے سے نیاز بیٹ، سلیم منگل، مسرت نیازی، نصیر احمد، کلیم الدین، عاجز احمد، وسع اللہ، اشفاق خان، حلہ نگ سے عباس علی۔ بدین سے احمد ترسیل۔ جنوبی کے لیے کے سے محمد بخش۔ چنی شاہ مردان سے شاہ مراد۔ میانوالی سے احسن جاوید، نذیر محمد، ڈیرہ غازی خان سے نسیم احمد، طارق الہصر عباسی۔ ڈی آئی خان سے اشرف علی سلطان۔ جوئیاں سے دانش بیگ۔ جنگ سے اشرف علی خان۔ چیوٹ سے قاضی احمد علی، زاہد علی، باقر رضا، ثناء رضا، محمد تقی زیدی۔ ملتان سے محمد بلال اقبال، محمد سعید چشتی، نورین افشار، اباز سومرو، زرعان خان، کلیم اللہ چغتائی، ذیشان ملک، فرحت مغیر، قدوس بخش، سعیدہ جلال، فاطمی خان اپجڑی، لبنی ظہیر، رشوانہ اختر، اللہ اللہ، محمد شفیق، فرمان ملک، زبید چوان، قدوس بخش۔ جہلم سے ارباز خان، ملک سرفراز، عدیمہ امتیاز، فیصل آباد سے محمد زاہد، ناصر عبدالحمید (سمندری)۔ جنگ سے عطا مصطفیٰ۔ گوجرانولہ سے الف اے کوکھر۔ پکوال سے رمضان وٹو، ارشد احسن۔ واہ کینٹ سے نور افضل خان عسک۔ منڈی بہاؤ الدین سے خرم جہانزیب۔ میانوالی سے عبدالخالق (کالا باغ) ایم شفیق قدسی (مسلم بازار)۔ کوئٹہ سے حبیب احسن، ناصر چنگیزی، نعمان خان، حسن عسکری، زاہد علی، فرحت پیر، خاقان چنگیزی، راؤ رشید، ارباز خان، فضل اللہ خان، قتیل سید پوری، تقی چنگیزی، ٹکارٹ، صاحب بشیر، نصرت چنگیزی۔ سرگودھا سے انعام اللہ انعام، اکبر خان، اشرف ممتاز، زاہد حسن، نادر شاہ، حیات خان، فصیح الزماں، عطی اکمل لونہ، خلق الزماں، مختصر حیات۔ شجاع آباد سے حسن علی زیدی، نجیب اللہ نصیر جنونی، خانوالہ سے طارق شہزاد، سید الانعام اشرف شہیدی۔ حیدرآباد سے احمد انصاری، بارخان، طہ یاسین، دعا زہرا۔ میرپور خاص سے مجاہد علی ایس جی۔ کھاناں سے سلیم کامریڈ۔ پاک پتن سے علی محمد (حسن پورہ)۔ ساہیوال سے سرفراز ملک۔ پیچھے برہہ ذوی سے ذوالفقار فضل کریم، ملک جاوید محمد خان سرکانی۔ حاصل پور سے نعمان ادیس۔ ڈی جی خان سے موٹی خان۔ بہادر پور سے قاضی عدنان احمد، حمیرا کوکب واسطی، آمنہ ملک۔ پشتاور سے غازی توپچی، مظہر حسین، مالک اسلم، نوید ملک، نسیم نیاز احمد، خالد کنول، وقار احمد، جعفر حسن، تولتی الاسلام، افضل شیو، شوقار، منہال زیدی، الانعام رضا خان، نسیم شیرازی، فجر الاسلام، سردار علی میمنگل، قربان اختر، نسیم اپجڑی، بینش ملک، نسیم فروس، ارباب احسان، جویریہ گلشن خان، نسیم احسن، قربان اختر شاہ نواز، اطہر قیوم، نسیم فاروقی، شفاء الحق، اطہر شاہ.....۔ جمال شاہ، فراست خان، نوید نجیب، اسف طوروی گلشن، محمود اپجڑی، بنوزاد شاہ، ارباب خان، وردان شاہ، نسیم فیاضی۔ چشتیاں سے معظم علی سرمان سے محمد انور (ہادی چشم)، پیچھے برہہ ذوی سے ذوالفقار فضل کریم، ملک جاوید محمد خان سرکانی، ماما گلبرہ سے زاہد بشیر قادری (چاپان) احمد انصاری (بزمن) نصیر غفران سامری (جدہ سعودی) محافظہ قلندر شہر ایندھی (سلطنت ایوبان) انعام ملک (برزمن) کہنہ قدوس (نوکیو جان)

علمی آزمائش - 145

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا مندرجہ انتظامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس مندرجہ سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے بھیججوائے۔ درست جواب بھیجے والے پانچ قارئین کو ماہانہ سسرگزشت، ممبرشپ ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہانہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ”یک مصلیٰ سرگزشت“ کے عنوان تلے مندرجہ انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرح ہر مہینہ کی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو پوچھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 31 جنوری 2018 تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

18 مئی 1922ء میں وزیر کوٹ میں پیدا ہوئے۔ ان کے خاندان کو تاج برطانیہ کی جانب سے 1750 ایکڑ زمین ملی تھی۔ لاہور گورنمنٹ کالج سے ماسٹر ڈگری حاصل کی اور پنجاب کالج سے بی اے اچ ڈی، اردو ادب کے بڑے معماروں میں شمار ہوتا ہے۔ تنقید میں بڑا نام پیدا کیا۔

علمی آزمائش 143 کا جواب

انقلاب حسین کے 1952ء سے لے کر 2004ء تک انسانوں کے 9 مجموعے آئے۔ 1953ء سے لے کر 1995ء تک پانچ ناول شائع ہوئے۔ مختلف اخبارات میں کالم بھی لکھے۔ میرٹھ سے 1946ء ایم اے کر کے پاکستان آئے۔ اردو ادب کا ایک بڑا نام۔

انعام یافتگان

- 1۔ محرش بٹ، لاہور
- 2۔ نعیم الحق، کوئٹہ
- 3۔ جعفر حسن خان، جہلم
- 4۔ امیر الاسلام، کراچی
- 5۔ ذریاب، راولپنڈی

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے خادم حسین، رضیہ مسعود، عبدالبہار رومی، جلیل احمد جعفری، عبدالحکیم شمر، وجاہت وکیل عثمان خان، محمد یونس جان، مصفیہ افسر، نامہ تحریم، وردہ بٹول، ارشد علی، اکبر علی ریسائی، اسرار احمد، نواب خان، خادم حسین، نسیم عرفان قریشی، سلیم کوکھر، فرحین بشیر، مولانا بخش، جویریہ حسین، ہارون محمد، عطیہ نورین، نسیم عزیز، پروین بیگم، میوش علی خان، فیروز رحمانی۔ لاہور سے حنیف ادیب، یاسین فرحت، قاضی حسین رضوی، نعیم عباس، چختن نقوی، علی نواز، اعجاز علی، اصغر، صابر

خان، نوید احسن، اقبال اصغر، مصباح الرضا، عبدالخالق، احمد علی بٹ، نواز کبیر، سلمان احمد، تاثیر احسن، فدا احمد، ذیشان خان، قدر علی پاشا، نازش سلطان۔ ملتان سے عہترین چشتی، محمد سرفراز مغل، عرفان احمد شاہ، محمد معین چشتی، احمد یار خان، قیام الدین گردیزی، نصیر شاہ، وردہ فاطمہ، خالق حسین، نسیم احمد، نوذریہ اختر، فیروز اختر، اکبر علی خان، قصور سے عثمان علی، نہت جبین، عنایت اللہ۔ جہلم سے اختر شاہ عارف، غار احمد۔ سرگودھا سے سید امتیاز حسین بخاری چکڑا لوی، احمد توحید، شفیق سیال، نور احمد نور، آفتاب احمد خان، نفیس اللہ خان، صالح بانو، ارتضیٰ حسن، نذیر احمد خان۔ حیدر آباد سے محمد یاسین اندروی، طہ یاسین، حدیقہ، مریم بنت کاشف، احمد یار خان، قیام الدین گردیزی، کاشف علی کاشف، اکبر علی رند، ابرار مصطفیٰ، خالق حسن، وردان حسن، صباحت مرزا، نعمان صدیقی، نواز علی خان، نیاز موسیٰ، سکھر سے ممتاز حسن، زبیدہ بیگم۔ میرپور خاص سے طاہر الدین بیگ۔ راجن پور سے ملک محمد ظفر اللہ، ملک محبوب احمد۔ لیہ سے نذیر احمد گجر، اشرف جہانگیر، عباس ڈوڈیال، اشرف علی، راولپنڈی سے ڈاکٹر سعادت علی خان، توصیف حسن، نعیم اختر، مسعود ظہیر، افتخار حسن، بشیر احمد، ارشد بانو، محمد ذیشان، خالد عثمانی، ماہ جبین فاطمہ، عزیز احسن۔ اسلام آباد سے عفتن عرفاس مرزا، ارشد بانو، ماہ جبین فاطمہ، عزیز احمد، نصرت جاوید۔ بہاولپور سے حمیرا اکوب واسطی، نکبت بانو، اختر عباس، عرفان سلیم واسطی، میانوالی سے افتخار حسین شاہ پٹیل، حنیف اسد۔ ساہیوال سے زین الایمان احمد قریشی، ثار اسدی، حافظ نعمان اشرفی۔ حافظ آباد سے محمد ابراہیم مستری، لیاقت علی خان۔ ڈیرہ غازی خان سے محمد جاوید احسن، رفیق احمد ناز، زیب النساء، جاوید احسن۔ کھاتاں سے سلیم کامریڈ۔ گلدوبیراج سے شبیر شاہ، اسفر خان، یونس خان، محمد حنیف، عبدالبہار۔ مردان سے مالور، باڈی چم ہوتی۔ بکھر سے شامی، اشفاق خان۔ واہ کینٹ سے شاد احمد، ثاقب علی۔ پشاور سے سردار سونہ سنگھ، ذریاب اپکنڈی، نادر حسن زئی، نادر خان، امیر حسن، ساحد فرحت، باقر رضی طوری، حسین طوری، انور حسن خان، فرحت اللہ، دارودغہ خان، گلشن، حبیب الرحمن۔ ڈسکہ سے طاہر سلیم۔ میرپور ماٹیلو سے اسرار علی، وسیم الدین احمد نیاز، میرپور اے کے سے نیاز بٹ، سلیم علی، مسرت نیاز، نصیر احمد، سلیم الدین، عاجز احمد، وسیم اللہ، اشفاق خان، ملہ سنگ سے عباس علی۔ بدین سے احمد رفیق۔ جنو کی کے کے محمد بخش۔ کئی شاہ مردان سے شاہ مراد۔ میانوالی سے احسن جاوید، نذیر محمد، ڈیرہ غازی خان سے نسیم احمد، غار علی انصر عباسی۔ ڈی آئی خان سے اشرف علی سلطان۔ جوئیال سے دانش بیگ۔ جنگ سے اشرف علی خان۔ چنیوٹ سے قاضی احمد علی، زاہد علی، باقر رضا، غار رضا، محمد تقی زبیدی۔ ملتان سے محمد بلال اقبال، محمد سعید چشتی، نورین افتخار، ایاز سہروردی، زندان خان، کلیم اللہ چشتی، ذیشان ملک، فرحت مغیرہ، قدوس بخش، سعیدہ جلال، فاضل خان، اپکنڈی، انجی ظہیر، رضوانہ اختر، اللہ اللہ، محمد تقی، مفرانہ ملک، زیب چوہان، قدوس بخش۔ جہلم سے ارباز خان، ملک سرفراز، ندیمہ امتیاز، فیصل آباد سے محمد زاہد، ناصر عبدالعزیز (سمندری)، جنگ سے عطا مصطفیٰ، گوجرانوالہ سے الف اے کوکھر، کچوال سے رمضان ڈو، ارشد حسین۔ واہ کینٹ سے نور افضل خان، عکب۔ منڈی بہاؤ الدین سے خرم جہانزیب۔ میانوالی سے عبدالخالق (کالا باغ)، ایم شفیق قدسی (مسلم بازار)۔ کوئٹہ سے حبیب احسن، ناصر چنگیزی، نعمان خان، حسن عسکری، زاہد علی، فرحت بابر، خان چنگیزی، راڈرشید، ارباز خان، فیض اللہ خان، فہمید سید پوری، تقی چنگیزی، نگار بٹ، صالح بشیر، نصرت چنگیزی۔ سرگودھا سے انعام اللہ انعام، اکبر خان، اشرف ممتاز، زاہد حسن، نادر شاہ، حیات خان، فصیح الزماں، عطیٰ اکمل، نواز، خلیل الزماں، خضر حیات۔ شیخ آباد سے حسن علی زبیدی، نعیم اللہ، نصیر جنونی۔ خانیوال سے طارق شہزاد، سید انعام اشرف شہیدی۔ حیدر آباد سے احمد انصاری، بابر خان، طہ یاسین، دعا بھرا۔ میرپور خاص سے عبدالعلی ایس بنی۔ کھاتاں سے سلیم کامریڈ۔ پاک پتن سے علی محمد (حسن پورہ)۔ ساہیوال سے سرفراز ملک۔ چچھہ برہہ کی سے ذوالفقار فضل کریم، ملک جاوید محمد خان سرکانی۔ حاصل پور سے نعمان اورس۔ ڈی جی خان سے موسیٰ خان۔ بہاولپور سے قاضی عدنان احمد، حمیرا کوکب واسطی، آمنہ ملک۔ پشاور سے غازی توفیق، مظہر حسین، بانک اسلم، نوید ملک، نسیم نیاز احمد، خالد نول، وقار احمد، قیصر حسن، توفیق الاسلام، افضل میو، شاد قار، منہال زبیدی، ابیہام رضا خان، نعیم شیرازی، خیر السلام، سردار علی مینگل، نرفان اختر، نسیم اپکنڈی، بخش ملک، نسیم فردوس، ارباب خان، جویریہ بخش خان، نسیم احسن، نرفان اختر شاہ، نواز، اطہر نواز، شمس فاروقی، فیاض الحق، اطہر شاہ۔ بہاول شاہ، مفراسٹ خان، نوید نعیم، اصغر طوری، بخش، محمود اپکنڈی، نذر شاہ، ارباب خان، وردہ شاہ، نسیم نیاز، چشتیاں سے معتمد علی۔ مردان سے محمد اور (باڈی چم)۔ چچھہ برہہ کی سے ذوالفقار فضل کریم، ملک جاوید محمد خان سرکانی، سماک غیرہ، زاہد بشیر فاروقی (جاپان) احمد انصاری (جزی) نصیر خان، صامری (جدہ صوبہ) صافقہ تعذیق بشیر البندی (سلطنت اومان)۔ انعام ملک (جزی)۔ فہد فاروق (نوید جاپان)



ملازمت کر رہا تھا جہاں مفت میڈیکل کی سہولت تھی۔ ڈاکٹر نے کندھے کا سرسری معائنہ کیا اور مجھے اسپتال میں داخل ہونے کا مشورہ دیا۔ اس پر مجھے تھوڑی سی حیرانی ہوئی۔ اصولاً تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ وہ پہلے میرا ایکسرے کرواتا اور اس کی رپورٹ دیکھنے کے بعد اسپتال بھیجتا۔ یہی بات میں نے بھی اس سے کہی۔

”ڈاکٹر صاحب! کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ پہلے ایکسرے کروالیا جائے۔“

دراصل میں اسپتال میں داخل ہونے سے گھبرا رہا تھا کیونکہ بچے چھوٹے تھے اور میری بیوی انہیں گھر میں چھوڑ کر میرے ساتھ اسپتال میں نہیں رہ سکتی تھی اور دوسرے ان کا اسکول سے بھی نافذ ہو کر تھیں ڈاکٹر نے میری تجویز سے اتفاق نہیں کیا اور بولا۔ ”میں آپ کی آسانی کے لیے کہہ رہا ہوں۔ آپ بار بار کے چکر لگانے سے بچ جائیں گے کیونکہ کندھے کی سونین جلد ہی ہے کہ

آپ کو بالآخر اسپتال تو جانا ہی ہوگا اور میرا خیال ہے کہ اس میں دیر کرنا ٹھیک نہیں۔“

میں نے ڈاکٹر سے مزید بحث کرنا مناسب نہ سمجھا۔ مجھے یہ بات معلوم تھی کہ کچھ ڈاکٹر کا کمیشن ملے ہوتا ہے اور وہ بات بات پر مریضوں کو اسپتال بھیج دیتے ہیں۔ میں نے اس سے ایڈمیشن لینا اور وہیں سے اسپتال چلا گیا۔ وہ تو جیسے میرے ہی انتظار میں بیٹھے تھے۔ استقبال والوں نے جھٹ پٹ میری فائل بنائی اور مجھے ایک پر انیویسٹ روم میں شفٹ کر دیا گیا۔ اس وقت موبائل فون کا رواج نہیں تھا۔ اس لیے میں نے استقبال کا ڈاکٹر سے ہی فون کر کے فوریہ کو اسپتال میں داخل ہونے کے بارے میں بتا دیا اور کہا کہ وہ شام کو بچوں کو لے کر اسپتال آجائے۔

شام کو فوریہ بچوں کو لے کر آئی تو خاصی پریشان اور

میری عورت

محترم
السلام علیکم

میں نے زندگی میں پہلی بار کہانی لکھی ہے۔ یہ کہانی خود میری ہے اس لیے میں نے اپنا نام نہیں دیا ہے فرضی نام سے کہانی لکھی ہے کیونکہ میں عورت کے بارے میں مردوں کے رویہ کو غلط ٹھہراتا چاہتا ہوں۔

ندیم احمد
(کراچی)

سڑک پر گرتا ہوا دیکھ کر فوراً ہی بریک لگا دیے ورنہ مجھے پکڑ دیتی۔ اس کے پیچھے آئے والی گاڑیاں بھی رگ گئیں۔ فوراً ہی سچ اٹھا ہو گیا۔ لوگوں نے سچ جان کر مجھے اور فوریہ کو سڑک سے اٹھایا۔ اب بھانت بھانت کی بولیاں میری سماعت سے گھرا رہی تھیں۔ کوئی پوچھ رہا تھا زیادہ چوٹ تو نہیں آئی، کوئی اسپتال لے جانے کی پیشکش کر رہا تھا۔ غرض جتنے مذاقی باتیں۔

میں نے دو قدم چل کر دیکھا، ساری ہڈیاں سلامت تھیں۔ گویا فریج ٹکڑ نہیں ہوا تھا البتہ بائیں کندھے میں درد ہو رہا تھا جسے میں نے زیادہ اہمیت نہیں دی اور بیوی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ بالکل سچ سلامت تھی۔ انہی لوگوں میں میرے محلے کا ایک لڑکا ارشد بھی تھا جو اسی وقت کانج سے واپسی میں بس سے اترا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ موٹر سائیکل گھر پہنچا دے اور ہمارے لیے کسی ٹیکسی کا بندوبست کر دے۔ اس طرح ہم سلنڈر سمیت گھر پہنچ گئے۔ گھر پہنچنے کے کچھ دیر بعد میرے کندھے میں تکلیف بڑھ گئی۔ میں نے کندھے پر سے میٹ بٹا کر آئینہ میں دیکھا تو وہ جگہ مجھے کچھ سوچی ہوئی محسوس ہوئی تو مجھے تشویش ہونے لگی کہ کہیں فریج ٹکڑ نہ ہو گیا ہو۔ بیوی نے ڈاکٹر کے پاس جانے کا مشورہ دیا اور میں وقت ضائع کیے بغیر اسے دکھانے چلا گیا۔ ان دنوں میں ایک ٹیم سرکاری خود مختار ادارے میں

اس وقت ہمارے گھر میں گیس نہیں آئی تھی اور گیس سلنڈر پر گزرا ہوا تھا۔ جب وہ ختم ہو جاتا تو خالی سلنڈر دے کر ڈپو سے گھرا ہوا سلنڈر لے آتے جو ہمارے گھر سے دو میل کے فاصلے پر تھا۔ ہم دونوں بھائی موٹر سائیکل پر یہ سلنڈر لاتے تھے۔ جس روز یہ واقعہ پیش آیا تو میرا بھائی کسی کام سے اسلام آباد گیا ہوا تھا اور گھر میں گیس ختم ہو گئی تھی۔ یہ میری بیوی کی خاص عادت ہے کہ ہمیشہ بین وقت پر کام بتاتی ہے۔ گیارہ بجے کا وقت تھا اور اڑدس پڑوس کے سب لوگ اپنے اپنے کاموں پر یا اسکول کانج گئے ہوئے تھے۔ اس لیے میرے پاس اس سے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ بیوی کو ساتھ لے جاؤں۔ درمیان میں سلنڈر رکھوں اور وہ اسے پکڑ کر پیچھے بیٹھ جائے۔ جاتے ہوئے ہمیں کوئی مسئلہ نہیں ہوا البتہ واپسی میں دکان دار نے سلنڈر رکھنے میں ہماری مدد کی اور میں خراماں خراماں گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

ابھی ہم گھر سے ایک فلائنگ کے فاصلے پر تھے کہ اچانک ہی بھائی سڑک کے موڑ پر ایک بچے سامنے آ گیا۔ اسے بچانے کی کوشش میں پوری قوت سے بریک لگائے تو توازن ہل گیا اور ہم دونوں میاں بیوی سلنڈر سمیت سڑک پر گر گئے۔ بیوی ایک طرف جا کر گری، سلنڈر رلھٹا ہوا دور چلا گیا اور میں سچ سڑک پر چٹ لیتا ہوا تھا۔ وہ تو خیریت تھی کہ میرے پیچھے آنے والی سوزوکی پک اپ نے مجھے

تکھرائی ہوئی لگ رہی تھی۔ اس وقت تک میرا ایکسرے ہو چکا تھا اور ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر نے ڈرپ لگا دی تھی۔ اس کے علاوہ ایک نرس میرے سر ہانے پین کھرا اور وٹامن کی گولیاں رکھ کر چلی گئی۔ غالباً اس سے یہ تاثر دینا مقصود تھا کہ میرا علاج شروع ہو چکا ہے اور اسپتال کا میٹر چل پڑا ہے۔ میں نے نرس سے پوچھا کہ کیا یہی گولیاں کھلانے کے لیے مجھے داخل کیا گیا ہے۔ وہ شکل سے ہی تک چڑھی اور آدم بے زار لگ رہی تھی۔ منہ بناتے ہوئے بولی۔ ”میرے کام لیں۔ سات بجے سرجن صاحب آئیں گے تو معلوم ہوگا کہ آپ کو پلاسٹر چڑھتا ہے یا آپریشن کرنا پڑے گا۔“

آپریشن کا نام سننے ہی میری بیوی رونے لگی اور منہ بسورتے ہوئے بولی۔ ”آپریشن کیوں ہوگا۔ خدا خواستہ کوئی خطرناک بات تو نہیں؟“

نرس کندھے اچکا تے ہوئے بولی۔ ”مجھے کیا پتا۔ میں نے تو ڈاکٹر سے جو ناوہ بتا دیا۔ سچ پوریشن تو سرجن صاحب کے آنے پر ہی معلوم ہوگی۔“

میں نے فوراً یہ کوئی دیتے ہوئے کہا۔ ”تم پریشان مت ہو۔ دیکھو سرجن صاحب کیا کہتے ہیں۔ اگر انہوں نے آپریشن کے لیے کہا تب بھی میں پہلے کسی دوسرے سرجن سے مشورہ کروں گا۔“

نرس منہ بناتی ہوئی چلی گئی تو میں نے فوراً یہ سے کہا کہ وہ بھی بچوں کو لے کر گھر چلی جائے۔ وہ بلاوجہ ہی اس ماحول میں پریشان ہو رہے تھے اور پھر انہیں ہوم ورک بھی کرنا ہوگا۔ فوریہ جانا نہیں چاہ رہی تھی۔ اسے کئی فکریں ستا رہی تھیں۔ پہلی تو یہ کہ اگر اس کی غیر موجودگی میں سرجن نے آپریشن کر دیا تو کیا ہوگا۔ دوسرے یہ کہ رات کو میرے پاس کون رہے گا۔ میرے کھانے پینے کا کیا بندوبست ہوگا وغیرہ وغیرہ۔

میں نے بڑی مشکل سے اسے سمجھا کر گھر بھیجا اور کہا کہ سرجن سے جو بھی بات ہوگی وہ میں فون پر اسے بتا دوں گا۔ اس کے بعد دیکھیں گے کہ کیا کرتا ہے۔ جہاں تک کھانے کا تعلق ہے تو وہ پڑوس میں رہنے والے ارشد کے ہاتھ بھی بھیج سکتی ہے۔ صرف ایک دن کی بات تھی۔ اگلے روز تو بھائی کو اسلام آباد سے واپس آ جاتا تھا۔

سرجن صاحب آٹھ بجے تک ٹریف لائے اور انہوں نے میرا معائنہ کرنے کے بعد کہا کہ فی الحال وہ آپریشن نہیں کر رہے۔ البتہ کندھے پر پلاسٹر چڑھانا ہوگا۔ امید ہے کہ اس کے بعد آپریشن کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔

ان کی بات سن کر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ میرا خیال تھا کہ پلاسٹر کرنے کے بعد اسی روز یا زیادہ سے زیادہ صبح تک مجھے ڈسچارج کر دیا جائے گا۔ میں گھر فون کرنے ہی والا تھا کہ دو دار ڈیوائے وینل چیز لے کر آگئے اور مجھے آپریشن تھیٹر میں لے گئے۔ مجھے ایک ٹیبل پر بٹھا دیا گیا اور سرجن صاحب اپنے ایک معاون کے ہمراہ اپنی کارروائی میں مصروف ہو گئے۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد میں روم میں واپس آیا تو ارشد اور فوریہ میرا انتظار کر رہے تھے۔ وہ بچوں کے پاس پڑوس کو چھوڑ کر آئی تھی۔ میں نے جلدی جلدی کھانا کھایا اور اسے گھر بھیج دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ زیادہ دیر بچوں سے دور رہے اور ساتھ ہی یہ بھی تاکید کر دی کہ وہ صبح ناشا یا دوپہر کا کھانا لے کر نہ آئے۔ میں اسپتال کی کینٹین سے

منگوا لوں گا۔

دس بجے کے قریب ایک دوسری نرس آئی۔ اس وقت میں غنودگی میں تھا۔ اس نے آہستہ سے میرا شانہ ہلایا اور بولی ”انجکشن لگے گا۔“

میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ دوپہر والی نرس سے مختلف انتہائی پرکشش عورت تھی۔ ہلکا ناولا رنگ، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، ریلے ہونٹ اور بھرا ہوا جسم۔ اس نے مسکرا کر میری نبض دیکھی اور بولی۔

”اب کسی طبیعت ہے؟“

اس کی دلکش سترن آواز میرے کانوں میں رس کھول رہی تھی۔ میں غور سے اسے دیکھنے لگا، وہ تھوڑا سا جھپٹتے ہوئے بولی۔ ”اس طرح کیا دیکھ رہے ہیں۔ میں نے آپ کی طبیعت پوچھی ہے۔“

”آپ جیسی تیار دار ہو تو طبیعت ٹھیک ہونے میں کیا دیر لگتی ہے۔“ میں نے خوشی سے کہا۔ اسے دیکھ کر میں اپنی تکلیف بھول گیا تھا۔

”اوہ! اگر یہ بات ہے تو میں آپ کے پاس ہی بیٹھ جاتی ہوں۔ باقی مریض جابیں بھاڑ میں۔ وہ بڑی بے تکلفی سے میرے بستر پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

اس کے گداز جسم کا تس محسوس کر کے میری حالت غیر ہونے لگی۔ میں اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ”پوچھ سکتا ہوں کہ مجھ پر یہ خصوصی عنایت کیوں ہو رہی ہے؟“

”کسی خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔“ وہ بلند پریشانی سے کا آہ نکالتے ہوئے بولی۔ ”ہم سب مریضوں سے ایک جیسا سلوک کرتے ہیں، یہ ہماری ڈیوٹی میں شامل ہے۔“

یہ کہہ کر وہ آگے کوچکی اور میرا بلند پریش چپک کرنے لگی۔ وہ میرے اتنے قریب آئی تھی کہ میں اس کی سانسون کی تپش محسوس کر سکتا تھا۔ وہ صریحاً غلط بیانی کر رہی تھی۔ میں نے کسی نرس کو مریض کے اتنے قریب ہوتے نہیں دیکھا تھا بلکہ زیادہ تر نرسیں تو بڑی رکھائی سے پیش آتی ہیں اور سیدھے منہ بات نہیں کرتیں۔ اس لیے مجھے اس کی بات پر یقین نہیں آیا۔ مجھے یہ خوش فہمی ہونے لگی کہ وہ مجھ سے خصوصی برتاؤ کر رہی ہے۔ اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے، وہ مجھے بعد میں سمجھ میں آئی۔

بلند پریش چپک کرنے کے بعد اس نے ٹرے میں سے

ایک انجکشن نکالا اور اسے سرخ میں ڈالنے لگی۔ اسے دیکھ کر میں نے برا سامنے بنایا کیونکہ مجھے انجکشن لگوانے سے ہمیشہ الجھن ہوتی ہے۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی اور اپنے موتیوں جیسے دانوں کی نمائش کرتے ہوئے بولی۔ ”گھبراہٹیں نہیں، بالکل بھی تکلیف نہیں ہوگی۔“

یہ کہہ کر اس نے آہستہ سے میرے بازو کو ہلانا شروع کر دیا۔ میرے پورے بدن میں مسکنی سی دوڑ گئی۔ اس کی انگلیوں کے کس سے مجھے بے حد سکون مل رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ وہ یونہی میرا بازو دھسلائی رہے۔ پھر مجھے ہلکی سی جھپٹ کا احساس ہوا۔ اس کے بعد اس نے دوبارہ روئی کے پھاہ سے وہ جگہ ہلانا شروع کر دی، پھر وہ میری جانب بھی جیسے میری پیشانی کو بوسہ دینا چاہ رہی ہو، پھر اچانک پچھتے پھٹے ہوئے بولی۔ ”اب آپ آرام کریں۔ میں ایک گھنٹا بعد دوبارہ آؤں گی۔“

یہ کہہ کر اس نے چار سے میرے گال پر چھکی دی اور اپنا سامان اٹھا کر لہرائی ہوئی چلی گئی۔ اس کے بعد چراغوں میں روشنی بند رہی۔ یوں لگا جیسے وہ مجھے کسی ویرانے میں تنہا چھوڑ کر چلی گئی ہو۔ اس نے مجھے آرام کرنے کے لیے کہا تھا لیکن میری تو نیند ہی غائب ہو گئی تھی۔ لوگ اس حالت میں کروٹیں بدلتے ہیں لیکن میرے لیے یہ بھی ممکن نہیں تھا۔ اگلے ہاتھ پر پلاسٹر ہونے کی وجہ سے میں صرف دائیں جانب ہی کروٹ لے سکتا تھا۔

وہ ایک گھنٹے بعد آنے کا کہہ گئی تھی لیکن میں نے پانچ منٹ بعد ہی اس کا انتظار شروع کر دیا۔ دراصل میں لڑکپن سے ہی عاشق حراج واقع ہوا ہوں۔ ہر خوب صورت لڑکی اور جوان عورت کو دیکھ کر کھل جاتا ہوں۔ اب تو مجھے ٹھیک طرح سے یاد بھی نہیں کہ میں نے زندگی میں ایک طرفہ طور پر کتنے عشق کیے۔ ان میں لڑکھن، بڑبڑیں، مسرالی رشتے دار خواتین، کلاس فیلوز اور دفتر میں ساتھ کام کرنے والی خواتین سب ہی شامل ہیں لیکن خدا کو اہ ہے کہ میں نے آج تک کسی عورت کو بڑی نیت سے نہیں دیکھا۔ بس یہی خواہش رہی کہ اس سے دوستی کروں۔ اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزاروں، پیار بھری میٹھی میٹھی باتیں کروں، تجھے تعارف کا جاولہ ہو لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ بنیادی طور پر شریف آدمی ہوں اس لیے اکیلے رات میں بیوی کے علاوہ کسی دوسری عورت کا ساتھ تصور بھی نہیں کر سکتا، بقول میرے ایک دوست کے کہ تم ان لوگوں میں سے ہو جو چاہتے ہیں

بھی بیٹھیں لیکن کھانا گھر آ کر ہی کھاتے ہیں۔ وہ ایک گھنٹے کا کہہ کر گئی تھی لیکن ڈیڑھ گھنٹے بعد واپس آئی۔ اس نے آتے ہی بجلی گرائی اور میرے بستر پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”کیا حال ہے میرے مریض کا؟“

اس کے انداز میں جواب نہایت ہی اسے دیکھ کر میں اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور حسبِ عادت نثر میں غلط شعر پڑھ دیا۔

انہیں دیکھ کر جو آ جاتی ہے چہرے پر رونق وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے ”وہا دی واہ۔“ وہ اٹھلاتے ہوئے بولی۔ ”آپ تو اچھے بھلے شاعر بھی ہیں۔“

”یہ میرا نہیں، غالب کا شعر ہے۔“ میں نے جھپٹتے ہوئے کہا۔

”کسی کا بھی ہو۔“ وہ خوشی سے بولی۔ اس کے لبوں پر ایک شریر مسکراہٹ تھی۔ ”اس وقت تو آپ نے ہی پڑھا ہے۔ پھر وہ میری نبض دیکھتے ہوئے بولی۔ ”بخار تو نہیں ہے۔“

”اگر ہو بھی تو تمہیں دیکھ کر بھاگ گیا۔“

”کیوں.... کیا میری شکل اتنی خوفناک ہے۔“ وہ اٹھلاتے ہوئے بولی۔

جی چاہا کہہ دوں کہ تم تو آسمان سے اتری ہوئی کوئی حور ہو لیکن فی الوقت اتنی بے تکلفی مناسب نہیں تھی۔ ویسے بھی مجھے اپنے مرتبہ اور منصب کا خیال رکھنا تھا۔ میں سترہ گریڈ کا افسر اور وہ ایک معمولی نرس۔ ہماری سماجی حیثیت میں زمین آسمان کا فرق تھا اور یہ مجھے گوارا نہیں تھا کہ جلدی میں کوئی فعل بات کہہ کر اپنی ہی نظروں سے گرجاؤں۔

اس نے ابھی تک میری کلائی پکڑ رکھی تھی پھر اس نے آگے کی طرف جھک کر اپنا ہاتھ میری پیشانی پر رکھ دیا۔ وہ کچھ اس طرح مجھ پر چھکی ہوئی تھی جیسے میرے ساتھ کسی فلم کا رومانوی منظر کس بند کر رہی ہو۔ پھر اچانک اسے کچھ خیال آ گیا اور وہ چپچپے بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”اب میں چلتی ہوں۔ آپ بھی آرام کریں۔“

میں نے بے اختیار ہو کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے دباتے ہوئے بولا۔ ”اتنی جلدی کیا ہے، کچھ دیر تو بیٹھو۔“ وہ میری نظروں کا معلوم سمجھ گئی اور کھٹکھٹا کر بولی۔

”اس وقت میٹرن راولڈ ہے۔ اسے یہ پسند نہیں کہ ہم کسی مریض کے پاس زیادہ دیر تک رہیں۔“

اس نے اپنا سامان اٹھایا اور میرے کان کے قریب جھٹکتے ہوئے سرگوشی میں بولی۔ ”بارہ کے بعد آؤں گی۔“

اس کے جانے کے بعد میں اپنے آپ کو کھٹ ملامت کرنے لگا۔ اس نے جس انداز میں میری حوصلہ افزائی کی اس سے اندازہ ہو گیا کہ وہ کوئی اچھی عورت نہیں تھی ورنہ مجھے اسی وقت جھڑک دیتی یا اپنی جگہ کی دوسری نرس کو بھیج دیتی لیکن وہ تو بارہ بجے آنے کا کہہ چکی تھی گویا وہ اس کی عادی تھی اور مریضوں سے دل لگی کرنا اس کا مشغلہ تھا۔ مجھے چاہئے تھا کہ اپنی پیش قدمی وہیں روک دیتا اور جب وہ آتی تو سب سے پہلے انداز میں دوچار باتیں کر کے اسے ٹال دیتا لیکن میں اپنی فکر کی فطرت سے مجبور تھا۔ اس لیے ایسا نہ کر سکا۔

وہ بارہ کی بجائے ایک بجے آئی۔ شاید میری آتش شوق کو بھڑکانا مقصود تھا۔ اس بار اس کا روپ ہی بدلا ہوا تھا۔ لگ رہا تھا کہ وہ تیار داری کے لیے نہیں بلکہ میرے ساتھ ڈیٹ پر جانے کے لیے آئی ہو۔ ویسے تو وہ نرس کے لباس میں ہی تھی لیکن اس کے انداز ہی بدلے ہوئے تھے۔ اس نے ہلکا ہلکا میک اپ کیا تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ اس نے ہونٹوں پر تازہ تازہ لب اسٹک لگا لی ہوئی ہے۔ دوپٹا سر سے ڈھلک کر شانوں پر آگیا تھا اور اس کے بدن سے پرفیوم کی ہلکی ہلکی مہک آرہی تھی۔

اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی دروازہ بند کر دیا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا چاہ رہی تھی۔ اس نے بڑے معصومانہ انداز میں خود ہی دروازہ بند کرنے کا جواز پیش کر دیا۔ وہ حسب معمول میرے لمبر پر بیٹھنے ہوئے بولی۔

”ویسے تو ڈاکٹر سمیت سارا عملہ سوچکا ہے لیکن میٹرن کی نیند بہت جلدی ہے۔ وہ کسی وقت بھی اس طرف آسکتی ہے۔“

”پھر تو تمہیں نہیں آنا چاہیے تھا۔ بند دروازہ دیکھ کر کوئی بھی شک میں پڑ سکتا ہے۔“

”آپ پریشان نہ ہوں۔“ اس نے میرے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”اگر کوئی آگیا تو میں سنبھال لوں گی۔ یہ کہہ کر وہ میرے اوپر بھجک گئی اور بولی۔ ”اگر میرا بس چلے تو رات بھر آپ کے پاس بیٹھی رہوں۔“

”کیا تم سب مریضوں کے ساتھ اسی طرح پیش آتی ہو؟“ میں نے اسے چھیڑنے کے لیے کہا۔

”توبہ کریں جی۔“ وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے

بولی۔ ”میں تو کسی کو بھی منہ نہیں لگاتی، بس اپنی ڈیوٹی پوری کرتی ہوں۔“

”پھر مجھ پر یہ مہربانی کیوں؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

”اس لیے کہ آپ مجھے پہلی ہی نظر میں اچھے لگے۔“ وہ چھپتے ہوئے بولی۔ ”خاص طور پر آپ کی یہ شرقی آنکھیں۔“

”کی کو بھی دیوانہ بنانے کے لیے کافی ہیں۔“

میں اپنی تعریف کو حیران رہ گیا۔ مجھ میں ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی جس سے کوئی عورت متاثر ہو سکتی۔ عام سی شکل صورت، دو سادہ قد، البتہ میں اپنے لباس اور گھٹ اپ پر خاص توجہ دیتا تھا۔ ہمیشہ صاف ستھرے کپڑے پہن کر کمرے باہر نکلتا۔ بال سلیپ سے سنورے ہوتے اور پالش کیے ہوئے ہوتے۔ شادی بیاہ کی محفلوں میں بہت کم کھاتا اور لوگوں سے گفتگو میں محتاط رہتا۔ مجھے مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ ہر وقت میرے ہاتھ میں کوئی کتاب یا ڈائریکٹس ہوتا۔ کبھی کبھی میری بیوی بھی اس عادت سے پڑ جاتی۔ وہ چاہتی تھی کہ میں فارغ وقت میں اس سے باتیں کروں یا بچوں کو کہیں گھمانے لے جاؤں جس کی نوبت کبھی نکھار ہی آتی۔

میں جانتا تھا کہ وہ مجھے بے وقوف بنارہی ہے لیکن میں خود بھی اس کی قربت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ کسی مرد کے لیے اس سے بڑی نعمت اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک خوب صورت اور پرکشش عورت تمہاری قریب بیٹھی اپنی اداؤں اور شیطانی شیطانی باتوں سے اس کا دل بہلا رہی ہو۔ میں خود بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ دیر تک میرے پاس بیٹھی رہے۔ اس لیے میں نے بات کو آگے بڑھانے کی خاطر پوچھا۔ ”تم نے اپنا نام نہیں بتایا۔“

”آپ نے پوچھا ہی کب؟“ وہ شوق لہجہ میں بولی۔

”تو اب بتا دو۔“ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔

وہ میری جانب کھٹکتے ہوئے بولی۔ ”میرا نام مریم ہے۔“

”کہاں رہتی ہو؟“

”کھوکھرا پار میں۔“

میں اس کی ازدواجی حیثیت جاننا چاہ رہا تھا اس لیے گھما گھما کر پوچھا۔ ”مگر میں اور کون کون ہے؟“

”میرا شوہر اور بیٹی۔“

”اوہ!“ میں نے ایک طویل سانس لی پھر پوچھا۔

”تمہارا شوہر کیا کام کرتا ہے؟“

اس نے میرے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ”کیا ماری باتیں آج ہی پوچھیں گے، کچھ کل کے لیے بھی چھوڑیں۔“

مجھے لگا کہ وہ اپنے شوہر کے بارے میں بتانا نہیں چاہتی۔ شاید وہ کھٹو یا بے روزگار ہے یا پھر کسی ایسے پیشے سے وابستہ ہے جس کے بارے میں اسے بتاتے ہوئے شرم آرہی ہے۔ وہ کچھ دیر بعد مجھ سے ابھر اُدھر کی باتیں کرنی لگی پھر اس نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا اور اُدھر کھڑی ہوئی۔

”اوہو، باتوں میں وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چلا۔ دو بج گئے۔ اب میں چلتی ہوں کہیں بیٹی نہ اٹھ جائے۔“

”کیا تم بیٹی کو ساتھ لے کر آتی ہو؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”ظاہر ہے۔ چھ ماہ کی بچی کو کس کے پاس چھوڑ کر آؤں۔“ اس کے لہجے میں ہلکی سی تکی تھی جسے میں محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ اس لمحہ مجھ اس سے ہمدردی محسوس ہونے لگی لیکن میں اس معاملے میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن اس کے مالی حالات اچھے نہیں تھے ورنہ وہ بچی کو کسی گھر کے کینئر سنٹر میں بھی چھوڑ سکتی تھی۔

”اپنا دل والوں کو اس پر کوئی اعتراض تو نہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”انہیں کیا اعتراض ہوگا۔ میں اپنی ڈیوٹی پوری کرتی ہوں اور ویسے بھی وہ پوری رات سوئی رہتی ہے۔ میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد چکر لگا کر اسے دیکھ لیتی ہوں۔“

اس نے لہجہ بھر توجہ کیا، پھر مسکراتے ہوئے بولی۔

”میں بھی کیا قصہ لے بیٹھی۔ یہ میرا مسئلہ ہے اور مجھے ہی حل کرنا ہے۔ اب آپ آرام کریں، صبح ملاقات ہوگی۔“

وہ جانے لگی تو میں نے کہا۔ ”تمہیں ایک زحمت دینا چاہتا ہوں۔“

”جی بولیں۔“

میں نے اپنے پرس میں سے کچھ نوٹ نکال کر اسے دے دیے اور کہا۔ ”صبح کسی وارڈ ہوائے سے کہہ کر میرے لیے ناشائستہ آنا۔“

”تو براہ کرم۔ یہ میرے پاس رکھیں۔ صبح جب کینٹین والا لڑکا ناشائستہ لے کر آئے تو اسے دے دیجیے۔“ اس نے

عہدا کبریٰ میں میاں تان سین جن کا اصل نام عطا حسین خاں تھا، انہوں نے مسلم لیگ پاکستان کی قیادت کی۔ عروج تک پہنچایا۔ سید عابد علی عابد فرماتے ہیں: ”میاں تان سین نے کمال کی سکیت کو نارتنگ، نئی حلاوت اور نیا نکلین بخشا۔ انہوں نے راگوں میں نہایت دلکش تصرفات کیے اور یہ راگ ان تصرفات کیے اور یہ راگ ان تصرفات کے ساتھ اب ان کے نام سے منسوب ہیں۔ مثلاً میاں کی ملہار، میاں کی ٹوڈی لیکن جو راگ تان سین کا نام لیا گیا سکیت میں ہمیشہ زندہ رکھے گا کہ وہ درباری ہے جسے سن کر بقول اکبر اعظم دل کی سوئی ہوئی تناسیم جاگ اٹھتی تھیں اور بڑے بڑے کام کرنے والے دلوں نے بیدار ہوتے تھے۔“

مرسلہ: جنیم بٹ۔ لاہور

اگر آپ اپنی یادداشت بہتر بنانا چاہتے ہیں تو چاکلیٹ کھانا شروع کر دیں۔ L'Aquila یونیورسٹی کی ایک تحقیق میں بتایا گیا کہ کوکا (چاکلیٹ کا بنیادی جز) کھانا معمول بنالین طویل العمریادداشت کو بہتر بنانے میں مدد دیتا ہے۔ تحقیق کے مطابق چاکلیٹ میں موجود فلیوونوئیز یا فلیوونولز ذہنی صحت کے لیے فائدہ مند ہیں۔ اس تحقیق کے دوران صحت مند افراد کے ساتھ ساتھ انزائیمز یا ذہنیاتی کے شکار افراد کا بھی جائزہ لیا گیا اور انہیں کوکا سے پھر پور مشروبات کا استعمال آٹھ ہفتے تک کرایا گیا۔ نتائج سے معلوم ہوا کہ اس سے ذہنی صحت خصوصاً یادداشت میں بہتری آتی ہے جبکہ بلڈ پریشر اور انسولین لیول بھی بہتر ہوتے ہیں۔ تحقیق میں مزید بتایا گیا کہ چاکلیٹ کھانا یا مشروب کی شکل میں اسے استعمال کرنا دماغ کے لیے فائدہ مند ثابت ہوتا ہے کیونکہ اس سے دماغ کی جانب دوران خون بڑھتا ہے جس کے دماغی صحت پر فوری اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ تحقیق کا کہنا تھا کہ چاکلیٹ کھانے کا یہ مطلب نہیں کہ آپ فوری طور پر اسٹارٹ ہو جائیں گے کیونکہ بازار میں دستیاب عام چاکلیٹ بار میں مناسب مقدار میں فلیوونوئیز موجود نہیں ہوتے مگر کوکا ضرور فائدہ مند ثابت ہوتا ہے۔ یہ تحقیق طبی جریدے فرنیئر ان یوریشن جرنل میں شائع ہوئی۔

مرسلہ: وارث علی۔ ملتان

مجھے پیسے واپس کرتے ہوئے کہا تو مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ کتنی محتاط اور سمجھ دار ہے۔

اس کی ڈیوٹی صبح آٹھ بجے ختم ہوتی تھی اس لیے وہ سات بجے ہی ناشتا لے کر آئی۔ اس نے کینٹین والے لڑکے سے کہا کہ وہ ایک کھنڈے بعد خالی برتن اور پیسے لے جائے۔ میں اسی کے انتظار میں جاگ رہا تھا۔ وہ میرے پاس آ کر رکی اور بڑے پیار سے میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔ ”آپ منہ ہاتھ دھوئیں۔ میں آتی ویر میں ایک راولٹر لے کر آئی ہوں۔ پھر میں آپ کو ناشتا کرواؤں گی۔“

اس کی اس ادا پر تو میں سوچاں سے غذا ہو گیا۔ اتنے پیار سے میری بیوی نے بھی نہیں اٹھایا تھا۔ اس میں کچھ تصور میرا بھی تھا۔ میرے نرم رویہ نے اسے حاکمیت پسند بنا دیا تھا اور وہ مجھ سے عام انداز میں بات کرتی تو یوں لگتا جیسے حکم دے رہی ہو۔

بہر حال اس نے مجھے سہارا دے کر اٹھایا۔ مجھے چل پھانے اور واش روم تک لے گئی۔ وعدے کے مطابق وہ دس منٹ بعد ہی آئی۔ اس نے میرے لیے چائے بنا کر۔ تو س پر مار جین لگائی۔ ابلے ہوئے انڈے کو پھیل کر دو حصوں میں تقسیم کیا اور بولی۔ ”شروع ہو جائیں۔ میرے پاس صرف بیس منٹ ہیں پھر مجھے دن والی نرس کو چارج دینا ہے۔“

”تم میرا ساتھ نہیں دو گی۔“

”نہیں۔ میں گھر جا کر ناشتا کرتی ہوں۔“

”جہیں میرے ساتھ شریک ہونا ہوگا۔ مجھے اکیلے ناشتا کرنے کی عادت نہیں ہے۔“

میں صریحاً جھوٹ بول رہا تھا۔ ساری عمر میں نے اکیلے ہی ناشتا کیا۔ صبح کے وقت بیوی کو بچوں سے ہی اتنی فرصت نہیں ملتی تھی کہ وہ مجھ پر توجہ دیتی۔

وہ میرے برابر میں بیٹھ گئی اور ہاتھ سے مجھے ناشتا کرائے لگی۔ میں نے بھی زبردستی ایک سلاخ اس کی طرف بڑھا دیا جسے اس نے بڑے نازخروں اور انداز میں دکھانے کے بعد منہ میں رکھ لیا۔ یوں لگ رہا تھا کہ کسی فلم کا رومانی سین چل رہا ہو۔ وہ بالکل کئی نئی ٹولی جیو کی طرح مجھے اپنی اداؤں سے کھال کر رہی تھی۔ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد وہ اٹھی اور بولی۔ ”چلتی ہوں۔ رات کو ملاقات ہوگی۔“

”ہو سکتا ہے کہ شام تک مجھے ڈسچارج کر دیا جائے۔“

”ابھی آپ کہیں نہیں جا رہے۔“ وہ ہنستے ہوئے بولی۔

”آپ سرجن شریک کے مہمان ہیں۔ وہ اتنی جلدی آپ کو ڈسچارج نہیں کریں گے۔“

میں نے دل میں کہا کہ اچھا ہی ہے۔ کچھ دن اور تمہاری قربت میں گزارنے کا موقع مل جائے گا۔

ایک ہی رات میں وہ پوری طرح میرے دل و دماغ پر چھا چکی تھی۔ اس وقت میں ”کھتے ہیں عشق جسے غل نہ دماغ کا“ کی مکمل تفسیر بنا ہوا تھا۔ اس کی من موئی صورت، دلکش اداؤں اور مسکراتے ہوئے چہرے نے مجھے ہوش و حواس سے بے گانہ کر دیا تھا اور میری کچھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ اسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد اس سے ملنے کی کیا صورت ہوگی۔ میں صبح سے شام تک دفتر میں سرکھٹا تھا اور وہ نائن ڈیوٹی کرتی تھی۔ اس لیے یہ کسی طرح بھی ممکن نہیں تھا کہ وہ میرے ساتھ گھومتے پھرتے جاتی یا ہمیں تنہائی میں ملنے کا موقع میسر آتا۔ پھر یہ کہ اس سبب جوں سے حاصل بھی کیا ہوتا۔ دونوں ہی شادی شدہ تھے۔ میں تین بچوں کا باپ اور وہ ایک شیر خوار بچی کی ماں تھی اور ہر اعتبار سے یہ تعلق ناجائز تھا۔ اس کے بارے میں تو کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن اگر کوئی مجھے اس کے ہمراہ دیکھ لیتا تو میں کسی کو نہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا اور اگر میری بیوی کو اس کی جھگڑ جاتی تو وہ مجھے کبھی بچا جاتی لیکن اس وقت میری عقل بالکل ماؤف ہو چکی تھی اور میں کچھ سوچنے کے قابل نہیں تھا۔

دو پہر کو فوڈ یہ کھانا لے کر آئی۔ اس نے آتے ہی سب سے پہلے ناشتے کے بارے میں پوچھا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ اسپتال کی کینٹین سے منگوا لیا تھا تو اسے کچھ اطمینان ہوا۔ میں نے اسے منع کر دیا کہ وہ آئندہ کھانا لے کر نہ آئے۔ میں یہیں سے منگواؤں گا۔ ایک دو دن کی بات ہے اس کے بعد تو یہ لوگ مجھے ڈسچارج کر ہی دیں گے۔

اس روز سرجن صاحب نہیں آئے۔ میں نے ڈیوٹی ڈاکٹر سے اپنے ڈسچارج ہونے کے بارے میں پوچھا تو وہ انتہائی روکے انداز میں بولا۔ ”میں اس معاملے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہ تو سرجن صاحب ہی بتائیں گے۔“

”اور سرجن صاحب کب آئیں گے؟“

”معلوم نہیں۔ وہ آج کال ہوتے ہیں اور ضرورت پڑنے پر ہی آتے ہیں۔“

”اگر ایک مہینہ تک ان کی ضرورت نہ ہوئی تو وہ نہیں آئیں گے اور میں اسی طرح بے یار و مددگار یہاں پڑا

ہوں گا۔“

”اب ایسا بھی نہیں ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”ان کے کیسز آتے ہی رہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کل ہی آجائیں۔“ پھر وہ میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”آپ کو پریشانی کیا ہے؟ اسپتال کا مل تو کتنی ادا کرے گی۔ آپ کو کیا فکر ہے؟“

”مجھے مل کی نہیں اپنے گھر کی فکر ہے۔“ میں نے علاتے ہوئے کہا۔ ”گھر میں کوئی دوسرا مرد نہیں ہے اور بچے بہت چھوٹے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ ایک دن اور گزار لیں، کل سرجن صاحب آئیں تو ان سے پچھنی کی بات کر لیں۔“

اب میں پوری بات سمجھ گیا تھا۔ اصولاً تو انہیں بلا سٹر کے بعد ہی ڈسچارج کر دینا چاہئے تھا لیکن پھر مل کیسے بننا۔ اس لیے انہوں نے علاج کے بہانے مجھے روک رکھا تھا۔ ہاں مجھے دن میں تین مرتبہ دو مختلف رنگوں کی گولیاں دی گئیں اور بلڈ پریشر چیک کیا جاتا۔ یہ علاج تو گھر پر بھی لگتا تھا۔

شام کو وہ نرس مریم ٹھیک آٹھ بجے آئی۔ اس نے دروازہ پر ہلکی سی دھک دی اور اندر آئی۔ اس کے آنے سے پندرہ منٹ پہلے میں اپنی بیوی کو کھینچ چکا تھا حالانکہ اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی لیکن شاید میرے دل میں جھجکتا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ ان دونوں کا آنا سامنا ہو کیونکہ مریم بہت خوبصورت تھی اور اگر وہ میری بیوی کے جیسے ایسی ہی بے تکلفی کا مظاہرہ کرتی جو وہ کرشنہ شب کر رہی تھی تو فوڈ یہ بھینا شک میں مبتلا ہو جاتی۔

مریم آہستہ آہستہ چلتی ہوئی میرے پاس آئی اور سرکشی کے انداز میں بولی۔ ”میں راولٹر پر جا رہی ہوں۔ آپ کے اس سب سے آخر میں آؤں گی تاکہ زیادہ دیر تک بیٹھ نہ سکوں۔“

مجھے اس کی یہ بات اچھی نہیں لگی۔ میں تو شام سے ہی اس کا انتظار کر رہا تھا لیکن اس نے راولٹر پر جانے کا بہانہ کر کے مجھے مزید انتظار میں مبتلا کر دیا۔ شاید اس طرح وہ پھر سے میرا امتحان لے رہی تھی۔ اسے اپنی قدرو قیمت کا اندازہ تھا اور وہ مجھے انتظار کی لذت سے آشنا کر کے اپنے دام کھڑے کرنا چاہ رہی تھی۔

ایک گھنٹا بھی کسی نہ کسی طرح گزر گیا۔ وہ لگتی مکتی آئی۔ اس کے ہمراہ ڈاکٹر بھی تھا۔ میں کوئی بیمار تو تھا نہیں جو

اسے کوئی تشویش ہوتی۔ اس نے رسامیرا حال پوچھا اور چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد مریم نے دروازہ بند کیا اور میرے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”آج انکسٹن نہیں لگے گا۔ صرف بلڈ پریشر چیک کروں گی۔ آپ نے دو کھالی؟“

میں نے لٹی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ابھی نہیں کھائی۔ ویسے میرا خیال ہے کہ مجھے کسی دوا کی ضرورت نہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

”یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟“ وہ میرا بلڈ پریشر چیک کرتے ہوئے بولی۔ ”جب تک سرجن صاحب آپ کو نہ دیکھ لیں۔“

میں ان خوشگوار کلمات کو بحث میں ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا اس لیے خاموش ہو گیا۔ وہ اپنا سامان پیٹنے سے روک کر بولی۔

”اب میں جاؤں؟“

”اتنی جلدی؟“ میں نے باپوس ہوتے ہوئے کہا۔

”ابھی تو کوئی بات بھی نہیں ہوئی۔“

”پھر آؤں گی۔“ اس نے میرے بال سہلاتے ہوئے کہا۔ اس وقت کام کا شہ ہے۔ میٹرن بھی راولٹر پر ہے۔ اس نے دیکھ لیا تو خواہ مخواہ ہنگامہ کھڑا کر دے گی۔“

میں نے بادل خواستہ اسے جانے کی اجازت دی اور خود انکسٹن موند کر لیٹ گیا۔

اب مجھے بے چینی سے اس وقت کا انتظار تھا جب وہ اپنے کام سے فارغ ہو کر میرے پاس آئی۔ میں مسلسل اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ اس بری طرح میرے دل و دماغ پر چھا گئی تھی کہ اس کے علاوہ میرا دھیان کسی اور جانب نہیں گیا۔ میں نے اس دوران ایک دفعہ بھی بچوں کو یاد نہیں کیا اور نہ ہی بھائی کا خیال آیا کہ نہ جانے اس کے اعتر و یو کیا کیا بنا۔ میں نے کئی بار اپنے دل کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اسپتال سے جانے کے بعد ویسے ہی اس سے ملنے کا امکان تقریباً ختم ہو جائے گا پھر میں کیوں اس کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ دل اور دماغ میں ایک کشش ہو رہی تھی۔ بالآخر رجبت دل کی ہوئی، دماغ بار گیا۔

وہ کرشنہ شب کی طرح ایک بجے آئی۔ اس بار بھی اس نے اپنے آپ کو ایک نئے سرے سے سنوارا تھا۔ وہی ہلکا ہلکا میک اپ، ہونٹوں پر لگی تازہ تازہ لب اسٹیک، کھلے ہوئے بال اور دوپٹا سر کے بجائے شانوں پر۔ اس نے دروازہ بند کیا اور میرے پاس بستر پر آکر بیٹھ گئی۔ پھر اس نے بڑے پیار سے میرے بالوں میں انگلیاں پھیریں اور بڑے لاڈ

ارسطو

(ارسطو 384-322 قبل مسیح) تھریس کے ایک شہر استاجیرہ میں پیدا ہوا اور فلکس میں فوت ہوا۔ اس کا باپ کوئیکس، اسکندریہ عظمیٰ کے دادا امپطاس کا جو مقدونیا کی ریاست کا ایک طاقتور و حکمران تھا، دوست اور درباری طبیب تھا۔ ارسطو کی پرورش جب اودیات اور امراض کے تذکروں میں ہوئی تو اس کا رجحان طبع کا علوم طبیعی کی طرف ہو جانا ایک فطری عمل تھا۔ 367 ق م میں ایشیا میں اس کی تعلیم شروع ہوئی۔ اس کے ہم عصر شباب کی کئی ایک کہانیاں مشہور ہیں۔ ایک کہانی کے مطابق اس نے اپنی تمام آبائی جائیداد جوانی کی سرمستوں میں برباد کر ڈالی اور جب تلاش ہو کر بھوکوں مرنے لگا تو فوج میں بھرتی ہو گیا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد ملازمت چھوڑ کر اپنے آبائی شہر استاجیرہ میں لوٹ آیا اور طبابت کرنے لگا۔ تیس برس کی عمر میں اسے علم وحکمت سکھنے کا شوق ہوا اور وہ افلاطون کے حلقہ تلمذ میں شریک ہونے کے لیے امتحان چلا گیا۔ اس سے زیادہ مستند روایت کی رو سے اس نے اٹھارہ برس کی عمر میں افلاطون کی شاگردی اختیار کی تھی۔ اس کے شباب کی سرمستوں کا اس روایت میں بھی ذکر ملتا ہے، اس نے افلاطون سے ایک روایت کے مطابق آٹھ اور دوسری روایت کی رو سے تیس برس تعلیم حاصل کی۔

مرسلہ: زویا خان، شیخوپورہ

اس کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ وہ لوگ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد چلے گئے۔ آٹھ بجے مریم اپنے شوہر کے ساتھ آئی۔ اس کا نام بڑا نوازا تھا۔ مریم نے اسے میرے پاس بٹھایا اور خود راؤنڈ پر چلی گئی۔ میں اس شخص کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ مریم کے ساتھ اس کا کوئی جوڑ نہ تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ مریم سے دینی عمر کا تھا اور اسے اس نے بڑا عجیب و غریب حلیہ بٹھارہ تھا۔ ٹکٹے کپڑے، مدفون چہرہ، کچھڑی بال، بڑھا ہوا شیدو اور اندر کو دھکی ہوئی آنکھیں۔ کثرت تبنا کوٹوشی سے اس کی انگلیاں زرد ہو گئی تھیں۔ اس کے علاوہ اس کا چہرہ بٹھارہ تھا کہ وہ کوئی اور نشہ بھی کرتا ہے۔ اسے دیکھ کر واقعی مجھے مریم پر ترس آنے لگا۔

”درخواست لائے ہو؟“ میں نے اس کی طرف بخور دیکھتے ہوئے کہا۔

”جی ہاں۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک لفافہ مجھے پکڑا دیا۔ میں نے درخواست دیکھی جو اس نے ہاتھ سے لکھنے کے بجائے کہیں سے ٹائپ کروائی تھی۔ اس کا یہی مطلب تھا کہ اسے درخواست لکھنا نہیں آتی یا پھر اس کی پینڈر اننگ خراب ہے۔ درخواست کے ساتھ دو تصویریں تو تھیں لیکن اس کے ہمراہ کوئی ٹیکٹ نہ تھا۔ اس کے کوائف پڑھ کر مجھے بہت مایوسی ہوئی۔ وہ صرف میٹرک پاس تھا اور اس نے رکشا چلانے کے علاوہ کوئی کام نہیں کیا تھا۔

میں نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے پاس نہ کوئی ہنر ہے اور نہ ہی کسی کام کا تجربہ۔“ میں تمہیں کہاں لگاؤں؟“

”نہیں بھی لگاؤں۔ میں ہر طرح کا کام کرنے کو تیار ہوں۔“

”رکشا کے علاوہ کوئی گاڑی چلاتی ہے؟“

”جی ہاں۔ کار اور سوزوکی پک اپ چلا سکتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے پھر میں تمہارے لیے ڈرائیور کی جگہ دیکھتا ہوں لیکن بہت زیادہ امید مت رکھنا کیونکہ ہمارے یہاں پہلے ہی ضرورت سے زیادہ اسٹاف ہے۔“

”کوئی بات نہیں۔ آپ کوشش کر کے دیکھ لیں۔ قسمت میں ہوگا تو نوکری بھی مل جائے گی۔“

مجھے یوں لگا جیسے اسے ملازمت سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے اور مریم اسے زبردستی میرے پاس لائی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ بھی اپنا راؤنڈ مکمل کر کے آگئی اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ”بات ہوگئی، آپ نے اپنی تسلی

مجموعات ہوگی۔ آپ کے لیے ناشتا لیتی آؤں گی۔“

یہ ملاقات بھی ادھوری رہی بلکہ میری تسلی کچھ اور بڑھ گئی۔ وہ ایک قدم آگے بڑھ کر دو قدم پیچھے ہٹ جاتی۔ مجھے بھی اس آنکھ بھولی میں لطف آ رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر اس کے شوہر کو ملازمت مل گئی تو میرا راستہ صاف ہو جائے گا اور میں بلا ٹکٹے اس کے گھر جا سوں گا۔ اس وقت بھی میری عقل میں یہ بات نہیں آئی کہ مجھے اس کا موقع ہی کب ملے گا۔

دوسرے روز وہ ٹیکسٹات بجے میرے لیے ناشتا لے کر آگئی۔ پہلے روز کی طرح وہ مجھے سہارا دے کر دوش پر رکھ لے گئی۔ میں نے دانت برش کیے، منہ ہاتھ دھویا۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ ہی بیٹھ کر ناشتا کیا۔ اس دوران اس نے خوب لگاؤ کا مظاہرہ کیا۔ وہ اپنے ہاتھ سے مجھے ناشتا کروا رہی تھی اور ہار ہار کوئی ایسی حرکت کرتی جس سے اس کے جسم کا کوئی حصہ مجھ سے مس ہو جاتا۔ وہ اس وقت بالکل ایک روائی مجھ پر کارواں کر رہی تھی۔

میں نے اس روز فوریہ کو اسپتال آنے سے منع کر دیا تھا۔ اس لیے جب ٹیکسٹن والا لڑکا ہاتھ کے خانی برتن اور پیسے لے کر آیا تو میں نے اس سے دوپہر کا کھانا لانے کے لیے کہہ دیا۔ شام کو سرجن صاحب مجھے دیکھنے آئے تو میں نے ان سے گھر جانے کی بات کہی تو انہوں نے صاف انکار کر دیا اور بولے کہ مجھے کم از کم دس روز اسپتال میں رہنا ہوگا۔

”لیکن کیوں؟“ میں نے جھگڑتے ہوئے کہا۔ ”یہاں میرا کوئی خاص علاج نہیں ہو رہا، یہ گولیاں تو میں گھر میں بھی کھا سکتا ہوں۔“

”گھر اور اسپتال میں بہت فرق ہوتا ہے۔ گھر میں اسپتال جیسی نگہداشت نہیں ہو سکتی، میں آپ کو اس حالت میں ڈیپنچارج کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔“

”میں لکھ کر دینے کے لیے تیار ہوں کہ اگر مجھے کچھ ہو گیا تو اس کی ذمہ داری مجھ پر ہوگی۔“

”ٹھیک ہے۔ اگر آپ بعد میں تو شوق سے گھر جائیں۔“ سرجن نے ہتھ پاڑا اٹاتے ہوئے کہا۔

”کل صبح آپ کا ایکسیرے لیا جائے گا۔ اس کے بعد آپ گھر جا سکتے ہیں۔ دسویں روز آکر چیک اپ کروالیں۔“

شام کو نو بیہ میرے بھائی کے ساتھ مجھے دیکھنے آئی۔ میں نے اسے اپنے ڈسپانچر ہونے کے بارے میں بتایا تو

سے بولی۔ ”سر آپ کا عہدہ کیا ہے؟“

میں اس کی جانب سے کسی رومانی حرکت کی توقع کر رہا تھا۔ اس بے تکے سوال پر چونک گیا۔ میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں یوں کچھ لو کہ چھوٹا سا افسر ہوں۔“

وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ ”اگر آپ چھوٹے افسر ہوتے تو پرائیویٹ روم کبھی نہ ملتا۔“

”تمہیں میرے ریمک سے اتنی دلچسپی کیوں ہوگئی؟“

میں نے اس نے گال کو ہلکے سے چھوتے ہوئے کہا۔

”اس لیے کہ مجھے آپ سے ایک کام ہے۔“ وہ بڑی اداسے بولی۔

”کیا کام؟“

”بات دراصل یہ ہے کہ میرا شوہران دنوں بے کار ہے۔ گھر کا سارا بیوہ مجھ پر آگیا ہے۔ بڑی تنگی ہو رہی ہے۔ اگر آپ اسے اپنے تنگے میں ملازمت دلاویں تو بڑی مہربانی ہوگی۔“

”تمہارا شوہر کام کیا کرتا ہے؟“

”وہ رکشا چلاتا تھا۔ ایکسٹنٹ ہو گیا تو مالک نے رکشا چھین لیا۔ اب وہ بے روزگار ہے۔ کوشش کے باوجود اب تک اسے کوئی کام نہیں مل سکا۔“

”دیکھو بھئی، ہمارے ادارے میں رکشا ڈرائیور کی تو کوئی آسانی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ وہ کیا کام کر سکتا ہے؟“

”جی اس کا تو مجھے پتا نہیں۔ میں اسے کل بلا لیتی ہوں۔ آپ خود اس سے بات کر لیں۔“

”ٹھیک ہے۔ اس سے کہنا کہ اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی درخواست اور دو نوٹو ساتھ لیتا آئے اور اگر اس کے پاس تعلیم یا تجربہ کا کوئی ٹیکٹ ہو تو وہ بھی درخواست کے ساتھ لگا دے۔ دیکھو میں کسی سے بات کرتا ہوں۔“

”آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔“ وہ میرے دونوں ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی۔ ”میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔“

”اس میں احسان کی کیا بات ہے۔ انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔“

اس نے اچانک ہی اپنی گھڑی میں وقت دیکھا اور کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ”اوہو! دو بج گئے۔ کہیں بچی نہ اٹھ گئی ہو۔ بہت دیر سے سو رہی ہے۔ اب میں چلتی ہوں،

کر لی؟“

”ہاں۔“ میں نے مختصر سا جواب دیا۔

پھر وہ اپنے شوہر سے بولی۔ ”تم نے صاحب کو سب ٹھیک ٹھیک بتا دیا ہے۔ نا کوئی بات چھپائی تو نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ انہیں دوسروں کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔“

”ہاں، ہاں، بتا دیا ہے سب کچھ۔ کوئی بات نہیں چھپائی۔“ وہ کچھ چڑتے ہوئے بولا۔

”اب میں جاؤں؟“

”ہاں۔“ مریم نے جواب دیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے مریم سے پوچھا۔ ”یہ تم نے کس بانگو سے شادی کر لی۔ اس کا اور تمہارا کوئی جوڑ

نہیں۔

”بس جی، یہی لکھا تھا قسمت میں۔“ وہ کچھ اداس ہوتے ہوئے بولی۔ پھر اس نے ایک دم ہی بات بدل دی اور بولی۔ ”سنا ہے کہ آپ کل گھر جا رہے ہیں؟“

”ہاں۔ تم نے ٹھیک ہی سنا ہے۔ اور اب میں سوچ رہا ہوں کہ یہاں سے جانے کے بعد تم سے کس طرح رابطہ ہوگا۔ اگر تمہارے شوہر کے کام کے سلسلے میں کوئی پیش رفت ہوئی تو تمہیں کیسے اطلاع دی جائے گی؟“

”اس کی تو آپ فکر ہی نہ کریں۔“ وہ چپکتے ہوئے بولی۔ ”میں صبح آپ کو اپنے برابر والوں کا نمبر دوں گی۔ وہ مجھے بلا دیں گے اور اگر میں گھر پر نہیں ہوئی تو آپ کا پیغام مجھ تک پہنچ جائے گا۔“

اسے یوں چپکتے دیکھ کر مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ وہ میرے جانے کی خبر سن کر اداس ہو جائے گی لیکن میں نے اس کے چہرے پر ایسی کوئی علامت نہیں دیکھی بلکہ وہ پہلے دو دنوں کی نسبت زیادہ خوش نظر آ رہی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میں نے اس کے شوہر کی درخواست لے کر رکھ لی تھی اور اس کے باوجود میں کوئی تین تین منٹ نکالی۔ یہ گویا اس امر کی جانب اشارہ تھا کہ مجھے اس کے شوہر کی مدد کرنے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔

اس روز وہ میرے پاس نہیں بیٹھی اور نہ ہی اس نے پہلے دو دنوں کی طرح ٹیکسی ٹیکسی باتیں کیں بلکہ فوراً ہی جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ البتہ جاتے وقت اس نے اتنا ضرور کہا۔ ”آج مصروفیت بہت زیادہ ہے اس لیے فی الحال نہیں رک سکتی، البتہ رات کو آؤں گی۔“

میری عادت ہے کہ بہت جلدی بدگمان ہو جاتا ہوں۔

مریم کا بدلا ہوا رویہ دیکھ کر میرے دل میں یہ خیال جڑ پکڑنے لگا کہ وہ صرف اپنے شوہر کی ملازمت کے لیے مجھ سے قربت کا ڈھونگ رہا رہی تھی اور جیسے ہی اسے یہ امید ہوئی کہ اس کا کام ہو جائے گا، اس نے مجھ سے فاصلہ بڑھانا شروع کر دیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اتنی طوطا چشم نکلے گی۔ میں نے سوچ لیا کہ اگر وہ رات کو نہ آئی یا اس نے مجھے نالے کی کوشش کی تو میں بھی اسے منہ نہیں لگاؤں گا۔

میرا اندازہ قلم لکھا۔ وہ وعدے کے مطابق ایک بجے آگئی۔ اسی طرح بنی سنوری تردنا تازہ۔ وہ اپنے معمول کے مطابق میرے پاس بستر پر بیٹھ گئی اور میری نبض دیکھتے ہوئے بولی۔ ”اب تو آپ بالکل نارمل ہیں۔“

”میں پیار ہی رہ گیا ہوا تھا۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”یہ تو ہسپتال والوں نے مجھے زبردستی روک رکھا تھا اپنا تیل بنانے کے لیے۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اگر یہ لوگ ایسا نہ کریں تو ان کا کاروبار کیسے چلے۔“

”آج بھی اگر میں خد نہ کرتا تو یہ لوگ دس دن سے پہلے مجھے ڈسچارج نہ کرتے۔ خیر اب تو میں کل چلا ہی جاؤں گا۔ یہ بتاؤ کہ تم سے ملاقات کس طرح ہوگی؟“

”آپ جانتے ہیں کہ ہمارا تعلق ہسپتال تک ہوتا ہے۔ اس کے بعد کون کس سے ملتا ہے۔“

”یہ بات تمہیں ہے مریم۔ میں یہاں سے جانے کے بعد بھی تم سے ملنا ہوں گا۔“

اس کے چہرے پر ایک رنگ آ کر کڑ گیا۔ وہ آہستہ سے بولی۔ ”کیا یہ بہت ضروری ہے؟“

”ہاں۔“ میں نے فطرتی سانس لیتے ہوئے کہا۔ اس نے اپنے گریبان سے ایک کارڈ نکالا۔ اس پر کسی دانی کا نمبر اور نام لکھا ہوا تھا۔ وہ بولی۔ ”یہ میرے پڑوس کا نمبر ہے۔ آپ مجھے سبہر میں فون کریں۔ اس وقت میرا شوہر گھر پر نہیں ہوتا۔“

میں نے خوش ہو کر وہ کارڈ اپنے پرس میں رکھ لیا۔ وہ اچانک ہی اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی۔ ”آج میری بیٹی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں اس کے پاس جا رہی ہوں، صبح آؤں گی۔“

دوسرے دن وہ ناشائے کر آئی تو اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ اس نے ڈھنگ سے ناشائے نہیں کیا۔ میں نے اداسی کی وجہ پوچھی تو وہ ٹال مٹال گئی لیکن میں دیکھ سکتا تھا کہ اس کی خوب صورت آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ مجھ سے اس کا رونا دیکھا نہیں گیا۔ میں نے واسطے ہاتھ سے اس کے آنسو پونچھے اور بولا۔ ”سچ بتاؤ کیوں رورہی ہو؟ کیا پریشانی ہے؟“

”کچھ نہیں۔ آپ ناشائے کریں۔ یہ تو روز کا رونا ہے۔“ میں نے ہاتھ پچھتے ہوئے کہا۔ ”اگر تم نہیں بتاؤ گی تو میں بھی ناشائے نہیں کروں گا۔“

میرے بے حد اصرار پر اس نے بتایا کہ گھر میں راشن ختم ہو گیا ہے اور اس کے پاس بچی کے دودھ کے لیے بھی پیسے نہیں ہیں اور تنخواہ ملنے میں ابھی ایک ہفتہ باقی ہے۔ اس کی بات سن کر میرا دل اندر سے کٹ کر رہ گیا۔ میں نے فوراً

اپنے پرس میں سے دو ہزار روپے نکالے اور اسے دیتے ہوئے کہا۔ ”فی الحال تم یہ رکھو، بعد میں ضرورت پڑی تو اور دے دوں گا۔“

”نہیں۔“ وہ انکار کرتے ہوئے بولی۔ ”میں بخشش نہیں لیتی۔“

”یہ بخشش نہیں، مدد ہے۔ اگر تمہیں منظور نہیں تو قرض سمجھ کر رکھ لو۔“

”آپ اصرار کر رہے ہیں تو لے لیتی ہوں۔“ وہ نظریں جھکاتے ہوئے بولی۔ ”لیکن یہ مجھ پر قرض ہے، بہت جلد لوٹا دوں گی۔“

اس نے شکر گزار نظروں سے مجھے دیکھا اور بولی۔ ”رب نواز کی نوکری ہو جائے تو میری پریشانی کچھ کم ہو سکتی ہے۔“

”تم فکر مت کرو۔ میں دفتر جاتے ہی پہلا کام یہی کروں گا۔“

ڈاکٹر نے مجھے دس دن آرام کے لیے کہا تھا لیکن مجھ پر رب نواز کی نوکری کی دھن سوار تھی لہذا ڈسچارج ہونے کے دوسرے روز ہی دفتر چلا گیا۔ میں نے ایڈمن کو آفسر کو رب نواز کی درخواست دی اور تا کیڈی کہ یہ کام جلد از جلد ہونا چاہیے۔ اس وقت ہمارے یہاں کوئی جگہ خالی نہیں تھی لیکن انہوں نے تعلقات کا خیال رکھتے ہوئے رب نواز کو عارضی ملازم کے طور پر رکھ لیا اور مجھ سے وعدہ کیا کہ جیسے ہی کوئی جگہ نکلے تو اسے منتقل کر دیا جائے گا۔

میں نے اسی روز شام کو مریم کے دیئے ہوئے نمبر پر فون کیا اور کہا کہ وہ صبح رب نواز کو دفتر پہنچ دے تاکہ وہ ایڈمن کو آفسر سے اپنا لینڈ فون کے ڈیوٹی جوائن کر لے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس کے پاس ڈرائیونگ لائسنس بھی نہیں تھا۔ میں نے اپنے تعلقات سے کام لے کر اس کا لائسنس بنوایا اور اس نے کام شروع کر دیا لیکن چند روز بعد ہی اس کی شکایتیں آنے شروع ہو گئیں۔ وہ عموماً دیر سے کام پر آتا اور وقت سے پہلے چلا جاتا۔ اس کے علاوہ اکثر چھٹی بجی کر لیتا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسے ایک ماہ بعد ہی ملازمت سے فارغ کر دیا گیا۔ مجھے مریم کی پریشانی کا اندازہ تھا اس لیے میں نے اسے فون کر کے اس سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ پہلے تو وہ ٹال مٹول کرتی رہی پھر اس نے مجھے دوسرے دن چار بجے اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔

میں نے دفتر سے تین بجے چھٹی کی۔ بازار سے چل، اپنے پرس میں سے دو ہزار روپے نکالے اور اسے دیتے ہوئے کہا۔ ”فی الحال تم یہ رکھو، بعد میں ضرورت پڑی تو اور دے دوں گا۔“

مٹھائی ہینکٹ اور کھانے پینے کا دوسرا سامان خریدا اور اس کے گھر پہنچ گیا۔ وہ دو کمروں کا چھوٹا سا مکان تھا جس کے در و دیوار سے غربت فیک رہی تھی۔ اس نے گھر کے کپڑے پہن رکھے تھے اور اس لباس میں وہ پہلے سے زیادہ پرکشش لگ رہی تھی۔ اس کے گھر میں فرنیچر نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ صرف دو پرانی کرسیاں اور ایک میز رکھی ہوئی تھی۔ اس نے میرے لیے چائے بنائی اور میرے سامنے بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”آپ نے اتنا تکلف کیوں کیا؟ یہ سامان تو میری ضرورت سے بہت زیادہ ہے۔“

”میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ تمہاری قسمت میں یہ چیزیں لکھی ہوئی تھیں اس لیے تم تک پہنچ گئیں۔“

”پھر بھی مجھے اچھا نہیں لگتا کہ کسی پر بوجھ بنوں۔“ وہ چائے بنانے کے لیے جگہ کی تو میری نظر اس کے کندھے پر پڑی۔ وہاں سے میں پھٹی ہوئی تھی۔ میں نے فوراً اپنی نگاہیں وہاں سے ہٹا لیں۔ جلدی جلدی چائے ختم کی اور بولا۔ ”چائے پی کر میرے ساتھ بازار چلو۔“

”کیوں؟“

”سوال جواب بعد میں کرتا۔ پہلے میں نے جو کہا ہے وہ کرو۔“

اس نے بچی کو پڑوس میں چھوڑا اور میرے ساتھ چل دی۔ میں نے اسے جارعد سوٹ، دو جوتے جو تھے، میک اپ کا سامان اور گھر کے استعمال کے لیے تھوڑی سی کراکری دلوائی۔ ہم سامان سے لدے پھرتے ہوئے اس کا ڈیوٹی پر جانے کا وقت ہو چکا تھا۔ میں نے اس سے اجازت جانی تو وہ بولی۔ ”آج میں آپ کی کوئی خدمت نہ کر سکی لیکن میرے گھر کے دروازے آپ کے لیے ہمیشہ کھلے ہوئے ہیں۔ آپ جب چاہیں مجھ سے ملنے آ سکتے ہیں۔“

”تمہارے شوہر کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا؟“

”وہ کیا کہے گا، بے غیرت۔“

اس کے ان الفاظ سے میرا حوصلہ بڑھ گیا۔ اب میرا راستہ بالکل صاف ہو گیا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ اس کا شوہر دو پہر سے رات گئے گھر سے باہر رہتا ہے۔ اس کا سارا وقت محلے کے اداش لوگوں کے ساتھ کیرم اور ڈبو کھیلنے میں گزرتا۔ اگر کسی جیب میں کچھ پیسے ہوتے تو جوئے کی بازی بھی کھیلتا۔

میرے لیے آئے دن دفتر سے چھٹی کرنا مشکل تھا لہذا میں نے اپنا ٹرانسفر ایک ایسے سکشن میں کر دیا جہاں آؤٹ

گناہ

محترم عذرا رسول
السلام علیکم

سرگزشت کا مطالعہ میرے لیے ٹانگ ہے۔ اس میں لگنے والی ہر تحریر اپنے آپ میں منفرد ہوتی ہے۔ کافی عرصے تک سوچنے کے بعد یہ سچ بیانی لکھی ہے۔ یہ ان کے لیے ہے جو بچوں کی تعداد سے گھبرا کر گناہ کی سمت بڑھ رہے ہیں۔ یہ بھول رہے ہیں کہ ہمیں ان کاموں سے دور رہنا چاہیے جس کی اسلام نے اجازت نہیں دی ہے۔

وردہ خان
(کراچی)

میں اپنی ایک جان پہچان والی خاتون کو لے کر ڈاکٹر کے پاس گئی تھی۔ وہ ڈاکٹر ایک سائیکراٹھ تھی۔ میں جس کو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ ان کے سر پر کچھ دنوں پہلے چوٹ لگی تھی۔ جس سے ان کی یادداشت پر اثر پڑا تھا۔ کسی نیورو کو دکھانے سے پہلے یہ مناسب سمجھا گیا تھا کہ انہیں کسی سائیکراٹھ کے پاس لے جایا جائے۔

میں ڈاکٹر کے دیننگ روم میں ان خاتون کو لے کر بیٹھ

فروری 2018ء

203

ماہنامہ سرگزشت

بار پیسے دیے تو میں نے نہ چاہے ہوئے بھی انہیں قبول کر لیا۔ کیونکہ میں اپنی بچی کو بھوک سے ترپتا ہوا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس وقت مجھے اپنی ماں یاد آئی، وہ بھی ترس گئی اور اس نے مجھے ہمیشہ یہی تربیت دی کہ مریضوں اور خاص کر مردوں کا خیال رکھو گی تو وہ ہمیشہ تمہیں تمہاری بخشش دیں گے اور اگر وہ تمہیں ساتھ چلنے کے لیے کہیں تو انکار نہ کرنا۔ اس طرح وہ تمہاری ساری ضرورتیں پوری کرتے رہیں گے اور تمہیں کبھی تنگی نہیں ہوگی۔

”مجھے یہ بات بالکل پسند نہیں تھی اور نہ ہی اپنے شوہر سے بے وفائی کر سکتی تھی۔ اس لیے میں نے کبھی کسی مریض کو منہ نہیں لگایا اور نہ ہی اس سے کوئی بخشش لی۔ میں آپ کی احسان مند ہوں کہ میرے شوہر کو ملازمت دلائی لیکن وہ بد نصیب اس سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔ پھر جب آپ خبر گیری کرنے سامان سے لدے چندے میرے گھر آئے اور مجھے ساتھ لے جا کر شاپنگ کروائی تو مجھ پر لالچ غالب آ گیا اور میں اپنی ماں کے پڑھانے ہوئے بھتی برکتل کرنے لگی۔ رب نواز نے بھی کبھی نہیں پوچھا کہ گھر میں یہ چیزیں کہاں سے آ رہی ہیں۔ اس کی آنکھوں پر بے غیرتی کی پٹی بندھ گئی ہوئی تھی اور وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بنا ہوا تھا۔ شاید اس کی بھی یہی خواہش تھی کہ میں مردوں کو بے وقوف بنا کر ان کی جیبیں خالی کرتی رہوں۔“

”جب آپ مجھے شاپنگ کرواتے تو مجھے بڑی شرم آتی۔ کئی بار سوچا کہ آپ کو کس طرح مردوں کی بھجوری میری زبان روک لیتی۔ میں اب تک یہی سمجھ رہی تھی کہ آپ میری ہمدردی میں یہ سب کچھ کر رہے ہیں لیکن آج معلوم ہوا کہ آپ بھی دوسرے مردوں سے مختلف نہیں۔ آپ کی نیت میں شروع سے ہی فحش تھا۔ آپ نے میرے التفات کو آوارگی سمجھا اور خراج وصول کرنے آ گئے۔ کاش آپ سمجھ سکتے کہ میں بری عورت نہیں ہوں۔ میں نے بھی بیٹیوں کی خاطر اپنے جسم کا سودا نہیں کیا۔ خدا گواہ ہے کہ شوہر کے علاوہ کسی غیر مرد نے مجھے ہاتھ نہیں لگایا۔ خدا کی قسم۔ میں بری عورت نہیں ہوں صاحب۔ میں بری عورت نہیں ہوں۔“

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور میں کچھ کہے بغیر وہاں سے چلا آیا۔ میں اپنی ہی نظروں میں گر گیا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ نہیں بلکہ میں برا آدمی ہوں۔

ڈورڈیوٹی تھی۔ اب میں ہر تیسرے چوتھے روز دفتر کے کام کا بہانہ کر کے مریم کے پاس پہنچ جاتا۔ وہ کچھ دیر میرے پاس بیٹھ کر کتنی بھی باتیں کرتی، چائے پانی اور پھر اسے ایک دم ہی کوئی کام یاد آ جاتا اور وہ میرے ساتھ شاپنگ کے لیے نکل جاتی۔

اب اس کا حجاب کھل چکا تھا اور وہ غریبائیں کر کے اپنی پسند کی چیزیں خریدتی۔ ہم کبھی کبھی میٹھی شو دیکھنے چلے جاتے، دوران کوئی رومانی منظر آ جاتا تو میں بھی جذبات سے بے قابو ہو کر کوئی گستاخی کر بیٹھتا لیکن اس نے بھی میری کسی حرکت کا برا نہیں منایا۔

میں دل کھول کر اس پر پیسے لٹا رہا تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میرا بجٹ جواب دے گیا اور خواہ میں آدھا مہینا پورا کرنا بھی مشکل ہو گیا۔ میرے پاس آمدنی کا کوئی اور ذریعہ نہیں تھا جس سے قاتلو اخراجات پورے ہوتے۔ چنانچہ میں نے اس کے پاس جانا کم کر دیا۔ اب میں سوچ رہا تھا کہ اس پر جو سرمایہ کاری کی ہے وہ بعد سود وصول کر کے یہ کھانا بند کر دوں۔ ویسے بھی اس کے ساتھ کھونٹے بھرنے میں خطرہ تھا۔ شہر میں میرے کئی جاننے والے تھے۔ اگر کوئی مجھے اس کے ساتھ دیکھ لیتا تو بڑی بدنامی ہوتی۔

ایک دن میں اس سے ملنے گیا تو ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی اور موسم بہت ہی خوشگوار تھا۔ اس وقت وہ نہا کر نکلتی تھی اور گیلے بالوں سے پانی ٹپک کر اس کے جسم کو بھگو رہا تھا۔ اس نے سفید لون کا کرتہ اور گلابی شلوار پہن رکھی تھی۔ اس کا بھگیا بدن دیکھ کر میرے جذبات بے قابو ہو گئے اور جب وہ میرے قریب آئی تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی جانب کھینچ لیا اور وہ میرے سینے سے آن لگی۔ اس نے حیران نظروں سے مجھے دیکھا اور ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چمڑاتے ہوئے بولی۔ ”یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟“

مجھے اس رد عمل کی توقع نہیں تھی۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ وہ بچے ہوئے پھل کی طرح میری آنکھ میں آن کرے گی۔ میں بری طرح گڑ بڑا گیا اور مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ ”میں تو آپ کو شریف انسان سمجھتی تھی لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ آپ بھی دوسرے مردوں کی طرح ایسی کری ہوئی حرکت کر سکتے ہیں۔ میں پہلے دن سے ہی آپ کی پھوٹی موٹی جڑتیں برداشت کر رہی تھی کیونکہ اس میں میری غرض شامل تھی۔ مجھے اپنے شوہر کو ملازمت پر رکھوانا تھا۔ اس لیے آپ کی ناز برداری کرتی رہی۔ پھر جب آپ نے مجھے پہلی

فروری 2018ء

202

ماہنامہ سرگزشت

گئی۔ اگر دیکھ کر کسیوں پر اور بھی مریض بیٹھے تھے۔ ایک بات بتا دوں یہ کوئی پاگل خانہ نہ تھا بلکہ ایک کلینک تھا۔ دینی مریض آتے، مشورے لیتے اور پٹل جاتے۔ اسی لیے یہاں کا ماحول بہت پرسکون تھا۔ کوئی ہنگامہ نہیں کوئی شور نہیں۔ ایک غنودگی کی سی کیفیت ہوا کرتی تھی۔ اعصاب کو پرسکون کرنے کے لیے ہلکی ہلکی موسیقی بھی ہوا کرتی۔

اسی ماحول میں میری ملاقات صبا سے ہوئی۔ ایک دلکش عورت۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر تیس بیسٹیس سے زیادہ نہیں تھی۔ چہرے کے نقوش بہت پیارے تھے۔

قد بھی بہت مناسب تھا۔ اس کے ساتھ ایک مرد بھی آیا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اس کا شوہر تھا۔ پرویز نام تھا اس کا۔ ایک مہذب انسان جو خود بھی چالیس پینتالیس سے زیادہ نہیں ہوگا۔

دونوں کی ڈریٹنگ بہت معقول تھی۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ دونوں کسی اچھے بیک گراؤڈ کے ہیں۔ پرویز دیکھنے میں اس سے کچھ کم عمر رہا تھا جبکہ صبا بھی مسکرا دیتی تھی اور کسی خیال میں کم ہو جاتی۔ نہ جانے کیا پرانہ تھی۔ (یہ کہانی بعد میں مجھ پر واضح ہوئی تھی)

میرا دل چاہ رہا تھا کہ اس عورت سے تعارف حاصل کروں۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ میں ایک کہانی کار ہوں۔ اس قسم کے کردار مجھے اپنی طرف متوجہ لیتے ہیں۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہ یوں ہی نہیں آئی ہوگی۔ اس کے ساتھ کوئی کہانی ضرور ہوگی۔

کچھ دیر بعد صبا نے پرویز سے کہا کہ اسے پیاس لگی ہے۔ اتفاق سے میرے پاس اس وقت منرل واٹر کی بوتل موجود تھی جو میں ہمیشہ اپنے پاس رکھتی ہوں۔ یہ اچھا چانس تھا۔ میں نے فوراً صبا کو پیاس لگ کر دی۔ صبا نے اجازت طلب لگا ہوں سے پرویز کی طرف دیکھا۔ پرویز نے فوراً کہا۔ ”کیوں نہیں۔ جب یہ پانی دے رہی ہوں تو لے لو۔“ صبا نے میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد پانی کی بوتل لے لی۔ میں نے ایتنا نام بتایا۔ ”میرا نام وردہ ہے۔ میں آنٹی کو لے کر آئی ہوں۔“ میں نے ان خاتون کی طرف اشارہ کیا جو میرے ساتھ تھیں۔

”کیا ہوا ہے ان کو؟“ پرویز نے پوچھا۔ ”کچھ دنوں پہلے ان کے سر پر چوٹ لگی تھی۔“ میں نے بتایا۔ ”ان کی یادداشت غائب ہو گئی ہے۔“

”اوه“ پرویز نے ایک گہری سانس لی۔ ”یہ ایک المیہ ہوتا ہے کہ انسان اپنوں کے درمیان ہے بھی اور نہیں بھی ہے۔“ ”اگر برا نہ مانیں تو کیا میں یہ پوچھ سکتی ہوں کہ آپ کیوں آئے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ میری بیگم ہیں۔“ پرویز نے بتایا۔ ”میں ان کو لے کر آیا ہوں۔ ان کا یہ خیال ہے کہ یہ گناہ گار ہیں۔ کیا گناہ کیا ہے یہ نہیں بتاتیں۔ ہر وقت ڈپریشن میں رہتی ہیں۔ رو رہی ہیں۔ ہم نے اپنے طور پر بہ دہم دور کرنے کی بہت کوشش کی ہے لیکن کچھ نہیں ہوا تو مجبور ہو کر یہاں لائے۔“

اس دوران صبا بالکل لائق سی بیٹھی رہی تھی۔ وہ اپنی سوچوں میں گم تھی۔

مجھے اس پر غور ہونے لگا تھا۔ بے جا رہ اپنی بیوی کی طرف سے کتنا پریشان تھا۔ کچھ دیر بعد پرویز کی کام سے اٹھ کر کلینک سے باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں صبا کے پاس آ کر بیٹھ لی۔ میں نے اس سے یوں ہی اصرار دھری کہ باتیں شروع کر دیں۔ ”آج تو کئی بھی بہت زیادہ ہے۔“

صبا نے میری طرف دیکھا اور میرے سے بولی۔ ”ہاں گری تو ہے۔ اسی لیے مجھے پیاس لگ رہی ہے۔“

”میں یہاں ان کو دکھانے آئی ہوں۔“ میں نے آنٹی کی طرف اشارہ کیا۔

”کیا یہ آپ کی کوئی رشتہ دار ہیں؟“ صبا نے پوچھا۔

”نہیں دیسے تو ان سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔“ میں نے بتایا۔

”جان پہچان ہے اور ڈاکٹر صاحب سے میری جان پہچان ہے اسی لیے یہ لوگ مجھے اپنے ساتھ لے آئے ہیں۔“

”نیکس یہ تو اچھی بات ہے۔“ صبا نے کہا۔ ”یہ جو میرے شوہر ہیں نا انہیں یہ وہم ہو گیا ہے کہ میں بہت چپ رہنے لگی ہوں۔ اسی لیے مجھے یہاں لے لائے ہیں۔“

میں نے اس کا نام پوچھا۔ اس نے صبا بتایا پھر میں نے ایتنا نام بتایا۔ اس کے شوہر کا نام وردہ بتایا۔

اس دوران پرویز بھی واپس آ گیا تھا۔ اس نے یہ دیکھ کر کہ میں صبا سے مکمل مل کر باتیں کر رہی ہوں اور صبا بھی مجھ سے باتوں میں لگی ہوئی ہے۔ بہت خوش ہوا۔ اس نے میرے پاس آ کر کہا۔ ”بہن آپ کا بہت بہت شکریہ۔ بہت دنوں کے بعد صبا کو کسی سے باتیں کرتا ہوا دیکھ رہا ہوں ورنہ اس نے تو چپ ہی سا رہ رہی تھی۔ اگر رحمت نہ ہو تو میں آپ سے درخواست کروں گا کہ ہمارے یہاں آ جایا کریں۔“

مجھے تو خود صبا سے دلچسپی ہونے لگی تھی۔ اس کی جو صورت حال تھی اس نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ اس نے بھینا اپنے سینے میں کوئی عہد چھپا رکھا تھا۔

میں آگئی یہ سوچ رہی تھی کہ صبا نے کہا۔ ”ہاں۔ بہن آ جایا کریں۔ میرا دل بہل جانے لگا۔“

اس کے شوہر پرویز نے فوری طور پر اپنے گھر کا نمبر اور ایڈریس لکھ کر دے دیا۔ بہت آسان پتا تھا۔ میں نے ان سے وعدہ کر لیا کہ میں ان کے گھر آؤں گی۔ کچھ دیر بعد ہمارا نمبر آ گیا۔ میں آنٹی کو لے کر ڈاکٹر کے پاس چلی گئی۔

دو دن گزر گئے۔ فون کرنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔ ایک دن میں نے صبا کو فون کر ہی لیا۔ میری آواز سن کر وہ خوش ہو گئی تھی۔ ”ارے میں تو بھی کبھی کہ تم بھول گئی ہو۔“ اس نے بڑی اپنائیت اور بے تکلفی سے کہا۔

میں نے بھی اسی انداز سے جواب دیا تھا۔ ”جب تم سے وعدہ کر لیا تھا تو بھولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔“

”تو مجھ پر آ رہی ہو؟“ اس نے پوچھا۔ ”اگر تم بھولو تو میں ابھی پہنچ جاؤں؟“

”ارے سنو ابھی پوچھ پوچھ آ جاؤ۔“ اس نے کہا۔ وہ بالکل نارمل ہو کر باتیں کر رہی تھی۔ کہیں بھی ایسا احساس نہیں ہو رہا تھا کہ وہ شدید قسم کی ڈپریشن میں مبتلا ہے۔

میں تھوڑی دیر بعد اس کے گھر پہنچ گئی۔ ایک منزلہ کالج نما گھر تھا، خوبصورت سا۔ آگے ایک لکڑی کا دروازہ تھا۔ جس میں بہت سیلے سے پھول لگائے گئے تھے۔ صبا مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی۔ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔

”وردہ“ اس نے کہا۔ ”نہ جانے ایسا کیوں ہوتا ہے کہ کچھ لوگ پہلی ہی نظر میں اچھے لگتے لگتے ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ ان سے دوستی کی جائے۔ تم کو دیکھ کر بھی ایسا ہی محسوس ہوا تھا۔“ اس وقت ہم لان ہی میں کھڑے ہوئے تھے۔ میں پچھلوں کو دیکھ رہی تھی۔ ”بہت خوبصورت پھول ہیں۔“ میں نے تعریف کی۔

”ہاں۔ یہ میرا شوق ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”چلو اندر چلتے ہیں۔“

وہ مجھے گھر کے اندر لے آئی۔ اس وقت ذرا بھی احساس نہیں ہو رہا تھا کہ یہ وہی عورت ہے جو کچھ دنوں پہلے بالکل خاموش بیٹھی تھی۔ ذرا انیک روم بہت سیلے سے سجا ہوا تھا۔ ایک ملازمہ دکھائی دی جس کو اس نے چائے کے لیے کہہ دیا۔ ملازمہ کچن میں چلی گئی۔

اس نے پوچھا۔ ”تمہاری ان آنٹی کا کیا حال ہے جن کو تم لے کر گئی تھیں؟“

”ابھی تو ہیلا سیشن ہوا ہے۔“ میں نے بتایا۔ ”کئی بار جانا ہوگا یہ ایک پرانا کیس ہے۔ اتنی جلدی حل نہیں ہوگا۔“

”دیسے تمہارا مشغلہ کیا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

جب میں نے بتایا کہ میں کہانیاں لکھتی ہوں اور کالم بھی لکھتی ہوں تو وہ بہت کچھ جوشی ہو گئی۔

اس دوران ایک بچہ کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی عمر سات یا چھ برس کی ہوئی۔ بہت پیارا سا تھا لیکن دیکھنے ہی میں اینارل لگ رہا تھا۔ اس نے صبا کے دامن تھام کر کچھ کہنا شروع کیا۔ وہ جوبی کہہ رہا تھا وہ کچھ نہیں آ رہا تھا۔ صبا نے ملازمہ کو آواز دی۔ ملازمہ جانے کی ٹرے لے کر آ رہی تھی۔ اس نے ٹرے سے میز پر رکھ دی۔ صبا نے بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”سفیان کو اندر کمرے میں لے جا دو اور تم بھی اس کے ساتھ ہی رہنا۔“

ملازمہ اس صند کرتے بچے کو اپنے ساتھ لے گئی۔ اس وقت صبا کے تاثرات کچھ عجیب سے تھے۔ میں نے اس بچے کے بارے میں کچھ پوچھا جابجا لیکن اس نے خود ہی بتا دیا۔ ”سفیان میرا بیٹا ہے۔ پہلی اولاد۔“

”اوه“ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”شاید یہ۔“ مجھ سے کچھ اور نہیں کہا گیا۔

”ہاں۔ یہ اینارل ہے۔“ اس نے بتایا۔ اس وقت اس کے چہرے پر بے پناہ دکھ تھا اور یہ ظاہر تھا کہ جس کی پہلی اولاد ایسی ہو۔ اس ماں کا ایسا ہی حال ہونا چاہیے۔ وہ وقت ایسا نہیں تھا کہ میں اس سے اس کے بچے کے بارے میں معلومات حاصل کرتی۔ اسی لیے چائے کی کراؤنڈر گھر کی باتیں کر کے واپس آ گئی لیکن غلش رہی تھی۔ شاید یہی وجہ صبا کے ڈپریشن کی ہو سکتی تھی۔

دو تین دنوں کے بعد صبا کا فون آ گیا۔ وہ مجھے بلا رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”وردہ، کیا تم میرے پاس آ سکتی ہو؟ مجھے تم سے ایک کام ہے۔“

حالانکہ اس دن مجھے ایک ضروری کام سے جانا تھا اس کے باوجود میں اس کے گھر پہنچ گئی۔ وہ کچھ پریشان دکھائی دے رہی تھی۔ مجھے دیکھنے ہی اس نے مجھ سے لپٹ کر رونا شروع کر دیا۔ میں خود ہی اس کی یہ حالت دیکھ کر پریشان ہو گئی تھی۔ ”بتاؤ کیا ہوا؟“ میں نے اسے چپ کرانے کی کوشش کی۔ ”اس طرح کیوں رو رہی ہو؟“

”وردہ، میں اپنے دل کا پوجہ ہلکا کرنا چاہتی ہوں۔“
اس نے کہا۔ ”وردہ پاگل ہو جاؤ گی۔ سرجاؤں کی میں۔ کوئی تو ہو جس کو میں اپنی کہانی سنا سکوں۔“
”ہاں۔ ہاں۔ میں سب سن لوں گی۔“ میں نے کہا۔
”پہلے تم خود کو سنبھال لو۔ اس طرح روئے سے کیا مسئلہ حل ہو جائے گا؟“
”یہ اطمینان تو ہو گا کہ میں نے کسی کے سامنے اپنے گناہ کا اعتراف کیا تھا۔“

مجھے اس وقت اس کے شوہر کی وہ بات یاد آگئی۔ اس نے بتایا تھا کہ صاحبہ خود کو گناہ گار سمجھتی ہے اور کیا گناہ ہے۔ اس کا راز ابھی تک کسی کو نہیں معلوم تھا اور اب وہ میرے سامنے اپنے گناہ کے بارے میں بتانے جا رہی تھی۔
”اچھا چلو متاؤ۔ کیا گناہ کیا ہے تم نے؟“ میں نے پوچھا۔
”وہی ہے جو بتا دوں کہ گناہ چاہے جیسا بھی ہو۔ اگر سچے دل سے تو یہ کر لی جائے تو خدا معاف کر دیتا ہے۔“
”لیکن یہ ایسا گناہ ہے جسے شاید کوئی بھی معاف نہ کرے۔ تو خدا اور نہ ہی میرا کچھ۔“
”تہا راجی؟“ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔
”میں نہیں سمجھتی۔ تم نے اس معصوم کے ساتھ کون سا گناہ کر دیا ہے؟“

”تم اس کی حالت دیکھ رہی ہو؟“
”ظاہر ہے۔ اس کی یہ حالت تو سامنے ہے۔“ میں نے کہا۔
”لیکن یہ تو خدا کی مرضی ہے۔ اس میں تمہارا کیا قصور؟“
وہ خاموش ہو گئی۔ سوچتی رہی، پھر اس نے اپنے سر کو اس طرح جھکا دیا جیسے کوئی فیصلہ کر رہی ہو۔ پھر آہستہ سے بولی۔
”وردہ، سفیان کی یہ حالت میری وجہ سے ہے۔ میں نے ہی اسے اس حال کو پہنچایا ہے۔“

”کیا کہہ رہی ہو تم؟ تم کیسے اس بچے کو ایسا کر سکتی ہو؟“
”ہاں وردہ۔ میں نے ہی کیا ہے۔ اور یہی وہ گناہ ہے جس کا احساس مجھے پریشان رکھتا ہے۔ میں نفسیاتی مرلیض بن گئی ہوں۔ جو کچھ بھی ہوا ہے۔ یہ میں نے ڈاکٹر کو بھی نہیں بتایا لیکن کب تک۔ کب تک اس بوجھ کو اپنے سینے پر رکھوں۔ اسی لیے تمہیں بتا رہی ہوں۔ کاش تم ہی کوئی ایسا طریقہ بتا سکو کہ میں اس عظیم گناہ کے احساس سے چھٹکارا پا سکوں۔“

☆.....☆

پرویز سے شادی کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میں نے شاید کوئی گناہ نہ کر سکا تھا۔

میں نے پرویز کی ظاہری حالت اور بہن دیکھ کر یہ اندازہ لگا یا تھا کہ شاید وہ کوئی دولت مند انسان ہے لیکن ایسا کچھ نہیں تھا۔ پرویز سے میری ملاقات ایک تقریب میں ہوئی تھی۔ وہ کبھی نگاہ میں مجھے اچھا لگا تھا۔ وہ ایک ہنرمند انسان ہے۔ لباس کے معاملے میں بھی اس کا ذوق بہت بلند ہے۔ اس تقریب میں اس نے نیلا سوٹ پہن رکھا تھا جو اس کے سرخ و سفید رنگ پر بہت اچھا لگ رہا تھا۔ مجھے وہ اچھا لگا۔ اس کے بارے میں پتا چلا کہ وہ کسی بڑی فرم میں کسی اچھے عہدے پر ہے۔

اتفاق سے ان دنوں میرے گھر میں میری شادی کے حوالے سے ایک الجھل مچی ہوئی تھی۔ میرے لیے رشتہ تلاش کیا جا رہا تھا۔
اس موقع پر پرویز جیسے آدمی کا دلکھائی دے جانا ایک اچھا شگون تھا۔ پھر یہ ہوا کہ پرویز بھی میری طرف متوجہ ہو گیا۔ ہم بہت دیر تک باتیں کرتے رہے اور تقریب کے خاتمے تک ہمارے درمیان اچھی خاصی انٹرا سٹینڈنگ ہو چکی تھی۔

اس کے بعد ہم ملتے رہے۔ وہ جب بھی ملتا۔ اس کے جسم پر اچھا سا سوٹ ہوتا۔ وہ دیکھنے ہی سے بچے والا معلوم ہوتا تھا اور آج بھی ویسا ہی ہے۔ بہر حال اس نے ہمارے گھر رشتہ بھیج دیا اور پرویز سے میری شادی ہو گئی۔ اس میں کہانی کے بہت سے واقعات سے گریز کرتی جا رہی ہوں۔ جیسے شادی کے بہت دنوں تک ہماری خوشیاں۔ ہماری فانی مہون۔ ہماری خوشیوں بھری زندگی وغیرہ۔
صباحت خاموش ہو گئی۔ اس کے تاثرات سے اندازہ ہو رہا تھا جیسے وہ اپنی کہانی کے تانے بانے بننے میں ذہنی طور پر مصروف ہو۔

کچھ دیر بعد اس نے ایک گہری سانس لی اور دیر سے بولی۔
”بہر حال کچھ دنوں کے بعد یہ شمارا کر گیا۔“
”کیا مطلب؟“ میں نے پوچھا۔

مطلب یہ کہ مجھے پتا چل گیا کہ صرف دکھاوا ہے۔ اس کے پاس اتنے وسائل نہیں ہیں کہ زندگی کو تنگ سے گزار سکے۔ ایک بڑی فرم میں کام تو کرتا ہے لیکن وہاں اس کی پوزیشن ایسی نہیں ہے کہ اس کی بنا پر اسے دولت مند کہا جاسکے۔ میں نے جب اس سے بات کی تو اس نے کہا۔ ”صباحت۔ میں نے تم سے کبھی نہیں کہا ہوا کہ میں کوئی لکھی لکھی انسان ہوں یا میں اس فرم کا جنرل منیجر ہوں۔ رہا میری ظاہری شخصیت۔ تو یہ کسی کو دھوکا دینے کے لیے تو نہیں ہے نا اور اب تم میری بیوی

ہو۔ تمہیں یہ تو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ میرے پاس صرف تین سوٹ ہیں لیکن میں بہت طریقے اور طریقے سے استعمال کرتا ہوں۔ تم نے میری احتیاط دیکھ لی ہو گی۔ تم یقین کرو۔ میں نے تمہیں دھوکا نہیں دیا ہے اور نہ زندگی بھر دے سکتا ہوں۔ ہاں میں اپنے اور تمہارے مستقبل کو بہتر بنانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ دعا کرو سب ٹھیک ہو جائے۔“

اس کے بعد میں نے کچھ نہیں کہا لیکن میرے دل میں ایک غلطی پیدا ہو گئی تھی۔ خواب چمکا چور ہو جائیں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ میرے سارے خواب ٹھکر گئے تھے۔ اسی عالم میں پتا چلا کہ میں پرکینٹنٹ ہو چکی ہوں۔ میرے وجود میں ایک اور وجود پرویز پارہا ہے۔ ان حالات میں مجھے بچہ نہیں چاہیے تھا۔ کیا کرتی ایسے بچے کو جو نداداری کے ماحول میں جنم لے۔ میرے برعکس پرویز بہت خوش تھا۔ بہت خوش۔ اس کی خوشی کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ وہ مجھے بھی خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتا تھا لیکن میرا تو دل ہی بچھا ہوا تھا۔ ایک بار میں نے اس سے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

”پرویز۔ میں یہ چاہتی ہوں کہ اس سلسلے کو کچھ برسوں کے بعد کیا جائے۔“
”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ اگر ہماری اولاد کچھ برسوں کے بعد ہو تو کیا حرج ہے؟“ میں نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

”تمہیں صاحبہ۔ ناشکری مت کرو۔ خدا ہمیں اولاد سے نوازنا چاہتا ہے تو اسے قبول کرلو۔ اسی میں بھلائی ہے۔ ایسے کتنے لوگ ہوں گے جو اولاد کو ترس رہے ہوں گے اور ہمیں تو ایک سال بعد ہی خوش خبری سننے کو مل رہی ہے۔ یہ کوئی عام بات نہیں ہے۔ اس کے علاوہ تم نے یہ تو سنا ہی ہو گا کہ پیدا ہونے والا بچہ اپنی قسمت لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اس کا استقبال کرو۔ خوش رہو۔ خدا نے چاہا تو اس کے آنے کے بعد ہمارے حالات اور بہتر ہو جائیں گے۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہارا شوہر ایک سلجھا ہوا انسان ہے۔“ میں نے کہا۔

”ہاں۔“ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”اس میں تو کوئی شک نہیں ہے۔ بس ایک میں ہی ہوں جس نے خود اپنے پاؤں پر کھڑا ڈی ماری ہے اور اب روٹی رتی ہوں۔“
”تم نے بتایا نہیں کہ تم خود اپنے بچے کی گناہ گار کس طرح ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے پوچھا۔“

حضرت بابا فرید کو مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ مثلاً خواجہ فرید الدین مسعودی، شکر، فرید الدین مسعودی، شکر، خواجہ مسعودی، شکر اور شکر الدین کے معانی ایک ہیں۔ اول الذکر لقب کا مطلب ہے شکر خزانہ اور موخر الذکر کو مختصر کر کے اردو کا جامہ پہنا دیا گیا ہے۔ ان القابات کے علاوہ آپ کو شیخ العالم اور قلب اکبر بھی کہا جاتا ہے۔ آپ 14 اپریل 1179ء کو کھوار (یا کوہوال) میں پیدا ہوئے جو مٹمان کے نزدیک 10 کلومیٹر کے فاصلے پر ایک غیر معروف سا گاؤں یا قصبہ تھا اور 17 اکتوبر 1265ء کو 86 برس کی عمر میں پاک پٹن میں وفات پائی۔ والد کا نام جمال الدین سلیمان تھا اور والدہ محترمہ کا اسم گرامی مریم بی بی تھا (بعض تذکروں میں قروم بی بی بھی لکھا ہوا ہے) جو شیخ وجہ الدین چندی کی صاحبزادی تھیں۔ ابتدائی تعلیم مٹمان میں پائی جو اس زمانے میں اس علاقے میں علم متداول کا مرکز تھا۔ وہیں ان کی ملاقات حضرت قلب الدین مختیار کاٹی سے ہوئی انہوں نے آپ کو کچھ کفر مایا تھا: ”اس بچے کا ستارہ اونچ پر ہے اور مستقبل میں اللہ کریم اس سے دین اسلام کی تبلیغ و توسیع کا کام لے گا۔“

مرسلہ: قرۃ العین۔ اقراء علی بکراچی

خواہش نہیں تھی بلکہ یہ خیریں کر میری جان نکل گئی تھی۔ میں یہ چاہتی تھی کہ بچہ نہ ہو۔ میں اس آنے والے کا استقبال کرنے کو تیار نہیں تھی۔ ہو سکتا ہے کہ تم یہ کہو کہ میں کسی عورت تھی جس کو بچے کی خواہش نہیں تھی کیوں کہ کسی اولاد کا ہونا کسی بھی عورت کی تکمیل ہوا کرتا ہے لیکن کچھ قسمت میری طرح بھی ہوتی ہیں۔ اسی دوران میری ایک جاننے والی میرے پاس آگئی۔ وہ بہت دنوں بعد ملنے آئی تھی۔ اس کی کہانی یہ تھی کہ اس کے دو بچے ضائع ہو چکے تھے۔ جبکہ ان سے پہلے کے چار بچے زندہ تھے۔ ایک لڑکی اور تین لڑکے۔ چونکہ بہت دنوں کے بعد اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ اسی لیے میں نے انہوں کا اظہار کیا۔ ”شاہدہ۔ میں نے سنا ہے کہ تمہاری دوسری اولاد بھی ضائع ہو گئی۔“

”ہاں یار۔ دوسری بھی گئی۔“
”یہ تو بہت دکھ کی بات ہے۔“ میں نے کہا۔
”ارے چھوڑ۔ کس بات کا دکھ۔“ اس نے کہا۔ ”تو چونکہ میری پرانی دوست ہے۔ اسی لیے تجھے یہ راز بتا رہی ہوں



پیشدر کی شادی

مکرمی معراج رسول
السلام علیکم

انسان کی زندگی میں ایسے بے شمار واقعات ہوتے ہیں جن کو کہانی کا اندازہ دیا جاسکتا ہے۔ میں نے بھی اپنے رفیق خاص پر گزرے واقعات کو ایک دلچسپ کہانی کا رخ دے دیا ہے۔

عاطر شاہین
(ملتان)

دروازے پر دستک ہوئی تو کرسی کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھے ایک فائل کا مطالعہ کرتے چوہدری سرور ایڈووکیٹ نے سر اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھا اور بولے۔ ”آ جاؤ۔“
دروازہ کھلا اور چوہدری سرور ایڈووکیٹ کا فشی غلام محمد اندر داخل ہوا۔ اس نے سلام کرنے کے بعد مؤدبانہ لہجے میں کہا۔ ”چوہدری صاحب۔ ایک لڑکا اور لڑکی آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔“

چوہدری سرور ایڈووکیٹ نے چونکتے ہوئے پوچھا۔ ”وہ کون ہیں اور وہ کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں؟“
”انہوں نے مجھے کچھ نہیں بتایا، صرف آپ سے ملنے کی بات کی ہے۔“ فشی غلام محمد نے کہا۔ ”مجھے وہ پریمی جوڑا لگتا

لیا۔ اس نے چند گرم دوا کیں بتا دیں۔ ان میں دسکی ٹوٹے تھے اور اس کے بعد میں نے وہ دوا کیں استعمال کرنی شروع کر دیں۔ میں نے پرویز کو ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی کیوں کہ میں جانتی تھی کہ ایک آفت ہو جائے گی۔ اس نے نہ جانے کیسے برادر گرام بنارکے تھے۔ یہ کرنا ہے۔ وہ کرنا ہے۔ وہ بہت زیادہ excited تھا۔

مجھے خدشہ لگا ہوا تھا کہ کہیں الٹا ایسا نہ ہو جائے کہ مرا مقصد بھی مل نہ ہو اور صحت بھی برباد ہو جائے۔ آخر ہوا بھی یہی۔ مقصد مل نہیں ہوا۔ شیان کو اس وقت اس نے آتا تھا وہ آکر رہا۔ لیکن کس حال میں۔ یہ تہاڑے ساٹنے ہے۔ وہ رونے لگی تھی۔ ”میں گناہ رہوں اس کی گناہ رہوں۔“

”لیکن تم کس طرح گناہ گار ہو؟“ میں نے پوچھا۔
”اس لیے کہ ان گرم دواؤں نے اس کے ذہن کو متاثر کر دیا۔ برباد کر دیا۔ یہ صرف میرا نہیں بلکہ ڈاکٹر بھی کا خیال ہے۔ اس بچے کی معذوری کی غلط چیز کے استعمال کی وجہ سے ہے۔“

”اوہ خدا۔ میں کانپ کر رہ گئی۔ یعنی تمہارا بیٹا تمہاری حرکتوں کی وجہ سے ایسا ہوا ہے؟“

”ہاں، میری وجہ سے۔ میں اس کی مجرم ہوں۔ میں نے ایسا گناہ کیا ہے جس کی جو بھی سزا ہو وہ بہت کم ہے۔ میں نے اپنے بیٹے کو جیتے جی مار دیا ہے۔ ایک اپنی ضد کی وجہ سے۔ میں نے خدا کی بھی نافرمانی کی ہے اور اپنے شوہر کی بھی۔ میں بہت بڑی گناہ گار ہوں۔ بہت ذلیل ہوں۔“ وہ رورہی تھی لیکن اب مجھے اس سے کوئی ہمدردی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ وہ قاتل تھی۔ اس نے اپنے ہی بیٹے کو جیتے جی مار دیا تھا۔ کیا زندگی بھی بے چارے کی۔ عمر بھر کے لیے معذور ہو کر رہ گیا تھا۔ صرف ایک خدشے کی وجہ سے کہ نہ جانے اس کی پرورش ہو سکے گی یا نہیں؟

میں اس کے بعد مباحثات سے بچر نہیں ملی۔ میں نہیں جانتی کہ وہ کس حال میں ہے۔ اس کے فون آتے رہے لیکن میں نے ریسیو نہیں کیا۔

میں یہ کہانی اس لیے لکھ رہی ہوں کہ خدا کے لیے اگر کوئی ایسا دیرپا خیال دل میں آجی رہا ہو تو اس کو جھک دیں۔ پالنے والا کوئی اور ہے۔ ہم تو صرف ایک ذریعہ بنے ہیں اور اگر بہت ضروری ہو تو کسی ڈاکٹر کے مشورے کے بغیر یہ سب ناکریں۔ خدا کے لیے درندہ۔

کہ میں نے جان بوجھ کر دو دنوں کو ضائع کر دیا ہے۔“
”کیوں؟“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔
”تو اور کیا کرتی۔ چار چار پہلے دوائے نہیں سنبھال رہے تھے۔ اب یہ دوا اور آجاتے۔ میری طرف دیکھ۔ میں کیسی سہل ہوا کرتی تھی۔ ان کم بختوں نے پیدا ہو کر میرا سارا حسن لگا کر رکھ دیا۔ ایک تو یہ وجہ تھی۔ دوسری وجہ غربت تھی۔ تجھ کو کیا بتاؤں۔ میرے شوہر کی انہی نہیں ہے کہ وہ اتنے بچوں کی پرورش کر سکیں اسی لیے میں نے اپنے طور پر فیصلہ کیا کہ میں اپارشن کر واؤں گی۔“

”اور تمہارے شوہر؟“ میں نے پوچھا۔
”میں نے ان کو بتانے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ کیوں کہ وہ وہی پرانے نظریات پر قائم ہیں کہ بچہ اپنی قسمت لے کر آتا ہے۔ اس قسم کے خیالات۔ حالانکہ بحث کرتے کرتے ان کی حالت خراب ہو چکی تھی۔ اس کے باوجود ان کا وہی فلسفہ تھا۔“
”تو پھر تو نے کیا کیا؟“ میں اس کی کہانی میں دلچسپی لے رہی تھی کیوں کہ اس نے وہی ذکر چھیڑ دیا تھا جس کے لیے میں پریشان ہو رہی تھی۔

اس نے بتایا کہ اس نے انتہائی گرم دوا میں استعمال کیں۔ اس نے اپنے شوہر کو بے خبر رکھا تھا۔ ورنہ وہ ایک آفت کھڑی کر دیتا اور ان دواؤں کا اثر یہ ہوا کہ اس کا بچہ ضائع ہو گیا۔ اس نے بتایا کہ اس کا شوہر بہت اداس تھا۔ جبکہ وہ خود مطمئن تھی۔ کیوں کہ جو کچھ ہوا اس کی مرضی سے ہوا تھا۔ اس کے بعد اس نے دوسرے کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا۔ اس بار شوہر اسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ اب اولاد کا رسک نہ لیا جائے۔ ورنہ اس کی جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔ اس طرح اس کی جان چھوٹ گئی۔ اب وہی چار بچے ہیں۔ جن کی پرورش ہو رہی ہے۔

”یاد رہے کہ تو نے کیا دوا کیں استعمال کی تھیں؟“ میں نے پوچھا۔

”کیوں۔ تجھے کیا ضرورت پڑ گئی؟“
”یہ اصل بات یہ ہے کہ میں بھی چھٹکارا چاہتی ہوں۔“

میں نے کہا۔
”کیا پاگل ہو گئی ہے؟ یہ تو پہلی اولاد ہو گی۔ اس کو دنیا میں آنے دے۔ اس کے بعد تو کچھ لیں۔“
”نہیں یار۔ مجھے ابھی نہیں چاہیے۔“ میں نے کہا۔
وہ تو نہیں مان رہی تھی لیکن میں نے اسے قائل کر لی

ہے، کورٹ میرج کرنا چاہتے ہوں گے۔“

چوہدری سرور نے فائل بند کر کے سائڈ پر پڑی نوکری میں رکھتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے، انہیں اندر بھیج دو۔“

مشی غلام محمد چلا گیا اور پانچ منٹ کے بعد وہ واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک لڑکی اور ایک لڑکا تھے۔ لڑکے کی عمر پانچ سے تیس سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ دروازہ پر قہر دہلا پٹلا سا تھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی ہلکی موشمیں تھیں اور اس نے آسانی رنگ کی شلواریں پہنی ہوئی تھی۔ اس کے گلے میں ایک بڑا سا سفید رنگ کا رومال تھا جس سے شاید وہ اپنا چہرہ ڈھانپ کر وہاں آیا تھا۔ لڑکی عمر تھیں۔ اس کی عمر اٹھارہ سال کے لگ بھگ ہوئی۔ اس نے کالے رنگ کی بڑی ہی ایک چادر سے خود کو سر سے پاؤں تک ڈھانپا ہوا تھا۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوئی تھی تو اس نے اپنے چہرے پر نقاب کیا ہوا تھا مگر اب اس نے نقاب اتار دیا تھا۔ لڑکی کی رنگت سائو تھی۔ وہ حجاب نظر دکھائی دیتی تھی۔ دونوں ہی وضع قطع سے دیہاتی دکھائی دے رہے تھے۔ مشی غلام محمد ان دونوں کو وہاں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

”بیٹھو۔“ چوہدری سرور نے ان دونوں سے مخاطب ہو کر کہا تو وہ دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ پھر چوہدری سرور ان سے گویا ہوا۔ ”تم دونوں کون ہوا اور مجھ سے کس سلسلے میں ملنے آئے ہو؟“

”چوہدری صاحب۔ میرا نام جمال ہے اور یہ رضیہ ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور شادی کرنا چاہتے ہیں۔ ہم آپ کے پاس اسی لیے حاضر ہوئے ہیں کہ آپ ہماری کورٹ میرج کرادیں۔“ لڑکے نے جواب دیتے ہوئے کہا تو چوہدری سرور نے لڑکی کی طرف دیکھا۔

”کیا یہ ٹھیک کہہ رہا ہے؟“
”جی۔“ رضیہ نے مختصراً کہا۔

”تم دونوں کہاں کے رہنے والے ہو۔“
 ”جی، ہم بہاولپور کے قریب ایک گاؤں کے رہنے والے
 ہیں۔“ جمال نے کہا۔

”تم دونوں ایک دوسرے کے کیا کہتے ہو؟“
 ”ہم دونوں ایک دوسرے کے کچھ نہیں کہتے۔“ جمال
 بولا۔ ”بس ہم ایک ہی گاؤں میں رہتے ہیں اور ایک دوسرے
 کو پسند کرتے ہیں۔“

”اگر تم ایک دوسرے کو پسند کرتے ہو تو تم نے رضیہ کو گھر سے بھگانے کی بجائے اپنا رشتہ رضیہ کے گھر کیوں نہیں بھیجا؟“

چوہدری سرور نے کھوجی نظروں سے جمال کے چہرے پر
تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

”میں نے رضیہ کے کھر رشتہ بھیجنا تھا۔“ جمال نے جواب دیا۔ ”لیکن رضیہ کے کھر والوں نے انکار کر دیا۔“

”رضیہ، تمہارے کمر والوں نے کیوں انکار کیا تھا؟“
چوہدری سرور رضیہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

”درا اصل میرا بھائی اس رشتے پر راضی نہیں تھا۔“ رضیہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”وہ میرے ماموں کی بیٹی

شہناز کو پسند کرتا ہے اور اس کی شادی کرنا چاہتا ہے مگر میرے
 اسول نے ابوبکر نے ایک شرط رکھ دی کہ روئے میں میری شادی
 اس سے کر دی جائے تو وہ شہناز کی شادی اس سے کرنے کے
 لیے تیار ہے۔ میرا بھائی راضی ہو گیا لیکن میں راضی نہیں
 ہوئی۔ ابوبکر کی عمر چالیس سال ہے اور اس سے پہلے بھی نہیں
 کرتی۔ میرے بھائی اگر کم سے کم کہیں کہیں کہیں۔ جب مجھے پتا
 چلا تو میں نے انکار کر دیا۔ جس پر اگر کم سے کم مجھ پر بے شامہ شادی
 کیا۔ خود کو مار دے۔ بچانے کے لیے میں نے ہاں کر دی اور پھر
 موقع ملے ہی میں جمال کے ساتھ گھر سے جہاں کر لیا۔ آ
 گئی۔“

”ہونہہ۔“ چوہدری سرور نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میں تم دونوں کی کورٹ میں رنج کرا دیتا ہوں لیکن یہ سوچ لو کہ تمہارا یہ اقدام تم دونوں کو مشکل میں بھی ڈال سکتا ہے۔“

”ہم ہر مشکل کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہیں۔“ جمال نے نزع عزم میں کہا۔ ”ہم نے ایک ساتھ جینے اور مرنے کی تسخیر کھائی ہیں تو مرے دم تک نبھائیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔“ چوہدری سرور نے اثنائی انداز میں سر

ہلایا۔ ”میں نکاح کا بندوبست کرتا ہوں..... اور ہاں، میری فیس دس ہزار روپے میں اس سے کم نہیں لیتا۔“

جمال اور رضیہ نے پہلے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر
 یہوں نے ہامی بھری۔ چوہدری سرور انہیں انتظار کرنے کا کہتا
 والا تھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆.....☆

جمال اور رضیہ نے چوہدری سرور ایڈووکیٹ کی وساطت سے کورٹ میں رجسٹریشن کی گئی اور لاہور چلے گئے تھے۔ رضیہ کے بھائی اکرم نے بہن کو ورغلائے اور چھٹانے کے الزام میں چھٹانے میں بچہ کرادیا تھا اور پولیس کے ساتھ ساتھ خود بھی قاتل جمال اور رضیہ کو تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ اسے جمال اور رضیہ کی

خفیہ محبت کا پتا نہیں تھا۔ پولیس نے جمال کے والد اور بیٹے
بھائی کو خراشا میں لے کر ان سے پوچھ کچھ شروع کر دی تھی
اور ہر اس جگہ چھاپہ مارا تھا جن کی جمال کے والد اور بھائی نے
شناخت دی تھی لیکن پولیس کو ناکامی کے سوا کچھ نہیں ملا تھا۔
اکرم تو غصے سے پاگل ہوا جا رہا تھا۔ سارے گاؤں میں اس کی
الگ بدنامی ہوئی تھی۔ جس جس کو پتا چلا تھا کہ اس کی بہن
رضیہ جمال کے ساتھ بھاگ گئی ہے تو اس نے اکرم کو طعنے
مارے تھے۔ یہاں تک کہ اس کے ماموں نے بھی اسے رشتہ
وہ سے انکار کر دیا تھا جس کی وجہ سے اکرم نے انتہائی
خطرناک فیصلہ کر لیا تھا اور جب اس نے اپنے فیصلے سے گھر
والوں کو آگاہ کیا تو سب لرز رہ گئے۔

”دیکھیا کریم۔ تم ایسا نہیں کر سکتے۔ وہ تمہاری بہن ہے۔“
 اکرم کو اس کے باپ نے خطرناک فیصلے سے باز رکھنے کی
 کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”ابا۔ میں اپنے فیصلے پر مل کر دل کا سناٹا ہے یہ بتا چل جائے کہ وہ دونوں کہاں چھپے ہوئے ہیں پھر دیکھنا میں ان دونوں کے ساتھ کرتا کیا ہوں۔“ اکرم غضبناک انداز میں بولا۔

”رضیہ میری ایک ہی بیٹی ہے۔“

چھوڑا۔ ”اکرم بولا۔ ”سارے گاؤں والے مجھ پر تھو تھو کر رہے

”یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔“ اس کے باپ نے کہا۔ ”جب وہ بشر سے شادی کے لیے راضی نہیں ہوتی تو نے

کیوں ضد کی۔ شیر اور رخصیہ کی عمر میں زمین آسمان کا فرق ہے اور اسے بھی پورا حق ہے کہ وہ اس رشتے سے انکار کر دے۔“

”کتنا فرق ہے ابنا۔ یہی کوئی بیس بائیس سال۔“
 ”تو تمہاری نظر میں یہ تھوڑا فرق ہے؟“ اکرم کی ماں

”اماں، تم تو جیہ ہی رہو۔ سب تمہاری ڈھیل کا نتیجہ کے لہجے میں طنز تھا۔

ہے۔ اگر تو اس کے کان نہ بھرتی تو وہ کبھی گھر سے نہ بھاگتی۔“

سے نکل گیا۔ وہ سیدھا تھا نے پہنچا۔
 ”تھانیدار صاحب۔ ان دونوں کا کچھ پتا چلا؟“

تھانیدار نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ہاں، صرف اتنا پتا چلا ہے کہ دو روز قبل انہوں نے کچھری جا کر کورٹ میرج کر لی

نہیں۔ اس کے بعد وہ کہاں گئے ہیں یا کہاں چھپے ہوئے ہیں

نئی تحقیق میں خواتین کے لیے انتہائی پریشان کن
 بات سامنے آئی ہے کہ کیمیکلس کا استعمال کینسر سمیت
 دیگر جلدی امراض کی وجہ بھی بن سکتا ہے۔ تاجروہ ویسٹرن
 یونیورسٹی اسکول آف میڈیسن کی تحقیق کے مطابق
 2015 سے 2016 تک میک اپ کے سامان پر
 شکایات کی تعداد دوگنی ہوگئی ہے جس میں بالوں کے
 استعمال کی اشیاء کی شکایات سب سے زیادہ نوٹ کی گئی
 ہیں۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ اس نقصان دہ سامان کا استعمال
 کسی خطرے سے خالی نہیں

کچھ پتا نہیں چل رہا مگر ہم جلد ہی انہیں تلاش کر کے عدالت میں پیش کر دیں گے اور عدالت جو فیصلہ کرے گی، اسی ہم پر عمل درآمد کریں گے۔"

اکرم تھاکے سے مل کر اپنے گھر کی طرف بڑھ گیا۔
 غنائدار نے جب اسے یہ بتایا تھا کہ جمال اور رضیہ نے
 کلوٹ میرج کر لی ہے تو غصے سے اس کا برا حال ہو گیا
 غنا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر ا ہوا تھا۔ وہ خود کو بے بس
 محسوس کر رہا تھا۔ وہ جینز تیز قدموں سے چلتا ہوا گھر کی
 طرف بڑھا چلا جا رہا تھا کہ درختوں کے جھنڈ کے قریب
 سے گزرتے ہوئے اس کے کانوں میں ہلکی سی آواز پڑی تو
 وہ رک گیا۔ درختوں کے جھنڈ میں کوئی موجود تھا جو ہلکی آواز
 میں باتیں کر رہا تھا۔ اکرم کا تجسس بڑھ گیا اور وہ قدموں
 سے چلتا ہوا درختوں کے جھنڈ کی طرف بڑھ گیا۔ قریب پہنچ
 کر وہ جھانپڑیوں میں دبک کر سامنے دیکھنے لگا تو وہاں ایک
 کاکا موجود تھا جو نیل فون پر دھیمی آواز میں باتیں کر رہا تھا۔
 اکرم اس لڑکے کو بخوبی جانتا تھا۔ وہ جمال کا دوست اقبال
 غنا۔ اکرم اس کی باتیں سننے لگا۔

”میں تمہیں ایک ایک پل کی رپورٹ دیتا رہوں گا۔ تم پریشان نہ ہو۔“ پھر اس نے دوسری طرف سے کوئی بات سنی اور جواب میں بولا۔ ”خدا حافظ۔“

اکرم کا چہرہ غصے کی شدت سے میڑچکا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اقبال، جمال سے بات کر رہا ہے۔ اقبال سیل فون جیب میں رکھ کر اٹھ اُٹھا تھا کہ اس نے سر پر کھڑے اکرم کو دیکھ کر اس کی گت فٹ ہو گئی اور اس کی آنکھوں میں خوف ابھر آیا۔

”جمال کہاں چھپا ہے؟“ اکرم نے اسے گردن سے بوہیٹے ہوئے کہا تو اقبال کی آواز اس کے حلق میں پھنس گئی

وہ وہ خرخرانے لگا۔ ”بتاؤ رشتہ کلا دیا دوں گا۔“

تبت

ونٹر کیئر دینج

سرد اور خشک موسم میں

اپنی جلد کو دیجئے

بھرپور تحفظ



تہت کولڈ کریم

تہت ہنی لوشن

تہت کلیننگ بلک

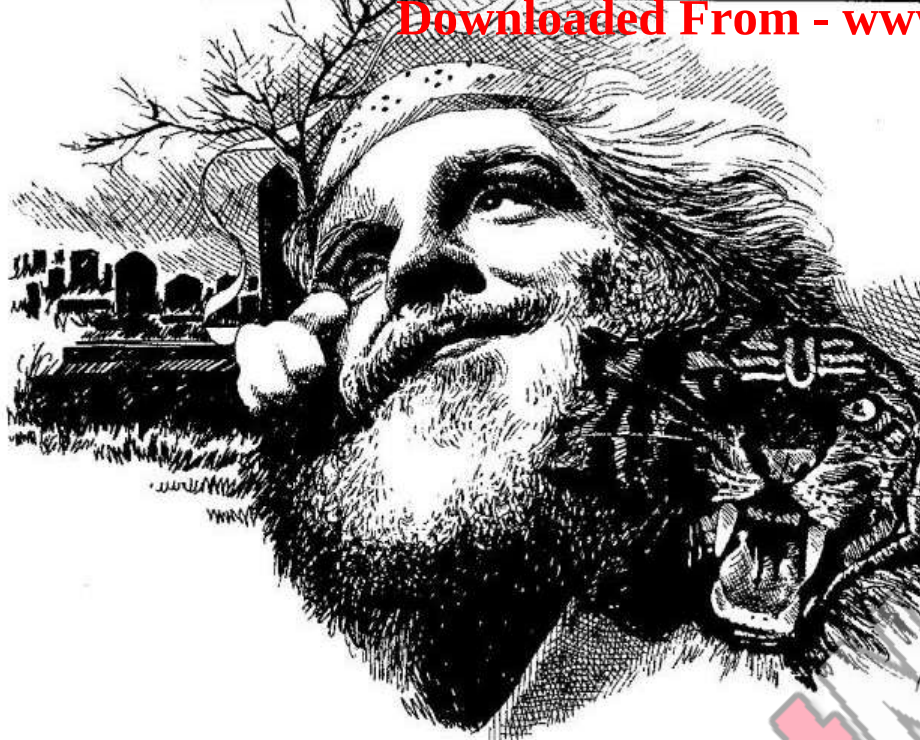
تبت ونٹر کیئر دینج - جلد کے لئے سب کچھ

”مم۔ مم۔ مجھے نہیں پتا۔ اقبال خوف سے ہلکایا۔
”جھوٹ مت بولو۔ ابھی میں نے تمہاری بات اپنے
کانوں سے سنی ہے۔ بتاتے ہو یا میں تمہارا گلا دبا کر تمہیں
موت کے منہ میں پہنچا دوں۔“ اکرم نے اس کی گردن پر دباؤ
بڑھاتے ہوئے کہا۔ اقبال کی کھٹکھی بندھ گئی اور حلق سے نکلنے
والی غرغرائش اور تیز ہو گئیں۔ ”بتاؤ، جمال کہاں چھپا ہے؟“
”تم سے آخری بار پوچھ رہا ہوں۔“
”دم کھٹنے سے اقبال کی حالت خراب ہونے لگی تھی۔ ایسے
لگتا تھا کہ اگر اکرم نے اس کی گردن نہ چھوڑی تو وہ دم کھٹنے
سے ہلاک ہو جائے گا۔“

”بتاؤ۔ کہاں چھپا ہے جمال؟“
”بب۔ بب۔ بتاتا ہوں۔ مم۔ مم۔ میرا دم گھٹ.....“
اقبال نے رک رک کر بولتے ہوئے کہا تو اکرم نے اس کی
گردن پر دباؤ کم کر دیا تو اقبال اسے بتانے لگا۔ ”وہ ملتان میں
ہیں۔“
”ملتان میں۔“ اکرم خشکا۔ ”ملتان میں کہاں موجود
ہیں؟“

”یہ اس نے نہیں بتایا۔“ اقبال بولا۔ ”اس نے صرف
یہی بتایا ہے کہ وہ کورٹ میرج کرنے کے بعد لاہور چلے گئے
تھے لیکن انہیں معلوم ہوا کہ تم نے اس پر رضیہ کو اغوا کرنے کا
مقدمہ کروا دیا ہے اسی لیے منانیت کرانے وہ ملتان آ گئے
ہیں۔“
اکرم نے اس سے مزید چند سوالات کیے پھر وہ اسے
دمکی دے کر کہہ کر اس نے جمال کو یہ بتایا کہ اکرم کون کی
ملتان موجودگی کا علم ہو چکا ہے تو اسے شیاہ بھگتتا بڑے گا پھر
اسے وہیں چھوڑ کر جھاڑیوں سے نکل کر اپنے گھر کی طرف بڑھ
گیا۔ اس کی آنکھوں میں خون کی سرخی مزید گہری ہو گئی تھی۔

☆.....☆
رضیہ کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی جبکہ جمال کمرے میں ٹہلنے میں
مصروف تھا۔ ان دونوں کے چہروں پر تشویش کے تاثرات
ابھرے ہوئے تھے۔ نکاح کرنے کے بعد جمال اور رضیہ
لاہور چلے گئے تھے۔ لاہور میں جمال کا ایک دوست رہتا تھا
اس نے وہیں قیام کیا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ لاہور
میں کرائے کا مکان لے کر رہائش رکھے گا اور وہیں کسی فیکٹری
میں ملازمت کرے گا مگر اسے موقع ہی نہ ملا تھا۔ اس کے
دوست اقبال نے ہی اسے فون کر کے بتا دیا تھا کہ رضیہ کے
بھائی اکرم نے اس پر رضیہ کو بھلا پھلا کر اغوا کرنے کا مقدمہ



روای

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم

ایک سچ بیانی ارسال کر رہا ہوں۔ یہ سچ بیانی میرے دوست واجد کی ہے۔ وہ اب بھی اس رات کو یاد کرتا ہے تو سہم اٹھتا ہے۔ جذبات کی ایک ہلکی سی لہر نے اسے خطروں کے گرداب میں دھکیل دیا تھا۔ گو کہ یہ سچ بیانی عقل کی کسوٹی پر پرکھی نہیں جاسکے گی پھر بھی میں چاہتا ہوں کہ یہ سرگزشت کے صفحات پر جگہ بنائے۔ امید ہے قارئین اس سچ بیانی کو پسند کریں گے۔

سید سخاوت
(امریکا)

1972ء کا دسمبر آزاد کشمیر میں داخل ہوا اپنے ساتھ دہ سرد برف باری بھی لے آیا تھا۔ عموماً وہاں برف باری مئی کے آخر یا جنوری کے شروع میں ہوتی ہے لیکن اب کی بار شروع میں ہی اوپر پہاڑوں پر برف باری دے رہی تھی۔ اس موسم کے آنے ہی پورے علاقے میں جیسے زندگی کی رفتار سست پڑ گئی کیونکہ سردی کو وادی نے متحید کر لیا تھا۔

تاثرات ابھر آئے۔
”وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔“ رضیہ بولی۔
”پریشان ہو کر خود کو بلکان مت کر رضیہ۔“ اس بار جمال کے لیے میں غصہ تھا۔ ”اگر تمہیں ڈر تھا تو تم نے مجھے گھر سے بھاگ کر شادی کرنے پر کیوں اکسا ہوا تھا۔“
”ایسا تو نہ کہو۔“ رضیہ تڑپ اٹھی۔ وہ جمال کی ناراضگی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

”تم مجھے حوصلہ دینے کی بجائے بار بار مایوسی کی باتیں کر رہی ہو۔ صرف تمہاری زندگی خطرے میں نہیں، میں بھی اپنا سب کچھ داؤ پر لگا چکا ہوں۔“ جمال نے کہا۔ ”میں تمہیں یہی سمجھا رہا ہوں کہ اگر تم ہمارا کچھ نہیں لگا سکتا۔ ہم نے قانونی اور شرعی راستہ اختیار کیا ہے کوئی گناہ نہیں کیا۔“
اتنا کہہ کر جمال نے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ رضیہ اٹھ کر اس کے سامنے فرش پر بیٹھی اور اس کے چہرے کا رخ اپنی طرف موڑتی ہوئی بولی۔ ”اب ناراض تو نہ ہو۔ اچھا اب ایسا نہیں کہوں گی۔“

جمال چند لمحوں کے لیے تڑپا نظر سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔
”رضیہ! میں تم سے محبت کرتا ہوں اور تم میری بیوی ہو اس لیے تمہاری حفاظت میں اپنی جان سے بھی زیادہ کروں گا۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“
رضیہ نے انہماک میں سر ہلا دیا۔

☆.....☆

اگلے روز جمال اور رضیہ عدالت کا وقت شروع ہونے سے ایک گھنٹا پہلے ہی پکھری پہنچ گئے تھے۔ رضیہ نے خود کو کالے رنگ کی چادر میں چھپایا ہوا تھا جبکہ جمال نے اپنے سر پر رومال لیا ہوا تھا جس سے اس کا پہچانا جانا مشکل تھا۔ چوہدری سردار ایڈووکیٹ تو ابھی تک اپنے چیمبر میں نہیں آئے تھے لیکن ان کا کافی آٹھ بجے ہی آ گیا تھا اور اس نے ان دونوں کو چوہدری سردار ایڈووکیٹ کے کمرے میں بٹھا دیا تھا۔ تقریباً ساڑھے آٹھ بجے تک چوہدری سردار ایڈووکیٹ اپنے آفس میں پہنچ گئے۔ انہوں نے ضروری کاغذات پہلے ہی تیار کر لیے تھے اس لیے جیسے ہی عدالت کا وقت شروع ہوا تو چوہدری سردار فائل لیے اٹھائے گئے۔ ان کی واپسی آدھے گھنٹے بعد ہوئی۔ انہوں نے جمال اور رضیہ کو بتایا کہ انہوں نے ان کی طرف سے درخواست ضمانت دائر کر دی ہے۔ پھر وہ انہیں لیے عدالت میں پہنچ گئے۔ رضیہ نے عدالت میں اپنے شوہر

جب اکرم اور رضیہ کی لاشیں ان کے گھروں میں پہنچیں تو دونوں گھروں میں کھرام بچ گیا تھا۔ ہر آٹھ اٹھارہ سب بیوی کہہ رہے تھے کہ اگر جمال اور رضیہ نے محبت کی شادی کر لی لی گئی تو انہیں مارنے کا کیا فائدہ تھا لیکن یہ بات ان لوگوں کو کون سمجھاتا کہ جب جمہوریت انا اور جمہوریت مان آئے آ جاتا ہے تو انسان اندھا ہوا جاتا ہے۔ اسے کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ اس پر خون سوار ہو جاتا ہے اور وہ پھر انتہائی اقدام اٹھانے سے گریز نہیں کرتا۔ یہی کچھ اکرم نے کیا تھا۔ جمہوریت آن اور جمہوریت انا کے سامنے وہ بھی ہتھیار چھینکنے پر مجبور ہو گیا تھا اور اس نے انتہائی اقدام اٹھایا تھا۔

دوسرا اپنا آدھا سفر طے کر کے رینگتا ہوا اپنے انجام کی جانب بڑھ رہا تھا۔

ان ہی دنوں کا ذکر ہے ایک دیکھن مسافروں سے بھری مظفر آباد سے راولا کوٹ کی جانب جا رہی تھی۔ تمام مسافر خاموش بیٹھے موسم کے خطرناک تیز دیکھ رہے تھے۔ کوہالہ تک سڑک ٹھیک تھی اور اس سے آگے یہ انتہائی ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی۔ اسی وجہ سے بچکوں کے ساتھ اس کی رفتار انتہائی کم تھی۔ بارش، دھند اور شدید سردی نے سب کو ادھوا کیا ہوا تھا۔

واجد علی، ڈرائیور کے پیچھے اپنی سیٹ پر سرنگائے کھڑکی کے پار بادلوں، دھند، پہاڑوں اور دریاے نیلم کو دیکھتا ہوا اپنے خاندان اور گھر کو یاد کر رہا تھا۔ وہ اس بار پورے چھ ماہ بعد گھر جا رہا تھا، جہاں اس کی ماں، بھائی، بیوی اور چھ سالہ بیٹی اس کا شدت سے انتظار کر رہی تھی۔ یہ تو اس سے اپنی بیوی کو کھلا لکھتا تھا اور وہ اسے باقاعدگی سے جواب دیتی تھی۔ وہ اس کے خط کو بڑی محبت سے بار بار پڑھتا اور پھر سوچوں میں ڈوب کر مسکراتا، اس نے اپنے آنے کی خبر خط میں لکھ کر بھیج دی تھی مگر اس کا یہ خدشہ بجا تھا کہ اسے خراب موسم میں خط اس کے گاؤں تک بروقت نہیں پہنچ سکے گا۔ یہ ہمیشہ سے یہاں ہوتا آیا تھا کہ ادھر موسم خراب ہوا اور ادھر پوری وادی کا کاروبار ٹھپ ہو گیا۔

وہ درمیانے قدر کا مضبوط اور کڑیل جوان تھا۔ وہ فوج میں سپاہی بھرتی ہوا اور ترقی پاتے پاتے لاکس ٹائیک کے عہدے پر آگیا تھا۔ ان دنوں اس کی پوسٹنگ مظفر آباد آری کیپ میں تھی۔ وہ سال میں دو یا تین بار اپنے گھر چھٹی لے کر جاتا تھا لیکن اس بار گزرے چھ ماہ کا عرصہ اسے بہت طویل لگ رہا تھا۔

انسان جتنے بھی لمبے سفر پر ہوا اور اس بھی ہو یا اسے فرصت ہو تو اس کا دل اڑ کر اپنے گھر کی جانب چلا جاتا ہے اور دل خود بخود انتہائی خوشیوں سے گھر جاتا ہے۔ اس کو بھی جب چھٹی ملتی یا وقت ملتا وہ چاہتا کہ آج کے آج اپنے گھر پہنچ کر وہ راحت و اطمینان حاصل کر لے جو اسے نہیں اور نہیں مل سکتا۔ وہ راولا کوٹ سے کچھ فاصلے پر واقع ایک گاؤں بنجوسہ کا رہنے والا تھا، وہیں پیدا ہوا، پلا بڑھا ابتدائی تعلیم حاصل کی اور پھر راولا کوٹ چلا آیا۔ اسکول کے بعد کالج گیا۔ علاقے کے اور نوجوانوں کی طرح اسے بھی آری میں بھرتی ہونے کا شوق تھا۔ سو وہ بھی آری میں چلا گیا۔ وہاں

کے سخت ترین ایام گزار کر جب وہ چشیاں گزرنے لگیں تو فوجی زندگی کی سختیاں ہوا ہوا جاتیں۔ اس بار بھی وہ خود کو ابھی سے تروتازہ محسوس کر رہا تھا۔

راستے میں بارش تھی، دھند تھی، دیکھن آہستہ آہستہ خطرناک موڑ کاٹنے چلی جا رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جس رفتار سے دیکھن چل رہی ہے یہ عشاء کی نماز تک راولا کوٹ پہنچے گی۔ بنجوسہ گاؤں اور پہاڑ کے وادیں میں تھا۔ وہاں تک کوئی سواری نہیں چلی، دن میں دیکھن درمیان میں واقع بنجوسہ جمیل تک جاتی تھیں جہاں ایک خوب صورت ریسٹ ہاؤس بلند پہاڑوں اور اونچے درختوں کے بیچ واقع تھا۔ جمیل سے گاؤں ایک گھنٹے کی پیدل مسافت پر تھا۔ موسم کی خرابی اور رات کے اندھے پن کی وجہ سے اب صرف چپ ہی اسے جمیل تک لے جا سکتی تھی اور آگے کا جنگل اسے پیدل عبور کرنا تھا۔ گویا بیوی بیٹی سے آج ملنے کا خواب پورا ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔

دیکھن کے مینے میں پہاڑ سے وہ بچے گاؤں میں آجاتے تھے مگر اس بار وادہ کو چھٹی دیر سے لی تھی۔ بھائی نے خط سے بتا دیا تھا کہ وہ انتظار میں ہے تاکہ وہ دنوں مل کر سامان بچے گاؤں والے گھر میں شفٹ کر سکیں۔ برف باری وقت سے پہلے شروع ہوئی اور گھر والے ایک طرح سے اوپر پھنسے ہوئے تھے۔ وہاں کے تمام گھر خالی ہو چکے تھے۔ پہاڑ کے اوپر کی چراگاہیں برف باری سے ڈھک چکی تھیں۔ موسم کی کڑھٹی بڑھتی جا رہی تھی اور ان کا پہاڑ پر رہنا اب بہت مشکل ہو گیا تھا۔

گاؤں کا گھر ان دنوں خالی پڑا تھا مگر ضرورت کا سارا سامان اس میں ہر وقت موجود رہتا تھا۔ جلانے کی ککڑی، رضائیاں، تنیکے، چار پائیاں، آٹا اور برتن کے علاوہ دوسرا ضروری سامان اور پانی اس میں موجود تھا۔ گھر کے تمام افراد کے پاس تالے کی جالی ہوتی جو گھر پر لگتا تھا۔

واجد کو اپنے گھر سے بہت پیار تھا جو گاؤں سے ذرا دور تھا جنگل کنارے بنا تھا جس میں اس کا بچپن گزرا تھا۔ گھر کا خیال آتے ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی، وہ جہاں بھی رہتا ہر بات اپنے گھر کو تصور میں ضرور لاتا۔ کیونکہ گھر یاد آتے ہی اس کے ذہن میں جملہ گونج اٹھتا کہ ہمارے گھر میں کتنا سکون ہے۔ کتنا اطمینان ہے۔ وہ چھوٹا تھا تو ساتھ کے جنگل میں مٹھنسی کرتا۔ بچپن کا غلیل سے شکار کرتا، چیز اور سفیدے کے درختوں

پر چڑھتا۔ درختوں کی چوٹیوں پر پہنچ کر وہ ارد گرد دیکھتا تو دور دور تک کے پھیلے درختوں کی چوٹیوں کے وہ دور دور ہوتا۔ بچپن کے گھونسلوں میں اڑنے گھٹنا کس طرح اکیلے جنگل میں گھومنے پر ہمیشہ اسے والد مرحوم کی ڈانٹ پڑتی تھی اور جب اس کی ماں اسے اپنی گود میں بھر لیتی۔

اس کا گھر تین سمتوں سے گھیرے اور بلند درختوں میں گھرا تھا۔ سفیدے اور چڑے کے درخت اس کے گھر کے سامناں تھے۔ سردیوں کی برف باری میں وہ سفید لباس اوڑھ لیتے۔ ہوائیں چلتیں تو برف کے گالے لپٹائیں اڑتے پھرتے اور وہ ان سے اپنی جھولی بھرنے کی کوشش کرتا جو اس کی جھولی میں گرتے ہی پانی پانی ہو جاتے تھے۔

گرمیوں میں جنگل سے معطر ہوائیں اترتیں اور اسے نہال کر دیتیں۔ بہار آتی تو جنگلی پھولوں اور خود رو بوٹیوں کی خوشبو چار سوچیل جاتی۔ سورج کی کرنیں زمین پر ٹہنڈیوں اور پتوں کی مختلف شبیں بنا کر اترتیں تو وہ ان ٹھنڈیوں ٹھنڈیوں کو جگمگ کرنے کی کوشش کرتا۔ انہیں ڈھونڈتا اور پھر اپنی کالی پر انہیں اتار دیتا۔ ٹھنڈی اور خشک ہوائیں مست ہو کر اسے ڈھونڈا کرتیں اور وہ ان ہواؤں کو خوب انجوتے کرتا۔ اس کے گاؤں کا گھر واقعی بہت پیارا تھا۔

اوپر پہاڑ والے گھر تک کا راستہ جنگل سے ہو کر گزرتا تھا۔ وہ آدھے گھنٹے میں اسے با آسانی طے کر لیتا۔ پہاڑ پر چڑھنا پھر اترنا اسے بہت پسند تھا۔ اس کے لیے ایک گھیل تھا۔ وہ یہ سب سوچ کر دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا۔

جمعہ کی نماز پڑھ کر وہ مظفر آباد سے روانہ ہوا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ شام تک اپنے گھر پہنچ جائے مگر بارش، دھند اور آگے محسوس ہوتی برف باری اس کی خواہش کے آگے کھڑی نظر آئیں۔ اسے اندازہ تھا کہ آگے راولا کوٹ سے گاؤں تک کا راستہ ایک دلدل میں تبدیل ہو چکا ہوگا۔ وہ ایک تربیت یافتہ سپاہی بھی تھا اس لیے چڑھائی طے کرنا کوئی اتنا مشکل نہ تھا۔ وہ آگے آگے بڑھ کر کے بھی ان راستوں پر چلا جاتا تھا تو بھی گاؤں پہنچ جاتا۔ وہ پہاڑوں کا باسی تھا اور پہاڑوں کا مزاج اس سے زیادہ کون جانتا تھا۔

موسم ابتر سے ابتر ہوتا جا رہا تھا۔ سارے راستے اور مناظر کو بارش نے ڈھانپ دیا تھا۔ پوری وادی دور دور تک دھواں دھواں نظر آ رہی تھی۔ ان کی دیکھن دیر کوٹ اور پھر غازی آباد سے نکلی کر پانی والا زیارت۔ دیر کوٹ سے رقتاری سے چلی جا رہی تھی۔ عصر کی نماز کے لیے وہ غازی

آباد میں رکے تھے۔ شام کے اڑدھانے پورے علاقے کو نگل لیا تھا۔ ڈرائیور کہہ رہا تھا کہ شام کی نماز ہم زیارت جا کر پڑھیں گے۔ دیکھن آج سے ہوتی ہوئی زیارت پانی والا دیکھنے والی تھی۔ وہاں پیر سید جنات شاہ کا مزار تھا۔ پورا علاقہ ان کا عقیدت مند تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ آج اسی بہانے مزار پر حاضری بھی دے دے گا۔

وہ پانی والا زیارت میں داخل ہوئے تو شام اتر چکی تھی اور رات کی سیاہی میں بدل گئی تھی۔ پورے علاقے کو بلند و بالا پہاڑوں نے گھیرا ہوا تھا۔ وہ پانی والا گاؤں کے بازار سے گزرے تو آدمی دکانیں کھلی تھیں مگر لوگ بارش کے باعث بہت کم نظر آ رہے تھے۔ بازار ختم ہونے سے پہلے دیکھن ایک چائے خانے کے سامنے رکی۔ ساتھ ہی مسجد کی مسافروں نے مل کر وہاں شام کی نماز ادا کی۔ نماز کے بعد چائے خانے کے گرم اور دھواں بھرے ماحول میں بیٹھ کر کوکوں کے اوپر بنی گرم چائے کے پہلے گھونٹنے اس کی ساری تھکاوٹ اور کسلندی جذب کر لی۔ دھواں اڑانی چائے نے اس کے تنے اعصاب ڈھیلے کر دیے۔ اس کے رگ دے میں میں ایک سکون دوڑنا چلا گیا۔

چائے ختم کرنے کے بعد..... اٹھا اور فاتحہ پڑھنے زیارت کی جانب چلا۔

بازار کے اختتام پر بائیں طرف کچھ سڑھیاں زیارت کی جانب اتر رہی تھیں۔ مقبرے کے گرد پختہ کن تھا اور محرم کے گرد متعدد بلند و بالا درخت جو زیارت کو گھیرے ہوئے تھے۔

بارش ختم ہو چکی تھی اور وہ سڑھیوں کے اوپر چیکٹ اور گرم ٹوپی اوڑھے کھڑا مقبرے کو عقیدت سے دیکھ رہا تھا۔ مزار کے درختوں کے اوپر پائوں سے لدے ہادل چھائے تھے۔ تیز جھونکوں سے درختوں کی بے برگ ٹہنیاں بھڑ بھڑا رہی تھیں۔ پانی کے قطرے درختوں کی شاخوں سے ٹپ ٹپ نیچے گر رہے تھے۔ وہ سید جنات شاہ کے مزار کی سڑھیاں اترتا چلا گیا۔

وہ قبر مبارک کے سر ہانے اکیلا ہاتھ اٹھائے کھڑا فاتحہ پڑھ رہا تھا۔ دوسرے عقیدت مند نماز پڑھنے کے بعد فاتحہ دے کر چائے خانے میں بیٹھے تھے۔ مزار پر عقیدت بھرے ماحول میں دعا پڑھتے ہوئے اس نے اپنے پیچھے کسی کی موجودگی کو محسوس کیا۔ دعا ختم کرنے کے بعد وہ گھوما تو وہاں چادر سے چھڑے ڈھانپے ایک عمر رسیدہ شخص کھڑا تھا۔ چادر

سے اس کے سر کے کچھ بے ترتیب سفید بال اور برقی کراتی آنکھیں نظر آ رہی تھیں جن میں اضطراب اور تشویش کے سائے لہرا رہے تھے۔ واجد نے اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا تو محسوس کیا کہ اگر وہ پتھر کو بھی جیسا کر اپنی نظروں سے دیکھتے تو اسے بھی پاش پاش کر دے۔

اس نے گہرے لہجے میں واجد سے اس کا نام پوچھا۔

واجد نے اپنا نام بتایا تو دوبارہ اس نے پوچھا۔ ”کہاں جا رہے ہو؟“

ایک انجینی کی یہ بے تکلفی اسے پسند نہ آئی۔ اسے پہلا خیال یہ آیا کہ یہ کوئی مزار پر بھیک مانگنے والا ہے۔ جواب دینے کی بجائے اس نے جیب سے بڑھ نکالا اور پانچ روپے نکال کر اس کی جانب بڑھائے اور بولا۔ ”یہ رکھ لو اور میرے لیے دعا کرنا۔“

اس شخص نے لوٹ کی جانب نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا اور اسی لہجے میں بولا۔ ”آگے موسم بہت خراب ہے۔ راستے برف سے ڈھک چکے ہیں۔ رات مزار پر ٹھہر کر صبح چلے جانا۔“

واجد کو اپنے معاملہ میں اس کی دخل اندازی پسند نہ آئی مگر اس نے اپنے لہجے میں کڑھکی آنے نہ دی اور نرم لہجے میں بولا۔ ”میری فکر نہ کرو۔ میں ان علاقوں میں چل کر جوان ہوا ہوں۔“ پھر اس کے کندھے پر اپنا دایاں ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”میں آرام سے چلا جاؤں گا۔ تم بھی جا کر آرام کرو اور یہ پیسے رکھ لو۔“

اس شخص نے جیسے واجد کی بات سنی ہی نہ ہو۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس سے مخاطب ہوا۔ ”تو پھر ایسا کر، آس پاس کچھ غریب غریب رہتے ہیں۔ ان کو رات کا کھانا کھلا کر اپنے سر کا صدقہ اتارتے جاؤ۔“

واجد نے یہ سن کر اپنا یقین پختہ کر لیا کہ یہ واقعی کوئی چال باز ہے جو اسے خوف دلا کر کچھ زیادہ رقم بٹورنا چاہتا ہے۔ اسی دوران وہیں کے ڈرائیور نے مسافروں کو بلانے کے لیے ہارن بجائے۔ واجد نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور اس کی جانب دیکھے بغیر مزار سے باہر آیا اور سڑکیاں چڑھتا ہوا مسرک پر اکڑا ہوا۔ ہوا میں تندی در آئی مگر اس کی جانب سے پتے بے تحاشہ شور کر رہے تھے کہ جیسے ماتم کر رہے ہوں۔ واجد نے مڑ کر نیچے مزار کی جانب دیکھا تو وہ شخص مزار سے نکل کر اس کی جانب تشویش اور ہمدردی بھری نظروں سے بغیر ٹپکیں جھپکائے

دیکھے جا رہا تھا۔ ہوائے اس کی چادر پھڑ پھڑا رہی تھی۔

لیکن روانہ ہوئی تو راستہ اور زیادہ مشکل ہو گیا۔ لیکن اس کی لاش تھوڑے قاصطے کے بعد معدوم ہو جاتی تھی۔ اندھیرا نکل جاتا تھا۔ دھند، پہاڑ، بادل اور تاریکی آپس میں مدغم ہو گئے تھے۔ مسرک کی خرابی اور مہیب اندھیرے کے باعث سفر آہستہ سے ٹک رہا تھا۔ انجن کے علاوہ کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ کبھی کبھی نظروں سے مسافر اُرد گرد دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے مگر نظر نہیں آتے۔ اندھیرے میں کھوجانی تھی۔ خاموشی نے سناٹے کی ہیبت کو مزید بڑھا دیا تھا۔ ایک عجیب سی چھاساریت فضا میں کھلی ہوئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ سب نے موت کی چابک سنبھالی ہو۔

لیکن دھیرے دھیرے بڑھتی ہوئی جب راولا کوٹ پہنچی تو رات کے فوج بکے تھے۔

راولا کوٹ نے بھی خاموشی کی چادر اوڑھ لی تھی۔ شہر نے دیرانی کی گود میں سر ڈال دیا تھا۔ ٹرک پر نہ آدم نہ ادا کا پتا تھا۔ برف کی چادر چھٹی تھی۔ سب بے ہوش تھے۔ ٹھہرا رہی تھیں۔ لوگ گھروں میں محصور ہو کر رہ گئے تھے۔

وہ لیکن سے اترا۔ اپنا بیک بیک پیٹھ پر لٹکا یا اور پہلا خیال اس کے ذہن میں یہ آیا کہ کیوں نہ رات راولا کوٹ میں بس کر لوں اور صبح ہوتے ہی بنجوسہ گاؤں کا سفر کروں مگر بیوی اور بیٹی کی محبت نے اسے سفر جاری رکھنے پر مجبور کر دیا۔ سفر میں جتنا بھی کوئی گھر کے قریب پہنچتا جاتا ہے، اس کی تھکاوٹ ختم ہوتی جاتی ہے۔ وہ پہاڑ تک تو نہیں مگر بنجوسہ گاؤں تک تو پہنچ سکتا تھا۔ وہاں اس کا گھر تھا اس گھر میں رات بٹا کر صبح ایک گھنٹے سے پہلے اپنے پیاروں کے پاس پہنچ سکتا تھا۔

اڑے پر ایک تھکے شاپ کھلی تھی۔ ساتھ والا کھوکھا بھی کھلا ہوا تھا۔ وہ تھکے شاپ کی جانب چل پڑا۔ برف باری اور پھر بارش نے مسرک پر پہنچ کر تھک چکا تھا۔ اپنے مضبوط فوجی بوتوں کی وجہ سے وہ آرام سے چلتا ہوا تھکے شاپ کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ تھکے والا چادر میں لپٹا اگھر رہا تھا۔ واجد نے نکول اور وہیوں کا آرڈر دیا تو اس میں لپٹل پیدا ہوئی۔ اس نے فروٹ والے سے کچھ کھل بھی خریدے۔ پھر سوچا جب تک آرڈر تیار ہوتا ہے وہ عشاء کی نماز ادا کر لے۔

وہ نماز پڑھ کر واپس آیا تو وہ مضبوط شاپروں میں آرڈر تیار تھا۔ اور فروٹ کا ایک بڑا شاہ بھی رکھا ہوا تھا۔ اس نے ادا کی گئی اور وہ اس جانب چل پڑا جہاں کچھ بیٹیس

کھڑی تھیں۔ آخری لیکن کھل چکی تھی۔ اب صرف جیب مل سکتی تھی اس کے ذریعہ وہ بنجوسہ جھیل تک جا سکتا تھا۔

ایک جیب کا ڈرائیور ماحد کی جان بچان کا تھا۔ واجد نے اس سے ہاتھ ملایا اور منظر آباد سے اپنے سفر کی داستان مختصر کر کے سنائی کہ کب کب وہ اوپر پہاڑ پر اپنے گھر بھی جانا چاہتا ہے۔ ڈرائیور نے پہاڑ کی بلندی کو نظروں میں جانا چاہا اور پھر اسے برف کی سفید چادر اوڑھے دیکھا تو بولا کہ رات نہیں راولا کوٹ میں رک جاؤ۔ اس وقت اوپر جانا خطرناک ہے۔ واجد اس کی بات سن کر ہنسا اور بولا کہ ایک فوجی کو خطروں سے ڈراتے ہو۔ میں ابھی گھر پہنچنا چاہتا ہوں اگر نہ گیا تو بے چینی بڑھتی جائے گی۔

واجد کا غزم دیکھ کر ڈرائیور خاموش ہو رہا۔ ڈرائیور بنجوسہ جھیل تک جانے سے بھی کتر رہا تھا مگر جس طرح ہر پاکستانی اپنی فوج کو احترام دیتا ہے۔ وہ ڈرائیور بھی دیتا تھا اور ساتھ ہی وہ اس کی جان بچان والا بھی تھا۔ معمولی سی گفتگو کے بعد انہوں نے گراہنے لگے۔

ڈرائیور اپنی سیٹ پر آ بیٹھا اور ساتھ والی سیٹ واجد نے مستیابی لی۔ اپنا بیک واجد نے جیب کے پیچھے رکھا۔ تینوں شاہراہ پر اپنے ایک ہاتھ میں پکڑے اور دوسرے ہاتھ سے جیب کا پینڈل مضبوطی سے تھام کر بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے زور سے ہم اللہ... پڑھی اور پھر آہستہ آہستہ بنجوسہ گاؤں کے راستے پر چل پڑا۔ اس وقت رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے مگر ایسا لگتا تھا کہ رات آدمی سے زائد گزر چکی ہے۔ آسمان اور زمین دھند اور بادلوں سے ڈھکے تھے۔ برف باری رک چکی تھی مگر فضا میں برف کے ذرات بھی کھار تیز ہواؤں کے باعث اڑتے نظر آتے تھے۔

جیب آہستہ آہستہ چلتی ہوئی بنجوسہ گاؤں جانے والی مسرک پر آئی اور پھر برف اور مٹی سے بے پکڑ پڑا ہوا زور لگاتی ہوئی چڑھنے لگی۔ جیب کی روشنی کی علاوہ چاروں جانب گہب اندھیرا تھا۔ شہر میں ایک خاص قسم کی مٹی پائی جاتی ہے جسے کٹی مٹی کہتے ہیں۔ یہ مٹی تھوڑی سے بھی بارش پڑے تو کچھ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ پہلے بارش اور پھر برف باری نے راستے کو دلدل بنا دیا تھا۔ اگر درگد سفیدے اور چڑے کے درخت تھے جو برف سے ڈھک چکے تھے۔ واڑوں کے چھوٹے درخت بھی تھے جو ہواؤں کی سرسراہٹوں کو بھین کر رہے تھے۔

جیب کی آواز کے علاوہ کوئی اور آواز سنائی نہیں دے

رہی تھی۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ ایک دل دہلا دینے والا سناٹا تھا۔ شوقی ہوائیں ہر تھوڑی دیر بعد اوپر سے اترتیں اور سیٹیاں بھاتی گزر جاتیں۔ وہ اپنے ہمراہ درختوں کی ٹہنیوں سے انگی برف کو بھی اڑاتی پھرتیں۔ جیب کی لاش جہاں جہاں پڑتی وہاں کی برف زیادہ روشن ہو جاتی تھی۔

ایک جگہ جیب کچھ اور برف میں اسکی دھنسی کر آگے چلنے سے انکار کر دیا۔ انجن کی بارخراہی مگر جیب بس سے مس نہ ہوئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ ڈرائیور کی آنکھوں میں تشویش تھی۔ یہاں جیب کا پکھن جانا ان دونوں کی موت کا سبب بھی بن سکتا تھا۔ رات کے تیسرے پہر درجہ حرارت اور زیادہ گر جاتا ہے اور جیب ان کے لیے برف خانہ بن سکتی تھی۔

ڈرائیور نے واجد سے کہا۔ ”نیچے اتر کر دھکا لگانا پڑے گا۔“

جیب وہ جیب سے نیچے اتر تو اس کے پاؤں گھٹنوں تک برف میں دھنس گئے۔ سب سے ہوائیں پڑیوں کا گودا بھی جھمک کر رہی تھیں۔ ڈرائیور نے اسپد بڑھائی تو پھیلا پائیوں کی جانب کا ٹائرس تیزی سے کھونا کر واجد کے کپڑے کچھ اور برف سے لٹ پت ہو گئے۔ اس نے جیب کو اپنی پوری طاقت سے دھکا لگایا مگر ٹائر کے نیچے کی طرف اب برف میں تبدیل ہو چکی تھی اور وہ اسی پر کھوم رہا تھا۔ اس نے پھر کدال اور ہاتھوں سے ٹائر کے نیچے سے برف کو نکالنا شروع کیا۔ چند ہی منٹ میں وہ اس کڑا کے کی سردی میں بھی پینا پینا ہو گیا۔ اب اس کے دل میں خیال آ رہا تھا کہ راولا کوٹ میں رات نہ گزرا کر اس نے حماقت کی ہے۔ بنجوسہ جھیل زیادہ دور نہ تھی اور اس لیے وہ ڈرائیور سے یہ بھی نہ کہہ سکتا تھا کہ وہاں راولا کوٹ جانا چاہتا ہے۔ یہ کہنا اس کے لیے ایک ہنگامی تھا۔ ڈرائیور محنت سے ٹائر کی گرفت زمین پر ڈر مضبوط ہوئی اور وہ جھکے سے غرا کر آگے بڑھی۔ اس نے دل میں اللہ کا شکر ادا کیا۔ کدال کو جیب کے پیچھے رکھ کر اپنی سیٹ پر آ بیٹھا۔

وہ بنجوسہ جھیل تک پہنچے تو رات کے بارہ بج رہے تھے۔ وہ جیب سے اترتا تو دیکھا کہ جھیل کے ساتھ ریسٹ ہاؤس مکمل تاریکی میں ڈوبا ہوا ہے۔ اگر درگد کے بلندی پہاڑوں نے جھیل کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔ جہاں جیب رکی وہاں چند دکائیں بند پڑی تھیں۔ کھڑے درخت تیز ہوا سے جھوم رہے تھے اور ان کی برف زمین پر گر رہی تھی۔ تاریکی

نے پورے علاقے کو فرحانپ دیا تھا۔ ریست ہاؤس کو دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ یہ بھی آباد رہا ہو گا مگر اب بھوتوں کا مسکن ہے۔

ڈرائیور نیچے اترا۔ اور گرد دیکھ کر بولا۔ ”اوپر پہاڑ پر صبح چلے جانا۔ تجھ سے پہنچنے والے ہیں وہاں اپنے گھر میں رات گزار لیتا۔ گاؤں سے آگے چڑھائی پر اس وقت چڑھنا عقل مندی نہ ہوگی۔“ اس نے جیب کے پچھلے حصے سے ایک مضبوط ڈنڈا نکال کر دھوکہ دیتے ہوئے کہا۔ ”نارنج تو تمہارے پاس ہوگی۔ یہ ڈنڈا ابھی رکھ لو۔ اس وقت جنگلی جانور بھی سڑک کے قریب آ جاتے ہیں۔“

واحد نے اپنے بیک بیک سے نارنج نکالی۔ بیک کو پیٹھ پر لٹکایا۔ ڈنڈے کے ساتھ تینوں شاہر منیوٹی سے باندھے اور اسے بائیں کندھے پر رکھا۔ اس سے پہلے وہ اپنے آپ کو مکمل طور پر ڈھانپ چکا تھا۔ دائیں ہاتھ میں نارنج پکڑی۔

ڈرائیور نے اسے خدا حافظ کہا اور جیب موڑ کر واپس چلا گیا۔ واحد اس جیب کی بیک لائٹس پر نظر نہ رکھے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا جب وہ آگے موڑ مڑ کر مہوئی تو اس نے مڑ کر ریست ہاؤس کی جانب دیکھا اور تادیر اسے دیکھتا رہا۔ وہ اس اندھیرے میں انجان مخلوق کا مسکن معلوم ہو رہا تھا۔۔۔ سنسنائی ہوا میں اس سے گھرا رہی تھیں۔ اگر اسے تھوڑی سی بھی یہ امید ہوئی کہ ریست ہاؤس میں کوئی چوکیدار ہو گا تو وہ اوپر گاؤں جانے کا ارادہ ترک کر کے رات وہیں ٹھہر جاتا۔ اسے معلوم تھا کہ سردیوں میں اس کا سارا اکلہ اور چوکیدار نیچے راولا کوٹ چلے جاتے ہیں۔

اس نے اللہ کا نام لیا اور نارنج کی روشنی سامنے ڈالی اور قدم بڑھا دیئے۔ سامنے جھیل کے بند کا پل تھا۔ وہ بھی برف سے ڈھکا تھا۔ اس نے لکڑی کا وہ پل پار کیا اور بوسہ گاؤں والے راستے پر پہنچے تھے قدم سے چل پڑا۔

اس کے قدم برف میں ڈھنسنے لگے۔ بیک اور شاہرڈ کے وزن سے برف میں چلنے ہوئے چڑھائی چڑھنا دشوار تھا۔ پھر ارد گرد کے ماحول نے اپنی ایک دہشت بھی قائم کر دی تھی۔ دلیر سے دلیر انسان بھی رات کے اس پہر بدن کو کاٹتی سردی اور ہیپ اندھیرے میں اپنی ہمت ہار دیتا ہے۔ ایک جگہ وہ لکڑا کر ڈھنگا اور نارنج برف پر گر گئی۔ اسی لمحے ہواؤں نے رفتار بھری اور برف اڑائیں، سنسنائی ہوئیں اس کے آس پاس سے گزریں تو وہ پہلی بار سمجھا گیا۔

اس نے اپنے آپ کو کوسا کرکھیں اس موسم میں یہ خطرہ مول لے بیٹھا ہے۔ اب اس کے پاس ایک ہی راستہ تھا کہ گاؤں کی جانب بنار کے بڑھتا جائے۔ واپسی کے راستے بند ہو چکے تھے۔

وہ قدم قدم چلتا رہا۔ وہ پورا کا پورا برف سے ڈھک چکا تھا۔ اس نے نارنج کو دوسرے ہاتھ کی بٹل میں دبایا اور لباس پر سے برف ہٹانے لگا۔ دوسرے ہاتھ میں ڈنڈے سے بندھے شاہرڈوں کا ہوجھ اب اس کے لیے اذیت ناک ہو چکا تھا۔ اس نے مڑ کر جنگل کی جانب دیکھا تو درختوں کی ٹہنیاں ہوا کے زور سے لرز رہی تھیں۔ بلند درختوں کی جگہ اسے کوئی غیر مرئی مخلوق گزری نظر آئی۔ اس نے ذکر ذہن سے جھٹکتا چاہا مگر مکمل طور کا سیانہ نہ ہوا۔ وہ بار بار اپنے آپ کو کوس کر رہا تھا۔ اس کا لباس برف اور کچھ سے لٹ پٹ تھا۔ اب قدم بھی لڑکھڑا رہے تھے۔ سردی کا احساس متواتر چلنے سے زائل ہو چکا تھا۔ اسے ایک خوف نے جکڑ رکھا تھا کہ رات کو اس اندھیرے میں جب انسان ہوتے ہیں تو جنگلوں بیابانوں میں ان دیکھی مخلوق چاک اٹھتی ہیں۔ وہ سوچ کر دل رہا تھا کہ درختوں پر لیبراکر کرنے والی مخلوق اسے اوپر سے دیکھ رہی ہوں گی۔ ہر درخت اسے ہلاؤں کا مسکن لگ رہا تھا۔ اسے بچپن میں مولوی صاحب کی کہی ہوئی ایک بات یاد آنے لگی تھی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ دلیر وہ ہوتا ہے جو اپنے خوف پر قابو پالیتا ہے جو جتنا خوف کو بھگا سکتا ہے وہ اتنا ہی بہادر ہوتا ہے۔ واحد بزدل نہ تھا مگر اب خوف اس کو اپنے قابو میں کرنا چاہتا تھا۔

وہ ہمت جمع کر کے چلتا رہا۔ دل ہی دل میں قرآن پاک کی ان ساری سورتوں کا دور کرتا جا رہا تھا جو اسے یاد تھیں۔ اس کی آنکھوں میں کھوئی ہوئی زندگی واپس آنے لگی جب اس نے دور، جنگل سے ذرا ہٹ کر اپنے گاؤں کے اندھیرے میں ڈوبے مکانات دیکھے۔

ان کی طرح بہت سے گھروں کے کینن ابھی اوپر پہاڑ پر تھے جو پہچے گاؤں میں تھے وہ لوگ روشنی کے لیے لائٹیں استعمال کرتے تھے اگر کسی گھر میں لائٹیں جل رہی تھی تو اس کی روشنی اتنی نہ تھی کہ اس گھب اندھیرے کو نکل سکے۔ رات کے پونے دو بج رہے تھے۔ اس نے رات اپنے اس گھر میں بسر کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا تھا۔ اب اس کے لیے بہت مشکل تھا کہ اتنا ہی سفر آگے اوپر پہاڑ پر کر سکے۔ ہواؤں میں تندی آگئی اور ساتھ ہی برف بھی گرنے

لگی۔ نارنج کی پیڑی وہ راستے میں تبدیل کر چکا تھا اور وہ دوبارہ قدم توڑ رہی تھی۔

اس نے دور سے اپنے گھر کی جانب دیکھا۔ ہواؤں کا زور گھر کے گرد بلند درختوں کو زمین بوس کرنے کے درپے تھا۔ ہوائیں ان سے ابھی ہوئی تھیں۔ وہ برف میں دھنستا ہوا اپنے گھر کے قریب پہنچا تو اسے تحفظ کا احساس ہوا۔ گھر ہر ایک لیے ایک پناہ گاہ ہوتا ہے۔ باہر کے جتنے بھی طوفان ہوں، گھر کے اندر آ کر ختم جاتے ہیں۔ وہ سکون اور طمانیت کے لمحوں میں تھا۔ وہ کچھ گھر تھا مگر اس کے لیے ایک محفوظ قلعہ تھا۔

گھر کے سامنے ایک کھلی جگہ تھی جس کے دائیں جانب بیٹھک کا دروازہ تھا۔ اس کھلی جگہ کو وہ لوگ صحن کے طور پر بھی استعمال کرتے تھے۔ اس صحن کی سامنے والی دیوار پر دروازہ سیدھا ایک کمرے میں کھلتا تھا۔ یہ گھر کا مرکزی دروازہ بھی تھا جو باہر آنے جانے کے لیے استعمال ہوتا۔ جب کینن اوپر پہاڑ والے گھر کمرے میں چلے جاتے تو اس دروازے پر تالا پڑ جاتا۔ پہاڑ والے گھر سے راولا کوٹ آمدورفت کے دوران اس گھر کو بھی وقتاً فوقتاً استعمال میں لایا جاتا تھا۔

واحد نے لکڑی کا ڈنڈا دیوار سے ٹکایا اور جیکٹ کی جیب سے تالے کی جانی نکالی۔ جب نارنج کی روشنی تالے پر ڈالی تو دروازے کی کندہ کی کھلی ہوئی تھی اور تالا غائب تھا۔ وہ بھر بھر کے لیے چکر لگایا۔ سوچنے لگا کہ آیا گھر میں کوئی ہے یا نہ تالا گاؤں کے لڑکوں نے کھولا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ اس گھر کو کبھی بھکاری گاؤں کے لڑکے تاش کھیلنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ اس نے زمین پر نارنج کی روشنی بھینکی تو تالا نیچے پڑا تھا۔ وہ تالا اٹھائے اس حشر و وحش میں کھڑا رہا کہ کیا اس تالے کو کھولا گیا ہے یا اسے توڑا گیا ہے۔ اس نے تالے کے پیٹل اور اس کے اندر دیکھا تو اسے معلوم ہو گیا کہ اسے جھٹکے سے توڑا گیا ہے۔ گاؤں میں چوری چکاری کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اس نے تالے پر دیکھا تو کوئی ضرب بھی نہ تھی۔ وہ پہلے ہی سے تھا کہ ہوا تھا اس نے دماغ کو اس سوچ سے آزاد کیا۔ پاس بٹھرا تو کوئی نہ تھا مگر اپنے آپ پر یہ بھروسہ تھا کہ دو تین پر تو وہ اکیلا ہی حاوی ہے۔ اس نے دروازے کو اندر کی جانب دھکیلا تو اس کے دونوں پٹ بھی سی آواز کے ساتھ کھلتے چلے گئے۔

دروازہ سیدھا ایک کمرے میں کھلتا تھا۔ وہ اندر داخل

ہوا۔ نارنج کی مدھم ہوتی روشنی میں اس نے آس پاس دیکھا تو کسی کو وہاں نہ پایا۔ اس کمرے میں ایک جانب چار پائیاں رکھی تھیں۔ دو خالی تھیں کہ کنستروں میں پانی بھرا تھا۔ اس کمرے میں ایک دروازہ سیدھے رخ پر اسٹور میں کھلتا تھا اور دوسرا دروازہ غسل خانے کا تھا۔ اگلے ہاتھ پر ایک دروازہ دوسرے صحن میں کھلتا تھا جہاں گھر کی عورتیں روٹی ہانڈی کرتی تھیں۔ اس صحن میں دائیں جانب ایک کمرہ تھا جہاں مال مویشی باندھے جاتے تھے۔ اس کمرے کا ایک بڑا دروازہ مال مویشیوں کی آمدورفت کے لیے باہر بھی کھلتا تھا۔

جس کمرے میں وہ کھڑا تھا۔ سامنے ایک اور دروازہ تھا جو بڑے کمرے میں کھلتا تھا۔ وہ سونے کا کمرہ تھا۔ وہی ان کا باورچی خانہ بھی تھا بلکہ سارا کتبہ شام کے بعد وہیں موجود ہوتا اور ضرورت کا سارا سامان اس بڑے کمرے میں رکھا ہوتا تھا۔ وہ آہستہ سے آگے بڑھا اور اس کمرے کے دروازے کے دونوں پٹ اندر کی جانب کھول دیئے۔ نارنج کی روشنی اندر چھٹی تو اسے سامنے آتش دان نظر آیا جس میں سے ایک باغی زمین سے چھت کے باہر نیک دھواں نکالنے کے لیے تھا۔ کچھ سوچی گزریاں پڑی تھیں۔ آتش دان کے گرد چائیاں چھٹی تھیں۔ اگلے ہاتھ پر اس نے نارنج کی نہایت ہی مدھم ہوتی روشنی ڈالی تو وہاں تین چار پائیاں چھٹی تھیں۔ دائیں جانب ایک چار پائی پر اوپر تلے رضائیاں رکھی تھیں جو چھت تک چا پھٹی تھیں۔ کوئے میں لوہے کے ٹرک تھے۔ اس نے ٹرک کے تالے چیک کیے وہ سالم تھے۔ اس نے چار پائیوں کے نیچے لائٹ بھینکی تو وہاں بھی کوئی نہ تھا۔ اسے غلغلہ بھی کہ تالا تو زمین پر پڑا تھا اور اندر بھی سب چیزیں اپنی جگہ موجود ہیں تو پھر اس تالے کو توڑنے والے کا مقصد کیا ہو سکتا ہے؟

اس نے اپنے خیالات جھٹکے اور چھوٹے کمرے میں آ کر اپنی جیکٹ اتاری، پھر اپنے جوتے اتارے۔ بیک سے ایک شلوار میں کا جوڑا نکال کر اپنے کچھ بھرے لباس سے نجات حاصل کی۔ ٹین کے کنستروں میں سے لوٹے میں پانی بھر کر غسل خانے میں گیا۔ منہ ہاتھ دھوئے، بڑے کمرے میں آیا اور لائٹیں دھوٹی سامنے اور بائیں جانب والی دیوار کے ساتھ ساتھ اوپر نیچے لکڑی کے شیفٹ بنے تھے۔ جہاں برتن اور دوسرا ضرورت کا سامان رکھا تھا وہیں اس کو لائٹیں پڑی ملی اور ساتھ ساتھ بھی تھی۔ اس نے لائٹیں

کوجا پاتا تو کمرے میں ہر جانب زردی روشنی پھیل گئی۔
ڈنڈے سے شاپرنگال کر اس نے بائیں ہاتھ پڑی
چارپائی پر رکے اور پھر دوسری چارپائی پر سنانے کے لیے
لیٹ گیا۔ ٹائم دیکھا تو رات کے تین بجے تھے۔
کچھ دیر سنانے کے بعد اسے ٹھنڈ محسوس ہونے لگی۔
اس نے بستر پر پڑی ایک گرم چادر سے اپنے آپ کو لپیٹ لیا
تھا۔ کمرے میں سوچی گزریوں کا ڈھیر تھا۔ خشک ایلے بھی ایک
بورلی میں بڑے تھے۔ کمرے کو گرم رکھنے کے لیے اس نے
سوچا کہ آتش دان میں آگ جلائی جائے۔ وہ چلا ہوا آتش
دان کے قریب آیا۔ لکڑیاں اٹھیں کیں، آتش دان کی راگھ کو
کریدا اور جگہ کو صاف کیا۔ لکڑیاں اوپر بچھ رہیں اور کچھ
ردی کاغذ اور ایلے بھی لکڑیوں کے نیچے رکھے۔ انہیں آگ
دکھانے کے لیے اس نے مچاس کی تیلی نکالی ہی تھی کہ اسے
دائیں جانب کونے سے کسی کی سسکاری سنائی دی وہ اچھل
پڑا۔
اس نے آواز کی سمت دیکھا تو دو گول اور چمکتی ہوئی
آنکھیں اسے تک رہی تھیں۔ لائٹن کی روشنی اس کونے کی
تار بجکی تک پھیل چکی تھی مگر اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ
وہاں کوئی جانور نہیں بلکہ انسانی ہویا ہے۔ اس کے ہاتھ
پاؤں مثل ہو گئے تھے۔ زبان لنگ تھی اور جسم کے سارے
پٹھے اکڑ چکے تھے۔ اس کے حلق میں کانٹے چھ رہے تھے۔
چند لمحوں میں وہ اس جانب دیکھا رہا پھر اس نے ہمت جمع کی اور
بیشکل اس کی زبان سے یہ الفاظ نکلے۔ ”تم کون ہو؟“
اپنی زبان کی کپکپاہٹ اسے صاف طور پر محسوس
ہو رہی تھی۔ اسی دوران اس نے جانچ لیا تھا کہ وہ کوئی لڑکی
ہے جو چادر میں لپٹی بیٹھی ہے۔ صرف چہرہ اسے نظر آ رہا تھا۔
وہاں سے کوئی جواب نہ آیا۔ اس نے اسی دوران اسے جانچ
لیا تھا۔ وہ بیس بائیس سال کی ایک نہایت خوب صورت لڑکی
تھی۔ آنکھیں چمکدار، رنگ تانبے کی طرح اور اس کی ناک
پتلی تھی۔ ہونٹ ایسے کہ جس طرح مصور نے اسے تراشا ہو۔
اس نے سرخ رنگ کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ اس کا چہرہ اور
ہاتھ پر سیاہ بالوں کی ایک لٹ کے علاوہ کچھ اور نظر نہ آیا
تھا۔ وہ اس طرح بیٹھی تھی کہ جیسے رکوع میں ہو۔ وہ ڈری اور
سبکی سی لگ رہی تھی۔ واجد کا خوف اسے اور اس کے
تاثرات دیکھ کر قدرے کم ہوا۔ اس کے ذہن میں پہلا خیال
ہی آیا کہ یہ راستہ بھیجی ہوئی ہے مگر اسے حیرت تھی کہ وہ اتنی
دیر سے اس کی موجودگی کیوں نہ محسوس کر سکا۔ اس نے اب

قدرے بلند آواز میں لڑکی سے پوچھا۔ ”کون ہو تم اور اندر
کیسے آئی ہو؟“
وہ دوبارہ سوال سن کر اور زیادہ سٹ گئی مگر اس کی
نظریں واجد پر ٹھہری ہوئی تھیں۔ وہ مسلسل خاموش تھی۔
اب واجد نے اپنے لہجے میں قدرے سختی پیدا کی اور کڑک کر
پوچھا۔ ”تو تم سے پوچھ رہا ہوں۔ تم کون ہو اور یہاں
کیوں بیٹھی ہو؟“
واجد کو اپنے سخت لہجے پر ہشامی بھی ہو رہی تھی۔ ایک
لڑکی سے کڑھت لہجے میں پوچھنا اسے خود برا لگ رہا تھا۔
لڑکی کی خاموشی اور گہرا جھٹ سے وہ اپنے خوف پر مکمل قابو پا
چکا تھا۔
واجد نے سخت لہجے میں کہا۔ ”اگر تم کچھ بولو گی نہیں تو
تمہیں کھینچ کر نیچے اتار دیں گا۔“ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا مگر
اسی دوران لڑکی کی ہلکتی ہوئی ”مزم آواز آئی۔“ تمہیں
تمہارے پیاروں کا واسطہ، مجھے ہاتھ نہ لگانا۔“
وہ وہیں رک گیا اور بولا۔ ”ٹھیک ہے میں نہیں آتا مگر
تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔“
وہ بولی۔ ”میں کھڑا بیٹ کی رہنے والی ہوں۔“ اس
کی آواز اتنی خوب صورت تھی کہ واجد کو محسوس ہوا کہ پہاڑ پر
کوئی بانسری کی مدھرجن بج رہی ہو۔
واجد جانتا تھا کہ کھڑا بیٹ یہاں سے کچھ دور ایک
پہاڑی گاؤں ہے۔ وہ اسے خود ہی بولنے کا موقع دے رہا
تھا مگر وہ خاموش تھی۔ اس نے زری سے پوچھا۔ ”یہاں
تمہیں کون چھوڑ گیا؟“
وہ لڑکی دھیمے دھیمے بول رہی تھی۔ اس کے ہونٹ پڑ
پڑا رہے تھے۔ اس کے حسین لبوں سے الفاظ کی مترنمدی
کی طرح بہنے لگے۔ ”وہ میری شادی زبردستی کر رہے تھے۔
میری محبت کی اور کے لیے تھی۔ جس کے لیے مگر سے
بھاگی، وہ بھی کہیں غائب ہو گیا۔ میں مگر سے سارا زور دینی
اٹھالائی پھر بھی وہ مجھے دعا دے گیا۔“ اس کی آنکھوں سے
موتی جھڑ کر گالوں پر بہنے لگے۔ اس کے بے پناہ حسن میں
حزن تھا۔ اس نے اپنے سر میں ہاتھ اپنی چادر سے باہر
نکالے تو دونوں ہاتھوں میں بیٹھی زیور تھے۔ واجد اس کے
خوب صورت ہاتھ، لمبی نرخی انگلیاں اور ان ہاتھوں کے
زیورات دیکھ کر سانس نہ کر سکا تھا۔ اس نے زیورات دیکھ کر
اندازہ کر لیا کہ یہ بہت قیمتی ہیں۔ زیورات سے بڑھ کر لڑکی
کامن اسے دیوانا کر رہا تھا۔ اتنی حسین و جمیل شکل شاید ہی

اس نے پہلے دیکھی ہو۔ وہ اسے آسان سے اتاری کوئی مخلوق
لگ رہی تھی جو اس برقانی رات میں اسے کسی انعام کی
صورت ملی تھی۔
واجد نے نام پوچھا تو اس نے لپٹی بتایا۔ وہ سوچنے لگا
کہ کتنا دلکش نام ہے اور اس پر بچ رہا ہے۔ اس کی آواز میں
اب خوف نہ تھا۔ وہ مرد بن گیا تھا جو اپنے ذہن میں کئی رنگین
کہانیاں سن رہا تھا۔ اس کے لہجے میں پیار، نرمی اور پناہیت
آگئی تھی وہ بولا۔ ”تم نیچے اتار آؤ۔ اوپر تم سے بات کرنی
مشکل ہو رہی ہے۔ میں اس دوران آتش دان جلاتا ہوں۔“
وہ اٹھا اور آتش دان کی طرف بڑھا۔ بھیجی اس نے
مدھر آواز میں کہا۔ ”آتش دان مت جلاؤ۔ مجھے گرمی لگ
رہی ہے۔“ اس نے مڑ کر دیکھا تو وہ چارپائی پر بیٹھی تھی۔ چادر
کی اوٹ سے جھانک کر چہرہ پورے کمرے میں دکھ رہا تھا۔
کمرے میں ابھی تک ٹھنڈی مگر لڑکی سے کوئی تپش نکل رہی
تھی جو واجد کو بے خود کیے جا رہی تھی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا
جیسے وہ بے خود ہوا چارہ ہے۔ بڑی مشکل سے اس نے خود پر
قابو پایا اور کھانا نکالنے کے لیے اٹھ گیا۔
اس نے شاپر سے نکلے اور نان نکالے اس سے
پوچھا۔ ”تمہیں بھوک لگی ہوگی۔ یہ کھا لو۔ پھر آرام سے
بائیں کریں گے۔“
لپٹی بولی۔ ”میں کچھ نہیں کھاؤں گی۔ اگر چھل ہیں تو
وہ کھا لوں گی۔“
اس نے پھلوں کا شاپر کھولا۔ وہ مالے، انار اور سیب
لایا تھا۔ ایک پلیٹ میں پھل ڈالے۔ انہیں صاف کیا اور اس
کے ہمراہ چارپائی پر آ بیٹھا۔ وہ اسے پھل دے رہا تھا جسے وہ
رجبت سے کھا رہی تھی۔ واجد سوچ رہا تھا کہ نہ جانے کب
سے بھوکی ہے جو پھل اتنی جلدی ختم کر لیے۔ وہ تو اس پر
سب کچھ لانے پر تھکا تھا۔ اس کے اندر ایک عجیب سی تہذیبی
آگئی تھی جب کہ وہ فطرتاً ہیانا تھا۔
وہ پھل کھا چکی تھی۔ واجد نے نکلے نان کے ساتھ
کھائے۔ پانی پی کر وہ اس کے ساتھ والی چارپائی پر آ بیٹھا۔
اس کے اندر ایک عجیب سی کیفیت انگڑائی لینے لگی تھی۔ وہ
اسے مجھوسا دلا رہا تھا کہ تم کو کسی چیز کا خوف نہیں ہونا
چاہیے۔ تم اب میری ذمہ داری ہو۔ میں فوجی سپاہی ہوں
اور اگر ضرورت محسوس ہوگی تو قیام کماٹھر سے بھی مدد لے
سکتا ہوں۔ وہ اس کی باتوں پر سر ہلاتی رہی۔
واجد کو ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے اس کے اندر ایک

تہذیبی سی آری ہے۔ کسی خاص مقصد کے لیے اسے اسکا
رہی ہے۔ واجد نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
ہاتھ تھامتے ہی اس کے بدن میں سسناہٹ سی دوڑ گئی۔ نرم
اور ملائم ہاتھ اس کے کھردرے ہاتھوں میں تھے۔ اس نے
اپنے ہاتھ نہیں چھڑوائے۔ واجد اسے اس کی رضا مندی
سمجھا۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھا یا لپٹی کے گلابی گالوں کو
چھوا تو وہ شرمائی۔
”وہ خود بھی وجہ انسان تھا۔ لپٹی کو رام کرنے میں اس
کی خود اعتمادی اس کے کام آ رہی تھی۔ لڑکی خاموش تھی۔
واجد نے اس کو کندھوں سے پکڑ کر اپنے سینے سے لگایا تو وہ
بولی لائین کی روشنی کم کر دو۔ مجھے شرم آ رہی ہے۔“
وہ یہ سن کر کھڑوہ ہو گیا۔ وہ چارپائی سے اتار آیا اور لو
کو دھیمہ کر دیا۔ وہ حواس کو چھو چکا تھا۔ شیطان نے اپنا غلبہ پا
لیا تھا۔ نیم اندر سے میں شیطانی کھیل شروع ہوا۔ وہ اسے
اپنانے کے وعدے کر رہا تھا۔ تمہیں کھارہا تھا اور وہ کہہ رہی
تھی کہ اپنا سب کچھ تمہارے سپرد کر دیا ہے تو اب تمہیں نہیں
نہیں جانے دوں گی۔ میری زندگی میں ایک ہی مرد آیا ہے
اور وہ تم ہو۔ مرتے دم تک تمہارا چچا کر دوں گی۔ وہ مدھوش
ہو کر کہہ رہا تھا کہ میں مگر بھی تم کو نہیں چھوڑ سکتا۔ یہ ایک مرد
کا وعدہ ہے اور مرد اپنے وعدے سے کبھی پیچھے نہیں ہٹتا۔ وہ
کافی دیر بائیں کرتے رہے اس نے رضائی اور نیچے اوپر سے
اتار لیے تھے۔ سفر کی تھکاوٹ بھی غالب آگئی تھی۔ وہ مطمئن
ہو کر نیند کی وادی میں چلا گیا۔
اس کی آنکھ کھلی تو کمرے کی درزوں سے دن کی روشنی
شعاعوں کی صورت اندر آ رہی تھی۔ رات کا اندھیرا چھٹ
چکا تھا اور باہر بادلوں کی جگہ سورج چمک رہا تھا۔ اس نے
اٹھ کر دیکھا تو کئی دوسری چارپائی پر بیٹھی اسے معنی خیر انداز
سے دیکھ رہی تھی۔ واجد نے پوچھا کہ تم کب بیدار ہوئی۔
اس نے جواب دیا۔ ”میں سوئی کب تھی۔ تمہارے
جاننے کا انتظار کر رہی تھی۔“
وہ خوش ہو کر بولا۔ ”مجھے اٹھاؤ جی۔“
اس نے جواب دیا۔ ”محبوب کے آرام میں غلط نہیں
ڈالنا چاہیے۔“
وہ مجھوسا تھا۔ اب وہ بھی سوچ رہا تھا کہ گھر پر بیوی،
ماں اور بیٹی انتظار کر رہے ہوں گے۔ وہ اپنے ذہن میں
مستقبل کی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ سوچا کہ لپٹی کوئی الحال
نہیں رکھوں گا۔ ایک دو دن میں سامان شفٹ ہونے سے

پہلے اس کا کہیں نہ کہیں انتظام کر لوں گا۔ اس نے سنی کی جانب دیکھا تو وہ اسے اپنی نظر میں متواتر رکھے ہوئے تھی۔ نگاہوں میں چمک تھی اور بھی بہت کچھ تھا جسے وہ کوئی مہتی نہ دے سکا۔ شاید اس کی اپنائیت کا جادو تھا جو اجد کے سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ تھا جو اسے گھاس کر رہا تھا۔ وہ نظریں چرانے لگا۔

وہ اٹھا اور غسل خانے سے منہ ہاتھ دھو کر واپس کمرے میں آیا۔ وہ اسی حالت میں بیٹھی تھی جیسے اسے چھوڑ گیا تھا۔ واعد نے اس سے کہا کہ تم بھی منہ ہاتھ دھو لو۔

وہ بولی۔ ”میں ابھی چلتی ہوں۔ شام کو پھر آؤں گی اور تم کو بھی آنا ہوگا۔“ اس کے لہجے میں حکم تھا۔

وہ بولا۔ ”تم کہاں جا رہی ہو؟ اور میری رات کو میں واپس آنے کی کوشش کروں گا۔“

واجدہ دوسری جا رہی تھی پر بیٹھ گیا جہاں وہ رات سویا تھا۔ لیٹی میں پہلی بار حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے پاؤں چادر سے نکالے اور زمین پر رکھے۔ واعد کی نظریں اس کے پاؤں پر پڑیں تو اس کے منہ سے ایک سچی چیخ برآمد ہوئی۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ کھڑا ہوا ایک خوف نے اسے گھیر لیا تھا۔ اس کا جسم اکڑ گیا تھا اور ہاتھوں میں جاپان نہ رہی تھی لیٹی کے پاؤں اٹلے تھے۔ وہ پھل پھری تھی۔

واجدہ کا دماغ سن ہو گیا تھا۔ زبان منگ اور حواس پر شدید خوف طاری ہو گیا تھا۔ وہ کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ میں شدید فطرت تھا۔ واعد کے سارے حواس غصہ جواب دے چکے تھے۔ وہ بدحواسی میں غصے پاؤں دروازے کی جانب دوڑا مگر راستے ہی میں لیٹی نے اس کا بازو پکڑ کر ایک جھٹکا دیا اور وہ ڈمگتا ہوا جا رہی تھی۔ وہ کچھ کہہ رہی تھی مگر اسے پتا نہیں چل رہا تھا۔ وہ بے ہوش ہونے لگا تو لیٹی نے پانی سے بھرا جگ اس کے منہ پر الٹ دیا۔ پانی پڑتے ہی وہ چیخنے لگا۔ رات جس کی آواز مدھر پائسری جیسی تھی۔ اب وہ ناگن کی طرح پھنکار رہی تھی۔

واجدہ کے پلے کچھ نہیں پڑ رہا تھا۔

وہ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا تو اس کے ذہن میں ایک ہی بات تھی کہ رات وہ کیا کر بیٹھا۔ جو ہوا تھا وہ اب اسے پہلے نہیں سکتا تھا۔ زندگی میں اس نے فیصد آپ کرتے ہیں اور باقی نوے فیصد اس کا رچا ہوتا ہے۔ وہ گڑبڑا ہوا معافیاًں مانگتا ہوا دونوں ہاتھ جوڑے ہوئے تھا۔ وہ مسلسل

وہ تیزی سے اٹھا۔ جیکٹ اوڑھ لی، بوٹ پہنے اور گھر کا دروازہ کھلا چھوڑ کر اوپر پہاڑ پر اپنے گھر کی جانب چل پڑا۔ راستے برف پاری سے ڈھک گئے تھے۔ اس کے قدم گھٹنوں تک برف میں ڈھنس رہے تھے۔ پھر بھی وہ جیسے تیسے اوپر چڑھتا رہا۔ اسے خبر بھی نہ تھی کہ وہ کب روانہ ہوا اور کب اپنے گھر کے سامنے پہاڑ پر پہنچا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اسے یہ سفر کرتے ہوئے سال گزر گئے۔ وہ کسی کمزور شاخ کی طرح لٹکڑا ہوا اور پھینچا تھا۔

گھر میں داخل ہوا تو ماں سامنے کمرے میں چوہا جلائے بیٹھی تھی۔ بیٹے کو اچانک اس حالت میں دیکھا تو بت

من گئی۔ حیرت اور صدمے سے پہلے تو کچھ لمبے بیٹھی رہی اور پھر اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے اس کی جانب نکلے پاؤں دیکھا تو وہ بڑی اور بڑھ کر اسے تمام لیا۔ وہ لڑکھڑا رہا تھا۔ وہ روتی بیٹھی اسے سہارا دے کر کمرے تک لائی۔ اسے چار پائی پر لٹایا۔ نگہ اس کے سر ہانے رکھا۔ اس پر رضائی اوڑھائی۔

ماں بیٹے سے رورور کر پوچھ رہی تھی۔ ”یہ تیرا حال کس نے کیا۔ کیا ہوا میرے بیٹے۔“

اسنے میں اس کا دوست شوکت آ پہنچا۔ واعد گرتا پڑتا جب گاؤں کی جانب آ رہا تھا تو کسی نے اس کے دوست شوکت کو خبر کر دی تھی۔

شوکت نے اس کی حالت دیکھی تو وہ بھی گھبرا گیا۔ اس نے ماں سے پوچھا کہ اسے کیا ہوا ہے۔ ماں روتی ہوئی بولی۔ ”میں تو یقینی روئیاں بنا رہی تھی کہ یہ گرتا پڑتا کھر میں داخل ہوا۔ میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اسے کیا ہوا ہے۔ یہ قبول بھی نہیں پا رہا تھا۔ میں نے پانی پلایا اور یہ بے ہوش ہو گیا۔“

شوکت نے پوچھا۔ ”اس کی بیوی کہاں ہیں۔“

ماں نے دوپٹے سے اپنے آنسو صاف کیے اور بولی۔ ”وہ بے چاری پچھلے چند دنوں سے برے برے خواب دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ بیٹی کو لے کر ماں کے پاس چل جاؤ۔ ذرا ذہن بدل جائے گا۔“

شوکت حیران تھا کہ واعد تو آنے سے پہلے خط لکھا کرتا ہے۔ اس بار اس نے کیوں نہیں لکھا۔ اس نے ماں سے پوچھا تو وہ بے ہوش بیٹے کا سر دباتے ہوئے بولی۔

”خط آیا ہوتا ہوتا کیوں نہیں جاتی، وہ تو اس کی راہ سمجھتی رہتی ہے۔“

ماں نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو وہ آگ کی طرح جل رہا تھا۔ وہ فوراً کھڑی ہوئی۔ ایک ڈبے سے چند جڑی بوٹیاں نکال کر اس کے لیے قہوہ تیار کیا، شوکت اپنے دوست کے قدموں میں بیٹھا ہوا تھا۔ ماں اور شوکت نے مل کر اس کے حلق میں قہوہ اٹھایا۔ وہ ذرا سی دیر کے لیے اپنی آنکھیں کھولیں۔ اپنی ماں کو تار دیکھتا اور پھر آنکھیں موندھ لیتا۔ کمرے میں مکمل خاموشی تھی اور صحن میں لگے صنوبر کے درختوں پر بے شمار کوئے آکر کانیں کانیں کر رہے تھے۔

واجدہ کے بھائی کو اطلاع ملی تو وہ بھی دوڑا چلا آیا۔

ماں نے اسے احوال بتایا تو وہ شوکت سے کہنے لگا کہ تم نیچے بنو۔ گاؤں جا کر فوری طور پر کپماؤنڈر کو لے آؤ۔ کپماؤنڈر علاقے کا واحد معالج تھا۔ شوکت فوری طور گھر سے نکلا۔ اسے آج سب کچھ بہت عجیب لگ رہا تھا۔ ایک دیوانگی اور اداسی اس گھر پر چھائی ہوئی تھی۔ لاکھوں کوؤں کی آوازوں نے گھر پر خوش ڈال دی تھی۔

واجدہ کو ہوش آیا تو اس لپک کر اس کے پاس پہنچی۔ وہ آنکھیں کھولے چمت کوک رہا تھا۔ ماں نے پوچھا۔ ”یہ کچھ کیا ہوا ہے۔ کس ظالم نے تیری یہ حالت بنائی ہے؟“

جواب میں وہ صرف چمت کی جانب دیکھتا رہا۔ ماں رونے لگی۔ بھائی کہنے لگا مجھے صرف نام بتاؤ وہ کون تھے؟ تمہارا بھائی بھی ساتھ نہیں ہے۔ اس علاقے میں چور ڈاکو تو کبھی نہ تھے۔ لگتا ہے کوئی باہر سے آیا ہے۔

واجدہ سخت مشکل میں پھنسا ہوا تھا۔ جورت کو ہوا تھا وہ بتا بھی نہیں سکتا تھا۔ اسے اپنی عزت کا بھی پاس تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ سب کو کیا بتائے کہ ان کی تلی ہو۔ ماں اور بھائی اسی کی جانب دیکھ رہے تھے۔ ان کی نظروں میں بہت سے سوال تھے۔ پھل پھری کا خوف علیحدہ تھا۔ اسے جبر جبری آ جاتی جب بھی یہ سوچتا کہ وہ اس کے کتنے قریب تھی۔ اسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ لاکھوں چوہیاں اس کے جسم پر رینگ رہی ہیں۔ ٹانگیں بے جان تھیں۔ شام قریب آ رہی تھی اور اس کی دہشت اسے بے جان کیے ہوئے تھی۔ اسے چڑیل کے الفاظ یاد آ رہے تھے کہ اگر تم رات کو نہ آئے تو میں آ جاؤں گی آگ کمرے میں نہ جلا تاں اور نہ تمہاری بیٹی کی لاش تمہیں ملے گی۔ اس کے الفاظ۔ یاد آئے تو بدن کو ایک جھٹکا لگا۔ وہ اس کے بارے میں سوچنا نہیں چاہتا تھا مگر وہ اس کے حواس پر چھائی ہوئی تھی۔

شام کے بعد شوکت کپماؤنڈر کو لیے پہنچا۔ اس نے تفصیل سے اس کا معائنہ کیا اور بڑی دانش مندی سے بولا۔ ”مردی کا بخار ہے۔ غصہ بے پانی کی پٹیاں رکھو۔ بخشی پلاؤ اور اسے آرام کی ضرورت ہے۔“ اس نے بخاری کو گولیاں دیں۔ ساتھ میں اور بھی دوائیں دے کر رخصت ہو گیا۔

لوگوں کے گھر اوپر چنے پہاڑ کی ڈھلوان پر بنے تھے۔ رات کا کالا ناگ روتی توکل چکا تھا۔ جنگل کے گیدڑ وقت سے پہلے چلانے لگے تھے۔ گھروں کے کتے لگاتار بھونکے جارہے تھے۔ پورا علاقہ برف سے ڈھکا تھا۔ غصہ نے ہر چیز کو اپنے کھینچے میں جکڑ لیا تھا۔ فضا سو گوار تھی اور لگتا

تھا کہ علاقے میں کوئی میت ہوگئی ہو یا کوئی موذی دبانے علاقے میں خوف پھیلا رکھا ہو۔

خوف کی کیفیت بھی بڑی بے نیام ہوئی ہے۔ پہلے وہ موت کا ہوا کسی مافوق الفطرت مخلوق کا کسی ڈراؤنے نتائج کا یا دولت کے چمن جانے کا۔ یہ خوف انسان پر صرف حاوی نہیں ہوتا بلکہ سارے ماحول کو، زمین اور آسمان کو بھی اپنے ساتھ کر کے باندھ دیتا ہے۔ خوف وہ بت ہے جو کسی مضبوط پتھر کا بنا ہوتا ہے اور اسے توڑنا ہمت کا کام ہے۔ خوف انسان کو سسک سسک کر پارتا ہے جس نے بھی خوف کا بت توڑ دیا وہ آزاد فضاؤں کا چھٹی بن گیا۔ اگر خوف کے ساتھ احساس گناہ بھی ہو تو پہلے اس کا ازالہ کیا جاتا ہے مگر واجد کے پاس تو کچھ نہ تھا جس سے وہ کفارہ ادا کر سکتا۔ ایک لمحہ پوری زندگی کو تہذیب کے رکھ دیتا ہے۔ واجد جو کہ ایک خطرناک سفر طے کر کے بخیر گاموں پہنچا تھا۔ آج اپنے گھر کی چار پائی پر پڑا ہشت اور خوف سے بلبل رہا تھا۔ یہ وہ بیماری تھی جس کا علاج شاید کسی کے پاس نہ تھا۔

وہ چار پائی پر مرضی اور ڈھلے لیٹا تھا اور اس شخص میں بھی پسینے سے شرابور تھا۔ کمرے میں صرف لائین جل رہی تھی۔ اس نے ماں سے کہا تھا کہ وہ دوسرے کمرے میں سوئے گا جہاں اس کی بیوی اور بیٹی سوئی تھی۔ اس کو ماں نے بتا دیا تھا کہ اس کی بیوی ماں کے گھر گئی ہے۔ وہ مطمئن ہو گیا کہ بیوی کی موجودگی میں وہ کس طرح اکیلے کمرے میں سوتا اور پل پل موت کا، چڑیل کا انتظار کر رہا ہوتا۔

وہ اس کمرے میں اکیلا تھا۔ دروازے کی کنڈی اس نے لگا دی تھی۔ کمرے میں لائین کی زرد روشنی ماحول کو اور ڈراؤنا بنا رہی تھی۔ گیدڑوں اور کتوں کے رونے کی آوازیں مسلسل اس کے کانوں میں پڑ رہی تھیں۔ شاید انہوں نے بھی کسی بلا کی چاپ بن گئی تھی۔

اس کی نظریں مسلسل کمرے کے دروازے کی جانب لگی تھیں۔ بھی زور کے جھکڑ چلنے لگے۔ باہر برف باری شروع ہو گئی تھی۔ ہواؤں کے زور سے دروازہ ہلتا تو بھی وہ دہل جاتا تھا۔ فضا میں ماتم کرتی سرد ہوائیں تھیں۔ رات کے بارہ بجے ہوں گے اور وہ لیٹا سمجھ کو کھوڑے جارہا تھا۔ کھلم کھلی ایسی تک نہ آئی تھی۔ وہ انتظار بھی کس کا کر رہا تھا۔ اس چڑیل کا جو اس کی موت کے درپے تھی۔ اچانک کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی اور اس کے منہ سے دہل دہل کر چیخ نکلی۔ حلق سوکھ گیا اور جسم پر لڑھ طاری ہونے

لگا۔ اس کے ہونٹوں سے کوئی الفاظ بھی نہ نکل رہے تھے۔ وہ ڈر سے خاموش رہا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اسے ماں کی آواز سنائی دی۔ ماں اس سے پوچھ رہی تھی۔ "بیٹا! تم سوئے نہیں؟"

"نہیں تو ہوں ماں۔"

ماں کی آواز ہمیشہ ڈھارس دیتی ہے۔ واجد کو بھی حوصلہ ملا اور بولا۔ "ماں بس سوئے والا ہوں، تم بھی سو جاؤ۔"

وہ دو بجے رات تک جاگتا رہا۔ ہر آواز پر اس کا دل دھڑکنے لگا۔ ہر جھکے پر اڑھ بیٹھتا۔ آہستہ آہستہ اس کے نہ آنے کا اطمینان اسے ہونے لگا۔ جیسے جیسے خوف کم ہوتا گیا ویسے ویسے آنکھیں پھول ہوتی گئیں۔ نیند تو سولی پر بھی آجاتی ہے۔ اس کی بھی آنکھ لگ گئی۔

اسی رات اس نے خواب دیکھا کہ وہ جنگل میں بھاگا جا رہا ہے۔ اس کی سانسیں پھولی ہوئی ہیں اور ہشت میں گھرا ہے۔ کچھ نامائوس چہرے اپنے منہ ڈھانپے اور ہاتھوں میں تلواریں لیے اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔ وہ چان بچانے کے لیے اپنی پوری قوت صرف کر رہا ہے۔ ارد گرد بلند وبالا درخت جن کی شاخیں برف سے ڈھکی ہیں اور اس کے دوڑتے قدم زمین پر پڑی برف میں چھن رہے ہیں۔ وہ پسینے سے شرابور ہو رہا تھا اور بخ بستہ ہواؤں کے جھکڑ ان منہ ڈھانپے چہروں کے ساتھ ساتھ اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔ وہ ہانپ رہا ہے۔ اس کی سانسیں دھنکی کی طرح چل رہی ہیں۔ وہ اس کے قریب سے قریب تر ہو رہے ہیں۔ وہ بے بس ہو کر گرنے والا ہے اور پھر وہ برف میں اوندھے منہ مگر پڑا تھا۔ اس کا پیچھا کرتی آوازیں نزدیک آچکی ہوتی تھیں۔ ایک شور تھا جو اس کے عقب میں ختم کیا تھا۔ وہ خوف کے مارے اپنا سر اٹھاتا ہے تو سامنے اٹلے پھروں والی کھڑی مسکرا رہی ہوتی ہے۔ اس کی مسکراہٹ میں زہر ہے۔ اس کی آنکھیں چمک رہی ہوتی ہیں اس کی آنکھوں میں خوف ہے۔ اس کا چہرہ دمک رہا ہوتا ہے اس کے چہرے کے ہر نقش میں موت ہے۔ واجد کے منہ سے دہل دہل کر چیخ برآمد ہوتی ہے اور اسی لمحے وہ بیدار ہو جاتا ہے۔

اس کا بدن پسینے میں نہایا ہوا تھا اور سانس ایسے چل رہی تھی کہ جیسے وہ میلوں بھاگتا رہا ہے۔ وہ چار پائی پر اڑھ کر بیٹھ جاتا ہے۔ لائین کی روشنی کمرے کے ماحول کو بڑا سرا رہا رہی تھی۔ اسی وقت وہ کسی بلی کی طرح دبے پاؤں چل کر اس

کے سامنے اکھڑی ہوئی۔

وہ پچھلی پچھلی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ اب اس میں چھینے، رونے اور گرگڑانے کی ہمت بھی باقی نہیں تھی جس طاقت پر اسے تازہ تھا، وہ سب کچھ چکا تھا۔ وہ اس سے کہتی ہے۔ "تم کیا سمجھتے تھے کہ میں نہیں آؤں گی؟ تم اگر زمین کی تہہ میں بھی ہوئے تو وہاں سے بھی تمہیں نکال لاؤں گی۔ یہ بند دروازے میری راہ نہیں روک سکتے۔" وہ دھیسے لہجے میں بات کر رہی تھی۔ واجد کی نگاہیں جھکی تھیں۔ وہ اس کی جانب دیکھ بھی نہیں پارہا تھا۔

باہر گیدڑوں اور کتوں کا شور اس کے آتے ہی ختم چکا تھا۔ ایک مکمل سکوت چاروں طرف چھایا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وقت ختم کیا ہو۔ فضا وہیں ٹھہر گئی ہو اور دھڑکنیں رک گئی ہوں۔ وہ اس سے متوجہ نہ لہجے میں دونوں ہاتھ جوڑ کر کہتا ہے۔ "کیا میری معافی کسی طرح ہو سکتی ہے۔ مجھ پر رحم کرو۔ میری بیٹی ہے، بیوی ہے، مجھ سے جو غلطی ہوئی ہے اس کی اتنی بڑی سزا نہ دو۔ میرا پیچھا چھوڑ دو۔ میں تم سے التجا کرتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے اس کے آنسو نکل پڑے۔

وہ کھڑی مسکراتی رہی۔ اسے روتے دیکھتی رہی اور پھر بولی۔ "تم اس دورِ رحم ہم میں بھی نہیں ہوتا۔ ہم نے یہ الفاظ نہ ہی سنے ہیں اور میں تو تمہیں پوری کی پوری آئی ہوں۔" اس کے لہجے میں زہر تھا، کھنکھائی تھی۔ اس کے الفاظ اس کے چہرے کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ اسے کسی طرح سے بھی نہیں لگ رہا تھا کہ اس حسین چہرے کے پیچھے ایک چڑیل کھڑی ہے، ایک ظالم اور جاہل لڑکی جس کو کسی پر بھی ترس نہیں آسکتا۔

اس نے لائین کی لوہریم کی اور اپنا مکروہ کھیل شروع کر دیا۔ اسے اب کھن آ رہی تھی۔ خوف سے بدن جھٹکے کھا رہا تھا۔ فجر کی اذان کہیں دور سے فضاؤں میں گونجی تو وہ ایک جھٹکے کے ساتھ چار پائی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ نیم بے ہوش پڑا تھا۔ اسے معلوم بھی نہ ہوا کہ وہ کب اور کیسے یہاں سے گئی۔

دوسرے دن بھی رات کو یہی ہوا۔ اس کی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔ بخار جان نہیں چھوڑ رہا تھا۔ اب اس کے جسم کو جھٹکے لگتے رہتے تھے۔ اس کی بیوی کو زہر پہنچا ہی گئی تو وہ نصیبوں کی ماری روٹی چینی اگلے دن نیکی کو لے کر آچکی۔

بیٹی کو دیکھ کر وہ اور زیادہ رونے لگا۔ بہت دیر سے سینے سے

چھٹائے لیٹا رہا۔ بیوی الگ روتی جا رہی تھی۔ شوکت اور اس کا بھائی اسے رونے کی وجہ پوچھتے تو وہ اور رونے لگتا۔ گاؤں کے مولوی صاحب کو دم کے لیے بلایا گیا۔ انہوں نے پڑھ کر پھر بھوکا۔ وقتی افادہ ہوا اور ان کے جاتے ہی پھر سے وہی حالت ہوگئی۔

بھائی اور دوست بھی پریشان تھے۔ دونوں ایک ساتھ کمرے میں آئے۔ دروازہ بند کیا پھر بھائی اس سے بولا۔ "میں نیچے گاؤں میں گیا تھا۔ گھر کا ٹالا ٹوٹا ہوا تھا۔ تمہارا بیک بھی وہیں تھا۔ صاف ظاہر ہے کہ تم نے رات وہیں گزار دی تھی۔ وہاں فروٹ کے چھلکے بھی پڑے تھے اور یہ ظاہر کر رہے تھے کہ جب گھر میں آئے تم پہلے چھلکے تھے پھر رات میں کیا ہوا ہے نہیں معلوم نہیں۔ اب تم ہی بتا سکتے ہو تاکہ ہم اس کا تو ذکر نہیں۔"

اس کا دوست شوکت کہنے لگا۔ "مجھے تو کسی جن بھوت کی کارروائی لگتی ہے۔ ہمارے علاقے میں بہت پہنچے ہوئے لوگ موجود ہیں جو شیطانی مخلوق کو قابو لینے کے طریقے جانتے ہیں تم ہمیں کچھ بتاؤ گے بھی تو۔۔۔ ہم کچھ کر سکتے ہیں۔"

وہ انکار کرتا رہا کہ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ مجھے بس سردی کا بخار چڑھ آیا ہے۔ ان دونوں نے بھی ہمت نہیں ہاری اور آخر کار وہ بتانے پر رضی ہو گیا۔

وہ دونوں سن رہے تھے اور بے یول رہا تھا۔ دونوں بے یقینی اور حیرت سے اس کی کہانی سن رہے تھے۔ انہیں اس واقعے پر یقین کرنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ بھائی اور دوست کو واجد کی شخصیت کا معلوم تھا کہ وہ جھوٹ، دروغ گوئی اور بناوٹ سے بہت دور ہے۔ ان دونوں کے پاس صرف دو اندازے رہ گئے تھے کہ یا تو اس کا داغ الٹ گیا ہے اور یا بے یول رہا ہے واجد سب سنا کر خاموش ہوا تو وہ دونوں حیرت سے ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہے۔

بہت دیر وہ بیٹوں خاموش رہے۔ واجد اپنی تھکانا کر چار پائی پر سیدھا لیٹ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں ملتی تھیں جن میں آنسو بھرے تھے۔ اس کا چہرہ تین دن میں کھلا کر رہ گیا تھا۔ وہ شکل سے سالوں کا مریض لگ رہا تھا۔ وہ دونوں اپنی اپنی سوچوں میں بیٹھے رہے۔ اگر یہ سب سچ تھا تو وہ جانتے تھے کہ اس کی جان کو شدید خطرہ ہے۔ اس قسم کے واقعات ان علاقوں میں اکثر ہوتے رہتے تھے۔ شوکت کو معلوم تھا کہ چند عرصہ پیشتر اس سے ملتا جلتا واقعہ کسی دوسرے گاؤں میں

ہوا تھا جہاں ایک نوجوان کو گردن کی بڑی توڑ کر قتل کر دیا گیا تھا۔ حالانکہ اس کا کمر اندر سے بند تھا اور اس کی لاش چارپائی پر سیدھی پڑی تھی۔
کچھ دیر بعد شوکت اٹھا اور اس کے بھائی کو پاہر آنے کا اشارہ کیا۔ دروازے کے دونوں پٹ بند کر کے وہ صحن میں کھڑے تھے۔ صحن کے درخت پر لگتا تھا کہ گاؤں کے سارے کوئلے نے قبضہ کر لیا ہو۔ ان کی کانیں کانیں کے شور سے بات کرنا مشکل ہو رہی تھی۔ اس کے بھائی نے پہلے بھی کئی بار ان کوئلے کو بھگایا تھا مگر وہ دوبارہ شور مچانے آ بیٹھے تھے۔

شوکت نے اس کے بھائی کو کہا کہ وہ اپنی ماں کو ساری کہانی بتا دے۔ اس کے خیال میں ماں اور بیوی کو باخبر رکھنا ضروری تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ ان کے پاس ہو سکتا ہے اس کے توڑ کا کوئی کچھ بھی موجود ہو۔ وہ صحن ہی میں کھڑے باقیں کر رہے تھے کہ اس کی ماں کمرے سے باہر آ گئی۔ آتے ہی وہ بولیں۔ ”میری بات مان لو کہ یہ جنوں کی کارستانی ہے۔ میرا گرو و جوان تین دن میں آدھا رہ گیا ہے۔ وہ کون سی مصیبت ماری پتاری ہے کہ تین دن پہلے لگی اور اسے چاٹ گئی۔“

وہ دونوں ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ شوکت نے کچھ دیر بعد آنے کا کہہ کر اپنے قدم باہر کی جانب بڑھا دیے۔ وہ اس کی ماں کے سامنے یہ کہانی بیان کرتے ہوئے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔

اس کی ماں نے اپنے چھوٹے بیٹے کی زبانی پوری کہانی سنی تو اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ پھر سر پینٹے ہوئے بولی۔ ”یہ وہی موتی چڑیل ہے جس کے قصے میں بچپن میں سنتی تھی۔ وہ تو غائب ہو گئی تھی۔ ہماری بری قسمت کہ اب دوبارہ ہمارے ہی گھر پر مٹی ہے۔“

واجد کی بیوی ہنسا بکا بیٹھی یہ سب سنتی رہی۔ اب وہ جیسے کسی سیکے میں تھی۔ وہ خالی خالی نظروں سے اپنی ساس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

ماں کا خیال فوری طور پر کھائی لگے گاؤں میں بزرگ خاتون دیالی کی طرف گیا۔ وہ کہنے لگی۔ ”دیالی کے علاوہ کوئی چارہ کر نہیں۔“

اسی سالہ دیالی پورے علاقے میں اپنے علم، فراست اور پرہیز گاری کی بدولت ایک بہت جبرک اور باعزت ہستی تھیں۔ لوگ اس کا نام اور ذکر اب بھی بہت عزت و احترام

سے کرتے ہیں۔ سر کے بال دودھ کی طرح سفید تھے اور سفید وہ پناہ دیتی تھیں۔ وہ اپنے علم و عمل سے کالے جادو کا توڑ اور ماورائی قوتوں کو اپنے قابو میں کرتی تھیں۔ دور دور سے لوگ اپنے مسائل اور ضرورتیں لے کر اس کے دروازے پر دستک دیتے تھے۔ اس کی ماں نے اپنے چھوٹے بیٹے سے کہا کہ ابھی کے ابھی دیالی کے پاس جانا ہو گا اور میں بھی تمہارے ہمراہ چلوں گی۔ وہ انکی اور اپنی جادو اور کھربو سے کہنے لگی کہ تم واجد کا خیال رکھنا۔ اس سے کسی بات کا ذکر نہ کرنا بلکہ اس کے ساتھ زیادہ پیار و محبت سے پیش آنا۔

چھوٹے بیٹے نے کہا کہ شوکت کو بھی ساتھ لے لینے ہیں۔ اس طرح وہ تینوں گاؤں سے باہر نکلے اس وقت صبح کے دس بج رہے تھے۔ کھائی لگہ وہ بیٹے تو۔ دوپہر ہو چکی تھی۔ دیالی کا گھر کون نہیں جانتا تھا۔ بیٹے سے بھی پتا کرتے تو وہ دور پہاڑ کے دامن میں ایک بے گھر کی جانب اشارہ کر دیتا۔ جہاں بادل جھکے تھے اور سرد دھواں اتر رہا تھا۔ وہ پہاڑی راستوں پر چلتے ہوئے وہاں جا پہنچے۔

دیالی کے آستانے پر نہ کوئی نشان تھا اور نہ کوئی جھنڈا لہراتا تھا۔ مٹی چار دیواری بہت سے درختوں سے گھری تھی۔ ہوا سے ٹہنیاں مل رہی تھیں۔ شوکت محسوس کر رہا تھا کہ ان ہواؤں میں تندی اور دھشت کے بجائے ایک سکون ہے۔ عقیدت مندر جھکاے کھڑکی کے بوسیدہ دروازے سے اندر جاتے اور واپس نکلنے والے چہرے پر اطمینان ہوتا۔ ایک ٹھہری ہوئی کیفیت تھی جو ان سب کے اضطراب میں کمی لے آتی تھی۔

وہ گھر میں داخل ہوئے اور دونوں مردانہ حصے میں جا کر اور لوگوں کے ساتھ زین پر بچھی در پر بیٹھ گئے۔ واجد کی ماں زنانہ حصے میں جا کر بیٹھ گئی۔ سب خاموش بیٹھے تھے۔ کوئی دوسرے سے سرگوشی بھی نہ کرتا تھا۔ کمرے کے اندر جدت تھی۔ وہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔

کچھ دیر بعد انہیں بلوایا گیا۔ ماں اور وہ دونوں ایک اور دروازے سے نیم تاریک بڑے کمرے میں داخل ہوئے۔ سامنے ایک چپترہ تھا جس پر عمر رسیدہ مائی بیٹھی تھی۔ چہرے پر جھریاں اور سر پر سفید چادر تھی۔ بیچ میں ایک آتش دان تھا اور لوہے کا ایک ایک پائپ وہاں سے ہوتا چھت کے پار جا رہا تھا۔ لکڑی کی جمل رہی تھیں۔ چپترے کے سامنے زین پر دریاں بچھی تھیں۔ وہ تینوں دیالی کے

سامنے جا بیٹھے۔ جلتی لکڑیوں سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ وہ سر جھکائے منڈوب بیٹھے تھے اور دیالی آنکھیں نیم داکھتے زیر لب کچھ پڑھ رہی تھی۔
وہ بیٹھ گئے تو دیالی کے منہ سے سرسراہٹ برآمد ہوئی۔ آواز نہ تھی بلکہ جیسے کوئی لہریں فضا میں تیرتی ان تک پہنچ رہی ہوں۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”اپنی مشکل مختصر الفاظ میں مجھے بتاؤ۔ زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس کے لہجے میں دبدبہ تھا۔ اس کی آواز میں ایسی کوئی بات تھی کہ وہ سب زیادہ ادب ہو گئے تھے۔

واجد کے بھائی نے اپنا گلہ صاف کرنے کے بعد مختصر طور پر شروع سے آخر تک کی کہانی دیالی کے گوش گزار کی۔ وہ آنکھیں بند کیے اور سر جھکائے کچھ بھی توجہ سے اس کی بات سنتی رہی۔ اس میں بلکی کی جنبش بھی نہ تھی۔ بھائی کی آواز کے علاوہ گہرا سکوت تھا جیسے وہ اپنے رب سے باتیں کر رہا ہو۔ واقعہ تمام ہوا اور پھر مصیب خاموشی چھا گئی۔ وہ سب خاموش بیٹھے تھے۔ دیالی زیر لب کچھ پڑھے جا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر تشویش کے سائے لہرا رہے تھے۔

پھر دیالی نے اپنا سر اٹھایا۔ اس کے چہرے کی سلوٹیں بڑھ گئی تھیں۔ وہ بھانپ گئی تھی۔ پریشانی کی لہریں اس کے چہرے پر تھیں۔ اس نے اپنی آنکھیں کھولیں تو جیسے دو شعلے بھڑک رہے ہوں۔ جیسے دو ہیرے رکھے ہوں اور شعاعیں منکس ہو کر ان تک پہنچ رہی ہوں۔ آنکھوں میں گہری تشویش اور بے انتہا چٹک تھی۔ وہ کچھ لمحے خاموش رہی۔ کہیں سوچوں میں کم غلاؤں میں کتنی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولی۔ ”یہ بد بخت پھر آگئی۔ سالوں پہلے اسے علاقے سے چلا کیا تھا۔ اس کا دوبارہ آنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔“

وہ پھر کہیں سوچوں میں کھو گئی۔ اپنے ساتھ رکھے مٹی کے ایک برتن سے کچھ بڑی بوٹیاں نکالیں اور انہیں آگ کے شعلوں پر پھینک دیا۔ شعلے ایک لمحے کوئی فٹ بلند ہوئے اور پھر آہستہ آہستہ نیچے آتے گئے۔

وہ آہستہ سے بولی۔ ”اس نے اپنا وعدہ توڑا ہے۔ وہ بہت زیادہ طاقت ور تھی۔ اسے قابو میں دوبارہ لانا ایک مشکل کام ہے۔“ وہ واجد کی ماں کی طرف دیکھ کر بولی۔ ”تمہارے بیٹے کی زندگی کو خطرہ لاحق ہے۔“

یہ سن کر ماں نے اپنی جیب منہ پر ہاتھ رکھ کر دبا لی مگر اسے دیکھ کر ہر ایک محسوس کر سکتا تھا کہ اس کے اندر بے پناہ

شور برپا ہے۔
دیالی پھر سب سے مخاطب ہوئی۔ ”اللہ نے کالے جادو اور شیطاں کے بارے میں ہمیں آگاہ کر دیا ہے۔ وہ اپنی شیطانی قوت اور اپنی بے پناہ قوت سے انسانوں کو ضرر پہنچاتے رہتے ہیں۔ مٹی لوگ ان کے وجود سے انکاری ہوتے ہیں تو وہ اللہ کے فرمان کو بھٹا رہے ہوتے ہیں۔ جس طرح کوئی پیار پڑتا ہے تو ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے۔ اسی طرح عقل مند جب کسی آئینی سائے کا یا کسی جادو کا شکار ہو تو صاحب علم و عمل کے پاس آتا ہے۔ اس چڑیل نے دراصل مجھے لاکا رہا ہے۔ سالوں پہلے میں نے اسے ذیل و رسوا کر کے علاقے سے باہر پھینک دیا تھا۔ وہ اب بھتی ہے کہ دیالی بوڑھی ہو گئی ہے، مگر در ہو گئی ہے اسی لیے وہ دوبارہ یہاں آدھکی۔ اس نے ایک شکار کے ذریعہ مجھ تک پیغام پہنچایا ہے۔ میں کو کہ بہت بوڑھی اور کمزور ہو گئی ہوں پر میرا علم کمزور نہیں ہوا۔ معلوم نہیں کہ وہ کون سی نئی طاقت کے ساتھ وارد ہوئی ہے، مجھے نیا دکھانا چاہتی ہے۔ اس جنگ میں کسی ایک کی جان جانا ضروری ہے۔ تمہارے بیٹے کی یا میری اس نامراد کی۔“ پھر دیالی نے اوپر کی جانب آنکھیں اٹھائیں اور کہا۔ ”یا اللہ جی کو قوت دے اور شیطانی طاقتوں سے اپنے انسانوں کو بچا۔“

اس نے پھر اپنی دہکتی ہوئی آنکھیں ان سب پر ڈالیں اور نے تلے لفظوں میں کہا۔ ”میری بات کو دھیان سے سنو۔ تم لوگ اب جادو اور کسی سے کچھ مت کہنا۔ نہ تو مغلوب لڑکے کو ابھی کچھ بتانا ہے اور نہ کسی اور کو۔ وہ آج رات کو بھی آئے گی۔ نہ تم اس کو روک سکتے ہو اور نہ اس وقت میں۔ رات کو میں اپنے علم سے پتا لگاتی ہوں کہ اس کا مقصد کیا ہے، وہ کیوں آئی ہے۔ کل صبح تم لوگ سواری کا انتظام کر کے مجھے لینے آ جانا۔ میں وہاں آکر آپ لوگوں کو کچھ بتا سکوں گی۔“

اس وقت دیالی کا چہرہ سستا ہوا لگ رہا تھا۔ وہ برسوں کی پیار لگ رہی تھی۔ شاید اس خبر نے اسے دھچکا پہنچایا تھا کہ شکست خوردہ پھل جیری دوبارہ لوٹ آئی ہے، جیسے ہی دیالی نے بات ختم کی۔

واجد کی ماں نے روتے ہوئے پوچھا۔ ”میرا بیٹا ٹھیک تو ہو جائے گا۔“

دیالی کے لہجے میں اداسی اتر آئی تھی۔ وہ بولی۔ ”ناممیری کفر ہے۔ اب کی بار اس کم بخت نے میرے

بڑھاپے کو ڈھال بنایا ہے۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتی کہ وہ ہمارے
کی یا میں سمجھتیوں گی۔ پھر اس نے ان سب کو اٹھ کر جانے کا
کہا اور بولی۔ ”یا اللہ میں بہت کمزور ہوں۔ تو کمزوروں کا
رب ہے۔ اپنے معاملات تیرے سپرد کرتی ہوں۔ مرنے
سے پہلے میری عزت رکھ لے۔“
وہ تینوں واپس اپنے گھر کو چلے آئے۔ راستے بھر وہ
خاموش تھے کیونکہ دیالی نے انہیں صاف امید بھی نہیں
دلوای تھی۔ وہ بیٹھے بیٹھے ایک مصیبت کا شکار ہو چکے تھے
اور امید کا دیباغ بھرا تھا۔

وہ گھر پہنچے تو شام اتر رہی تھی۔ لاتعداد کووؤں نے کل
کی طرح آج بھی درخت پر قبضہ کر رکھا تھا اور ان کی کرخت
آوازیں دلوں کو چیر رہی تھیں۔

سب کے دل مضطرب تھے۔ ماحول اداس تھا اور فضا
ویران دکھتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ زمین و آسمان پر یاسیت
چھائی ہے۔ وہ کمرے میں داخل ہوئے تو واجد بھڑکے پ
رہا تھا۔ پچھلے چند دنوں میں اس کا خون خچر گیا تھا۔ زرد اور
کھلایا ہوا چہرہ، لاغر بدن اور آنکھوں میں خوف۔

رات واجد کی بیوی اور بیٹی ماں کے پاس سوئی تھیں۔
واجد کمرے میں اکیلا تھا اس نے کمرے کے دروازے کی
کنڈی نہیں لگائی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ ہر حالت میں بے
سود تھا کیونکہ اس نے تو چھپکلی بن کر بھی کمرے میں داخل
ہو جاتا تھا۔ باہر سرد ہواؤں کے پھیرے پکارا رہے تھے۔ بار
بار دروازے کے پت کھول دیتے تھے۔ گھانٹوں سے
گیدڑوں کے چلانے کی آوازیں آرہی تھیں اور کتے بے
تحاشا بھونکے جا رہے تھے۔ فضا میں ایک نامعلوم سا خوف
تھا جو سب کے دل و دماغ میں بیٹھ چکا تھا۔

وہ رات کے تیسرے پہر پھر نمودار ہوئی۔ اس کے
چہرے پر مسکراہٹ کی بجائے وحشت تھی۔ اس کا چہرہ
بمیانک لگ رہا تھا۔ واجد نے اس سے کہا۔ ”مجھ پر رحم کرو
کہ ایک ہی بار میری جان لے لو۔ میں اب اس اذیت میں
نہیں رہ سکتا۔“ وہ رو پڑا تھا۔

چڑیل کے تیور غراب تھے۔ وہ غصے میں بولی۔ ”یہ
دیالی اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہے۔ وہ اور وقت تھا جب اس
نے مجھے زیر کیا تھا۔ اب میں اسے فنا کر کے دم لوں گی۔“
پھر وہ واجد کی آنکھوں میں دیکھنے ہوئے بولی۔ ”تم تو چارہ
تھے۔ میرا اصل شکار تو دیالی ہے۔ میں نے اس سے پرانا
حساب چکانا ہے۔ اس نے مجھے دھوکے سے جکڑ لیا تھا اب

میں اس کی اوقات بتاؤں گی۔ میں ہر رات تمہارے پاس
آؤں گی۔ دیالی کو قتل کرتی ہوں کہ اگر روک سکتی ہے تو مجھے
روک لے۔“

اس نے پھر واجد کے ساتھ گھٹاؤ ناعمل شروع کیا۔ وہ
اب اسے اپنے دانتوں اور ناخنوں سے نوچ بھی رہی تھی۔
جاتے جاتے وہ بولی۔ ”دیالی آئے تو اسے یہ دھم دکھا دینا
اور اس سے بولنا کہ اگر تمہیں نیست و نابود نہ کیا تو میرا نام
بھی.....“ پھر وہ ہنستی ہوئی چلی گئی۔

دوسرے دن کا سورج طلوع ہوا اور کوہے پرواز
کرتے اس درخت پر آ بیٹھے۔ پھر وہی شور اور پھر وہی
خوست گھر کے دروازے پر بٹا رہی تھی۔

واجد کے بھائی اور شوکت نے اپنے کچھ دوستوں کو
تیار کیا اور کھائی کھا گڑوں میں دیالی کو لینے چلے گئے۔ انہوں
نے ایک ڈولی کا انتظام کیا تھا تا کہ اسے آرام سے لائیں۔
دو پہر کے وقت وہ واپس آئے۔ دیالی ان کے ساتھ
تھی۔ حالانکہ وہ کہیں آتی جاتی تھی۔ سو ان کے پاس
چل کر جاتے تھے۔ دیالی کی بنجوسہ میں آمد یہ ظاہر کرتی کہ
اب کی بار معاملہ بہت گھمبیر ہے۔ یہ دیالی کی جنگ کی کیونکہ
چڑیل نے دیالی کو براہ راست لٹکارا تھا۔ وہ دیالی کے
علاقے میں دوبارہ گھس آئی تھی۔ یہ علم والوں کی باتیں تھیں
اور وہی جانتے تھے کہ کس معاملے کی کڑیاں کہاں ملتی ہیں۔
یہ صاحب نظر لوگوں کے معاملات تھے۔ وہی جانتے تھے کہ
کس مسئلے کو کس طرح پرلے جا کر سلجھنا ہے۔
دیالی گھر کے سامنے پہنچی اور بولی۔ ”مجھے یہیں اتار
دو۔“

ڈولی کو زمین پر رکھا گیا اور اسے عزت و احترام سے
اتارا گیا۔ وہ ڈولی سے باہر آئی۔ گھر کو دیکھا اور تادیر اسے
بھتی رہی۔ پھر نظر میں اٹھا کہ آسمان کی جانب دیکھا اور
بولی۔ ”یا اللہ! میری مدد کر میرا علم کچھ نہیں جب تک تیری
نصرت میرے ساتھ نہ ہو۔ اب کی بار بہت مشکل منزل
آپڑی ہے تیری مدد مانگتی ہوں۔“

وہ گھر میں داخل ہوئی تو درختوں پر شور کرتے کوہے
ایک دم چپ ہو گئے۔ ایسے کہ سب کو ایک ساتھ سانپ سونگھ
گیا ہو۔ یہ اشارہ تھا کہ دیالی اس گھر میں داخل ہوئی ہے۔
اسے واجد کے کمرے کی جانب لے جایا گیا۔
دروازے پر کھڑکی کر اس نے سب کو پیچھے رہنے کا اشارہ کیا۔
اس نے دلہیز کے پار قدم رکھا تو واجد بڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ وہ

پہنچی پھنی نظر سے دیالی کو دیکھ رہا تھا۔

دیالی تادیر واجد کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ وہ
خاموش تھی مگر زیر لب کچھ پڑھتی جا رہی تھی۔ اس کی چار پائی
کے گردنیں چکر کاٹنے اور اپنا بڑھنا جاری رکھا۔ پھر وہ
کمرے کے ہر کونے میں گئی اور کچھ دیر پڑھتی رہی اور بعد
میں پھونک دیا۔ اس نے اشارہ کیا اور اپنے لیے کرسی
منگوائی۔ پھر کرسی پر بیٹھ کر تادیر کچھ پڑھتی رہی۔ جیسے جیسے
وقت گزرتا گیا اس کا چہرہ سرخ سے سرخ ہوتا گیا۔ آنکھیں
سرخ ہو گئیں اور اس کا جسم کپکپانے لگا۔ اس پر لرزہ طاری
ہو رہا تھا اور پھر وہ اچانک ختم ہوئی۔ اس نے اپنی آنکھیں بند
کر لیں۔ اس نے پھر کمرے میں جا رہوں جانب پھونکا تو
واجد کو ایسا محسوس ہوا کہ کمرے میں کچھ فتنے کی دیواریں تھیں
جو چٹاخ سے ٹوٹ گئی ہوں۔ ایک تناؤ چھایا تھا جو پھونکنے
سے نرم گداز ماحول میں بدل گیا ہو۔ اس نے اپنی ایک پوٹی
سے چار لوہے کی سیمیں نکالیں۔ ان پر دم کیا اور واجد کے
بھائی سے بولی۔ ”انہیں کمرے کے چاروں کونوں میں گاڑ
دو۔“

دیالی دیواریں تھیں، ہاتھ کے دھاؤں سے ہی وہ دیوار
میں پیوست ہو گئیں۔ پھر اس نے پوٹی سے دھاگا نکالا اور
اس کے بھائی سے کہا کہ اسے ایک میل سے دوسری تک
باندھ دے۔ اس نے عمل پورا ہوا اور پھر اس نے کمرے کی
دیواریں پر اپنے دونوں ہاتھ پھیرے۔ پھر ایک تعویذ نکالا
اور واجد کی ماں سے کہا کہ اسے پانی کے مٹکے میں ڈال دو،
سب گھر والے اس مٹکا پانی پئیں۔

یہ سب کر کے وہ گھر کے چھوٹے سے صحن میں آئی۔
اپنی دائیں ہاتھ کی شہادت والی انگلی آسمان کی جانب اٹھائی
اور کچھ پڑھنے لگی۔ تقریباً دس منٹ وہ کچھ پڑھتی رہی۔ پھر
سب گھر والوں کو سامنے کھڑا کیا اور باری باری سب پر
پھونکا۔ پھر بولی۔ ”وہ بد بخت اب اس کمرے میں داخل
نہیں ہو سکے گی مگر وہ آسانی سے پیچھے ہٹنے والی نہیں ہے۔
میں یہاں سے جا رہی ہوں۔ چار پانچ دن میں صوفائی سے
یوسف یہاں آئے گا۔ اسے پیغام مل چکا ہے۔ ان دنوں وہ
کسی ضروری کام میں پھنسا ہوا ہے۔ وہ یا تو اپنی جان دے
دے گا یا پھر اس کی جان لے جائے گا۔ وہ میرا شکار ہے
اور شیاطین کو اپنی انگلیوں پر نچاتا ہے۔ گھر والے اطمینان
سے رہیں۔ وہ کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ باقی سب کا اللہ
محافظ ہے۔“ یہ کہہ کر وہ زور زور سے کلمہ پڑھتی گھر سے باہر

چلی گئی۔
رات آئی اور ساتھ ہی خوف و اطمینان دونوں
کیفیتیں لے آئی۔ خوف چڑیل کے آنے کا اور اطمینان
دیالی کے دم درود کا جو وہ آج کر کے گئی تھی۔ کمرے میں
لائٹن روشن تھی۔ مدھم سی لرزتی زرد روشنی کمرے میں پھیلی
ہوئی تھی۔ فضا میں مکمل خاموشی تھی۔ آسمان صاف تھا اور
تھوڑا سا ہوا چاند ہیں کہیں اٹکا ہوا تھا۔ نہ ہوا چل رہی تھی اور
نہ ہی درختوں کی ٹہنیوں میں کوئی سرسراہٹ تھی۔ یہ سکوت
کسی انجانے خطرے سے گھر کے کینوں کو ڈار رہا تھا۔ رات
اپنے تیسرے پہر میں داخل ہوئی اور پھر اچانک گیدڑ کے
چلانے اور کتوں کے بھونکنے کی آوازیں چاروں جانب سے
آنا شروع ہو گئیں۔ پھر ایک دلخراش چیخ صحن میں بلند ہوئی
چیخ اتنی بلند تھی کہ گھر کے کینوں کے کانوں کے پردے پھٹنے
لگے۔ واجد چار پائی پر پریشان بیٹھا تھا اور وہ کھٹکی باندھے
کمرے کی چھت کو گھور رہا تھا۔ اس کی ماں، بیوی اور بھائی
سامنے فرش پر سہجے سہجے بیٹھے تھے۔ دیالی ان سے کہہ گئی
تھی کہ وہ تم لوگوں کو ڈرنا سکتی ہے مگر نقصان نہیں پہنچا سکتی۔
اس نے بھی سے تاکید کی تھی کہ واجد کی بھی حالت میں اپنے
کمرے سے باہر قدم نہ رکھے۔ دیالی نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ
حلقہ صرف واجد کے گرد دے سکتی ہے کیونکہ چڑیل کا شکار
صرف وہی ہے۔

گھر کی چھت ٹھن کی تھی اور اس کی ساخت خردلی
تھی۔ کچھ دیر بعد چھت پر پتھر برساتا شروع ہو گئے۔ ٹھن کی
چھت سے پتھر گراتے تو ایک شور اٹھتا واجد کی بیٹی اٹھ گئی
تھی۔ پتھر مسلسل برس رہے تھے اس شور سے اس کی بیٹی
رونے لگی۔ واجد اپنی چار پائی پر بسے سالیٹا تھا۔ بیٹی کے
رونے کا اس پر کوئی اثر نہ تھا۔ اس نے بیٹی کی طرف مڑ کر بھی
نہ دیکھا تھا۔ پھر پتھر برساتا بند ہو گئے۔ ہوا رک گئی اور سکوت
چھا گیا۔ کچھ دیر تک سکوت چھایا بار اور پھر کسی کی سسکیوں کی
آواز صحن سے آنے لگی۔ رونے کی آواز بھی مدھم ہو جاتی اور
کبھی بڑھ جاتی۔ پھر اتنی بڑھی کہ انہیں کانوں میں انگلیاں
ٹھونسنی پڑیں۔ رونا ایسا تھا کہ جیسے بلائیں ماتم کر رہی ہوں۔
سب آہے لگتی اور درد و شریف پڑھ رہے تھے۔ یہ سلسلہ
رات بھر جاری رہا۔ کبھی پتھر برستے کبھی رونا شروع ہو جاتا
اور کبھی صحن میں تیز ہوا چلنے لگی۔ جب فجر کی اذان مسجد سے
آئی تو سب کچھ ختم گیا۔ انہیں ایسا لگا کہ ایک ہیولا سا صحن
سے اٹھا اور آسمان کی جانب اڑ گیا ہو۔ کچھ دیر وہ وحشت کے

عالم میں بیٹھے رہے مگر باہر مکمل خاموشی تھی۔ نماز پڑھنے کے بعد کہیں وہ جا کر سوئے۔

اگلے دن وہ سبے ہوئے اٹھے۔ صبح میں پتھر بکھرے پڑے تھے۔ انہوں نے کل کرائیں سمیٹا اور اس کا بھائی انہیں باہر پھینک آیا۔ وہ واحد کے کمرے تک تو نہ پہنچ سکی تھی مگر رات بھر اس نے باہر اودھم مچائے رکھا تھا۔

دن چڑھا اور سورج نے اپنا بچہ دکھا دیا۔ اس کی دھوپ میں تمازت تھی۔ ایک حدت تھی جس کی سب گھر والوں کو ضرورت تھی۔ چند چار پائیاں صحن میں بچھا کر بیٹھے تھے۔ آج سفیدے کے درخت پر کوئے نہیں تھے اس لیے صحن میں سکون تھا۔ سب کے چہرے رات والے واقعے سے اترے ہوئے تھے۔ واحد کی ماں اور بیوی کی آنکھیں رو رو کر سوجی ہوئی تھیں۔ اس کی پوی اپنی بیٹی کو چار پائی پر لٹائے اس کے سر ہانے اداس بیٹھی تھی۔ ماں نے باورچی خانے میں ہانڈی چولہے پر چڑھائی ہوئی تھی کہ اچانک باورچی خانے سے کسی چیز کے گرنے کی آواز آئی۔ واحد کا بھائی بھاگ کر اندر پہنچا تو دیکھا کہ ہانڈی کے فرش پر پڑی ہے۔ سارا سالن اور گوشہ بکھر ہوا ہے۔ اس کے پیچھے ماں اور بھائی کھڑی کھڑی سکتے کے عالم میں یہ سب دیکھ رہی تھیں۔

رات آئی پھر وہی ہنگام شروع ہو گیا جو پچھلی رات ہوا تھا۔ پتھر برسنے لگے، بھئی روٹا اور بھی آہ وزاری پھر گھر کے برتن اڑا کر گراتے۔ بھی گھنٹیاں بجنے کی آوازیں آئیں۔ بھی بکری کے ننھانے کی اور بھی دروازہ پینے لگا کہ جیسے کوئی اسے زور زور سے بجا رہا ہو۔ یہ سلسلہ فجر کی اذان تک جاری رہا۔ اذان بلند ہوئی تو سکوت چھا گیا۔

صبح سورج نکلا تو وہ کمرے سے باہر نکلے کہ پتھر جن کر باہر پھینکیں۔ دیکھا تو صحن کی تمام دیواروں پر تازہ خون کے چھینٹے ہیں اور لیکریں بھی ہوئی ہیں۔ وہ سب خوف اور دہشت سے اسے دیکھ رہے تھے۔

تیسری رات سکون سے گزری۔ ذرا سی بھی آہٹ نہ ہوئی اور نہ کوئی ہوا کا جھوٹکا صحن سے گزرا۔ وہ شب بھر انتظار میں بیٹھے رہے مگر کوئی دستک سنائی نہ دی۔ وہ حیران بھی تھے اور مطمئن بھی کہ آج وہ چڑیل ان پر نازل نہ ہوئی تھی۔ وہ رات سکون سے سوئے۔

وہ دوپہر میں دھوپ سینک رہے تھے۔ واحد شب بھر کے انتظار کے بعد کمرے میں سو رہا تھا۔ بھائی باہر گئیں گیا ہوا تھا۔ بیٹی دوسری چار پائی پر بیٹھی کھیل رہی تھی۔ اسکول سے

سردیوں کی پیمیاں ہونے کی وجہ سے وہ گھر سردی کی ماں نے باورچی خانے کی بجائے صحن میں چولہا بنا کر ہنڈیا چڑھا رکھی تھی۔ اس دن باورچی خانے میں ہنڈیا ٹوٹنے کے واقعے کے بعد وہ وہاں کم جاتے تھے۔ ساس چار پائی سے آگے اور کمرے کی جانب جاتے ہوئے بھوسے ہوئی کہ تم ہنڈیا دیکھ لو، میں کمرے سے سیلے پڑے نکلتی ہوں۔ آج دھوپ ہے تو کپڑے دھو لیتے ہیں۔ کچھ دیر بعد وہ کپڑے لیے باہر آئی۔ بھوپتیہ کے ہنڈیا دیکھ رہی تھی۔ اس نے بھوسے کہا۔ ”کپڑے بہت جتن ہو گئے ہیں انہیں دھونا شروع کرتے ہیں تاکہ شام سے پہلے سوکھ جائیں۔“

بھوپتیہ۔ ”رات کو چٹن کی نیند بھی نہ سو سکوں اور گھر کے کام ہیں کہ ختم ہونے کو ہیں آتے۔“

بھوکا لہجہ اور الفاظ کرساس بزرگ اٹھی اور بولی۔ ”تو بے ہی بد ذات۔ گھر میں مصیبت پڑی ہے اور تجھے اپنے آرام کی پڑی ہے۔“

بھونے جواب دیا۔ ”مصیبت تو تمہارا بیٹا لایا ہے۔ اس چڑیل کو بھی نہیں بخشا۔ معلوم نہیں کہاں کہاں اپنا منہ کالا کرتا رہا اور سراسیمہ ماں بیٹی کوئی ہے۔ اچھا ہے اسی کے ساتھ کہیں بھاگ جائے تاکہ میری توجان چھوٹے۔“

سیرن کرساس کا پارہ ایک دم چڑھا اور وہ لپک کر اس کے پاس پہنچی۔ اس کے پیچھے جا کر اسے کندھے سے پکڑا اور اپنی طرف کھینچا تو ساس کی چیخ نکلی۔ بھیا تک چہرہ، لمبے دانت، خونخوار آنکھیں دیکھ کر وہ پیچھے کی جانب بھاگی۔ وہ وہی چڑیل تھی۔ بھوکا روپ بدل کر بیٹھی تھی۔ ساس کی چیخ سن کر واحد کی بیوی غسل خانے سے باہر آئی۔ چڑیل کو دیکھا تو وہ بھی زور زور سے چیختی گئی۔ واحد بستر سے اٹھ کر کمرے کے دروازے تک آیا اور جب چڑیل کو اصل روپ میں دیکھا تو وہیں دلہیز پر رک گیا۔ اب باہر ماں اور بیوی دونوں چلا رہی تھیں اور چڑیل قہقہے لگاتی دیوار پر چڑھی اور پار کوڈ گئی۔

وہ چلی گئی مگر ان کا چلنا نہ رکا۔ خوف سے دونوں کانپ رہی تھیں۔ چہرے زرد پڑ چکے تھے۔ وہ دونوں روئے چلی جا رہی تھیں۔ واحد کی بیوی بھاگ کر اپنی بیٹی کو گھائی۔ اتنے میں باہر کا دروازہ کھلی نہ کھٹکھٹایا۔ واحد نے ماں سے کہا۔ ”دروازے پر جا کر دیکھو، کون آیا ہے؟“

ماں سسکیاں بیتی اور کانپتی ہوئی آگئی۔ دروازے پر جا کر پوچھا۔ ”کون ہے؟“

باہر سے آواز آئی۔ ”میں زاہد یوسف ہوں۔“

ماں نے سر پر چادر درست کی اور لپک کر دروازہ کھولنے پر تھی۔ دروازہ کھولا تو سامنے وہ کھڑا تھا۔ عمر کوئی بیٹھائیس برس کے قریب ہوگی۔ داڑھی کے بالوں میں سفیدی جھلک رہی تھی۔ سر پر ٹوپی، کاوندھے پر چادر اور ایک بیک لٹکائے ہوئے تھا۔ آنکھوں پر دھوپ والے سیاہ جھٹے اور قد درمیانہ تھا۔ اس کا چہرہ کسی انتہائی روشنی سے دھک رہا تھا اور اس کی جانب نظر اٹھتی تو بٹنے کا نام نہ لیتی تھی مگر اس کے سر پر سفید چہرے پر کوئی تاثرات نہ تھے۔

ماں راہ سے ہی سلام کیا اور زاہد یوسف سر کے اشارے سے جواب دیتا ہوا گھر کے اندر داخل ہوا۔ واحد کی خوف زدہ بیوی نے سلام کیا اور اس نے بغیر اس جانب دیکھے سر کے اشارے سے جواب دیا۔ بپے تلے قدم اٹھاتا وہ صحن کے وسط میں آیا اور وہیں رک گیا۔ اپنے باوقار اور باعرب چہرے کو گھما کر گھر کی دروازہ کو دیکھا۔ اسنے میں واحد دلہیز پر آیا اور اس سے ہاتھ ملانے کے لیے قدم بڑھاے۔ یوسف نے دایاں ہاتھ اٹھا کر اسے وہیں روک دیا۔ ”وہیں ٹھہر جاؤ۔ استانی صاحبہ کے حکم سے رو کر دانی نہ میں کر سکتا ہوں اور نہ ہی کوئی اور۔۔۔۔۔۔“ اس کی آواز میں دب دہ تھا۔ کوئی ایسی بات تھی کہ سب بت بے کھڑے تھے۔ وہ کمرے میں داخل ہوا اور چاروں طرف پھر کر اس کا جائزہ لیا۔ بتاڑ اور سات چہرے کے ساتھ بڑے غور سے دیواروں اور چھت کو دیکھنے لگا۔ اتنے میں واحد کا بھائی اور شوکت بھی آگئے۔ انہوں نے سلام کیا تو اس نے با آواز بلند جواب دیا۔ پھر اس نے انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

وہ ذریعہ بڑھ رہا تھا ہلتے لب سے پھسلتی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ ایسا خسوس ہوتا تھا کہ کمرے میں بہت سے چھتے اڑ رہے ہیں۔ پڑتے پڑتے وہ واحد کے رو برو آیا۔ اپنا دایاں ہاتھ اس کے سر کے پیچھے لگایا اور اچانک اس کے بالوں کو جکڑ لیا۔ اس نے اپنا سیاہ چشمہ نہیں اتارا تھا۔ وہ واحد کے چہرے پر نظریں گاڑے بے حرکت کھڑا رہا۔ وہ جب سے آیا تھا، اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا کہ آگے والا جان سکے کہ وہ کی کیفیت میں ہے۔

اس نے واحد کے چہرے پر پھونک ماری اور بال چھوڑ دیئے۔ چلتا ہوا واپس صحن میں آیا۔ واحد کا بھائی اور شوکت دونوں بھی صحن میں چلے آئے۔ دونوں کی حالت ایسی

تھی کہ جیسے انہیں کسی نے اپنے حشر میں باندھ دیا ہو۔ وہ ان دونوں سے بولا۔ ”رات میں تمہارے نیچے والے گھر میں اکیلے کزن ادرول گا۔ میں چلتا ہوں اور تم لوگ چار روٹیاں اور پانی کا انتظام کرو گے۔“ پھر وہ مرکز واحد کی جانب دیکھ کر بولا۔ ”کل رات تم بھی اسی گھر میں ٹھہرو گے۔ ہم دونوں کے علاوہ وہاں کوئی نہ ہوگا۔“ اس نے ایک لحاظی تو قف کے بعد واحد سے کہا۔ ”شام سے پہلے تم وہاں پہنچ جانا اور اگر سفید کرتا شلوار ہو تو وہ پہن کر آنا۔“ اس نے گھر سے باہر نکلنے سے پہلے اس کے بھائی سے کہا۔ ”کل بھی شام کو چار روٹیاں اور پانی کا انتظام کرنا ہوگا۔ میں پرسوں واپس چلا جاؤں گا۔ اگر زندہ رہا تو۔“

وہ گھر سے باہر نکلا تو سب لوگوں نے اپنی ٹیکس جھپکا لیں۔ ایک حشر تھا، کوئی طلسم تھا جو اس کے جاتے ہی ٹوٹ گیا۔ وہ سب ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگے۔

اللہ نے زاہد یوسف میں کوئی ایسی قوت اور کشش رکھی تھی کہ وہ خود تو چلا گیا تھا مگر گھر والے ابھی تک خاموش اور سرسبز تھے کہ جیسے چڑیل اب بھی نہیں موجود ہو۔

واحد کا بھائی اور شوکت روٹیاں بنوا کر نیچے بنجوسہ گاؤں میں پہنچے زاہد یوسف پہلے سے وہاں موجود تھا۔ وہی سیاہ چشمہ لگائے وہ گھر کے ارد گرد درختوں کو جاچ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں تقریباً چھ لٹکائے ہوئے کھڑا تھا۔ وہ کچھ بڑھ کر ہر درخت کے تنے پر اس لوہے کے ٹکڑے سے نشان لگا دیتا۔ جیسے ہی نشان لگتا تو اس درخت کے پرندے فر سے اڑ جاتے۔ وہ نشان ان کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ ایک مریخ بنا کر اس میں لکیریں کھینچ دیتا تھا۔ وہ اپنے کام میں مہمک تھا اور اس نے ان دونوں کی جانب ایک نکلے کو بھی نہ دیکھا تھا اور نہ ہی کوئی بات کی تھی۔

درختوں سے فارغ ہوا تو گھر کے پیچھے جنگل کی طرف گیا۔ جنگل کے کنارے پر گھر کے متوازی ایک لمبی لائن اسی لوہے کے ٹکڑے سے کھینچی۔ پھر لائن کے سروں پر کانٹے کے نشانات لگائے۔ وہ اس دوران کچھ بڑھتا بھی رہا تھا۔ نشانات لگانے کے بعد وہ جنگل کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں کھول کر رخ جنگل کی جانب کیا۔ کچھ بڑھا۔۔۔ تو قریب سے دور تک کے درختوں کے پرندے شور مچاتے اپنے ٹھکانے بدلنے کے لیے پرواز کر گئے۔

وہ جنگل سے واپس آیا۔ گھر کے چاروں جانب اسی

1987ء سے خدمت میں مصروف

LEUCODERMA-VITILIGO

تھکا جلدی بیماریوں کا موثر اور سب سے ضرر علاج

پھلجھری
قابل علاج مرض ہے

STERIODS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMENT

ملٹی
ایسولڈ
بولڈر
اجمل زیدی
کیسٹرونیکس
کیسٹرونیکس
کیسٹرونیکس

اسلام آباد

9- اپریل 30 تا مئی
9- اگست 30 تا ستمبر
9- دسمبر 30 تا جنوری

نمبر 162، سرحدی روڈ، کٹر 3/1
سرحدی روڈ، کٹر 3/1
فون: 2255880-2854695 (051)
موبائل: 0300-8566188
فکس: 2281636

ASIAN EXCELLENCE
PERFORMANCE AWARDAWARD
PILLAR OF LEUCODERMAAWARD OF
BEST ACHIEVEMENT

لاہور

پشاور

14- فروری تا 27 فروری
14- جون تا 27 جون
14- اکتوبر تا 27 اکتوبر

گل ف سینٹر
آفس نمبر 16
فیروز روڈ، سرحدی روڈ، کٹر 3/1
موبائل: 0300-8566188

11 تا فروری
11 تا جون
11 تا اکتوبر

ہیٹل لائٹ
ٹی وی روڈ، کٹر 3/1
فون: 2218215-2218215 (0521)
موبائل: 0300-8566188

ملتان

کراچی

28 مارچ تا 6 اپریل
28 جولائی تا 6 اگست
28 نومبر تا 7 دسمبر

ہیٹل لائٹ
ٹی وی روڈ، کٹر 3/1
فون: 4518061-62 (061)
موبائل: 0300-8566188

13 مارچ تا 27 مارچ
13 جولائی تا 27 جولائی
13 نومبر تا 27 نومبر

ہیٹل لائٹ
ٹی وی روڈ، کٹر 3/1
فون: 021-7012068-9
موبائل: 0300-8566188

E-mail: syedajmalzaidi@hotmail.com - syedajmalzaidi@yahoo.co.uk

لوہے کے کٹڑے سے ایک انچ کے قریب گہری کھدائی کی۔ اس مٹی کو ایک ڈھیر کی صورت میں کیا اور اس پر کٹڑے ہو کر اس طرح کچھ پڑھتا رہا جیسے لوگ قبروں پر پڑھتے ہیں۔ وہ پندرہ منٹ تک پڑھتا رہا اور دیکھتے ہی دیکھتے مٹی کا رنگ سرخ ہو گیا۔ اس نے پڑھائی ختم کی تو مٹی اس طرح سے سرخ ہو چکی تھی کہ جیسے اس میں خون ملایا ہوا ہو۔ واحد کا بھائی اور شوکت کھڑے حیرت سے یہ سب دیکھ رہے تھے مگر زاہد یوسف کا چہرہ پہلے کی طرح ہر قسم کے تاثرات سے پاک تھا۔ اس کی پڑھائی سے وہ دونوں ناقابل یقین قسم کے واقعات دیکھ رہے تھے اور زاہد یوسف کا انداز ایسا تھا کہ جیسے وہ کوئی عام سا کام کر رہا ہو۔ نہ اسے پڑھائی چاہیے تھی اور نہ ہی کوئی مداخلت۔

اس نے وہ مٹی چاروں جانب اس کھدائی ہوئی لائن میں بچھادی۔ گھر کو چاروں طرف سے گھیر لیا، سوائے مرکزی دروازے کے۔ مرکزی دروازے پر نہ اس نے کھدائی کی تھی اور نہ ہی مٹی بچھائی تھی۔ فارغ ہوا تو ہاتھ جھاڑ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے ان دونوں کو بلایا اور اپنے بھائی لہجے میں کہا۔ ”آؤ کھانٹر مٹی کے تیل کا لے آؤ۔“ اور اپنی بات بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”چار روٹیاں اور پانی لائے ہو؟“

شوکت نے فوراً روٹیوں والا خلاف اس کے ہاتھ میں دے دیا اور پینے کے لیے پانی وہ باہر سے بھر کر لائے تھے۔ واحد کا بھائی مٹی کا تیل لینے چلا گیا۔ شوکت اس کے پاس رک رہا کہ کوئی کام نہ پڑ جائے۔ دوپہر کی نماز کا وقت ہوا چاہتا تھا۔ پہلے اس نے وضو کیا۔ روٹی روٹی پانی کے ساتھ کھائی۔ اللہ کا شکر ادا کیا اور پھر نماز پڑھی۔ نماز پر کھڑے ہوئے سے پہلے اس نے شوکت سے کہا۔ ”اس لڑکے سے جا کر یو لو کہ ایک لائٹر اور ایک ماچس کی ڈیو بھی لیتا آئے۔“

وہ مٹی کا تیل لے آئے۔ ساتھ میں لائٹر اور ماچس کی دو ڈبیاں بھی۔ زاہد یوسف نے درخت سے ایک موٹی شاخ توڑی۔ اس پر بستر کی چادر لپیٹ کر ایک مشعل تیار کر لی اور اسے مٹی کے تیل میں ڈبو دیا۔

واحد کے بھائی نے اس سے بڑے ادب سے پوچھا۔ ”مولوی صاحب! کوئی اور رسم ہوتا ہوگا۔“ وہ پہلی بار ہلکا سا مسکرایا اور جواب دیا۔ ”یہ زندگی اور موت کی جنگ ہوئی۔ اب بات اس سے آگے بڑھ چکی ہے کہ اسے باغداد کر کہیں دور بہت دور پھینک آئیں۔ اس نے استانی جی

موت ہی بہتر ہے۔ جو موت کی تمنا کرتے تھے تو وہ بے خوف ہو جاتا ہے۔ کل رات اس کے لیے زیادہ بھاری تھی۔ اگر زہد یوسف شکست کھاتا تو اس کی موت جتنی بھی تھی۔ وہ مرنا چاہتا تھا۔ بے اس کمرے میں مرے یا بجوسہ گاؤں کے گھر والے کمرے میں۔ وہ بھیا یک چڑیل باہر برفانی رات میں ہوا کے ساتھ ساتھ صحن کے اندر پھرتی رہی۔ چار پائیاں توڑ ڈالیں۔ برتن توڑ دیئے۔

پھر ماں کے کمرے کے دروازے پر ہواؤں نے دستک دینا شروع کر دیا۔ ہوا آہستہ آہستہ بچھ رہی تھی۔ تیز سے تیز تر ہوا کا ہواؤ بڑھا تو کمرے کا دروازہ چوکت سے اکٹھا اور دھڑام سے اندر جا گرا۔ شکر تھا کہ گھر والوں کی چار پائیاں دور تھیں۔ کچلے دروازے سے ہوا اندر داخل ہوئی اور گبولے کی طرح کمرے میں گھومنے لگی۔ وہ سب چلا رہے تھے۔ اللہ کے واسطے دے رہے تھے۔ ہوا کے پتھروں ... سے ان کی ریشائیاں تک بے قابو ہو رہی تھیں واحد کی بیٹی غنید سے جاگ اٹھی اور وہ بھی زور زور سے رونے لگی۔ بیٹی کی رونے کی آواز سن کر واجد اپنے کمرے میں دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ ہوا ڈرا دیر کو گھم جاتی اور دوبارہ پھر سے چلنے لگتی۔ کمرے کا سامان تیز تر ہو رہا تھا۔ یہ قیامت فحشر کی اذان تک قائم رہی۔ اذان کی آواز آئی تو ہوا شوخی ہوئی باہر نکلی اور آسمان کی جانب اڑ گئی۔ باہر برف بڑی تھی صحن برف کی چادر میں سفید ہو رہا تھا اور ہوائے اس کو چھو ابھی نہ تھا۔

صبح تک وہ سردی میں بیٹھے کپکپاتے رہے۔ وہ واجد کے کمرے میں بھی نہ جا سکتے تھے کیونکہ دیالی کا حکم تھا کہ وہ رات کو اکیلا کمرے میں سوئے گا۔ برف باری صبح تک رک چکی تھی اور پورا ہاؤس سفیدی کی تہہ لیے خاموش تھا۔ شوکت صبح ہی صبح بیچ گیا تھا۔ ماں نے روتے روتے کمرے میں چوہا بنایا۔ روئیاں بنائیں اور وہ دونوں روئیاں نے کرچیچے گاؤں کی جانب چلے۔ وہاں زہد یوسف کمرے میں مصلے پر بیٹھا تھا۔ لگتا تھا کہ رات بھر وہ عبادت کرتا رہا تھا۔ انہوں نے اسے روئیاں دیں اور شام سے پہلے آنے کا کہہ کر واپس چلے آئے۔

سردیوں کے دن چھوٹے ہوتے ہیں۔ ظہر کی نماز واجد اور اس کے بھائی نے گھر میں بڑھی۔ وحند آسمان تلے چھائی تھی۔ اس کے بھائی نے اوپر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس سے پہلے کہ برف گرتا شروع ہو۔ ہمیں نکل جانا چاہیے۔“

ماں نے زہد یوسف کا تعویذ واجد کو گھول کر پلایا پھر اس کے سامنے کھانا رکھا جو اس سے دو تلتے بھی نہیں کھایا گیا۔ اس کے بھائی نے بھی تھوڑا بہت کھایا۔ شوکت ترکان پکڑ کر ماں کے کمرے کا دروازہ ٹھیک کر دیا تھا۔ واجد کی بیوی کچھ نہ کچھ بڑھ کر خاوند پر پھونکنی جاتی تھی۔ وہ لاغر ہو چکا تھا۔ کندھے ڈھلک گئے تھے۔ اپنی جس طاقت اور ہمت پر وہ نازاں رہتا تھا وہ چند دنوں میں فنا ہو چکی تھی۔

وہ گھر سے چلے اور شام سے پہلے بجوسہ گاؤں میں اپنے گھر کے سامنے پہنچ گئے۔ گھر کو دیکھ کر واجد اور سراپہ ہو گیا۔ اس پر وحشت چھانے لگی۔ اسے وہی برفانی رات یاد آئی جس میں اس سے ایسا کام ہو گیا تھا، ایک ایسی انہونی ہوئی تھی جس کے بارے میں وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ ایک چڑیل خوب صورت لڑکی کے روپ میں اس سے آگرائی پھر اس پر عذایوں اور حایوں کا سلسلہ شروع ہوا جو چند دن نہیں بلکہ سالوں پر محیط لگتا تھا۔

زہد یوسف کمرے کی چار پائی پر لیٹا تھا۔ ایک سیاٹ چہرے کے ساتھ جس پر نہ کوئی ٹھکان اور نہ کوئی تاثر اور نہ کوئی تشویش۔ اس کے لیے شاید یہ کوئی آئے دن کا سکیل تھا جو وہ اپنی انگلیوں پر کھیتا تھا۔

اس نے واجد کو دیکھا تو لیٹے لیٹے اس سے بولا۔ ”اسی چار پائی پر بیٹھو جہاں اس رات سوئے تھے۔“ واجد شرمندہ سا کوئے والی چار پائی پر بیٹھ گیا۔ اس نے شوکت اور واجد کے بھائی کو کہا کہ بیٹھک میں سے ایک چار پائی کے علاوہ سارا سامان کہیں دوسری جگہ رکھ دو۔ وہ سر ہلاتے باہر چلے گئے۔

کچھ دیر بعد وہ فارغ ہو کر آئے۔ زہد یوسف اٹھ کھڑا ہوا۔ واجد کو کمرے میں رکھنے کا اشارہ کیا اور خوان دونوں کے ہمراہ مرکزی دروازے سے باہر نکل آیا۔ آنکھیں اٹھا کر آسمان کی جانب دیکھا جو نیلے بادلوں سے بھرا تھا۔ برف گرنے لگی۔ ہوا ساکن اور درخت خاموش تھے۔ ایک مکمل سکوت چار سو پھیلا تھا۔ پوری فضا کسی کے قبضے میں جکڑی نظر آتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ جنگ کا طبل بجے گا اور پھر گھمسان کا رن شروع ہوگا۔

جائزہ لے کر اس نے دونوں کو کہا۔ ”تم دونوں گھر سے دو دو سو گز دور رہو گے قریب آنے کی کوشش نہ کرنا۔ اچھا ہے کہ یہ گھر آبادی سے ہٹ کر ہے ورنہ آس پاس کے گھر مجھے خالی کر دینے پڑتے۔“ اس کے چہرے پر اطمینان

تھا۔ وہ ان کو تاکید کرتے ہوئے بولا۔ ”کچھ بھی سنو یا کچھ بھی دیکھو یا محسوس کرو، اس گھر کے قریب نہ آنا اور جب فجر کا ٹائم ہو جائے تو بلا جھجک چلے آنا۔ اگر ہم دونوں مردہ پڑے ہوں تو ہماری لاشیں اٹھا کر دیالی کے پاس لے جانا۔“ وہ خاموش ہوا اور ان دونوں کو طے جانے کا اشارہ کیا۔

کچھ دیر میں برف باری شروع ہو گئی۔ واجد فحشر ہوا چار پائی پر بیٹھا تھا۔ وہ خالی خالی نظروں سے بھی زہد یوسف کو تکتا اور بھی کمرے کی چھت کو۔ زہد یوسف نے اس کی چار پائی کے ساتھ کوئے میں اوپر تلے رکھے ٹرک دیکھے اور واجد سے بولا۔ ”تم اس کمرے میں رہو گے اور اسی چار پائی پر بیٹھو گے۔ میں بیٹھک میں ہوں گا۔ وہ آئے تو مجھے خبر ہو جائے گی۔ تم نے چار پائی سے نیچے نہیں اترنا ہے۔“ کچھ لمحے اس نے توقف کیا اور پھر اس سے دوبارہ مخاطب ہوا۔ ”جب میں کمرے میں داخل ہوں تو اس کی توجہ میری جانب ہو جائے گی اور اسی دوران تم فوراً ان ٹرکوں کے پیچھے چھپ جانا۔ وہ آئے گی تو اسے بیٹھک میں میری موجودگی کا پتا نہیں چلے گا اور جتنی بھی اس کی چیخ و پکار ہو، تم نے منہ سے آواز تک نہیں نکالنی۔“

یہ سب ہدایات دینے کے بعد اس نے جا نماز بچھائی اور شام کے فرض ادا کر کے لگا۔ نماز کے بعد اس نے اپنے جسمے اتار دیئے اور دو چراغ جلنے لگے۔

وقت آہستہ آہستہ سرک رہا تھا۔ لمحے طویل ہوتے جارہے تھے۔ انجانے خطرے سے واجد کا دل زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہ چار پائی پر لیٹ گیا۔ عشاء کی نماز کے لیے زہد یوسف نے تیاری شروع کی تو ساتھ واجد بھی آکھڑا ہوا۔ نماز کے بعد زہد یوسف نے مختصر سی دعا کی اور آمین کہتے ہوئے دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔

زہد یوسف کمرے سے نکلتے ہوئے واجد سے بولا۔ ”میں بیٹھک میں کچھ دیر آرام کر رہا ہوں۔ دروازے کے پٹ بھیڑ دینا مگر کنڈی نہیں لگانی ہے۔ چڑیل کے آنے سے پہلے میں اس کی ہوسوگھ لوں گا۔ تم اس کو باتوں میں لگنا۔“ جب تک کہ میں کمرے میں داخل نہیں ہو جاتا۔

وہ چلا گیا۔ کمرے میں لائٹن کی ہلکی سی روشنی پھیلی تھی۔ مکمل خاموشی طاری تھی۔ نہ کوئی کلک تھا اور نہ کوئی آواز۔ وقت گھم گیا تھا۔ سب کو اس کا انتظار تھا۔ لگتا تھا کہ باہر کے درخت، ہوا میں، زمین اور آسمان سب اسی کا انتظار کر رہے ہیں۔ سب دم سادھے ہوئے تھے۔ صرف جو چیز

حرکت میں تھی وہ برف کے گالے تھے جو آہستگی سے زمین یوں ہو رہے تھے۔

رات کے دو بجے تھے۔ زہد یوسف غنودگی کے عالم میں بیٹھک کے اندر چار پائی پر لیٹا تھا کہ اسے ایک اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اس کے چہرے پر برقی خیر مسکراہٹ تھی۔ وہ لیٹا رہا۔ اس نے فضا میں کوئی جھنسن محسوس کر لی تھی۔ کوئی جھونکا تھا جو گھر کے ارد گرد چکر کاٹ رہا تھا۔ ایک سرسراہٹ تھی جو گھر کے چاروں جانب دوڑتی پھرتی تھی۔ اس ہوا میں پھر تندی بھرا آئی اور وہ دوباروں سے سر بٹھنے لگی۔ زہد یوسف کے بنائے ہوئے حلقے نے شاید اس کے راستے مسدود کر دیئے تھے۔ اس کے جال میں وہ پھنچ پھڑا رہی تھی۔ اس کے پاس صرف ایک ہی راستہ باقی رہا تھا اور وہ گھر کا مرکزی دروازہ تھا جسے زہد یوسف نے کھلا چھوڑ رکھا تھا۔ وہ دروازے سے داخل نہیں ہونا چاہتی تھی کیونکہ پھر واپسی کا وہی راستہ اسے استعمال کرنا پڑتا جسے زہد یوسف اس پر گھاؤ لگانے یا لیلیٹ کرنے کے لیے استعمال کر سکتا تھا۔ یہ باتیں یا تو چڑیل جانتی تھی یا زہد یوسف۔ یہ انجان دنیا کے اصول تھے جسے وہ جان سکتے ہیں جن کا وہاں آنا جانا لگا رہتا ہے۔

وہ کہیں اور سے داخل ہونے میں ناکام ہوئی تو ہوا کا ایک خٹنا تیز جھونکا تیزی سے اندر گھسا۔ زہد یوسف چار پائی سے اٹھ بیٹھا۔ اس نے پشادری چل کے کسے چڑھائے اور کھڑا ہو گیا۔ یہ کس تھا جسے صرف زہد یوسف جیسا شخص محسوس کر سکتا تھا۔

واجد کو تب معلوم ہوا جب وہ اجا تک اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ اس کے چہرے کے نقوش بھیا تک تھے اور مسکراہٹ تھی۔ یہ وہ نہ تھی جو اسے پہلی رات کی تھی۔ یہ وہ تھی جو اسے کبھی نہ ملی تھی۔ وہ بڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ واجد کی نظر اس کے چہرے سے پیچھی تو بمشکل اپنی چیخ کو دبا سکا۔ وہ تنک دھڑنگ تھی۔ کوئلے جیسا کالا جسم، لمبی اور پتلی کالی گردن، گلا نیلے تنک بازو چھوٹے اور ہاتھ بازو سے بھی بڑے اور لمبے تھے۔ ناخن بڑے بڑے جو آگے سے نوکدار بن گئے تھے۔ پتلے بد صورت پاؤں پیچھے کی جانب مڑے ہوئے تھے۔ آہستہ آہستہ اس کے چہرے کے نقوش اور زیادہ بھیا تک ہو گئے۔ ہمنوں کمان کی طرح تن گئیں اور ناک لنگ کر منہ کے نیچے آگئی۔ دانٹ لیے اور غنودی کے نیچے تنک لیے ہو گئے۔ پورے کے انڈے جتنی گول آنکھیں

دہکتی تھیں۔ ہال بکھرے تھے اور کتبک جھول رہے تھے۔ اس بھیا تک چہرے پر دشت تھی پھر وہ جیسے سکرانی تو چہرہ اور زیادہ بھیا تک ہو گیا۔ اسے دیکھ کر واحد کا سر چکرانے لگا۔ آنکھیں پھیل گئیں اور زبان خشک ہو گئی۔ وہ خوںخوار لہجے میں بولی۔ ”دھو کے بازو تم بھی اور اس کی طرح بے وقافتے لگو۔ وہ کیا سمجھتا ہے کہ مجھے اس کی خبر نہ ہوگی۔ وہ چالاک دیالی کا بزدل چیلہ۔ پہلے میں اس سے نمٹوں گی تاکہ تو میرا یہ روپ بھی دیکھ لے اور پھر تجھے تو میں ٹکڑے ٹکڑے کر کے کھاؤں گی۔“ اس کے بعد اس نے کرخت تہقہہ لگایا جسے سن کر وہ اجد بے ہوش ہو گیا۔

وہ چار پانی پر بڑا تھا۔ چڑیل نے معلوم نہیں کیا اس کے ساتھ کیا کر وہ جاگ گیا۔ ادھر ادھر دیکھا اور جب چڑیل کو دیکھا تو پھر سے لرزنے لگا۔ اس سے وہ کہہ رہی تھی۔ ”دیالی کا بزدل چیلہ سمجھتا ہے کہ میں اس کی موجودگی کو بھانپ نہیں سکوں گی۔ کم طرف ہے دیالی اور اس کا چیلہ۔ وہ تمہیں چارہ بنا کر یہاں لایا ہے۔ تیرے سامنے اس کا حشر کروں گی اور پھر تمہارا۔“ وہ بول کر یار بھی کر جیسے دسیوں کو بے مل کر کرخت آواز نکالتے ہیں۔ اس کے منہ کی جانب وہ دیکھ بھی نہ سکتا تھا۔ ایک غلاظت اور گندگی کا ڈھیر تھا۔ اس کی بدبو پورے کمرے میں پھیلی تھی۔ وہ زمین پر نہنگی بلکہ نفا میں ملوث تھی۔

وہ تہقہہ لگا رہی تھی۔ واحد کا دل اس کرخت آواز سے پھنا جا رہا تھا۔ وہ متواتر کہے جا رہی تھی۔ ”کہاں ہے تو بزدل چہرے، دیالی کے مکار چیلے۔ آج تیری اور دیالی کی موت میرے ہاتھوں ایسی بھیا تک ہوگی کہ پورے علاقے میں پھر کوئی سر اٹھانے کی جرأت نہیں کر سکے گا۔“

وہ دروازے کی جانب گھومی تو دروازے کے پیچھے زاہد یوسف کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے۔ واحد نے اسے دیکھا تو سرعت سے ٹوکوں کے پیچھے چلا ننگ لگادی۔ وہ آٹھیں ہو کر انہیں دیکھ بھی نہ سکتا تھا۔ واحد کا خوف وہ تھا جو پہلے ہی تھا۔ وہ اس کے ساتھ وقت گزار چکا تھا اس لیے قدرے ڈر ہو گیا تھا۔ یہ سب دیکھنے کا حوصلہ رکھتا تھا ورنہ پہلی بار اسے کوئی دیکھ لیتا تو اس کا کلیجہ پھٹ جاتا۔

زاہد یوسف دروازے کے بیچ میں کھڑا ہاتھ سینے پر باندھے بغیر پلٹیں چھپکائے شدید نفرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے سر سے ٹوپی اتار دی تھی۔ چڑیل نے اسے

دیکھا اور اپنے پاؤں زمین پر لگائے۔ دونوں ایک دوسرے کو آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہے۔ واحد ٹوکوں کے پیچھے سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ وہ زاہد یوسف کی بیادری اور بے خونی کا قاتل ہو گیا تھا۔ اس کی ڈھارس بندھ گئی تھی۔ زاہد یوسف نے چڑیل سے کہا۔ ”بہت برا کیا ہے تو نے واپس آکر۔ دیالی نے مجھے تیرے بارے میں پہلے ہی سے سب بتا دیا تھا۔“ اس کے لہجے میں ایک تہقہہ تھا کہ واحد کا دل بھی کانپ گیا۔ زاہد یوسف نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”اس سے پہلے میں تیری تلاش میں آتا، اچھا کیا تو نے جو خود موت کے منہ میں چلی آئی۔ تو نے دیالی کو دیا ہوا وعدہ توڑا ہے اور سزا کی حق دار ہے جو تمہیں مل کر رہے گی۔“ چڑیل غرانے لگی۔ بولی۔ ”میرے ہاتھوں پچاس سال پہلے علاقے کا ایک کسان مارا گیا تھا۔ دیالی کو میں نے کئی وضاحتیں دیں کہ یہ سب غلطی سے ہوا ہے مگر اس نے مجھے معاف نہ کیا۔ میں اس سے بات کرنے گئی تھی اور اس نے اپنے منکوں سے مجھے دھوکے میں باندھ دیا تاکہ مجھے کہیں دور دراز کے علاقے میں چھوڑ آئے۔ مجھے اپنے منکوں سے سالوں وہیں قید رکھا۔ پھر مجھ کی میری مدد کی اور مجھے قید سے نجات دلوائی۔ میں بھگتی رہی۔ میرا سینہ اب بھی دیالی کی نفرت سے جل رہا ہے۔ میں تو بھی مگی کہ وہ بوڑھی ہو گئی ہوگی مگر اس نے اپنے ارد گرد حصار باندھ رکھے ہیں تجھے مار کر میں وہ حصار توڑ ڈالوں گی پھر اس خبیث بڑھیا کی موت میرے ہاتھوں ہوگی۔“

زاہد یوسف دباؤا۔ ”اپنی زبان کو لگام دے۔ اس کا نام تیز سے لے۔ وہ کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کرتی۔ تجھ کو انسانوں میں آنے کی اجازت کیامی کہ تو انہیں ستانے لگی۔ اس علاقے میں خاص کر اور کہیں بھی تمہاری وجہ سے یا تمہارے جیسے شیطانوں کی وجہ سے انسانوں کو نقصان پہنچے، یہ دیالی کو گوارا نہیں۔ وہ بھی اسے برداشت نہیں کر سکتی۔ تو نے دیالی کو ایک بار پھر بھڑکایا ہے۔ کیا تو سمجھتی ہے کہ وہ ضعیف ہو چکی ہے؟ تجھے تو اندازہ ہی نہیں کہ وہ پہلے سے بھی زیادہ طاقت ور ہوئی ہے۔ میں اور میرے جیسے ہی اس کے حکم کی بجا آوری کے لیے اسے سرکٹانے کو تیار ہیں۔ تو نے دیالی کے گھر پر دھاوا بولا تھا۔ وہ دیالی جس کی آنکھ کے ایک اشارے سے تیرے جیسے جاوید باد ہو جاتے ہیں۔“ چڑیل نے ایک بھیا تک تہقہہ لگایا۔ پھر بولی۔ ”اپنے جیسے کئی اور بھی لے آ پھر میرا مقابلہ کر۔“

وہ بولا۔ ”تجھے ختم کرنے میں مجھے ذرا برابر بھی دیر نہیں ہوگی۔ اس کے بعد مجھے دیالی کے اور بھی کئی کام کرنے ہیں۔“

زاہد چند قدم آگے بڑھا۔ وہ اب لگا تار کچھ پڑھ رہا تھا۔ چڑیل نے زمین چھوڑی اور دوبارہ کمرے کے خلا میں تیرنے لگی۔ وہ پیٹیرے بدل رہی تھی اور زاہد یوسف اپنی جگہ پر ساکت کھڑا تھا۔ وہ اب زور زور سے کچھ پڑھنے لگا۔ یہ بھجری اور اڑتی ہوئی اس کے اوپر گئی اور بائیں ہاتھ سے اسے گردن کے پیچے ضرب لگائی۔ زاہد یوسف نے بچنے کی کوشش کی مگر اس نے اتنی تیزی سے ہاتھ ٹھمایا کہ وہ اڑتا ہوا بائیں جانب دیوار پر لگ کر زمین پر آگرا۔ وہ ابھی بمشکل اٹھایا تھا کہ چڑیل نے دائیں لات پیٹیرے باری تو وہ اڑتا ہوا چھت کے قریب ای دیوار پر جا لگا۔ دیوار سے ٹکرانے کے بعد وہ کسی کے درخت کی مانند زمین پر آ رہا۔ چڑیل کے تہقہہ کمرے کو لرزا رہے تھے۔ وہ زمین سے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے زور زور سے اپنی پڑھائی کرتا جا رہا تھا۔ چڑیل کی بھیا تک مٹی سختی نہ تھی۔ وہ اسے کہہ رہی تھی۔ ”اپنی آستانی کو بلا۔ وہ اس وقت خود چیلے میں بیٹھ گئی ہے اور تجھے موت کے منہ میں ڈال دیا ہے۔“

وہ ابھی اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ اڑتی ہوئی جاتی ہے اور ایک لمبی بیچ کے ساتھ اس کی دائیں ٹانگ پکڑ کر اسے گھماد اور دیوار پر دے مارا۔ واحد سمجھا کہ اب کے وہ نہیں اٹھ سکے گا۔ واحد کا خوف عود کر آیا۔ جس کو وہ نجات دہندہ سمجھ رہا تھا وہ خود ہولناں ہو رہا تھا۔ خون اس کے سر سے نکل کر اس کے چہرے پر دھاریوں کی صورت بہہ رہا تھا۔ اس کی گردن اور منہ کا کالر بھی خون سے رنگین ہو چکا ہے۔ وہ بچی دیوار سے ٹکرا کر ایک چار پانی پر آگرا۔ اس کا چہرہ خون و خون تھا اور اس نے اپنا درد جاری رکھا ہوا تھا۔ وہ چار پانی پر پڑا رہا۔ چڑیل اس کے اوپر بلا میں ملحق تھی۔ وہ طنز بے نیچس کہنے لگی۔ ”ابھی تو تیرے بنائے ہوئے حلقے نے میری آدھی طاقت لے لی ہے پھر بھی میں تمہیں اگرا ہی دوں اگلیوں کے بیچ میں دباؤں تو تمہارا قید بن جائے۔“ وہ اڑتی ہوئی گئی اور سامنے چار پانی پر بیٹھ گئی۔ اسے دونوں خوفناک ہاتھ اپنے بالوں میں دے کر بے رحمی شاقہ تہقہہ لگانے لگی۔ واحد ٹوکوں کے پیچھے چھپا حشر کانپ رہا تھا۔ اسے اپنی یقینی موت صاف نظر آ رہی تھی۔ وہ چار پانی پر گرے ہوئے زاہد یوسف سے کہنے لگی۔ ”میرا گلا دار آخری ہوگا۔“

تیری لاش اٹھانے سے پہلے دیالی اپنے انجام تک پہنچ چکی ہو گی۔“ وہ بمشکل اٹھا۔ اس سے اپنا سر بھی نہیں اٹھایا جا رہا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے جسم کی بیشتر ہڈیاں ٹوٹ چکی ہیں۔ سر پر شدید ضرب لگنے سے خون متواتر بہے چلا جا رہا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے چار پانی سے نیچے اتر۔ اس کی داڑھی بھی خون آلود تھی۔ ورنہ اس کا جاری تھا۔ خون آلود چہرے پر سرخ چمکتی آنکھیں جیسے شعلے برسا رہی ہوں۔ اس پر نقاب طاری ہو رہی تھی۔ وہ لڑکھڑا رہا تھا۔ اپنے قدموں پر کھڑا رہنا اس کے لیے مشکل تھا۔ ادھر چڑیل پر ہڈیانی کیفیت طاری ہو چکی تھی۔ اس کی آنکھیں پھیل کر اور زیادہ خوفناک ہو گئی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ خلا میں بلند ہو کر غرائے لگی۔ اس کے دہانے سے جھاگ بہہ رہا تھا۔ اس کی کریمہ شکل کو دیکھ کر ٹوک کے پیچھے دیکے واحد نے اپنی آنکھوں اور کانوں پر ہاتھ رکھ لیا۔

زاہد یوسف کھڑا ہو گیا تھا مگر ٹوکھڑا رہا تھا۔ وہ شعلے برساتی آنکھوں سے چڑیل کو دیکھ رہا تھا۔ اپنی آستین سے آنکھوں کے سامنے آیا خون صاف کیا۔ چڑیل اس کی جانب پھٹتی ہوئی آئی اور کہنے لگی۔ ”یہ میرا آخری وار ہے یاد کر لے چالاک اور مکار دیالی کو۔“ اس نے ضرب لگانے کے لیے اپنی دائیں ٹانگ بھلی کی مانند ٹھمائی اور اسی لمحے چشم زدن میں زاہد یوسف نے اس کے دائیں پاؤں کو پکڑ کر اسے گھماد اور دروازے کے اوپر دیوار پر اسے دے مارا۔ اس کی ایک لمبی بیچ بلند ہوئی اور وہ مگر آکر زمین پر آگری۔ وہ غلٹی گالیاں دیتے ہوئے انھی لیکن زاہد یوسف سرعت سے اس کے قریب پہنچا اور پوری قوت سے ہاتھ کو الٹا ٹھما کر اس کے منہ پر ضرب لگائی۔ وہ بیچ ماری ہوئی لکڑی کے شلیف سے جا ٹکرائی۔ شلیف پر رکھے برتن آپس میں بیٹھتے ہوئے بیچ آگرے۔ زاہد یوسف زور زور سے درد کرتا آگے بڑھا اور اسے دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر سر کے اوپر بلند کیا اور پوری طاقت سے اسے سامنے والی دیوار پر پٹ دیا۔ ایک بھیا تک اور خوفناک بیچ بلند ہوئی وہ لمحے بھر کے لیے دیوار سے لگ کر نیچے زمین پر آگری۔ وہ چلا رہی تھی اس کی کراہیں بلند ہو رہی تھیں، پورا کمر اس کے چلانے سے گونج رہا تھا۔ زاہد یوسف پھر اس کی جانب لپکا اور دہانے ہاتھ سے اس کی پٹلی اور کالی گردن جکڑ کر پھر اسے گھماتا ہوا دیوار سے جا لگا۔ زاہد کا چہرہ خوفناک ہو چکا تھا۔ یہ وہ زاہد یوسف نہ تھا

ندامت

جناب ایڈیٹر سرگزشت
السلام علیکم

یہ سچ بیانی سندس اور سجاد کی ہے لیکن بغور دیکھیں
تو یہ گھر گھر کسی کہانی بن رہی ہے۔ ہم بچے بچیوں کو
موبائل نہ کر خوش ہوتے ہیں کہ وہ اس کا صحیح
استعمال کریں گے جب کہ یہ ہماری خوش فہمی ہے۔ اس
موبائل نے کیسے سندس کی زندگی میں زہر گھولا آپ
بھی ملاحظہ کریں۔

افتخار حسین اعوان
(مظفر آباد، آزاد کشمیر)

صبح کی سنہری کرنیں دوپہر کی تمازت میں ڈھلنے لگی
تھیں کارخانہ زندگی اپنے معمول کے مطابق رواں دواں تھا۔
سندس چکن میں بڑی تندہی سے چکن بھوننے کے علاوہ
جھونے برتنوں کا ڈھیر دھونے میں مصروف تھی۔ گزشتہ
رات کی سستی نے برتنوں کے ڈھیر میں دوگنا اضافہ کر دیا
تھا۔ اس کی آنکھیں بار بار بیگ رہی تھیں لیکن ہاتھ صابن
سے نئے تھے۔ وہ چاہہ کر بھی آنسوؤں کو پونچھ نہیں پاری
تھی۔



وہ اتنی زور سے چیخی کہ پورا کرا کا نپ گیا۔ واجد اپنی جگہ پر
سب دیکھ رہا تھا اور ہر گھر کا نپ رہا تھا۔ وہ اب کھائے ہوئی
تھی۔ اس کا غلیظ جسم لوہے کے ٹکڑے کی حرکت سے جگہ جگہ
سے پھٹتا چلا جا رہا تھا۔ وہ اپنے بال نوچ رہی تھی۔ چلا رہی
تھی۔ زاید یوسف نے ایک بار پھر فضا میں لیکر پھینکی تو اس کے جسم
کے بدبودار ٹکڑے نیچے گرنے لگے۔ وہ ٹکڑوں میں بٹ
رہی تھی۔ سسکیاں لے رہی تھی۔ آہ وزاری کر رہی تھی۔ زاید
یوسف کے چہرے پر دم کا ذرا سا بھی تاثر نہیں تھا۔ اس نے
با آواز بلند اللہ اکبر کہا اور مشعل اس پر پھینکی تو اس کے
بالوں نے فوراً آگ پکڑ لی۔ اس کی گریہ جیچیں جیسے
کمرے کی چھت کو پھاڑ کر آسمان کی جانب اٹھتی محسوس
ہو رہی تھیں۔ اس کا چہرہ جل رہا تھا۔ زاید یوسف نے مٹی
کے تیل کا کستور دونوں ہاتھوں سے اٹھا یا اور اپنے سر سے
بلند کر کے آہستہ آہستہ اس پر اڑھیل دیا۔ آگ نے آنا فانا
چڑیل کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ حیرت انگیز طور پر آگ
چڑیل کے علاوہ نہ کسی اور چیز کو چھو رہی تھی اور نہ زاید
یوسف کی جانب لپکتی تھی۔ آگ کے شعلے بلند تھے، چڑیل
کی دلخراش چیخیں کمرے کی دروازہ پر گولرز مار رہی تھیں۔ وہ
انکارہ بن رہی تھی۔ ایک دہکتا ہوا انکارہ۔ اس کی سسکیوں
کی آوازیں بھی آہستہ آہستہ دم توڑ رہی تھیں۔ زاید
یوسف اپنے پاؤں پھیلائے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے
تن کر کھڑا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے کلام پاک کی آیتیں
جاری تھیں۔ چڑیل آہستہ آہستہ جل کر راکھ ہو رہی تھی۔
وہ لگا تار پڑھتا جا رہا تھا پھر اس نے کمرے کا دروازہ
کھول دیا۔ وہاں آیا تو وہ راکھ آہستہ آہستہ زمین سے بلند
ہوئی اور اڑتی ہوئی ایک جھونکے کی طرح باہر نکل گئی اور
کمرے کا فرش بالکل صاف ہو گیا۔ ایک روشنی گھر کے اوپر
مشرق سے مغرب کی جانب پھیلتی جا رہی تھی۔ اسی لمحے بخوسہ
گاؤں کی مسجد سے اذان کی آواز گونجی۔ اللہ اکبر اللہ اکبر۔

واجد بے ہوش ہو گیا تھا۔ اسے ہوش آیا تو وہ چار پائی
پر پڑا تھا۔ شوکت اور اس کا بھائی واجد کے چہرے پر پانی
پھینک رہا تھا۔ وہ بڑبڑا کر اٹھا۔ کمرے میں زاید یوسف نہیں
تھا۔ بیٹھک میں بھی نہیں تھا۔ بھائی نے بتایا کہ جب ہم
یہاں پہنچے تو تم چار پائی پر بے ہوش پڑے تھے۔ زاید
یوسف یہاں نہیں تھا۔ شاید وہ کہیں چلا گیا۔ دیالی کے کسی اور
کام کو نہ جانے!



جو واجد کو عشاء کی نماز پڑھا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں جیتے کی
طرح چمک رہی تھیں۔ آنکھوں میں غصہ تھا اس نے چڑیل کو
گردن سے پکڑ کر دانے ہاتھ سے اٹھا یا اور پورے وقت سے
اللہ اکبر کہتا ہوا اسے آتش دان کے قریب زمین پر پٹ دیا۔
ایک دلخراش چیخ چڑیل کے حلق سے برآمد ہوئی۔ وہ اٹھنے کی
کوشش کر رہی تھی کہ زاید یوسف بجلی کی سی تیزی سے لپکا اور
مٹن کے کستور سے مشعل نکال کر اس کے سامنے کھڑا ہو
گیا۔ پھر اس نے جٹک کی جب سے لائٹر نکالا۔ ہلکے سے
شعلے سے وہ مشعل بھڑک اٹھی۔ اب اس کے پائیں ہاتھ میں
مشعل بلند تھی اور دانے ہاتھ میں لوہے کا وہی پوکو ٹکڑا۔

زاید یوسف کے خون آلود چہرے پر زہریلی
مسکراہٹ تھی۔ آنکھوں میں خون اترتا ہوا تھا اور شدید
نفرت سے وہ چڑیل کو دیکھ رہا تھا۔ دونوں ہاتھ اس کے
کندھوں سے بلند تھے۔ مشعل جل رہی تھی اور سرخ روشنی
پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ چڑیل آتش دان کے
قریب گرا رہی تھی۔ آگ دیکھ کر اسے اپنی موت نظر آرہی
تھی۔ زاید یوسف اس سے کہنے لگا۔ ”اب ہٹا، دیالی کے
بارے میں کیا کہہ رہی تھی۔ دیکھ مجھے۔ دیالی کے ایک حقیر
مرید کو۔ جواب تیری موت بنا کھڑا ہے۔“ زاید کے تیر اور
لہجہ بہت زیادہ ہمایک ہو گیا تھا۔ وہ اپنی بھاری آواز میں
چڑیل سے کہنے لگا۔ ”تیرے انجام سے تیرے جیسی شیطانی
قوتیں دیالی کے علاقے سے میلوں دور ہیں کی۔“

وہ چٹکھاؤتی رہی، چیختی رہی اور پھر رونے لگے۔ اس
کے حلق سے ایسی آوازیں نکل رہی تھیں کہ جیسے اسے زندہ ذبح
کیا جا رہا ہو۔ وہ روتے ہوئے زاید یوسف سے رحم کی بیک
مانگنے لگی۔ التجا کرتے ہوئے کہنے لگی۔ ”مجھے جانے دو، میں
وعدہ کرتی ہوں کہ دوبارہ ادھر کا رخ بھی نہیں کروں گی۔
تمہیں دیالی کی قسم، تمہیں تمہارے رب کی قسم، مجھے جانے
دو۔“

زاید یوسف کہنے لگا۔ ”اب وقت گزر گیا ہے۔ وہ
دیالی جو اپنے آستانے سے سالوں نہیں نکلی مگر تمہاری
شرارتوں کی وجہ سے اس عمر میں میلوں کا سفر کر کے دوسرے
گاؤں گئی۔ تم نے ایک شریف اور بے ضرر گھرانے کے علاوہ
دیالی کو بھی تکلیف پہنچائی ہے۔ دیالی نے تمہاری موت کا
فیصلہ کر لیا ہے۔ میں اس سے تمہاری موت کا پروانہ لے کر آیا
ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے لوہے کے ٹکڑے پر کچھ بڑھ کر پھوکا
پھراس نے چڑیل کے آگے اوپر سے نیچے فضا میں لیکر پھینکی تو



سبق

محترم مدیر
السلام علیکم

یہ سچ بیانی میں نے حیدر علی کے واقعات جمع کر کے
لکھی ہے۔ حیدر علی نے ایک بہت بڑی غلطی کی تھی
جسے میں بیان کر رہا ہوں۔ جولیانہ ایک انگریز ماں کی
بیٹی ہے پھر بھی اس نے ایسا کرارا جواب دیا جو نہ
صرف حیدر علی بلکہ ہر ایک کے لیے سبق ہے۔

غلام رضا جعفری
(کراچی)

وہ ہنسی مسکراتی جو میرے قریب آئی تو اس کے جواں
جسم کی ہلکے میرے دماغ پر چھانے لگی۔ جو میں نے اس
سے کل بھی محسوس نہیں کی تھی۔ ساحل سمندر کی تیز ہوا سے
اس کی لمبی لمبی سیاہ دھنیں لہرائی ہوئی میرے چہرے کو چھو رہی
تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے اس کی دھنیں نہیں، کوئی ناگن
ہو جو مجھے ڈسنے کی کوشش کر رہی ہو۔ وہ اپنے منہ کھلاتے
چہرے کے ساتھ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ خوشی سے سرشار
ایک دھمکے کا ہاتھ تھا جسے سمندر کے دوسرے کنارے کو

پر لگا کر گزرتے گئے لیکن سجاد کے جس مخصوص رویے کی وہ عادی
تھی، وہ اب مفقود نظر آنے لگا تھا۔
شادی کے بعد ایک ماہ کا عرصہ انہیں سالوں پہنچنے نظر
آنے لگا تھا۔ خاموشیوں کا ایک جب سلسلہ پروان چڑھنے لگا
تھا۔ دونوں کئی بار کھوٹنے کے لیے جاتے لیکن خاموشی اور ایک
نا معلوم کھنچاؤ ان کے ہمراہی ہوتے تھے۔ وہ کوئی کبھی بات
کرتی تو سجاد کا ایک ہی جواب ہوتا۔
”دکھتی بار بتانا ہے یہ قصہ؟ جانتا ہوں میں پہلے
سے۔“ خود سجاد کو بھی اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ اس کی
گفتگو کی پٹاری الفاظ کے خزانے سے خالی ہو چکی ہے۔
دونوں کا سلسلہ ختم ہوتے ہی گھر کی ذمہ داری اس پہ
آن پڑی۔ اس کے سرسراں میں ماموں اور ممانی کے علاوہ
کوئی بھی نہ تھا لیکن انتظامی صلاحیتوں سے عاری ہونے کی
بنا پر وہ اس چھوٹے سے چمن کو سنوارنے سے بھی قاصر
تھی۔ ساس کے بھرپور تعاون کے باوجود کھانے میں بد
سلطی اور دیگر معاملات میں اناڑی پن سجاد کو اس سے مزید
دور کرتا جا رہا تھا۔ اس کی شیریں زبان اور دعوے اپنے ہی موت
آپ ہی مریخ تھے۔ سندس اب محض منگیت ندر ہی تھی۔ وہ
”بیوی“ تھی جس کا اولین فرض گھریلو معاملات میں نظم و
ضبط تھا۔ مگر دوسری طرف سندس اس نئے امتحان میں مکمل
نا کام ثابت ہو رہی تھی۔

☆.....☆

سجاد کے والدین عمرہ کی ادائیگی کے سلسلے میں حجاز
مقدس کے سفر کی تیاریوں میں مگن تھے۔ ساس کی روائی اسے
مزید بوکھلا رہی تھی۔ اس کی غلطیاں بڑھتی چلی جا رہی تھیں۔
سجاد تنگ آ کر کہتا ”خدا جانے! مجھ سے کلن سے ایسے گناہ مرزد
ہوئے ہیں جس کی مجھے تمہاری صورت میں مزا مل رہی ہے۔“
اس دن گھر میں میلاد منعقد کیا گیا تھا۔ سجاد نے دفتر
سے چھٹی کر رکھی تھی انتہوں کے اختتام پر درس کا انتظام بھی تھا
محلے کے مولانا صاحب کی بیوی دھیمے کچے میں سامعین سے
مخاطب ہوئیں۔

”اللہ عزوجل تعالیٰ نے اس کائنات کو ایک خاص
ترتیب اور نظم و ضبط سے پیدا کیا ہے۔ اس کائنات کی ہر
خلیق ایک خاص نظام سے چلتی ہے۔ پس ہم دیکھتے ہیں
کہ سورج بھی چاند کے مدار میں نہیں آتا اور چاند بھی سورج
کی حدود تجاوز نہیں کرتا۔ انسان اس کائنات میں اشرف
المخلوقات کے عہدے پر فائز ہے یعنی اس کا مرتبہ، مقام و

”اور بیشک اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔
لیکن جو توبہ کر لے تو وہ جتنے والا ہر ایمان ہے۔“ سجاد کی
آنکھوں سے ندامت کے اشک رواں ہو گئے۔

فروری 2018ء

244

ماہنامہ سرگزشت

245

فروری 2018ء

”نہیں نہیں..... خدا نہ کرے کہ میں تم سے بے وفا کی کروں.....“ اس نے میری بات بھی پوری نہ ہونے دی اور جلدی سے اپنا ہاتھ میرے منہ پر رکھ کر مجھے خاموش کرا دیا تھا۔ جیسے میری اس بات سے وہ تڑپ گئی ہو۔ جیسے اس کی روح کانپ گئی ہو۔

”تم خود ہی تو مجھے اپنا دل کہتے ہو مگر اس دل کی دھڑکن تم ہو۔ دھڑکن ہی سے تو دل زندہ رہتا ہے۔ میں بھلا تمہارے بغیر کسی طرح زندہ رہ سکتی ہوں۔“ اس نے کہا تو میرے دل کو اطمینان ضرور ہوا مگر دل کی بے یقینی بھی برقرار رہی۔ مجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیسی نکلتی ہے جو دل اور دماغ کو الجھائے ہوئے ہے۔ محبت اور چاہت کا اثر تھا کہ ایک لمحے کے لیے مجھے پھنجر جانا گویا جان لیوا بات تھی اور ادھر بے یقینی کا یہ عالم تھا کہ ایک لمحہ بھی اس کے پاس رکنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ میرے ساتھ یہ کیا ہو رہا تھا۔ میں کچھ نہیں پار رہا تھا۔ میرا دل اور دماغ دونوں الگ الگ جگہ پر رہتے تھے۔ دونوں ہی ایک دوسرے کو مات دینے کے درپے تھے۔

”اس کے باوجود بھی یقین نہیں آتا جوئی۔“ میں نے یکدم کہہ دیا تو وہ حیرت زدہ سی ہو گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے اس کے پاس میری اس بات کا جواب ہی نہ ہو۔

”شادی کے بعد تو یقین آجائے گا ناں۔ تم نہیں جانتے کہ تمہارے بغیر میرا کیا حال ہوتا ہے۔ ساری ساری رات جاگ کر گزارتی ہوں۔ تمہارا تھوڑی دیر کے لیے بھی مجھ سے جدا ہو جانا۔ مجھے عجب سے کرب میں مبتلا کر دیتا ہے۔ ہوا کی آہٹ پر بھی میں بے اختیار دوڑا زے کی طرف دوڑ پڑتی ہوں کہ شاید تم..... میری تنہائی اور میری بے قراری کو دور کرنے آ گئے ہو مگر میں تمہیں نہ پا کر بہت دہمی ہو جاتی ہوں۔“ وہ رو ہنسی ہو گئی اور میں خاموش بت بنا اسے دیکھتا رہا۔ وہ کچھ دیر بعد بولی۔

”مجھے اس بات پر بہت دکھ ہے کہ تم مجھ پر شک کر رہے ہو مگر میں تم سے کیوں بے وفا کی کروں گی۔ تمہارے پاس ہے کیا مجھے دینے کے لیے کہ میں سب کچھ لے کر فرار ہو جاؤں گی۔ تم تو خود پاکستان سے روزی کمانے آئے ہو۔“ اس نے کہا اور چپ ہو گئی۔ یہ تو اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں تھا بلکہ ایک تنگ وہ جو مجھے اپنے ساتھ ہونے لے جاتی تھی اور جو کچھ بھی وہاں کھانا پینا ہوتا تھا اس کا روپوں کا بل بھی وہ خود ہی ادا کرتی تھی۔ مجھے منع کر دیتی تھی۔ اس کی بات میرے دل کو تھکی تھی اور میں کچھ

یقین اور غیر یقینی کے عالم میں تھا۔

”کیا سوچ رہے ہو؟“ اس نے مجھے چھوا تو میں چونک گیا۔

”نہیں میں سننا تو نہیں دیکھ رہا؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”نہیں..... تم جاگ رہے ہو۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”لیکن، افسانوں اور فلموں میں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ آخر میں بے چارہ ہیرو.....“

میری اس بات پر وہ بہت زور سے ہنسی تھی۔ اس نے سمندری ریت سمیٹ کر میری طرف اچھال دی جس سے میرے کپڑے بھر گئے تھے لیکن اس کی یہ حرکت مجھے بہت اچھی لگی۔

”یہ کوئی افسانہ یا فلم نہیں ہے۔ یہ حقیقت ہے۔ افسانوں اور فلموں کے ہیرو تو تھوڑی دیر کے ہوتے ہیں جب تک افسانہ پڑھا جائے، یا جب تک فلم دیکھی جائے لیکن تم تو اصلی..... ہیرو ہو۔ میری زندگی کے خطی ہیرو۔“ اس نے کہا۔ وہ ہنستے ہنستے سنجیدہ ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کی جھلک تھی۔ اس سے پہلے کہ ماحول مزید غم ناک ہو جائے میں نے موضوع بدلا۔

”تمہاری قسم جوئی! جی چاہتا ہے کہ تم اسی طرح ہر وقت میرے سامنے بیٹھی رہو اور میں تمہیں اسی طرح خوش خوش دیکھتا رہوں۔“

”میں بھی تو یہی چاہتی ہوں۔“ اس نے کہا۔ وہ اپنی آنکھوں کی نمی کو میری شرت کے دامن سے صاف کرنے لگی۔ یہ بات بھی میرے لیے حیرت والی تھی۔

”مگر.....“ میں نے کہا اور خاموش ہو گیا۔ وہ میرے چہرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

”مگر کیا؟“ اس نے اس طرح ایک دم بے قراری سے پوچھا کہ جیسے اس کے دل میں بھی ہول اٹھ رہا ہو۔

”مگر..... دل میں ڈرا بھرنے لگا ہے جوئی۔“

”کس بات کا ڈر جانو؟“ وہ جلدی سے بول پڑی۔

”کہیں ایسا نہ ہو کہ تم مجھ سے.....“

”بے وفا کی نہ کروں۔“ اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔

اور میں جواباً اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ وہ مسکراتے لگی اور پھر مسکراتے مسکراتے اوجھی آواز میں بولی۔

”اگر تم نے بے وفا کی تو.....“

”وہ ہو گیا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔“ اس نے حیرت سے کہا۔ وہ میری بات کو سمجھ نہیں پاتی تھی اور میں کل کر بات کرنے سے گریز کر رہا تھا۔

”ہاں..... وہ ہو گیا ہے جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ مجھے اس کی بالکل بھی توقع نہیں تھی کہ جو تم نے کر دیا ہے۔“ میں نے بات کو خواہ مخواہ طول دیا۔

”مگر ایسا کیا ہو گیا ہے جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں نے کیا کر دیا ہے ایسا جس سے تم اس طرح پریشان ہو گئے ہو۔“ اس نے جھٹکا کر کہا۔ بظاہر تو اس نے اپنے غصے کو دبانے کی کوشش کی تھی اور مجھے لگے کہ میں بات کر رہی تھی۔ اس کے انداز پر مجھے ہنسی تو آئی مگر میں نے کمال ضبط سے کام لیا۔

”جادو.....“ میں نے کہا۔

”کیا جادو.....؟“ وہ میری بات پر ہنسی مچ گئی تھی۔

”مگر کس پر؟“ اس نے پوچھا۔

”مجھ پر اور کس پر۔ جو تم نے کر دیا ہے۔“ میں نے کہا۔

”جادو..... میں نے..... اور تم پر؟“ اس نے ہر لفظ پر زور دے کر کہا اور کھٹکھٹا کر ہنسنے لگی۔ اس کا اس طرح کھٹکھٹانا مجھے بہت اچھا لگا تھا۔ اسے کھٹکھٹاتے دیکھ کر میں بھی ہنس پڑا۔ مجھے اس پر بہت پیار آیا۔ جی چاہا کہ اسے اپنی ہانہوں میں سمیٹ لوں لیکن اس موقع پر میں نے ایسا کرنے سے اجتناب کیا۔

”ہاں جوئی! تمہارے حسن و شباب نے مجھے تمہارا اسیر کر دیا ہے۔ ہر وقت ہر جگہ میں تمہارے ہی خیالات میں کم رہتا ہوں۔ دل میں تم، دماغ میں تم، سانسوں میں تم، سوچوں میں تم اور نگاہوں میں بھی تم ہی تم۔ یہ سب تمہارا جادو نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ میری کیفیت تو ایک بوتل کے جن کی سی ہو گئی ہے۔ جی چاہے کسی شاعر نے

اس طرح سے چٹھا جیسے بوتل کا جن تیرے جادو کا کوئی اتارا نہیں مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے یہ کوئی پینا ہو یا پانی دی ڈراے کا رو مانوی سین۔ مجھے اس حقیقت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اپنے سر کو زور سے جھٹکا اور اچھرا دھر دیکھا۔ یہ حقیقت بھی مجھے افسانوں جیسی ہی لگ رہی تھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میری زندگی میں ایسے حسین لمحات بھی آئیں گے۔ مجھے کچھ سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیسے ہو گیا۔ قدرت نے اس ناممکن کو ممکن کیسے بنا دیا۔ میں کافی دیر تک

چھوٹے ہوئے سورج کی طرف دوڑ پڑے۔ سمندر کی تیز بیل کھاتی ہوئی لہروں نے ہمارے جسموں کو بھگو دیا تھا۔ ہم دونوں الگ ہو گئے پانی کا ریلا مجھے پیچھے چھوٹ گیا تھا مگر جب وہ غوطہ لگا کر..... سمندر کی چٹکی ہوئی لہروں کو چیرتی ہوئی اوپر کو ابھری تو ایسا لگا کہ جیسے کوئی جل پری ہو۔ وہ دوڑتی ہوئی میرے قریب آئی تو میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس سر میں صورت کو اپنی ہانہوں میں بھر لیا اور پھر اسی وقت مجھے ایسا جھٹکا لگا کہ میں خیالات کی دنیا سے واپس لوٹ آیا۔ میں نے اپنے سر کو جھٹکا اور ایک سرد آہ بھر کر رہ گیا۔ جولی میرے سامنے بیٹھی مجھے گھور رہی تھی۔

”اس طرح کیوں گھور رہی ہو؟“ اس سے پہلے کہ وہ کوئی سوال کرے میں نے مسکراتے ہی ناکام کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔ میرے دل میں اداسی چھا گئی تھی۔ ایسا پتا نہیں کیوں ہو گیا تھا۔ جب میں یہاں پہنچا تھا تو دل بہت خوش تھا اور چہرہ مکمل سا گیا تھا۔ پھر یہ اچانک..... پتا نہیں کیا بات تھی۔

”کہاں کھو جاتے ہو تم؟ اتنی دیر سے پکار رہی ہوں۔ تم ہو کہ سننے ہی نہیں۔ لگتا ہے کسی اور کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ کون ہے وہ جو تمہیں مجھ سے بچھن رہی ہے۔ جو تمہارے خیالات پر تمہاری سوچوں پر چھا گئی ہے۔“ اس نے میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے الٹا سوال کر دیا اور پھر بات اتنی ہی کہیں..... وہ وہ جو کچھ کہہ رہی تھی اسے سن کر حیرت ہو رہی تھی کہ وہ میری توجہ کی اتنی طالب ہے۔ اس کے جواب..... پر میں اسے کچھ دیر بت بنا دیکھتا رہا اور کوئی بات کرنے کی بجائے مسکرا دیا۔ میرا خیال تھا کہ مجھے مسکراتا دیکھ کر وہ بھی مسکرائے گی مگر ایسا نہیں ہوا۔ وہ اسی طرح خاموش خاموش بت بنی مونی مونی آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھتی رہی۔

”کافی دیر سے گم صدم ہو..... کوئی بات ہوئی ہے کیا؟“ اس نے میری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر پھر سوال کر دیا جب کہ یہی بات تو میں بھی سوچ رہا تھا کہ اس لڑکی کو کیا ہو گیا ہے اور وہ اس طرح کی گم صدم کی طرح پھرا سی کیوں گئی ہے۔

”ہاں..... ہوئی ہے بات.....“ میں نے کہا۔

”کیا؟“ اس نے فوراً پوچھا اور سوالیہ نظریں میرے چہرے پر جمائے میرے جواب کا انتظار کرنے لگی۔

”وہی..... جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔“ میں نے کہا۔ وہ اب بھی حیرت زدہ مجھے دیکھ رہی تھی۔

”آپ لوگ پاکستانی ہیں؟“ اس نے پوچھا۔
 ”آپ نے درست پہچانا۔“ میں نے داد دیتے ہوئے کہا۔ پھر پوچھا۔ ”آپ نے اپنا نام نہیں بتایا۔“
 ”جولی۔“ اس نے مختصر سا جواب دیا۔
 ”مجھے حیدر علی کہتے ہیں اور یہ میرا دوست منصور ہے۔“ میں نے تعارف کرایا۔
 ”بس..... ایک طرف گاڑی روک دو۔“ منصور نے کہا تو جولی نے ایک لمبے کی تاخیر کے بغیر گاڑی روک دی۔
 گاڑی کے رکے ہی منصور باہر نکل آیا اور مجھے بھی نہ چاہنے کے باوجود اترتا ہوا۔
 ”عجب بے وقوف آدمی ہو تم۔“ میں گاڑی سے اترتے ہی منصور پر ہنسی کیا۔
 ”کیوں کیا ہوا؟“ اس نے پوچھا۔ منصور میری بات کا مقصد سمجھ نہیں سکا تھا۔
 ”تم نے گاڑی کیوں رکوائی؟“ میں نے جواب دیا۔
 ”تو کیا سارا دن اس کے ساتھ گھومتے رہتے؟“ منصور نے کہا۔
 ”سارا دن نہ کسی مگر کچھ دیر ہی اور کپ شپ ہوجاتی۔“ میں نے جواب دیا۔
 ”تمہاری اس فضول کپ شپ کی وجہ سے اسٹاپ ایک میل پیچھے رہ گیا ہے۔“
 ”اچھا!“ اس نے بتایا تو میں چونک پڑا۔
 ”ہاں اب پیدل جانے میں اور مزہ آئے گا تمہیں۔“ اس نے کہا۔
 یہ جولی سے ہماری پہلی ملاقات تھی۔ دوسری ملاقات اس وقت ہوئی جب میں اور منصور ریسٹورنٹ میں چائے پی رہے تھے۔ ہم دونوں تقریباً روز یا کچھ وقت سے اپنی دکان بند کر کے کچھ وقت گزارنے یہاں آ جاتے تھے۔ چائے پیتے اور کپ شپ کرنے سے کچھ یوریت دور ہوجاتی تھی۔ جب کبھی چند ایک اور دوستوں کا ساتھ ہوتا تو شام کا دیر تک اسی قبوہ خانے میں بیٹھے رہتے تھے۔ اس روز بھی چند ایک دوستوں کے مل جانے کی وجہ سے ہم کافی دیر تک یہاں بیٹھے رہے تھے۔ ہم دوستوں کے جانے کے بعد اٹھنے ہی تھے کہ جولی نے آکر سلام کیا اور کہنے بغیر ہی میرے برابر والی کرسی پر براجمان ہو گئی اور ہم دونوں اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گئے۔ اس دوسری ملاقات میں جولی نے ہمارے ساتھ اسی طرح فری ہو کر کپ شپ کی کہ جیسے ہم بہت پرانے ملنے والے

”ابھی آپ اپنے گھر جائیں گے؟“ اس نے پوچھا۔
 ”ظاہر ہے اپنے ہی گھر جائیں گے۔ کسی اور کے گھر جائیں گے تو.....“ منصور نے کہا اور ادھر اوجھڑا جملہ چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔
 ”چلیں ٹھیک ہے۔ آپ میری گاڑی اسٹارٹ کرائیں تو میں آپ کو آپ کے گھر ڈراپ کر دوں گی۔“
 ”اگر آپ نے راستے میں اتار دیا تو پھر؟“ میں نے کہا۔
 ”میں نے کہا ناں آپ کے گھر تک چھوڑ دوں گی۔“ اس نے کہا۔
 اس گاڑی کے اسٹارٹ ہونے یا نہ ہونے سے ہمیں کوئی سروکار نہ تھا۔ ہمیں تو صرف ناٹم پاس کرنا تھا۔ گھر تو ہم نے جانا ہی تھا۔ تھوڑی دیر گاڑی کو دھکا دینے میں کیا حرج ہو گا۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے منصور کو آنکھ دبا کر اشارہ کیا اور کہا۔
 ”چل دیار لگا دو دھکا۔“
 ہم دونوں بہت دور تک دھکا لگاتے رہے اور اپنی پو پو لی ہوئی سانس کے ساتھ باتیں بھی کرتے رہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم بری طرح تھک گئے تھے اور اس کی گاڑی بھی کراٹھارٹ ہونے کا نام ہی نہ لے رہی تھی۔
 ”بیٹا یہ جان بوجھ کر گاڑی اسٹارٹ نہیں کر رہی۔ مزے لے رہی ہے۔ تمہاری بے وقوفی سے۔“ منصور نے کہا۔
 ”میری بے وقوفی کی وجہ سے نہیں بلکہ تمہاری ضد کی وجہ سے ایسا ہو رہا ہے۔“ میں نے اس بات کا انکزام بھی اسی پر لگا دیا اور پھر اسی وقت کفرنا خدا خدا کر کے والی بات کے مصداق ایک دم ہی گاڑی اسٹارٹ ہو گئی اور تیزی کے ساتھ آگے بڑھی اور ہم دونوں ہی لڑکھڑائے ضرور مگر کرتے کرتے بچ گئے۔
 ”مٹی بیٹا۔ تمہیں کالو مل گئی۔“ منصور..... ہنسنے لگا اور پھر ہم نے دیکھا گاڑی دور جا کر رک گئی۔
 ”رک گئی یا۔۔۔ گاڑی رک گئی۔“ میں نے فخر لگانے کے انداز میں کہا اور ہم دونوں ہی بھانگتے ہوئے گاڑی کے پاس پہنچے۔
 میں نے جلدی سے دروازہ کھولا اور ہم بچھلی سیٹ پر براجمان ہو گئے۔ میں نے اسے جگہ بتادی جہاں ہم نے جانا تھا۔

ہم چند قدم ہی چلے تھے کہ ایک تیز ٹیلے رنگ کی خوب صورت کار روک کنارے کھڑی نظر آئی۔ جب ہم اس کے نزدیک سے گزرے تو کار میں بیٹھی لڑکی نے ہمیں مخاطب کیا۔ ”ایکسکوز می“ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا اور پھر دونوں ہی اس لڑکی کی بات سننے کے لیے آگے بڑھے۔
 ”میری فرمائیں؟“ میں نے پاٹ لہجے میں پوچھا۔
 ”میری گاڑی بند ہو گئی ہے۔“ اس نے بڑی معصومیت سے کہا۔
 ”تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟“
 ”آپ کی طبیعت تو خراب نہیں ہے؟“ اس نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ منصور نے میرے سر پر ہیر مار کر مجھے خبردار کرنے کی کوشش کی مگر میں اس کی بات کو سمجھ کر بھی انجان بن گیا تھا۔
 ”اچھا تو آپ گاڑی کا کوئی کام کروانا چاہتی ہیں۔“ میں نے پوچھا۔ تو وہ چند لمبے میری صورت کو دیکھتی رہی اور پھر اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے بولی۔
 ”میرا مطلب ہے کہ آپ تھوڑا سا دھکا لگادیں۔“
 ”آپ کا مطلب ہے کہ ہم..... آپ کی گاڑی کو دھکا لگائیں؟“
 ”جی ہاں جناب میرا یہی مطلب ہے۔“ اس نے کہا۔
 ”میں ہم اتنی طاقت تھوڑی ہے کہ آپ کے گھر تک گاڑی کو دھکا لگاتے ہوئے لے جائیں۔“ میں نے انکار یہ لہجے میں کہا تو وہ چونک گئی۔ ذرا بیٹھا کی مگر اس نے اپنی کیفیت کو چھپانے میں کمال ضبط کا مظاہرہ کیا۔
 ”ارے نہیں بابا آپ گاڑی کو ذرا سا دھکا لگائیں گے تو اسٹارٹ ہو جائے گی۔“ اس نے کہا اس کا انداز دوستی کا تھا۔
 ”اگر ہم دھکا نہ لگائیں تو؟“ منصور نے کہا۔
 ”تو گاڑی اسٹارٹ نہیں ہوگی۔“ اس نے کہا اور گاڑی سے باہر ادھر ادھر جھانکنے لگی۔ ”کوئی بات نہیں ابھی کوئی نہ کوئی ضرور آ جائے گا۔ وہ آنے والا میری گاڑی کو دھکا لگے گا اور میری گاڑی اسٹارٹ ہو جائے گی۔“ اس نے کہا۔
 ”میں لطف و فٹ کی کوئی لالچ نہیں ہے۔“ میں نے کہا تو وہ مسکرائے لگی۔

شرمسار ہو گیا تھا۔ پھر کچھ دیر تک ہم دونوں ہی خاموش رہے۔
 ”میں اپنا تن من تمہارے حوالے کر دینا چاہتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ اپنے جذبات اپنی دھن دولت سب کچھ تمہارے سپرد کر کے تمہاری لازوال محبت کے سائے میں ترسوں زندگی گزاروں۔“ سچ بتاؤ تم مجھ سے جدا تو نہیں ہو جاؤ گے نا؟“ اس نے کرب ناک لہجے میں کہا اور اپنا سر میرے سینے سے لگا لیا۔ وہ باقاعدہ سسکنے لگی تھی۔ مجھے اس بات کا قطعاً احساس نہیں تھا کہ وہ میری محبت میں اس قدر آگے نکل چکی ہے۔ وہ میرے لیے اپنے دل میں ایسے جذبات رکھتی ہے۔ اسے مجھ سے سوائے محبت کے اور کیا غرض ہو سکتی ہے جب کہ یہ انداز محبت تو مشرقی ہے۔ مغرب میں محبت کے معنی اور ہیں۔ اس مغربی لڑکی کے اندر مشرقی روح تھی۔
 ”نہیں جولی میں تمہارے ساتھ جیوں گا اور تمہارے ساتھ ہی مروں گا۔“ میں نے کہا تو اس کا چہرہ ایک دم خوش سے مکمل گیا۔
 ”سچ۔“ وہ ایسے خوش ہو گئی کہ جیسے کسی روتے ہوئے بچے کو کھلو نال جائے۔
 ”تمہاری قسم جولی۔“ میں نے اس کی گردن کے گرد اپنی بانہوں سے حلقہ بنایا۔
 نہ جانے کتنی دیر ہو گئی تھی ہمیں اس طرح بیٹھے بیٹھے۔ سمندر کی تیز لہریں جب ہم سے ٹکراتیں تو ہم دونوں ایک دم ہی ہوش میں آ جاتے کہ جیسے مردہ جسموں میں روح داخل ہو گئی ہو۔ پھر ہم دونوں اٹھ کر ایک طرف چل پڑے۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم کار کے پاس پہنچ گئے۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور جولی کو ڈرائیوگ سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ جولی نے فرنٹ سیٹ سنبھال لی اور گاڑی اسٹارٹ کر لی۔ میں بھی اس کے برابر والی سیٹ پر براجمان ہو گیا۔ میرے بیٹھے ہی کار اس نے آگے بڑھا دی۔
 ہماری ملاقات بڑے عام طریقے سے ہوئی تھی۔ اس وقت میرا دوست منصور بھی میرے ساتھ تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس روز بھی ہم دونوں ریسٹورنٹ سے کھانا کھا کر باہر نکلے اور قریب ہی اسٹاپ پر ٹیکسی کے انتظار میں کھڑے تھے۔ اس وقت ہم دونوں بڑے خوشگوار موڈ میں نہیں لگنے میں مصروف تھے۔ کافی دیر تک کھڑے کھڑے ہم تھک گئے اور پور بھی ہو گئے تو آہستہ آہستہ ایک طرف بڑھنے لگے۔ ابھی

ہوں۔ وہ بطور خاص مجھے ہی مخاطب کر رہی تھی۔ اس ملاقات کے بعد میں اور جولی اکثر کہیں نہ کہیں ملنے لگے۔ ایک دوسرے کے گھر میں آنے جانے لگے۔ پہلی دفعہ وہ خود ہی مجھے گھر لے گئی تھی اور میرے گھر میں بن بلائے ہی آگئی تھی۔ ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ بدست چلا گیا اور ہم دونوں قریب سے قریب تر ہو گئے۔

☆.....☆

ایک روز دروازہ کھٹکا لگا اور میں ایک دم آگے کی طرف جھکا اور میرا سر کار کی ککڑکی کے ساتھ تھکتے تھکتے بجا۔ جولی نے ایک دم بریک لگایا کہ گاڑی جہاں تھی وہیں جم کر رہ گئی۔ جب مجھے احساس ہوا کہ اپنے علاقے میں پہنچ چکے ہیں۔

”تھیک یو۔“ میں نے مسکرا کر جواب دیا، اس سے مصافحہ کر کے گاڑی سے باہر نکلا اور اپنی بلڈنگ کی طرف چل پڑا۔ جس میں ہم عارضی طور پر رہ رہے تھے۔ اس سے پہلے ایک اور جگہ رہ رہے تھے جس کا کرایہ ادا کرنا ہوتا تھا۔ جولی سے قریبی تعلقات کے بعد اس نے اپنی بلڈنگ میں فلیٹ دے دیا تھا اور یہاں ہم پچھلے ایک سال سے رہ رہے تھے یہاں ضروریات زندگی کی تمام سہولیات موجود تھیں اور پھر کرایہ کی رقم بھی ادا نہیں کرنا پڑی تھی۔ میں ایک خاص انداز میں سیٹیاں بجاتا ہوا دو ویسٹریاں پھلانگ کر اپنے فلیٹ تک پہنچا اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ لائٹ جل رہی تھی۔

”ہیں..... لائٹ جل رہی ہے؟“ میں نے اپنے ذہن پر زور دے کر سوچا اور پھر میں آپ ہی آپ مسکرا دیا۔ کیوں کہ اکثر جولی سے ملنے کی جلدی میں کوئی نہ کوئی غلطی ضرور کر دیتا ہوں۔ چند روز قبل تو میں فلیٹ کے مین گیٹ کو لاک کرنا ہی بھول گیا تھا اور اس رات وہاں بھی کافی دیر سے ہوئی تھی مگر خدا کا شکر ہے کہ ہر چیز اپنی جگہ پر جوں کی توں موجود تھی۔

صوفے پر میں نے اپنے آپ کو اس طرح گرادیا کہ جیسے تھک کر چور ہو گیا ہوں۔ حالانکہ میں پچھلے دو دنوں سے مکمل چنچیاں کر رہا تھا۔ میں نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر اپنی دونوں آنکھیں اس طرح بند کر لیں جیسے نہ جانے کتنی ہی تکلیف میں ہوں۔ پھر پتا نہیں کب نیند نے بے خبر کر دیا۔

”ارے..... تم کس وقت آئے؟“ آنکھ کھلی تو منصور

کو بیڈ پر موجود پایا۔ اس طرح اچانک اسے دیکھ کر میں چونک پڑا تھا۔

”زیادہ دیر نہیں ہوئی۔“ اس نے جواب دیا۔

”زیادہ دیر کے بچے اطلاع نہیں کر سکتے تھے۔“

ایئر پورٹ آ جاتا۔“ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔

”میں نے تمہیں تکلیف دینا مناسب نہیں سمجھا۔“

اس نے اسی طرح سنجیدگی سے جواب دیا اور بیڈ سے اٹھ کر صوفے پر مگر کرنے کے انداز میں بیٹھ گیا۔

”ارے یا اس میں تکلیف کی کیا بات ہے۔“

”جولی جولی جولی..... بھائی میں جولی۔“ اس نے میری بات کاٹ کر کہا تو میں بھر گیا۔

”یہ کیا بکواس ہے۔“ میں نے جھڑک کر کہا۔ وہ بہت غصے میں تھا۔ غصے کی شدت سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

”خاموش ہی تو نہیں رہ سکتا۔“ اس نے کہا۔ اب اس کا لہجہ سرد پڑ گیا تھا۔

”کیوں؟“ میں نے منہ بسور کر کہا۔

”اس لیے کہ تم دن بھر عیاشی کی دلدل میں ڈوبتے جا رہے ہو۔ اپنی زندگی کو برباد کر رہے ہو۔“ اس نے پھر دینے کے انداز میں کہا۔

”بہنہ۔“ میں اس کے جواب میں طنزیہ ہنسا۔ وہ خاموش رہا۔

”یہ کیوں نہیں کہتے کہ تم جولی کو میرے ساتھ برداشت نہیں کر سکتے۔ اگر تم اپنے خوابوں کی اچھی تعبیر سے محروم ہو تو میرے راستے کا پتھر مت بنو اور تم.....“

میری زبان نہیں رک گئی۔ اس سے آگے میں نے کچھ نہیں کہا اور پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ کیوں کہ دروازے پر ایک مخصوص انداز میں دستک ہوئی تھی۔ میں نے جلدی سے بڑھ کر دروازہ کھولا تو جولی اپنے خوب صورت بالوں کو سنواراتی ہوئی اندر آگئی۔

”یہ شور کیسا ہے؟“ اس نے آتے ہی سوال کر دیا۔

میں نے منصور کی طرف دیکھا۔ وہ میرے اندر کے غصے کو بھانپ گیا تھا۔ اس نے معاملے کو دفع کرنے کی خاطر خاموشی سے اپنا وہ بیان کتاب پر مرکوز کر دیا۔

”اوہ..... کچھ نہیں..... شور تو کوئی نہیں ہو رہا۔“ میں نے جولی سے مخاطب ہو کر ہنستے ہوئے کہا اور اسے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”کہیں میری وجہ سے تو.....“

”نہیں نہیں جولی، تم تو میری جان ہو۔“ میں نے اس کا جملہ مکمل نہ ہونے دیا۔

”چلیں؟“ اس نے اپنی موٹی موٹی کاجل سے میری آنکھوں کو ایک خاص انداز میں سمجھاتے ہوئے کہا۔

”تو چلو۔“ میں نے ذرا آگے ہو کر سرگرمی کے سے انداز میں کہا اور پھر ہم دونوں ہنستے ہوئے دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

☆.....☆

وہ مجھے ٹائٹ کلب لے آئی تھی ایسی ہی جگہ میں پہلی بار آیا تھا۔ اس رات جولی کے اصرار پر میں نے وہ کسی کے کئی جام خالی کر دیئے تھے۔ ڈیڑھ سارے سگریٹ چھوٹک ڈالے تھے۔ وہاں رات گئے میں ہوئی۔

صبح دن چڑے اٹھا تھا۔ اٹھنے کے بعد گھڑائی لی تو مجھے اپنا جسم ٹوٹا ہوا محسوس ہوا۔ درو کی شدت سے سر پھٹ رہا تھا۔ آنکھوں میں شدید جلن ہو رہی تھی۔ جیسے کسی نے مرچیں جھوک دی ہوں۔ دل خراب ہو رہا تھا۔ کئی محسوس ہو رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے ابھی ایک اگلائی آنے کی اور تمام استریاں باہر آن کرں گی اور میری اگلائی میری زندگی کی آخری اگلائی ہوگی۔ درو کی شدت سے میں نے زوردار آہ بھر کر اپنا بایاں ہاتھ پل پر رکھ لیا۔ دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو رہی تھیں۔ کچھ فون بزرگ آگیا تھا۔

فون کی تیز گھنٹی نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے لپک کر رینگہ پورا اٹھایا۔

”ہیلو۔“ میں نے جلدی سے کہا۔

”ہیلو جانو کہاں ہو تم؟“ دوسری طرف سے کانوں میں رس گھونٹی آواز سنائی دی۔

”ہیں میں ابھی آیا۔“ میں نے کہا۔

”ایک گھنٹے تک تمہیں میرے پاس موجود ہونا چاہیے۔ میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔“

”میں اس سے پہلے ہی جاؤں گا۔“ میں نے کہا۔

”دیکھو جانو اگر تم نہ آئے تو میرا دم نکل جائے گا۔“

میں تمہاری باتوں میں مرنا چاہتی ہوں۔ تمہارے سینے سے لگ کر۔“ اس نے کہا اور فون کی لائن کٹ گئی۔ میں جلدی جلدی تیار ہونے لگا۔

”گھر سے تمہارا خط آیا ہے۔“ غسل خانے سے نکلتے ہی منصور نے اطلاع دی۔ میں نے اس کے ہاتھ سے خط لیا

اور ایک طرف رکھ دیا۔

”خط پڑھو تو سہی۔“ منصور نے کہا۔

”بہنہ..... کیا لکھا ہے اس خط میں۔“ مجھے سب معلوم ہے۔“ میں نے جیسے پروا ہی نہ کیا۔ میری اس حرکت پر منصور کی نظریں مجھ پر جم گئیں۔ وہ مجھے ذہر آلود نظروں سے گھورنے لگا۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ میرا گلا باندھ دیتا۔

میں نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی اور پیر پروا سے اپنے بال سنوارنے لگا۔

”خط پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ حالات سے آگاہی ہو جائے گی۔“ اس نے میرے قریب آ کر کہا۔

”مجھے سارے حالات معلوم ہیں۔ وہی رونا دھونا ہو گا۔ وہی تکلیفیں، وہی پیاریاں غریب، قرض داروں کی قطاریں، قافے، مجبوریاں اور ضرورتیں۔ ان کے علاوہ اور کیا ہو گا اس خط میں۔ کچھ بھی نہیں۔“ میں نے کسی مقرر کی طرح تقریر کی۔

”یہ سب تو اس وقت بھی تھا جب تم وہاں تھے۔“ منصور نے کہا۔

”ہاں۔“ تھا سب کچھ اس وقت بھی۔“ میں نے جواب دیا۔

”دیکھ..... اس وقت اتنا قرض نہیں تھا جتنا اب ہے۔“ اس نے کہا۔

”تو کیا ضرورت تھی اتنا قرض لینے کی۔“ میں نے کہا۔

”ضرورت نہیں تھی؟“ اس نے مجھے گھورا۔

”نہیں۔“ میں نے اس سے نظریں چرائیں۔

”تم یہ بھول گئے ہو کہ جا چاہتی تھی قرض لے کر ہی اپنا مکان سر کی چھت بچ کر نہیں بیٹھا ہے۔“ اس نے کہا۔ میں اس کے جواب میں خاموش رہا۔

”تم یہ بھی بھول گئے ہو کہ ان حالات کو ختم کرنے کے لیے ہی ہم یہاں آئے ہیں۔“ اس نے میرے یہاں آنے کا مقصد یاد دلایا۔

”ہم نہیں..... صرف تم..... میں تو ان سب چیزوں سے جان چھڑا کر یہاں آیا تھا۔“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

”اپنے ماں باپ سے بھی..... بہن سے بھی؟“ اس نے دسمی لہجے میں کہا۔

”میں نے یہ کب کہا ہے۔“ میں نے کہا۔

”یار! تمہیں اس قیدی کا بھی خیال نہیں۔“ اس نے

پوچھا۔

”قیدی..... کون قیدی.....؟“ میں اس کی بات پر چونک پڑا۔

”وہ قیدی جو تمہاری معیت ہونے کی سزا بھگت رہی ہے۔“ اس نے کہا۔

”ہونہ..... معیت.....؟“ میں نے طنز پر کہا۔ ”کسی سے کوئی رشتہ نہیں ہے اب میرا۔“ میں نے بے برہمی سے کہا۔

”کیا کہا؟ تمہارا کسی سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”نہیں۔“ میں نے کہا۔

”تم جانتے ہو۔ یہ تم نے کتنی بڑی بات کہہ دی ہے۔“

”میں سب جانتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”ہاں..... تمہاری تو تمام رشتہ داریاں جولی سے ہیں۔“ اس نے بھی طنز پر کہا۔

”ہاں ہاں! جولی سے تمام رشتہ داریاں ہیں۔“ میں نے کہا۔ اس کے جواب پر میں بھڑک گیا تھا۔ ”میں جولی سے شادی کر رہا ہوں۔“

”کیا؟“ میری بات سن کر منصور چیخ اٹھا۔ ”اور..... اور میری بہن..... اس کا کیا ہوگا؟“ اس نے کہا اور میرا بازو پکڑ کر اپنی طرف گھمایا۔ وہ میرا منہ دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔

”میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ میں نے دو ٹوک جواب دیا۔

”اس وقت تو تم اور تمہارے ماں باپ نے میری اماں کے بچہ پکڑ لیے تھے۔ منت سماجت کی تھی۔ میں تو رضامند بھی نہیں تھا اور آج تم.....“

وہ کہہ رہا تھا اور میں اس کی مزید کوئی بات سننے بغیر فلیٹ سے باہر نکل گیا۔

میں نے گاڑی اشارت کی اور جولی کے گھر کی طرف دوڑا دی۔ وہ میرا بے چینی سے انتظار کر رہی ہوگی۔ اتنی دیر میں وہ خود آجانی اگر میں اس کی گاڑی نہ لایا ہوتا۔ کل رات کا پی ہو گئی تھی اس لیے اس نے اپنی گاڑی مجھے دے دی تھی تاکہ مجھے گھر آنے میں پریشانی نہ ہو اور پھر وہ کہ مجھے منصور پر غصہ بھی آ رہا تھا۔ اس کی اس بے بسی کی وجہ سے میں لیٹ ہو گیا تھا۔

جولی کے گھر میں کافی دیر تک رہا پھر واپس آیا تو

منصور کو روک دیتا تھا..... پھر اس کے دن کی وہ نہ آیا۔

مجھے اس کی پروا بھی نہیں تھی اس لیے میں نے اس کی محسوس ہی نہ کی اور ایک مینینا گزر گیا۔ میں ہر روز اس کے ساتھ وقت گزارتا۔ اس دن بھی میں رات دیر تک اس کے گھر میں رہا پھر واپس لوٹ آیا۔ ابھی رات کی کسکندی اتنی بھی نہ تھی کہ جولی کا فون آ گیا کہ فوراً پہنچو۔

مختلف راستوں سے ہوتا ہوا جولی کے گھر کے سامنے پہنچا۔ میں نے جلدی سے گاڑی سے باہر نکل کر کال نکل دیا۔

”جی فرما ہے؟“ ملازم نے آکر پوچھا۔

”جولی؟“

”جولی صاحبہ تو انگلینڈ چلی گئیں۔“ اس نے بتایا۔

”انگلینڈ چلی گئی؟“ میں نے اس کے جواب کو حیرت سے دہرایا۔ انہوں نے آپ کے لیے ایک لفافہ دیا تھا۔ ملازم نے کہا اور گھر کے اندر گھس گیا۔ میں دو لڑے سے اندر داخل ہونے لگا تو ملازم نے مجھے روک دیا اور وہیں انتظار کے لیے کہا۔ وہ تھوڑی دیر بعد لفافہ لے آیا۔

”کون کون گئے ہیں۔ کب واپس ہوں گے؟“ میں نے پوچھا۔

”واپسی کا تو پتا نہیں ویسے دیر سے آئیں گے..... کیوں کہ.....“

”کیوں کہ کیا؟“ میں نے اس کی بات کاٹ کر جلدی سے پوچھا۔ میرا دل گھبرانے لگا تھا۔

”کیوں کہ وہ کہہ رہی تھیں کہ وہ مشرقی ممالک بھی جائیں گی۔“

”کیا؟“ ملازم کا جواب سن کر میں ہکا بکا اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔

میں نے جولی کا چھوڑا ہوا لفافہ جلدی جلدی لرزتے ہاتھوں سے کھولا۔ میرے ہاتھ بری طرح لرز رہے تھے۔ گلا خشک ہو رہا تھا۔ حلق میں کانٹے سے چسپے لگے تھے۔ لفافے سے کاغذ نکال کر دیکھے تو میرے قدموں تلے سے زمین نکل گئی۔ کیونکہ اس نے دیے ہوئے فلیٹ جس میں ہم پچھلے ایک سال سے رہ رہے تھے۔ پورے ایک سال کا کرایہ کا پورے سو ڈالر کے حساب سے مطالبہ کیا تھا۔ مجھے ایسے لگا کہ جیسے زمین اور آسمان یک دم آپس میں ٹک گئے ہوں اور میں ان دونوں کے درمیان دب گیا ہوں۔ میں اس ملازم کی شکل دیکھنے لگا۔ میں بوجھل بوجھل قدموں سے گاڑی کی طرف

بڑھا۔ میں نے گاڑی کا دروازہ ابھی کھولا ہی تھا کہ ملازم دوڑتا ہوا آیا۔

یہ گاڑی مت لے جائیں۔ جولی صاحبہ نے منع کیا تھا۔ ویسے بھی یہ گاڑی ہم ملازموں کے لیے ہے۔ اس نے کہا اور گاڑی کی چابی نکال کر اندر چلا گیا اور میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ اب مجھ پر حقیقت آشکار ہوئی تھی۔

میری آنکھوں سے خود بخود دانی جاری ہو گیا۔ میری سانس بے ترتیب ہو گئی۔ دل کی دھڑکن اس قدر تیز ہو گئی کہ جیسے دل ابھی سینہ چیر کر باہر آ کرے گا۔ قدم سن من بھر کے لگ رہے تھے۔ ڈپریشن کی شدت سے سر درد سے پیٹنے لگا تھا۔ جسم پیٹنے لگ گیا تھا۔ ایک قدم بھی چلنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ اس کے باوجود بھی کافی دور تک چلتا رہا۔ ٹھنکی روکی اور گھر واپس آ گیا۔ اس گھر میں جہاں میں صرف تین چار دن ٹھہرنے کی اجازت ملی تھی ورنہ قانونی کارروائی کرنے کی دھمکی ملی تھی جو کہ جولی ہی کی طرف سے تھی اور صاف ظاہر ہے کہ قانونی چارہ جولی میں میری ہی بار ہوتی۔

جرمانہ کے علاوہ ایک ماہ قید ہوتی۔ میں فلیٹ میں آتے ہی بیڈ پر گر پڑا۔ جولی پر مجھے بہت غصہ آ رہا تھا۔ اس وقت اگر وہ میرے سامنے جوتی تو شاید میں اس کا گلا دبانے سے بھی گریز نہیں کرتا۔

میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ مجھے اتنی بلندی پر لے جا کر گرا دے گی۔ ایک دن باتوں باتوں میں اس نے مجھے خبردار بھی کر دیا تھا تھیں میں اس کی بات کو سمجھ نہ پایا تھا۔ اپنی محبت کا اظہار کرتے ہوئے میں نے جب اس کی بل کھائی ہوئی اس زلف گرہ کیہ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا تھا۔ ”تم ایک ایسا مہکتا ہوا گلاب ہو کہ جسے میں اپنے کار میں اس طرح سجانا چاہتا ہوں کہ دسی دسی مہک مجھے سرور کرتی رہے۔“

”تم مردوں کی بیٹی تو خانی ہے کہ جس خوب صورت چیز کو دیکھا اور اسے حاصل کرنے کی خواہش کر دی۔ کسی نا سمجھ معصوم بچے کی طرح جو بچی نہیں جانتا کہ جسے وہ خوب صورت سمجھ کر حاصل کرنا چاہتا ہے وہ چیز اسے نقصان بھی دے سکتی ہے۔“

”میں..... اس خوب صورت گلاب کی بات کر رہا ہوں۔“ میں نے پہلی بار اس کے رخساروں کو چھونے کی کوشش کی تھی۔ اس نے کسی قدر دلچسپی سے میرے ہاتھوں کو ہٹا دیا تھا۔

”لیکن اس بات کا خیال ضرور رکھنا کہ گلاب کے ساتھ خار بھی ہوتے ہیں۔ کہیں گلاب کو حاصل کرنے کی لگن میں یہ خار ہاتھ زخمی نہ کر دیں۔“ افسوس مجھے اپنی غفلت پر کہ میں نے اس کی یہ بات نظر انداز کیوں کر دی لیکن مجھ پر تو اس کی محبت کا جادو چڑھا ہوا تھا۔ واقعی اس کی بات سچی تھی۔ آج اسی خار گلاب نے مجھے زخمی کر دیا ہے۔

لیٹے لیٹے میری نظر میز پر پڑے ہوئے لفافے پر پڑی تو میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر وہ لفافہ اٹھا کر کھولا تو اس میں ایک رقعہ کے علاوہ ڈالر بھی تھے۔

”یہ کس نے رکھے؟“ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ کچھ دیر تک میں بت بنانا ڈالر کو بخور دیکھتا رہا۔ گئے وہ پورے چھ ہزار ڈالر تھے۔ نہ کم نہ زیادہ۔ میں نے لرزتے ہاتھوں سے جلدی جلدی رقعہ کھول کر دیکھا تو اس پر لکھا تھا۔

”عمران صاحب!“

آخر بار سلام عرض ہے۔ خدا کرے کہ تمہارا یہ خوابوں کا سورج اور میری اونچا ہو جائے۔ اتنا اونچا کہ اس سورج کی تپش بھی تمہیں ٹھنڈی محسوس ہو۔ جب یہ پرچا تمہیں لے گا اس وقت تک میں واپس وطن جا چکا ہوں گا اس لیے اس حقیر دوست کی طرف سے تمہارا عرض ہے۔ یہ وہ رقم ہے جو تم نے مجھ پر خرچ کیے۔ میں ان کے بارے میں جانتا تو نہیں ہوں مگر مجھ پر بھی چھ ہزار ڈالر چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ تمہیں اتنی حقیر رقم کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی میرے جانے سے تمہیں کوئی فرق پڑے گا لیکن پھر بھی تمہارے راستے سے ہٹ جانا مناسب سمجھتا ہوں اس لیے

کرم جولی جیسے خوب صورت گلاب کے ساتھ مجھے خار گلاب نہ کچھ پھینکنا اور میں اپنی تمام تر غلطیوں کی معذرت کے ساتھ یہ رقعہ چھوڑ کر جا رہا ہوں۔

خاکسار منصور احمد

منصور کا یہ چھوڑا ہوا خط پڑھ کر میرا سر پکڑانے لگا۔ مجھے ایسا لگا کہ میرا جسم دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ہو لیکن اس میں وہ قطعاً بے قصور تھا۔ وہ میرے غلط رویے کی وجہ سے یہ قدم اٹھانے پر مجبور ہو گیا تھا۔ میں عیاشی کے نشے میں بھی بھول گیا تھا کہ میری ہونے والی شریک حیات اس کی بہن ہے اور یہ بھی مجھے یاد نہیں رہا تھا کہ وہ نہ صرف میرا دوست ہے بلکہ کزن بھی ہے۔ اس کا اور میرا خون رشتہ بھی ہے۔

کاش میں اس کی باتوں کو سمجھ سکتا۔ میرا جسم کپکپانے لگا۔ میں اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے اپنے آپ پر بے چارہ غصہ آ رہا تھا لیکن اب اس بات کا کوئی فائدہ نہیں یہ بے سود تھا۔

گھر سے آیا ہوا خط اٹھایا تو میرے ہاتھوں کی لرزش اور بھی بڑھ گئی۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ لٹافہ کھولنے کو بالکل بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ مجھے میرے اپنوں کا خیال بھی نہیں آیا تھا۔ ماں، باپ، بہن اور بھائی۔ سب مجھے کتنا سس کرتے ہوں گے۔ ان کے چہرے میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے تھے، مجھے ایسا لگا کہ ہر فرد اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کا شکوہ کر رہا ہو۔ جولی کی اس جھوٹی محبت میں اپنے ماں، باپ، بہن اور بھائی کی کچی محبت کو بھول گیا تھا۔ یہ بھی بھول گیا تھا کہ بوڑھے اور غریب ماں باپ نے کس طرح میری خواہش کی تکمیل کی جو کہ میری جی نہ ہونے والی تھی۔ انہوں نے میری ملک سے باہر جانے والی خواہش کو پورا کرنے کے لیے کیا کیا جنن کیسے تھے۔ انہوں نے میری خاطر بے پناہ قرض لے کر اپنی گردن جھکا لی تھی۔ رخصت ہوتے وقت ماں نے مجھے کتنا پیار کیا تھا۔ مجھے سینے سے لگا کر اس نے بے شمار آنسو بہائے تھے۔

”بیٹا! جی تو نہیں چاہتا کہ اپنے وجود کا حصہ اپنے ہاتھوں سے اپنے آپ سے الگ کروں لیکن..... اس لیکن کے بعد وہ چند لمحے خاموش رہی اور پھر ”اپنا خیال رکھنا بیٹا“ کہہ کر رونے لگی اور میں نے اس کو ایک قطرہ بہائے بغیر مسکراتے ہوئے جھوٹے دلا سے دے کر ماں کو مطمئن رہنے کی تاکید کی۔ جب ماں سے الگ ہوا تو باپ نے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔“

”بیٹا! منزل تک پہنچنے کے لیے پر خار رستوں سے گزرتا ہی رہتا ہے۔ حالات تھکے سانسے ہیں وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے تھے۔ ان کی اس بات میں جیسے مقصد کو سمجھ نہیں پایا تھا اور پھر باپ سے الگ ہوا تو بہن آنکھوں میں جدائی کے آنسو لیے کھلے سے گئی۔“

”بھیا! کسی گوری کے چکر میں مت پھنس جانا۔“ اس نے مسکرائے گی کو شش ضرور کی تھی مگر روپڑی۔

”بھئی کہیں کی۔“ میں نے ہنستے ہوئے صرف اتنا ہی تو کہا تھا۔ پیار سے اس کے سر پر چپت بھی لگا کی تھی اور پھر اس کے بعد بھائی نے سینے سے لگا لیا۔

”ہم سب کو بھولنا مت بھیا۔ سنا ہے لوگ پردیس

چاکر عمر وادلوں کو نبھوں جائے ہیں۔ یہ چوٹے بھائی کی
 بڑی نصیحت تھی۔ پتا نہیں کیوں میں اس کے جواب میں
 خاموش رہا۔ جیسے میرے منہ میں زبان ہی نہ ہو۔
 دروازے پر ہونے والی دسک نے مجھے چونکا دیا۔
 میں نے دروازے کی طرف دیکھ کر آواز لگائی۔
 ”بلیں..... دروازہ کھلا ہے۔“

دروازہ کھلا اور مسٹر جو نے دروازے سے گردن اندر کر کے کہا۔ ”مسٹر عمران! تمہارے پاس صرف دو دن ہیں ورنہ قانونی کارروائی کے لیے تیار ہو جاؤ۔“ اس نے وارننگ دی اور چلا گیا۔

یہ دیکھی دوستی اور محبت کے جھوٹے وعدے کرنے والا
مشر جو تھا۔ جو اکثر میرے ساتھ دیکھی پیٹا رہتا تھا اور نہ
صرف تقریبی معاملات بلکہ اس کے کئی مسائل حل کرنے
میں، میں نے کئی ہزار ڈالر خرچ کیے تھے۔ یہ جولی کا کزن
تھا جو اکثر جولی کے پشیمان لایا اور بے جایا کرتا تھا۔

جولی اور میری قرابت میں اس کا بہت اہم کردار تھا۔ جواب میرا دکھ میں اور مدعوں کرنے کی بجائے مجھے واؤنگ دے کر چلا گیا اور میں دیکھتا رہ گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا جب کہ میں اپنی پوری زندگی میں بھی اس طرح نہیں رویا تھا۔

مجھے پریشان تو ہوئی ہی تھی لیکن اگر منصور کے چھوڑے ہوئے چہ ہزارڈالررز نہ ہوتے تو میں بہت ہی زیادہ پریشان ہو جاتا۔ گراہ، بجلی اور گیس کا بل ملا کر مجھ پر اس وقت 27 ہزارڈالررز لگا تھے اور یہ ساری رقم ادا کرنا میرے لیے بہت مشکل تھا۔ چہ ہزارڈالررز منصور نے چھوڑے تھے اور دس ہزارڈالررز میرے پاس تھے۔ ان کے علاوہ گیارہ ہزارڈالررز درکار تھے۔ ان کے لیے مجھے بہت بھاگ دوڑ کرنا پڑی تھی۔ رقم زیادہ اور وقت بہت کم تھا۔ قرض ادا کرنے کے علاوہ مجھے یہاں ہی رقم کی ضرورت تھی کہ میں باآسانی اپنے وطن واپس آ جا سکوں۔ اسے اگر مفید سمجھیں

[illegible]

25 فروری 2018ء

دوسرے یہ کہ وہ لوگ ایچھے خاصے بارسون لوگ تھے۔ اس لیے وہ مجھ پر کسی قسم کے کیس بنا سکتے تھے۔ سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ وہ مجھے میری کسی بھی حرکت پر مجھے غیر ملکی جاسوس نہ قرار دے دیں۔ لہذا مجھے ان کے مطالبات پورے کرنا پڑے کیوں کہ میں ان کے آگے ایک میل بولنا نہیں چاہتا تھا۔ حالانکہ جولی نے میرے ساتھ سراسر زیادتی کی تھی۔ اس نے مجھ سے بے شمار رقم ہٹوئی تھی۔ وہ عیاش عورت تھی۔ اس نے مجھے اپنی محبت کے جال میں پھانس کر لوٹ لیا تھا لیکن پھر وہی حقیقت کہ غلطی تو میری اپنی ہی تھی۔ مجھے اس لئیری عورت کی جھوٹی محبت، شادی کے وعدے، اپنے کاروبار اور جاہ و مال مجھے حصہ دار بنانے کی لالچ نے مجھے اندھا کر دیا تھا۔ لالچ کی اس چکاچوند روٹی نے میری آنکھوں کو چنپا دیا تھا۔ اتنے بڑے نقصان کے بعد میں دلبرداشتہ اپنے گھر واپس جانے کو تیار ہو گیا۔

کراچی ایئر پورٹ کی حدود سے گاڑی باہر نکلی تو میرے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں۔ سانس اس طرح پھو لنے لگی کہ جیسے یورپ سے پاکستان تک کا سفر دوڑ کر طے کیا ہو۔ بسنے کی دھاریں میرے جسم پر بہنے لگی تھیں۔ غیبی شے سے جھانکا تو میری آنکھیں سرخ انگاروں کی طرح دھبہ رہی تھیں۔ درو کی شدت سے سر بھٹ رہا تھا۔ ایسے لگ رہا تھا کہ جیسے سارے جسم کی ہڈیاں جگمگاتی ہوں۔ جی چاہ رہا تھا کہ چیخ کر رونے لگوں۔ اپنے کپڑے بھاڑ دوں، سارے زمانے کو اکٹھا کر لوں اور اپنے جسم زدہ ہونے کا قصہ سناؤں۔ ان کو خبردار کروں کہ میری طرح کوئی اپنی آنکھوں پر عیاشی کی چربی نہ چڑھا لے۔ ان کو خبردار کروں کہ کبھی بھی شعلوں پر آشیانہ بنانے کی کوشش نہ کرنا۔ میرے بال بری طرح بٹھر رہے تھے۔ میں نے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں سے بالوں کو درست کیا۔ گھڑی دیکھی تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔

ڈرائیور نے حسبِ عادت عقیبی شیشے سے مجھے دیکھا اور اس کی نظریں مجھ پر جمی کہ جی رہ گئیں۔ وہ کچھ دیر تک جبرائلی کے عالم میں مجھے دیکھتا رہا اور پھر اس نے غیر متوجع سوال کر دیا۔

”تس ملک سے آرہے ہیں آپ؟“ اس نے پوچھا
اور اپنی نظریں سامنے مرکوز کر دیں۔

”امریکا سے۔“ میں نے مختصر جواب دیا۔ میرا

ملینامہ سرگزشت

جواب سن کر اس نے ایک بار پھر مجھے غور سے دیکھا اس کی حیران آنکھوں سے تجسس جھلک رہا تھا۔
 ”کلتا تو نہیں ہے۔“ اس نے کہا۔
 ”یقین تو مجھے بھی نہیں آتا۔“ میں نے اپنا درد چھپانے کی کوشش کی مگر پھر بھی آواز بھرا گئی۔
 ”کتنا عرصہ رہے؟“ اس نے پوچھا۔
 ”چار سال۔“ میں نے بتایا۔
 ”کلتا ہے چار سال میں بھی آپ کو کچھ بنانے کا موقع نہیں ملا۔“ اس نے کہا۔ وہ عقی شے سے مجھے گھور رہا تھا۔
 ”بنایا تو تھا۔“ میں نے ردعملی ہوئی آواز میں کہا۔
 ”کیا؟“ اس نے ایسے پوچھا جیسے اسے بھی کوئی غرض ہو۔

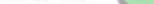
”شعلوں پر آشیانہ“ میں نے کہا۔
 ”کیا مطلب؟“ وہ میری بات کو سمجھ نہیں پایا۔
 ”بس یہیں روک دو۔“ اس سے پہلے کہ وہ کوئی اور سوال کرے میں نے کہہ دیا۔ اس نے فوراً گاڑی ایک طرف روک دی۔ میں نے اپنا بیگ اٹھایا اور گاڑی سے باہر نکل آیا۔ وہ ابھی تک حیرت سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کا کراہہ ادا کیا اور اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔

گلی سنان تھی۔ مجھے ایسے لگ رہا تھا کہ بے خبر
سوئے ہوئے لوگ گھروں کے خاموش بند دروازے میرا
منہ چرا رہے ہوں۔ مجھ پر میرے کردار پر قہقہے لگا رہے
ہوں۔ جن میں میرا نکلوں سے بنایا ہوا آشیانہ جل رہا ہو۔
آہستہ آہستہ چلا ہوا آکر میں اپنے گھر کے سامنے رک گیا۔
دروازے پر دستک دینا یا چاہتا تھا کہ کسی کے قدموں کی
چاپ سنائی دی اور ایک دم خاموشی چھا گئی۔ میں نے پلٹ

شماره جنوری 2018ء کی منتخب سچ بیانیاں
ہماری پیشکش..... آپ کا انتخاب

☆ اول: مرگوبہ برگ..... بشری شہت (لاہور)
☆ دوم: بخارا..... نعیم الحسن (کراچی)
☆ سوم: میری مڑیا..... احمد تقیہ (کراچی)

پہلے دوسرے اور تیسرے انعام کے لیے آپ جتنی منتخب کیجئے
ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے



فروری 2018ء 2



محترم ایڈیٹر سرگزشت
السلام علیکم

سب سے پہلے ایک گزارش ہے کہ اس سرگزشت کو میرے اصل نام سے شائع نہ کریں۔ یہ سرگزشت میں نے آپ کے خصوصی نمبر کے لیے ارسال کی ہے۔ یہ ایک جنونی فین کی سرگزشت ہے جو آپ کو بھی پسند آئے گی۔
تہینہ ہمدانی
(لاہور)



مجھے میں نہیں آتا کہ اس کو کیا نام دوں۔
میں نے موسیقی کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی ہے۔
میرے استاد مرحوم نقیس علی خان تھے۔ ایک شریف اور
مہذب انسان۔ ان کا تعلق پشاور کے گائیکی سے تھا۔
(یہاں یہ بتا دوں کہ موسیقی میں جو گھانا کہا جاتا ہے اس کا
مطلب کوئی گھر کے افراد نہیں ہوتے بلکہ اسکول آف تھاٹ
کچھ نہیں)
میں بچپن ہی سے گانوں کی شوقین تھی۔ میری آواز کو
ان کی آواز ہی نہیں لگتی۔

کر دیکھا منصور کھڑا تھا۔
”تم؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔
”اب کیوں آئے ہو؟ کیا لینے آئے ہو یہاں؟“
اس نے ساٹ لہجے میں پوچھا۔ اس کے ان سوالات پر
میری نظریں جھک گئیں۔
”اپنے گھر۔“ میں نے صرف اتنا ہی کہا اور اس کا
چہرہ پگھلنے لگا۔

”کون سا گھر؟ وہ گھر۔۔۔۔۔ جسے تم نے اپنے ہاتھوں
سے برباد کر دیا۔ اس گھر کی بات کر رہے ہو جس کی بربادی
کے ذمے دار تم خود ہو۔ آج تمہیں اس گھر میں غربت،
بیاریاں اور مسائل نظر نہیں آ رہے۔ کیوں آئے ہو ان
بھوکے ننگے لوگوں کے گھر میں؟ اس لیے کہ جولی نے تمہیں
لوٹنے کے بعد بھی کی طرح نکال کر پھینک دیا ہے۔“
”پلیز!“ میں نے منصور کی طرف دیکھتے ہوئے
ساجت سے کہا اور وہ خاموش ہو گیا۔ میری آنکھوں سے
ندامت کے آنسو بہہ رہے تھے۔

اسی وقت ایک صاحب تیز چلتے ہوئے آئے اور
ہمارے پاس ٹھہر کر کہنے لگے۔
”اس وقت کیا کر رہے ہیں آپ یہاں؟ آگے پیچھے
ہو جائیں۔ ویسے ہی حالات خراب ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے
دروازے پر دستک دی۔ کسی نے دروازہ کھولا اور وہ اندر
چلا گیا۔

”یہ۔۔۔۔۔ یہ تو ہمارا گھر۔۔۔۔۔“
”نہیں اب یہ گھر تمہارا نہیں رہا۔ یہ وہ صاحب ہیں
جن سے تمہارے ماں باپ نے تمہیں تمہاری خواہش پر
یورپ بھیجنے کے لیے قرض لیا تھا اور اسی قرض میں یہ لوگ
تمہاری جگہ کے مالک بن گئے۔“ اس نے بتایا۔
”اور۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ میرے ماں باپ۔۔۔۔۔ بہن
بھائی۔۔۔۔۔؟“ میں نے پوچھا۔

”بھائی چاچا چاچا اور بہن ایک دوسرے مکمل میں
کرایہ کا مکان لے کر رہ رہے ہیں۔ چلو میں وہاں لیے چلا
ہوں۔“
شرمندگی کا بوجھ اٹھانے میں اس کے ساتھ ٹھیکسی
میں بیٹھ گیا۔ ٹھیکسی مختلف راستوں سے ہوتی ہوئی ایک
خشہ حال عمارت کے سامنے رکی۔ منصور نے کرایہ ادا کیا
اور مجھے ساتھ لے کر اس عمارت کے دروازے پر پہنچا۔
پہلی دستک پر ہی دروازہ کھل گیا۔ سامنے ابو کھڑے

من کر خاندان والے میرے والدین سے کہا کرتے۔ ”یہ تم لوگ اس بچی کو کیا سکھا رہے ہو؟ کیا آگے چل کر اسے گلوکارہ بنانا ہے؟“

اس پر میرے والد جواب دیا کرتے۔ ”کیا آپ لوگ یقین کریں گے کہ اس کی آواز بنانے میں ہمارا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ یہ قدرت کی طرف سے اچھی آواز لے کر پیدا ہوئی ہے اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ خدا کی نعمت ہے۔“

میرے ابو اسی مزاج کے تھے، مکمل ذہن کے۔ انہوں نے ہمیں اچھا برا سکھا دیا تھا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اگر کسی کی نیچری ہی بڑ جانے والی ہے تو وہ لاگت تربیت کے باوجود بڑ ہی جاتا ہے اور جس کی فطرت اس کے برعکس ہو اس کو دنیا کی کوئی طاقت خراب نہیں کر سکتی۔ ہم نے اپنے بچوں کو اچھے برے کی تیز سکھا دی ہے۔ یہ جانتے ہیں کہ انہیں کیا کرنا ہے کیا نہیں کرنا۔ کون سا راستہ غلط ہے اور کون سا صحیح ہے۔

اسی لیے ہم بہن بھائی ہمیشہ ان راستوں پر چلتے رہے جو راستے ہماری تہذیب اور مذہب نے بنائے تھے۔ شو برنس میں کامیابی کے بعد بھی میں اپنی جگہ مستحکم رہی۔ کوئی مجھ پر اثر نہیں لگا سکتا تھا۔ اپنے کام سے کام رکھا کرتی۔ بڑے بڑے کنسرٹ میں جایا کرتی۔ اپنے باوقار لباس میں۔ مجھے یہ فخر ہے کہ میرے رویے نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ لوگ گائیکی سننے کے لیے آیا کرتے ہیں۔ گانے والی کا جسم اور اس کی ادائیں دیکھنے نہیں آتے۔

بہر حال سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا کہ ایک گزب ہو گئی۔ اب پتا نہیں ہے گزب ہوئی یا کچھ اور تھا۔ میں ابھی تک سمجھ نہیں سکی ہوں۔

کنسرٹ میں شریک ہوئی۔ پر قارم کے بعد واپس ہال سے نکل کر اپنی گاڑی کی طرف جارہی تھی کہ ایک بچہ سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ میں اسے بچہ ہی کہوں گی، یا لڑکا سمجھ لیں۔ میرے انداز سے کے مطابق اس کی عمر سولہ سترہ سے زیادہ نہیں تھی۔

ایک پیارا سا لڑکا۔ اس نے سفید لباس پہن رکھا تھا۔ سر پر سفید ٹوپی تھی۔ جالی والی، ویسی ٹوپی جو عام طور پر نماز کے لیے پہنی جاتی ہے۔ میں نے اس کو ایک نظر دیکھا اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے مجھے آواز دے کر روک لیا۔ ”میری بات سنیں پلیز۔“

اس نے اس انداز سے کہا تھا کہ میں آگے نہیں جا سکی۔ اس کی آواز سن کر رک گئی۔ وہ تیزی سے میرے پاس آگیا۔

”کیا بات ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”میں ایک غریب لڑکا ہوں۔“ اس نے کہا۔

”اوہ تو تمہیں کچھ پیسے چاہئیں۔“ میں نے پوچھا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں غریب ہوں۔ اسی لیے آپ کے لیے کچھ اور نہیں لاسکا ہوں۔“ اس نے اپنا وہ ہاتھ اٹھ کر دیا جو اس نے پیچھے کر رکھا تھا۔ اس میں گلاب کا ایک پھول تھا۔ ”یہ لے لیں۔ مجھے خوشی ہو گی۔“

وہ ایک عجیب لڑکا تھا۔ کسی نے اس انداز سے مجھے ایسا تعذیب نہیں دیا ہوگا اور وہ بھی گلاب کا پھول۔

”بہت بہت شکریہ۔“ میں نے پھول لے لیا تھا۔

”میرا نام خرم ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”مجھے آپ کی آواز بہت اچھی لگتی ہے۔“

”چلو ایک بار اور شکریہ۔“ میں بول کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔

وہ اسی جگہ کھڑا میری طرف دیکھتا رہا تھا۔ گھر کی طرف آتے ہوئے بھی اسی کے بارے میں سوچتی رہی۔

گھر آکر جب میں نے گھر والوں کو یہ بتایا تو سب حیران رہ گئے تھے۔

”بے چارہ۔“ میری چھوٹی بہن نے تبصرہ کیا۔

”ہوتے ہیں۔ اس قسم کے جنونی ہوتے ہیں۔“

”لیکن وہ جنونی نہیں لگ رہا تھا۔“ میں نے کہا۔

”ایک نارمل لڑکا تھا۔ نہ جانے اسے کیا سوچتی تھی۔“

”چلو اس نے مجھے نہیں گلاب ہی دیا۔ اگر ہاتھ میں کوئی بم بکڑا دیتا تو کیا کر لیتیں؟“

بات مذاق میں تھی۔ اس کے بعد کئی دنوں تک وہ مجھے نظر نہیں آیا۔ جب کہ میری مصروفیات جاری رہیں۔

ایک دن وہ پھر میرے سامنے آگیا۔ اس بار بھی اس کا لباس وہی تھا۔ میں اس رات ایک پروگرام سے گھر کے لیے نکلی تھی کہ راستے میں کچھ ہی دور جا کر گاڑی غرے دکھانے لگی۔ ایک دو ہچکیاں لے کر بند ہو گئی۔ اس وقت رات کے گیارہ بجے تھے۔ میں عام طور پر رات گئے کسی پروگرام میں نہیں رہا کرتی۔ زیادہ سے زیادہ بارہ بجے تک اٹھ جاتی ہوں جب کہ دوسروں کو دیکھتی ہوں کہ تین تین بجے تک پروگراموں میں مصروف رہتے ہیں۔

میں اسی شرط کے ساتھ کوئی پروگرام قبول کرتی ہوں کہ بارہ بجے کے بعد نہیں رکوں گی۔ اس رات گیارہ بجے ہی اٹھ نکلی تھی۔ سوچا تھا کہ جلدی گھر پہنچ جاؤں گی لیکن گاڑی ہی خراب ہو گئی۔

اب میں بے بسی کی تصویر بنی گاڑی کے پاس کھڑی تھی۔ لوگ گزرتے جا رہے تھے۔ وہ ایسا زمانہ تھا کہ لوگ کسی کی ہمدردی سے بھی کٹ پائا کرتے تھے اگر کسی کو مدد کے لیے بلاتی بھی تو نہ جانے کتنی دیر میں آتا۔

اسی دوران کسی فرشتے کی طرح وہی لڑکا میرے پاس آگیا۔ ”السلام علیکم۔“

میں نے اسے فوری طور پر پہچان لیا تھا۔ ”ارے تم یہاں؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”میں تو ہمیشہ آپ کے ساتھ ہی رہتا ہوں۔“ اس نے کہا۔

”کیا مطلب؟“

”اس شہر میں آپ کا جو بھی فنکشن ہوتا ہے۔ میں کسی نہ کسی طرح پاس یا ٹکٹ لے کر پہنچ جاتا ہوں۔“ اس نے بتایا۔ ”اگر نہ لے سکوں تو ہال کے باہر کھڑا ہوجاتا ہوں تاکہ آپ کو ایک نظر دیکھ سکوں۔ آج بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ میں آپ کو دیکھ کر واپس گھر جا رہا تھا کہ آپ کی گاڑی کو خراب دیکھ کر آپ کے پاس آگیا۔“ اس نے بڑی معصومیت سے بتا دیا۔

اس وقت اس کا دم بہت قیمت لگا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا گاڑی خراب ہو گئی ہے؟“

”ہاں میری گاڑی خراب ہو گئی ہے۔“ میں نے بتایا۔ ”مجھ میں نہیں آرہا کہ میں کیا کروں؟ یہاں کوئی مکانیک بھی نہیں ملے گا اور میں کسی مکانیک کو جانتی بھی نہیں ہوں۔“

”آپ گھر والوں کو فون کر دیں۔“ اس نے مشورہ دیا۔ ”میں اپنے ایک اٹکل کو بلاتا ہوں۔ وہ مکانیک ہیں۔ دس منٹ میں گاڑی ٹھیک کر دیں گے۔“

اس وقت کچھ ڈر سا لگا تھا۔ نہ جانے اس کا اٹکل کیا ہوگا۔ رات کا وقت ہے۔ خدا جانے وہ کس مزاج کا ہو لیکن کچھ اور بھی نہیں سکتا تھا۔

”آپ گھبراہٹیں نہیں۔“ اس نے میری ہچکچاہٹ بھانپ لی۔ ”میرے اٹکل بہت اچھے مکانیک ہیں۔ میرے بلانے پر آجائیں گے۔“

اس وقت اس کی بات مان لینے سے سو کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس کے پاس موبائل بھی نہیں تھا۔ اس نے مجھ ہی سے موبائل لے کر اپنے اٹکل کو بلانا شروع کر دیا۔ بعد وہ اپنے اٹکل سے باتیں کر رہا تھا۔ ”اٹکل پلیز! آپ تیسروں کو برا آجائیں۔ آپ کی بہت ضرورت ہے۔ پلیز ہاں میں وہیں کھڑا ہوں اور اپنا سامان بھی لیتے آئیے گا۔ اس کی ضرورت ہوگی۔ کتنی دیر میں آ رہے ہیں؟“

اس نے میرا موبائل واپس کرتے ہوئے کہا۔ ”اٹکل دس منٹ میں پہنچ رہے ہیں۔ وہ قریب ہی رہتے ہیں۔“

”تم کیا کرتے ہو؟“ میں نے وقت گزارنے کے لیے پوچھا۔

”بڑھتا ہوں۔“ اس نے بتایا۔ ”سینکڑ ایئر میں۔ مجھے آپ کی آواز بہت اچھی لگتی ہے۔ اسی لیے میں آپ کو دیکھتا رہتا ہوں۔“

اس کی باتوں میں بھی سادگی تھی۔ ایک بھولا بین تھا۔ نہ جانے کیا جذبہ تھا جو اسے اس طرح میرے پاس لایا کرتا تھا۔ کچھ دیر بعد ایک پرانی سی گاڑی ہمارے پاس آکر رک گئی۔ اس میں سے ایک اوجڑ عمر آدمی برآمد ہوا۔ وہ لڑکا اس کو دیکھ کر اس کے پاس چلا گیا۔ ”اٹکل! ان کی گاڑی خراب ہو گئی ہے۔ آپ ڈرا دیکھ لیں۔“

اس کے اٹکل نے ایک نظر میری طرف دیکھا پھر پہچان کر بولا۔ ”تم شاید وہ گھر ہونا شہر زاد۔“

”جی ہاں میں وہی ہوں۔“ میں نے بتایا۔ ”اپنے گھر جارہی تھی کہ گاڑی خراب ہو گئی۔ اس وقت یہ کسی فرشتے کی طرح میری مدد کے لیے پہنچ گئے۔“ میں نے اس لڑکے کی طرف اشارہ کیا۔ اس وقت تک مجھے اس کا نام بھی نہیں معلوم ہوا تھا۔

”اوہ خرم۔“ اس شخص نے اس لڑکے کو مخاطب کیا۔ ”چلو میری مدد کرو۔“

اس وقت مجھے یاد آیا کہ اس لڑکے کا نام خرم تھا۔ ان دونوں نے مل کر میری گاڑی کچھ دیر میں ٹھیک کر دی۔ گاڑی ٹھیک ہو جانے کے بعد وہ شخص میرے قریب آگیا۔ ”یہ جو خرم ہے نا۔ یہ ادھا پاگل ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”وہ تمہارے لیے پاگل ہے۔ ہر وقت تمہاری ہی باتیں کرتا رہتا ہے۔ میں اس کا دور کا اٹکل ہوں لیکن جب بھی میں اس کے گھر جاتا ہوں یہ تمہاری باتیں کر کر کے میرا دماغ خراب کر دیتا ہے۔ پتا نہیں کیا ہوا ہے اس کو۔ اور یہ اتفاق دیکھو کہ

اس وقت اس کی بات مان لینے سے سو کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس کے پاس موبائل بھی نہیں تھا۔ اس نے مجھ ہی سے موبائل لے کر اپنے اٹکل کو بلانا شروع کر دیا۔ کچھ دیر بعد وہ اپنے اٹکل سے باتیں کر رہا تھا۔ ”اٹکل پلیز! آپ تیسروں کو برا آجائیں۔ آپ کی بہت ضرورت ہے۔ پلیز ہاں میں وہیں کھڑا ہوں اور اپنا سامان بھی لیتے آئیے گا۔ اس کی ضرورت ہوگی۔ کتنی دیر میں آ رہے ہیں؟“

اس نے میرا موبائل واپس کرتے ہوئے کہا۔ ”اٹکل دس منٹ میں پہنچ رہے ہیں۔ وہ قریب ہی رہتے ہیں۔“

”تم کیا کرتے ہو؟“ میں نے وقت گزارنے کے لیے پوچھا۔

”بڑھتا ہوں۔“ اس نے بتایا۔ ”سینکڑ ایئر میں۔ مجھے آپ کی آواز بہت اچھی لگتی ہے۔ اسی لیے میں آپ کو دیکھتا رہتا ہوں۔“

اس کی باتوں میں بھی سادگی تھی۔ ایک بھولا بین تھا۔ نہ جانے کیا جذبہ تھا جو اسے اس طرح میرے پاس لایا کرتا تھا۔ کچھ دیر بعد ایک پرانی سی گاڑی ہمارے پاس آکر رک گئی۔ اس میں سے ایک اوجڑ عمر آدمی برآمد ہوا۔ وہ لڑکا اس کو دیکھ کر اس کے پاس چلا گیا۔ ”اٹکل! ان کی گاڑی خراب ہو گئی ہے۔ آپ ڈرا دیکھ لیں۔“

اس کے اٹکل نے ایک نظر میری طرف دیکھا پھر پہچان کر بولا۔ ”تم شاید وہ گھر ہونا شہر زاد۔“

”جی ہاں میں وہی ہوں۔“ میں نے بتایا۔ ”اپنے گھر جارہی تھی کہ گاڑی خراب ہو گئی۔ اس وقت یہ کسی فرشتے کی طرح میری مدد کے لیے پہنچ گئے۔“ میں نے اس لڑکے کی طرف اشارہ کیا۔ اس وقت تک مجھے اس کا نام بھی نہیں معلوم ہوا تھا۔

”اوہ خرم۔“ اس شخص نے اس لڑکے کو مخاطب کیا۔ ”چلو میری مدد کرو۔“

اس وقت مجھے یاد آیا کہ اس لڑکے کا نام خرم تھا۔ ان دونوں نے مل کر میری گاڑی کچھ دیر میں ٹھیک کر دی۔ گاڑی ٹھیک ہو جانے کے بعد وہ شخص میرے قریب آگیا۔ ”یہ جو خرم ہے نا۔ یہ ادھا پاگل ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”وہ تمہارے لیے پاگل ہے۔ ہر وقت تمہاری ہی باتیں کرتا رہتا ہے۔ میں اس کا دور کا اٹکل ہوں لیکن جب بھی میں اس کے گھر جاتا ہوں یہ تمہاری باتیں کر کر کے میرا دماغ خراب کر دیتا ہے۔ پتا نہیں کیا ہوا ہے اس کو۔ اور یہ اتفاق دیکھو کہ

اس وقت اس کی بات مان لینے سے سو کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس کے پاس موبائل بھی نہیں تھا۔ اس نے مجھ ہی سے موبائل لے کر اپنے اٹکل کو بلانا شروع کر دیا۔ بعد وہ اپنے اٹکل سے باتیں کر رہا تھا۔ ”اٹکل پلیز! آپ تیسروں کو برا آجائیں۔ آپ کی بہت ضرورت ہے۔ پلیز ہاں میں وہیں کھڑا ہوں اور اپنا سامان بھی لیتے آئیے گا۔ اس کی ضرورت ہوگی۔ کتنی دیر میں آ رہے ہیں؟“

اس نے میرا موبائل واپس کرتے ہوئے کہا۔ ”اٹکل دس منٹ میں پہنچ رہے ہیں۔ وہ قریب ہی رہتے ہیں۔“

”تم کیا کرتے ہو؟“ میں نے وقت گزارنے کے لیے پوچھا۔

”بڑھتا ہوں۔“ اس نے بتایا۔ ”سینکڑ ایئر میں۔ مجھے آپ کی آواز بہت اچھی لگتی ہے۔ اسی لیے میں آپ کو دیکھتا رہتا ہوں۔“

اس کی باتوں میں بھی سادگی تھی۔ ایک بھولا بین تھا۔ نہ جانے کیا جذبہ تھا جو اسے اس طرح میرے پاس لایا کرتا تھا۔ کچھ دیر بعد ایک پرانی سی گاڑی ہمارے پاس آکر رک گئی۔ اس میں سے ایک اوجڑ عمر آدمی برآمد ہوا۔ وہ لڑکا اس کو دیکھ کر اس کے پاس چلا گیا۔ ”اٹکل! ان کی گاڑی خراب ہو گئی ہے۔ آپ ڈرا دیکھ لیں۔“

اس کے اٹکل نے ایک نظر میری طرف دیکھا پھر پہچان کر بولا۔ ”تم شاید وہ گھر ہونا شہر زاد۔“

”جی ہاں میں وہی ہوں۔“ میں نے بتایا۔ ”اپنے گھر جارہی تھی کہ گاڑی خراب ہو گئی۔ اس وقت یہ کسی فرشتے کی طرح میری مدد کے لیے پہنچ گئے۔“ میں نے اس لڑکے کی طرف اشارہ کیا۔ اس وقت تک مجھے اس کا نام بھی نہیں معلوم ہوا تھا۔

”اوہ خرم۔“ اس شخص نے اس لڑکے کو مخاطب کیا۔ ”چلو میری مدد کرو۔“

اس وقت مجھے یاد آیا کہ اس لڑکے کا نام خرم تھا۔ ان دونوں نے مل کر میری گاڑی کچھ دیر میں ٹھیک کر دی۔ گاڑی ٹھیک ہو جانے کے بعد وہ شخص میرے قریب آگیا۔ ”یہ جو خرم ہے نا۔ یہ ادھا پاگل ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”وہ تمہارے لیے پاگل ہے۔ ہر وقت تمہاری ہی باتیں کرتا رہتا ہے۔ میں اس کا دور کا اٹکل ہوں لیکن جب بھی میں اس کے گھر جاتا ہوں یہ تمہاری باتیں کر کر کے میرا دماغ خراب کر دیتا ہے۔ پتا نہیں کیا ہوا ہے اس کو۔ اور یہ اتفاق دیکھو کہ

آج اسے تمہاری مدد کرنے کا موقع بھی مل گیا۔
”جی ہاں جناب، ورنہ میں تو بڑی طرح پھنس چکی تھی۔“

خرم بھی اپنے اٹکل کا سامان اس کی گاڑی میں رکھ کر ہمارے پاس آ گیا۔ کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ وہ میری باتیں کرتا تھا۔ میرے پروگرام میں شرکت کرتا تھا۔ کیا تھا یہ سب، بہر حال میں نے ان دونوں کا شکریہ ادا کیا۔ میں نے خرم کے اٹکل کو معاوضہ بھی دینا چاہا تھا لیکن اس نے انکار کر دیا۔ ”کیوں شرمندہ کرنی ہیں جی، ذرا سا تو کام تھا۔“
”کام تو ذرا سا تھا لیکن آپ اپنا کام چھوڑ کر آئے آپ نے وقت دیا، یہ تو بہت ہے نا؟“
”کچھ بھی نہیں ہے۔ اب آپ جائیں رات ہو رہی ہے۔“

میں ان دونوں کو خدا حافظ کہہ کر رخصت ہو گئی۔ خرم بہت خوش تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ میرے کسی کام آیا تھا۔ اس کے لیے یہ ایک بڑی بات تھی۔ کچھ بھی ہو۔ وہ میرے کام آیا تھا۔ میں نے اپنے دل میں یہ سوچ لیا تھا کہ میں اسے کوئی اچھا سا تحفہ دے دوں گی۔
میں فٹشن میں جاتی تو کبھی لیکن یہ اعزاز نہیں ہوتا کہ خرم اس بھیڑ میں کہاں ہوگا۔

وہ میرے سامنے بھی نہیں آتا تھا۔ ایک بار میں نے اپنی ایک دوست سے اس کا ذکر کیا تو وہ میرے نہیں ہوئی۔ ”شہزادہ ایک خطرناک بات ہے۔“ اس نے کہا۔ ”اس قسم کے لوگ جنونی ہوتے ہیں۔ وہ تمہارے عشق میں مبتلا ہو گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ تم اس کو کوئی مل سکتیں تو وہ تم کو نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔ کچھ بھی کر سکتا ہے۔“
”بار کیوں ڈرا رہی ہو مجھے۔“ میں نے کہا۔

”ڈرا نہیں رہی۔ خبردار کر رہی ہوں۔“ میری دوست نے کہا۔
”تو پھر بتاؤ کیا کروں؟“
”اس کو سختی سے منع کر دو کہ وہ تمہارا پیچھا نہ کیا کرے۔“

”جی تو پراہم ہے کہ وہ پیچھا بھی نہیں کرتا۔ میرا مطلب ہے کہ پیچھا کرتے ہوئے دکھائی نہیں دیتا۔ ہو سکتا ہے کہ جہاں میں ہوتی ہوں وہ اس کے ارد گرد ہی گھومتا ہو لیکن سامنے نہیں آتا۔“
”بہت عجیب جو پیش ہے۔ بہر حال تم اس کی حوصلہ

افزائی مت کرو۔ منع کر دو اس کو۔ ورنہ جان کا عذاب ہو جائے گا تم یہ کہہ رہی ہو کہ ابھی اس کی عمر بھی بہت کم ہے۔“
”ہاں بہت کم عمر ہے۔“ میں نے بتایا۔

”یہ تو اور بھی خطرناک بات ہے۔ اس عمر کے لڑکے خواہوں کے درمیان رہتے ہیں۔ نہ جانے کیا کیا سوچتے رہتے ہیں۔ کسی نہ کسی کو اپنا آئیڈل بنا لیتے ہیں۔ اس نے تم کو اپنا آئیڈل بنا لیا ہے اگر وہ تم کو کچھ نہیں کر سکا تو خود کو برباد کر دے گا۔“

میری دوست نے یہ سب بتا کر مجھے پریشان کر دیا تھا۔ میں نے تو اس کو کھنسل دیا تھا۔ وہ تو خود ہی میرے پیچھے پڑ گیا تھا لیکن اس سے مجھے کوئی نقصان بھی نہیں ہوا تھا بلکہ وہ تو ایک بار میرے کام بھی آیا تھا۔

کئی دن گزر گئے۔ اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں چلا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بے جا رہے اپنے ارادے سے باز آ گیا ہو یا کسی نے اسے سمجھا دیا ہو۔ بہر حال بات کچھ بھی ہو وہ غائب ہی ہو گیا تھا۔

لیکن ایک دن اچانک میرے موبائل پر کسی کا فون آ گیا۔ میں عام طور پر کسی نامعلوم نمبر کو انیڈ نہیں کرتی۔ اسی لیے میں نے اسے نظر انداز کر دیا۔ بہت دیر بعد پھر اسی نمبر سے فون آیا اس بار میں نے نمبر انیڈ کر لی۔ ”ہیلو“ میں نے پوچھا۔ ”کون ہے؟“

”میں ہوں، خرم۔“ دوسری طرف سے اسی کی آواز آئی۔ ”آپ نے مجھے پہچان لیا ہوگا۔“
”ہاں خرم پہچان لیا ہے نہیں؟“ میں نے کہا۔ ”تم کو میرا یہ نمبر کہاں سے ملا؟“ میں نے پوچھا۔

”بڑی مشکلوں سے ملا ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”میری ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ آپ سے بات کروں۔ نہ جانے آپ کیا سمجھیں۔ لیکن ناراض نہ ہو جائیں۔ پھر ایک بات یہ بھی کہ میرے پاس میرا اپنا موبائل سیٹ نہیں تھا۔ میں نے کچھ پیسے جمع کر رکھے تھے۔ ان سے موبائل خرید کر لایا ہوں اور آپ سے بات کر رہا ہوں۔“

اس کی سادگی پر افسوس بھی ہو رہا تھا۔ بے جا رہے اپنے بارے میں بتا چکا تھا کہ ایک غریب آدمی ہے۔ اب صرف مجھ سے باتیں کرنے کے چکر میں موبائل سیٹ خرید کر لے آیا تھا۔

میں نے اس سے کہا۔ ”خرم تم ایسا کرو مجھ سے ملو۔ تم سے کچھ کہنا ہے۔“

”آپ سے ملوں؟“ اس کی آواز کاہنے لگی تھی۔
”ہاں مجھ سے ملو۔“ میں نے دوبارہ کہا۔ ”بلکہ ایسا کرو تم ویلز پر آ جاؤ۔ ویلز تم نے دیکھا ہے نا؟“

”جی ہاں دیکھا تو ہے لیکن باہر سے۔“ اس نے کہا۔
”اندر بھی نہیں گیا۔“
”کوئی بات نہیں۔ تم اندر آ جانا۔“ میں نے کہا۔
”میں وہیں ملوں گی۔ شام چھ بجے آ جانا۔“

میں نے اس کو اس لیے بلایا تھا کہ میں اس کو سمجھا سکوں۔ اس سے کہوں کہ وہ اپنی تعلیم پر دھیان دے۔ اپنا مستقبل بنائے۔ وہ کن پکڑوں میں پھنس گیا ہے۔ میرے پیچھے بھاگنے سے کچھ نہیں ملے گا۔

میرے بلانے پر وہ ویلز پہنچ گیا تھا۔ اس شام اس نے ڈھنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ سر پر ٹوپی بھی نہیں تھی۔ ہاتھ میں ایک موبائل بھی تھا۔ جو سستا سا تھا لیکن وہ اسی کو بہت شان سے لایا تھا۔

میں نے اسے بیٹھ جانے کو کہا تو وہ سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ نروس بھی دکھائی دے رہا تھا۔ خود میں نے ہی بات شروع کی۔ ”خرم کیسے ہو تم؟“ میں نے پوچھا۔

”جی اچھا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔
”اچھا یہ بتاؤ کیا کھاؤ گے؟ یا پیو گے؟“
”نہیں آپ نہیں۔“ اس نے کہا۔ ”آپ بتائیں کیا کھائیں گی؟ کیا پیئیں گی؟“

”ادھو۔“ میں نے دی۔ ”چلو تمہاری آفر ڈیو رہی۔“
”آج میری طرف سے۔“

میں نے اس کے لیے سینڈویچ اور آئس کریم منگوا دی۔ پھر جب وہ کسی حد تک نارمل ہوا تو میں نے بات شروع کی۔ ”دیکھو خرم اگر میں کچھ کہوں تو کیا تم مان لو گے؟“
”کیوں نہیں۔ آپ بول کر تو دیکھیں۔“ اس نے کہا۔

”خرم دیکھو تم بہت اچھے لڑکے ہو۔“ میں نے بات شروع کی۔ ”میں چاہتی ہوں کہ تم آگے بڑھو۔ خوب ترقی کرو۔ تمہارے سامنے اگلی زندگی باقی ہے۔ کسی سے محبت کرنے کو زندگی باقی ہے۔ وقت ہاتھ سے نکل جائے گا تو افسوس کرتے رہ جاؤ گے اور جہاں تک میرا سوال ہے تو میں تمہاری دوست ہوں۔ ایک اچھا دوست۔ وہی ہوتا ہے جو اچھے مشورے دے۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟“

”جی سمجھ رہا ہوں۔“ اس نے اپنی گردن جھکا رکھی۔

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں
گھر بیٹھے
رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا رسالہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا کانس کے لیے 900 روپے

امریکا، نیوزیڈلینڈ اور نیوزی لینڈ کے لیے 10,000 روپے

بقیمت ایک رسالے کے لیے 9,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے چے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ سب مفت سروس ہے۔

ہر دن ملک سے قارئین صرف ویٹرن یونین یا مٹی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجئے پر ہماری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: 0301-2454188
0333-3285269

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیروز ٹاؤن ہاؤسنگ اتھارٹی میں کوڑی روڈ کراچی
فون: 35804200-35804300

ماہ فروری 2018ء کے دلکش شمارے کی حسین جھلکیاں

پاکینہ

رافعت سراج اور شیریں حیدر کے مسلسل ناول کی نئی چونکا دینے والی اقساط

حیا بخاری کے سلسلے وار ناولت محبت لفظ ہے لیکن میں دیکھیے کردار نگاری کے حسین جوہر

ناہید سلطانہ اختر کے مشاق قلم کا شاہکار افسانہ چاک چاک قبائے دل

فرحین اظفر عورت کہانی میں ایک نہایت حساس موضوع لیے حاضر ہیں

قرۃ العین رائے کا مکمل ناول شہریار

کردار سازی اور روح کی بالیدگی کا اہتمام لیے

ذکیہ بلگرامی اور اختر شجاعت

کے ایمان افروز کالم

شائستہ زبیر نے مہمان بلایا شہزادہ شیخ اور ان کی وکیل ہم سفر کو

(نئی جلد)

ماریہ ناز قلم کاروں کی دل کو چھو جانے والی بہترین تحریریں جن میں عقیلہ حق، طیبہ عنصر مغل، بشری سیال،

ہما بیگ، ماہ وش طالب، نزہت جبین ضیا، حرا قریشی، صدیق آصف و دیگر مصنفات شامل ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ دلچسپ مستقل سلسلے، رنگارنگ تراشے، دل موہ لینے والی شاعری، آئرموڈہ ترکیبیں اور بہت کچھ.....

تھی۔
”دیکھو تم جو کچھ کر رہے ہو۔ یہ جنون اچھا نہیں ہے۔
تم اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی نقصان پہنچا دو گے۔“
”خدا نہ کرے کہ میری وجہ سے آپ کو کوئی نقصان ہو۔“ اس نے کہا۔
”تم جان بوجھ کر کچھ نہیں کرو گے۔“ میں اس کی طرف دیکھ کر بولی۔ ”لیکن تم جانتے ہو تاکہ میرا تعلق کس شے سے ہے۔ یہ اخبار اور نیوی والے الٹی سیرمی خبروں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ یہ کہانی بنانے میں دیر نہیں لگاتے۔ پتا نہیں کیا کیا یوسرا اڑا دیں۔ تم اسے دنوں سے میری کھوج میں ہو۔ تم کو یہ اندازہ ہو گیا ہو گا کہ میرا حراج بہت الگ ہے۔ میں نے ہمیشہ خود کو بچا کر رکھا ہے۔ اس لیے میرا دامن صاف ہے۔ میں کوئی اسکینڈل برداشت نہیں کر سکتی۔ میں تمہارے جذبے کی قدر کرتی ہوں لیکن تم کو بہت سوچ کر قدم اٹھانا ہے۔ تم ابھی بہت کم عمر ہو۔۔۔۔۔ تم اپنی تعلیم کی طرف دھیان دو بلکہ ایسا کرو کہ تم اپنی تعلیم کے اخراجات مجھ سے لے لیا کرو۔ بغیر کسی جھجک کے۔ کیوں کہ میں جان گئی ہوں کہ تم بہت اچھے اور سچے دوست ثابت ہو سکتے ہو۔ تم ہمیشہ مجھے اپنا دوست پاؤ گے۔“

اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ اس نے دھی لگا ہوں سے میری طرف دیکھا۔ ”آپ کیا سمجھتی ہیں کہ میں پیسوں کے لیے آپ کے ساتھ ہوں؟“
”ارے نہیں یہ تم نے کیسے سمجھ لیا۔ میں تو ایک دوست کے ناطے کہہ رہی ہوں۔ کیا دوست کا فرض نہیں ہے کہ وہ دوست کی مدد کرے۔“
اس کی انا اچھی لگی تھی۔ اس نے کچھ نہیں کہا۔ بہت دیر بعد وہ دھیرے سے بولا۔ ”چلیں ٹھیک ہے لیکن جو میں بولوں گا آپ بس وہی دیں گی۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔“
”اچھا بابا۔“ میں بس دی۔ ”چلو تمہاری یہ بات مان لی۔ اب کو کیا ضرورت ہے؟“
”اسنے پیسے کے میں ایک اچھا سا جوڑا خرید سکوں۔“
اس نے کہا۔ ”لیکن اپنے لیے نہیں۔ آپ کے لیے اور یہ بھی ادھار ہوں گے۔“
”یہ کیا بات ہوئی؟“
”ہاں یہ میری خواہش ہے۔ کیا اسے پوری نہیں کریں گی؟“
اس نے اس انداز سے بات کی کہ مجھ سے کچھ کہا

”اب میں ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں۔“

”ضرور کرو۔“

”بس کسی دن مجھے یہ سوٹ پہن کر دکھا دیں۔“ اس نے کہا۔ ”میری خوشی کے لیے۔“

”اچھا بابا۔“ میں بس دی۔ ”تم نے اتنی محبت سے سوٹ دلایا ہے کل۔۔۔ اسی رستوران میں آ جاؤں گی۔“

دوسری شام میں اسی رستوران میں پہنچ گئی۔ میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے وہی سوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ پہلے سے انتظار کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اتنا خوش ہوا کہ میں بتا نہیں سکتی۔ اس کی خوشی اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی۔

میں ایک بار پھر وہی کہوں گی کہ آخر کیا ہو رہا تھا یہ سب؟ میں اس کے کیا کام آ سکتی تھی۔ یادہ میرے لیے کیا ثابت ہو سکتا تھا کچھ بھی نہیں۔ ایک اور حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ اپنے ساتھ پانچ ہزار بھی لے آیا تھا۔ جو اس نے میرے سامنے میز پر رکھ دیئے تھے۔

”ارے یہ کہا۔“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”یہ وہ پانچ ہزار جو آپ نے کل مجھے دیئے تھے۔“

اس نے بتایا۔ ”میرا ایک دوست ہے۔ اس سے لے کر آیا



کاش

محترمہ عنذرا رسول
السلام علیکم

ایک ایسی سچ بیانیں بھیج رہی ہوں جو پراسرار سی لگے گی لیکن پراسرار نہیں۔ اس میں ایک ایسی بیماری کا... تذکرہ ہے جس کے بارے میں لوگ فوراً کہہ دیتے ہیں کہ یہ جن جنات کا شاخسانہ ہے۔ امید ہے آپ کے قارئین بھی اس سے محفوظ ہوں گے۔

نیلما پت
(لاہور)

میں نے دستک پر کوئی توجہ نہیں دی۔
”میں ہوں شجاعت۔“ باہر سے آواز آئی۔ ”تم
میری آواز بھی نہیں پہچان رہے۔“
میں نے دروازہ کھول دیا۔ وہ شجاعت ہی تھا، میرا
شوہر، میرا محبوب، میرا سب کچھ۔ اس کی حالت بہت خستہ
میں کچھ دیر خاموش بیٹھی رہی۔ لیکن جب دستک رکنے
میں نہیں آئی تو میں دروازے کے پاس چلی گئی۔ ”کون

ہوں بعد میں اس کو واپس کر دوں گا۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ میں اس کی بے لوثی پر حیران ہو کر رہ گئی۔
وہ کس طرح کا تھا اور مجھ سے کیا چاہتا تھا؟ اتنی بے غرض محبت بھی میں نے کم ہی دیکھی ہوگی۔ اگر اس کو محبت کا نام دیا جائے تو وہ ہر قدم پر حیران کرتا جا رہا تھا۔
میں نے اسے وہ پیسے واپس کرنے چاہے لیکن اس نے انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ اگر میں نے وہ پیسے نہیں لیے تو اس کا دل ٹوٹ جائے گا۔
اس کے بعد ایک ہفتے تک اس کا پتا نہیں چلا۔ معلوم بھی ہوا تو اس وقت جب میں ہوش میں آئی۔
دوسرے ہی دن میرا ایک بھائی ایکسپریٹ ہو گیا تھا۔ خدا کو اندیشہ کی بجائی میں اس لیے بچ گئی۔ ورنہ میری گاڑی کی حالت دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کو چلانے والا زندہ ہوگا۔ موٹروں پر موجود لوگ مجھے اٹھا کر اسپتال لے آئے تھے۔ وہاں کسی نے مجھے پہچان لیا تھا۔ اسپتال والوں نے تلاش کر کے میرے گھر والوں کو نوٹ کر دیا۔
اس کے بعد کی کہانی بہت پریشان کرنے والی اور بھاگ دوڑ والی ہے۔
مجھے خون کی فوری ضرورت تھی۔ وہ بھی مل گیا تھا۔ یہ تو بعد میں پتا چلا کہ ایک نوجوان نے مجھے خون دیا تھا۔ اتفاق تھا کہ اس کا خون پیچ کر گیا تھا۔ ورنہ خون کا بندوبست کرنے میں نجانے کتنی دیر لگ جاتی۔ میڈیا کو بھی پتا چل گیا۔ بہت سے لوگ آئے۔ میرے ایکسپریٹ کی خبریں نشر کی گئیں۔
مجھے اس بات کی حیرت تھی کہ وہ خرم ابھی تک میرے پاس نہیں آیا تھا۔ نہ جانے کیوں۔ ممکن ہے کہ اسے میرے ایکسپریٹ کی خبر ہی نہ ملی ہو۔ لیکن ایسا کیسے ہو سکتا تھا وہ تو میرے سامنے کی طرح میرے ساتھ رہتا تھا۔
پھر ایک دن ایک آدمی کسی طرح اجازت لے کر میرے پاس پہنچ گیا۔ میں نے اس کو پہلی نظر میں پہچان لیا تھا وہ کلینک تھا جس نے میری گاڑی ٹھیک کی تھی جس کو خرم نے فون کر کے بلایا تھا۔
اس نے میرے بستر کے پاس آکر پوچھا۔ ”کیسی ہیں آپ؟“
”میں تو ٹھیک ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”آپ مجھے خرم کے بارے میں بتائیں وہ کیسا ہے؟“
اس نے جواب دینے کی بجائے اپنی گردن جھکالی۔ ”بتائیں تو کسی خرم کیسا ہے؟“

ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں حلقوں میں دھنس چکی تھیں۔
گالوں کی ہڈیاں بہت نمایاں ہو رہی تھیں۔ بہت تیز چلی آگئی
تھی۔ اس کے باوجود وہ شجاعت ہی تھا۔ میں اسے بھول ہی
نہیں سکتی تھی۔ اسی دوران تیز سر دھوا کا ایک جھوٹا آیا اور وہ
کانپ کر رہ گیا۔ احساس ہوا کہ اس نے جو کپڑے پہن
رکھے تھے وہ اس موسم کے لیے ہرگز نہیں تھے۔
میں ایک طرف ہٹ آئی۔ ”آؤ اندر آ جاؤ۔“ میں
نے کہا۔

وہ اندر آ گیا۔ برسوں کے بعد اسے دیکھ رہی تھی۔ میرا
خیال ہے کہ بیس برسوں کے بعد۔ ان طویل برسوں میں
صرف وہی نہیں بدلا تھا بلکہ میں بھی بدل چکی تھی۔ ایک زمانہ
تھا کہ میرے رنگ و روپ کا چرچا ہوا کرتا تھا۔ خاندان اور
خاندان سے باہر کے نوجوان مجھے اپنانے کی خواہش کرتے
تھے۔ دعائیں مانگتے تھے کہ میں ان کے نصیب میں لکھ دی
جاؤں۔ پھر میں شجاعت کے حصے میں آ گئی۔
وہ ایک سیر تھا، ایک جری جہاز کا کپتان۔ میرے گھر
والوں کو سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ کس کوڑی دے رہے ہو۔
یہ لوگ بہت بدعاش ہوتے ہیں۔ دنیا بھر میں گھومتے رہتے
ہیں۔ عیاشی ان کی مٹی میں ہوتی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ سب
سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ یہ لوگ گھروں میں تو بہت کم ہی
رہتے ہیں۔ عام طور پر گھروں سے باہر سندروں میں ان کی
زندگی گزر جاتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

لیکن جو قسمت میں ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔
شجاعت سے میرا جوڑا اکٹھا ہوا تھا۔ لہذا ہماری شادی ہوئی۔
کیا اچھے دن تھے۔ اس زمانے میں شجاعت نے چھ ماہ کی
چھٹی لے لی تھی۔ اس نے اپنی کمپنی والوں کو کہہ دیا تھا کہ وہ
نی الحال اپنی بیوی کو چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔

ہم نے شادی کے ایک ہفتہ بعد کرائے کا ایک
خوبصورت سامکان لے لیا۔ ایک ہفتہ تک دونوں مل کر اس
مکان کو سجاتے رہے۔ فرنیچر سے لے کر سب کچھ۔ جب
تھک جاتے تو گاڑی لے کر کہیں سیر کے لیے چلے جاتے۔
پھر رات کا کھانا کہیں باہر کھا کر واپس آتے۔ کیا اچھی
زندگی تھی۔ اس وقت احساس نہیں ہو رہا تھا۔ پہلی بار
احساس اس وقت ہوا۔ جب شجاعت کو کمپنی سے کال آ گئی۔
اسے ہر قیمت پر ڈر بن جانا تھا۔ ویسے بھی اس کی چھٹیاں ختم
ہی ہوئی تھیں۔

وہ چلا گیا۔ میں اس دن بہت روئی تھی۔ امی نے

چھوٹی بہن کو میرے پاس بھیج دیا تھا تاکہ میں اکیلی نہ رہ
سکوں۔ ندا کا اسکول بھی زیادہ دور نہیں تھا۔ اسی لیے اس
کے آجانے سے دل بھٹکا رہا تھا۔ شجاعت تین مہینوں کے
لیے گیا تھا۔ تین مہینوں کے بعد جب واپس آیا تو ایک بار پھر
زندگی واپس آ گئی۔

اس کے بعد وہ ایک اور لمبے دورے پر چلا گیا۔ اس
کے بعد اس کی واپس ہی نہیں ہو سکی تھی۔ نہ جانے کہاں چلا
گیا تھا۔ شپنگ کمپنی والے کہتے تھے کہ جہاز کو کوئی حادثہ پیش
آ گیا ہے۔ جری فراٹوں نے محلے کو غائب بنالیا ہے۔

اخبارات میں خبریں آتی رہیں۔ اس کے بعد بالکل
خاموشی چھا گئی۔ کوئی پتہ نہیں چلا۔

پھر جو کچھ یہ گزری ہے۔ اس کی کیا داستان بتائی
جائے۔ میں تو بالکل برباد ہو چکی تھی۔ ایک ایک دن میرے
لیے عذاب کا تھا۔ میں کہاں کہاں منتقل رہی تھی۔ میرے گھر
والوں کے لیے سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ اگر شجاعت واپس
نہیں آیا تو پھر میرا کیا ہوگا۔ میں کیا کہلاؤں گی، بیوہ؟ یا
شادی شدہ۔ میری سماجی حیثیت کیا ہوگی؟

مذہب اس بارے میں کیا کہتا ہے؟ میں نے شجاعت
کو تلاش کرنے میں کیا کیا جتن نہیں کیا۔ یہ میرا دل ہی جانتا
ہے۔

کئی سال گزر گئے۔ میں نے شجاعت سے مایوس ہو
کر ایک جگہ جا بھی کر لی۔ کیا زندگی تھی میری۔

انتظار کی کیفیت تھی۔ گھر والے کہا کرتے کہ کب تک
اس کی راہ دیکھو گی، شادی کر لو، اگر کو تو عالموں سے فتویٰ
لے لیا جائے۔ فتویٰ بھی لے لیا گیا۔ یہ ایک مسلکی معاملہ
تھا۔ کئی ایسے فتنے تھے۔ جن کے یہاں اگر شوہر چار سال تک
غائب رہے تو اس کے بعد عورت اپنی عدت مکمل کر کے
نکاح کر سکتی ہے۔

لیکن اس کے لیے بھی شرعی عدالت وغیرہ کی اجازت
ضروری ہوگی۔

ہم سب نے پوری طرح کوشش کی کہ شجاعت کا سراغ
مل جائے۔ شپنگ کمپنی والوں نے بتایا کہ کچھ لوگ مل گئے
ہیں۔ جن کو ایک شے کے ذریعے ایک جریہ میں پناہ ملی
تھی لیکن ان میں شجاعت شامل نہیں تھا۔

کب تک تنہا زندگی گزاری جاسکتی تھی۔ بالآخر گھر
والوں نے میری شادی ظفر سے کر دی۔

شادی کے بعد ظفر کمال کے آدمی ثابت ہوئے۔

انہوں نے میرے دل سے شجاعت کی یاد بھلا دی۔ اتنی
محبت کی کہ میں بتا نہیں سکتی۔ بہت ہی وسیع دل کے انسان
تھے۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ اگر تم شجاعت کو یاد رکھو تو اس میں
کوئی برائی نہیں ہے۔ بلکہ یہ عین فطرت ہے۔ جس کے
ساتھ ایک وقت گزارا ہو۔ اس کو ایک دم سے اپنے ذہن
سے جھٹک دینا آسان نہیں ہوتا۔ میں بھی سمجھ گیا کرتی۔
”ظفر، فرض کرو۔ اگر کسی دن شجاعت چلے آئیں تو تمہارا کیا
رویہ ہوگا؟“

”اس سوال کا جواب دینا بہت مشکل ہے۔“ ظفر کہا
کرتے۔ ”لیکن اتنا ضرور ہے کہ میں نے بھی تم سے بہت
محبت کی ہے۔“

میں جس کر چپ ہو جاتی۔ دن پر دن۔ مہینے پر مہینے
گزر رہے تھے۔ سال پر سال، پورے چودہ برس۔ پھر
بیس سال۔ اتنے دیر سارے دن کو نہیں ہوتے۔ جوت
ختم ہو جاتی ہے۔ آنکھیں بھجھ جاتی ہیں۔ زلفیں سوکھی گھاس
کی طرح ہو جاتی ہیں۔ چہرے کی تازگی اور شادابی نہیں کم
ہو جاتی ہے۔ اور اس وقت اگر کوئی آجاک آ جائے تو کیا ہوتا
ہے۔ ”یہ تو بتاؤ کہ ایک عمر کا بچہ عجیب..... اتھا تھا اگر
مل جائے تو کیا کہتے ہیں؟“

میری میرے ساتھ وہ شجاعت کی واپسی میرے لیے
قیامت کی واپسی تھی۔ میں نے انہیں ڈرائنگ روم میں بیٹھا
دیا۔ میں دوسرے کمرے میں جا کر روئے گی۔ ان کی آمد
ایک طوفان تھی۔ اور خدا جانے یہ طوفان کس کس کو اپنے
ساتھ اڑا کر لے جانے آ گیا تھا۔

کچھ دیر بعد میں اپنے آپ پر قابو پا کر ڈرائنگ روم
میں واپس آ گئی۔ شجاعت خاموش بیٹھتے تھے، کسی خیال میں
نہیں۔

بہت ممکن تھا کہ جو کچھ مجھ پر گزری تھی۔ اس سے کہیں
زیادہ ان پر گزر چکی ہو۔ ان کی حالت بتا رہی تھی کہ انہوں
نے بہت برے دن گزارے ہیں۔ زندگی ان کے لیے بہت
تخت رہی ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے سامنے بالکل
خاموش بیٹھے تھے۔ ہمارے پاس شاید کہنے کے لیے کچھ نہیں
رہا تھا۔ ورنہ ایک زمانہ تھا کہ جب ہم ایک ساتھ بیٹھے تو میں
اپنی باتوں سے ان کا دماغ چاٹ جاتی تھی۔

بہت دیر بعد شجاعت نے کہا۔ ”نیلما، کیسی ہو تم؟“
”بس تمہارے سامنے ہوں۔“ میں دیر سے

بولی۔ ”زندہ ہوں اور کیا چاہیے؟“

”نیلما زندگی کیا ہے کیا ہو گئی؟“ اس نے کہا۔
”میرے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ہم اس طرح ایک
دوسرے سے بچھڑ جائیں گے۔ لیکن.....“

”بس شجاعت!“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔
”ہم نے جو زندگی گزاری ہے اسے ایک خواب سمجھ کر بھول
جاؤ۔ جو کچھ ہو چکا وہ اب واپس نہیں آسکتا۔ میں اب کسی
اور کی ہو چکی ہوں۔ ظفر بہت اچھے ہیں۔ بہت پیار کرنے
والے۔ اب تم میری زندگی میں بچل چلنے کیوں آ گئے
ہو؟“

وہ خاموش رہا۔ جیسے سوچ رہا ہو کہ میری بات کا کیا
جواب دے۔ پھر کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ ”نیلما میرے
ساتھ جو گزری ہے۔ وہ میں بتا نہیں سکتا۔“

”اب میں سننا بھی نہیں چاہتی۔ تم آگے ہو۔ تم کو
دیکھ لیا ہے۔ میرے لیے یہی بہت ہے۔ میں ظفر کو دھوکا نہیں
دے سکتی۔ تم چلے جاؤ یہاں سے۔“

ابھی میں نے کہا ہی تھا کہ دروازے کی گھنٹی بج گئی۔
میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ ظفر واپس آ گئے تھے۔
میں اب کیا کہتی۔ یا خدا، میں کس شکل میں پڑ چکی تھی۔ کاش
میں نے شجاعت کے لیے دروازہ کھولا ہی نہ ہوتا۔ یا پھر
اسے دروازے سے رخصت کر دیا ہوتا۔ اندر لانے کی کیا
ضرورت تھی۔

میں نے گھبرا کر شجاعت کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی جگہ
کسی جیسے کی طرح بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر کسی قسم
کے تاثرات نہیں تھے۔ گھنٹی پھر بج گئی۔ اب دیر کرنا
مناسب نہیں تھا۔

میں نے شجاعت سے کہا۔ ”ظفر واپس آ گئے ہیں۔
میں دروازہ کھولنے جا رہی ہوں۔ تم اس سے کوئی بہانہ بنا
دینا یا کچھ باتا دینا۔“

تیسری بار بھی گھنٹی بجی۔ میں نے جا کر دروازہ کھول
دیا۔ ظفر کھڑے تھے۔

”خیریت تو ہے جان۔“ ظفر نے کہا۔ ”دروازہ
کھولنے میں اتنی دیر لگا دی۔“

وہ اندر آ گئے۔ شجاعت کرسی پر بیٹھا تھا۔ ظفر اس کے
سامنے جا کر بیٹھ گئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک شاعر تھا۔
انہوں نے وہ شاعر میری طرف بڑھا دیا۔ ”یہ تو مجھی
تمہاری دوا میں لیتا آیا ہوں۔“

میں بس پاگوں کی طرح ان کو دیکھے جا رہی تھی۔ کیا

ہو رہا تھا یہ سب۔ وہ شجاعت کا ٹوس کیوں نہیں لے رہے تھے۔ جیسے اس کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔ میں نے شجاعت کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی جگہ خاموش بیٹھے تھے۔ جیسے ظفر کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہو۔

میرا حال کیا تھا۔ یہ میں بتا نہیں سکتی۔
”میں فریض ہونے جا رہا ہوں۔“ ظفر نے کہا۔ ”تم میرے لیے جانے بنا دو۔“

وہ اٹھ کر چلے گئے اور میں پھٹ پڑی۔ ”شجاعت خدا کے لیے آپ چلے جائیں۔ نہ جانے کیوں ظفر خاموش ہیں۔“ انجان بنے ہوئے ہیں۔ لیکن کب تک..... چلے جائیں۔

اتنی دیر میں ظفر بھی کسی کام سے ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ ”ارے بھائی کیا ہوا تم کس سے باتیں کر رہی ہو؟“ ظفر نے پوچھا۔

”ظفر..... یہ..... یہ..... میں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔“ یہ آگئے تھے تو میں نے انہیں بیٹھایا۔
”کون آگئے تھے؟ کس کو کہہ رہی ہو۔“

اور اس وقت مجھے ایک شاگ سا لگا۔ ظفر کا لہجہ ایسا نہیں تھا جیسے وہ مذاق کر رہے ہوں۔ یا انوکھ کر رہے ہوں۔ یا کوئی اور بات ہو۔ ان کا لہجہ یہ بتا رہا تھا کہ انہیں واقعی شجاعت دکھائی نہیں دے رہے۔ خدا جانے یہ کیا ماجرا تھا؟ میں نے مزید تصدیق کے لیے پوچھا۔ ”ظفر کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ کیا کرسی پر کوئی نظر نہیں آ رہا ہے؟“

”نیلما۔ میرا خیال ہے کہ تم کو آرام کی ضرورت ہے۔“ ظفر نے کہا۔ ”کرسی پر کوئی ہو تو نظر آئے؟ کرسی تو خالی ہے۔“

اور اس لمحے پتا چلا کہ ظفر سچ کہہ رہے تھے۔ انہیں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ کوئی نہیں تھا وہاں۔ تو پھر جو کچھ میں نے دیکھا وہ کیا تھا۔ کون میرے سامنے آیا تھا۔ میں نے کس سے باتیں کی تھیں۔ کیا تھا یہ سب۔

میرا سر پکڑنے لگا تھا۔ میں صوفے پر بیٹھ گئی۔ ظفر میرے لیے گلاس میں پانی لے کر آ گئے۔ ”لو پانی پی لو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ سونو مل جائے گا۔“

میں پانی پی کر ظفر کی طرف دیکھنے لگی۔ کسی حد تک میری طبیعت ٹھیک ہو گئی تھی۔ ظفر بھی میرے پاس ہی بیٹھ گئے۔ ہاں۔ اب بتاؤ۔ کیا دیکھا تھا تم نے کس کو دیکھا تھا؟

”شجاعت کو۔“ میں نے بتایا۔
”شجاعت کو؟ وہ بھی حیران رہ گئے تھے۔“ کیا کہہ رہی ہو۔ کس شجاعت کی بات کر رہی ہو؟ اپنے ساتھ شوہر کی؟

”ہاں۔ وہ آئے تھے۔ بہت خستہ حالت تھی ان کی۔ وہ دروازے پر دستک دے رہے تھے۔ میں نے دروازہ کھولا تو اندر چلے آئے۔ سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئے۔ جب آپ آئے تو اس وقت بھی وہ بیٹھے ہوئے تھے۔ لیکن آپ نے دیکھا ہی نہیں۔“

”نیلما۔ جب میں اندر آیا تو کوئی بھی نہیں تھا۔“ ظفر نے کہا۔ ”تم جس کرسی کی بات کر رہی ہو۔ اس پر کوئی بھی نہیں تھا۔ بالکل خالی تھی۔“

تو پھر کیا تھا یہ سب؟ کیوں نہ تھا۔ اگر یہ وہم تھا تو وہم اتنا حقیقی بھی ہو سکتا ہے۔ اتنا مضبوط ہو سکتا ہے؟

اس رات ظفر نے زبردستی مجھے سونے پر مجبور کر دیا۔ ورنہ میں تو ساری رات ہی بیٹھی سوچتی رہتی کہ یہ سب کیا تھا۔ کیا میں پاگل ہو گئی تھی۔ دوسرے دن جب ظفر دفتر جانے لگے تو میں نے انہیں روک دیا۔ ”نیلما ظفر آج آپ نہ جائیں۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“

”نیلما۔ اگر اسی طرح رہیں تو اپنے آپ کو پریشان کرتی رہو گی۔ جو کچھ ہوا ہے اسے بھول جاؤ۔ چلو آج دفتر نہیں جا رہا۔ تم کہیں اور چلے ہیں۔ ٹھیک ہے؟“

اس دن ہم دن بھر گھر سے باہر رہے۔ شام کے وقت ہم نے ایک ہوٹل میں کھانا بھی کھایا۔ رات کو ہم واپس آئے تو میری طبیعت بہل چکی تھی۔ اس کے بعد سب نارمل ہو گیا تھا۔ ایک ہفتے تک کچھ بھی نہیں ہوا۔ ایک ہفتے کے بعد جب میں شجاعت کو بھول چکی تھی تو پھر وہی سب کچھ ہوا۔ اس بار بھی دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو شجاعت کھڑے تھے۔ ان کا وہی حال تھا۔ جوش پیلہ دیکھ چکی تھی۔

اس بار ایک دہشت سی طاری ہو گئی۔ میں پیچھے ہٹ آئی۔ خوف سانسوں ہو رہا تھا۔ اگر یہ حقیقت تھی تو پھر ایسی حقیقت صرف میرے لیے کیوں تھی۔ شجاعت ظفر کو نظر کیوں نہیں آتے تھے؟

میں نے گھر کا دروازہ بند کرنا چاہا تو شجاعت بول پڑے۔ ”نیلما کیا ہوا ہے تمہیں؟ کیا تم نے مجھے پہچانا نہیں؟“

”وہی آواز؟ وہی لہجہ۔ وہی سب کچھ۔ تو پھر کیا تھا یہ سب؟ ہو سکتا تھا کہ ظفر کسی مصلحت سے کام لے رہے

ہوں۔ اسی لیے انہوں نے یہ غاہر کیا ہو کہ کوئی بھی سامنے نہیں ہے۔ میں یا تو خواب دیکھ رہی ہوں یا پھر مجھے کوئی وہم ہوا ہے۔“

”شاید اسی قسم کی کوئی بات ہوگی۔ میں نے دیر سے کہا۔“ شجاعت۔ یہ بتائیں۔ آپ کا وجود ہے یا کوئی خواب ہے؟“

”کیسی بات کر رہی ہو۔ میں زندہ ہمارے سامنے کھڑا ہوں۔ کیا تم میرے وجود سے انکار کر رہی ہو؟ جانتی ہو۔ میں نے کس سے کچھ نہیں کھایا۔ تم نے کچھ بنایا تو ہوگا۔“

اور اس وقت میں پہنچ گئی۔ یا خدا۔ شجاعت بھوکے ہیں۔ کیا حالت ہو گئی ان کی۔ اور میں اپنے گھر میں دنیا بھر کی نعمتوں کے ساتھ رہ رہی ہوں۔

”آپ شجاعت۔ اندر آ جائیں۔“ میں نے کہا۔ میں ایک طرف ہٹ گئی۔ وہ پیلہ کی طرح اندر آ گئے۔

ان کو جیسے معلوم تھا کہ کس صوفے پر بیٹھنا ہے۔ وہ اسی صوفے پر بیٹھ گئے جس پر پہلے بیٹھے تھے۔

”میں نے آج پہنڈی کا سالن بنایا ہے۔ آپ تو بہت شوق سے کھاتے تھے نا؟“

”ہاں۔ ہاں۔ بہت شوق سے اور ہاں۔ اس کے ساتھ چاول بھی بنائے ہوں گے؟“

”ہاں۔ ہاں۔ بس آپ دو منٹ بیٹھیں۔ میں ابھی لے کر آتی ہوں۔“ میں نے کہا۔

میں جب کمرے لے کر آئی تو شجاعت الماری میں رکھی کتابیں دیکھ رہے تھے۔ میری آہٹ سن کر میری طرف دیکھا۔ ”نیلما۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ تم نے ابھی تک ان کتابوں کو سمیٹ کر رکھا ہے جوش پر حا کر رہا تھا۔“

”ہاں۔ میں انہیں ہمیشہ سنبھال کر رکھتی ہوں۔“ میں نے ٹرسے میز پر رکھ دی تھی۔ ”یہ ہیں۔ کھائیں۔“

شجاعت کھانے لگے۔ ہر نوالے پر وہ اپنی عادت کے مطابق تعریف کرتے جا رہے تھے۔ ”مزہ آگیا۔ اتنی مدت کے بعد گھر کا کھانا ملا ہے۔ اور وہ بھی تمہارے ہاتھوں کا۔ اور کیا چاہیے۔“

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ ”شجاعت۔ آپ کہاں چلے گئے تھے؟ میں نے پوچھا۔“ شاید آپ کو اندازہ نہ ہو کہ ہم نے آپ کی تلاش میں کیا کیا کیا تھا نہیں کیا۔“

”اندازہ ہے مجھے۔“ شجاعت نے کہا۔ ”اسی لیے تو واپس آ گیا ہوں۔“

پتا نہیں کیوں۔ اس دن بہت خوشی سی محسوس ہو رہی تھی۔ حالانکہ ظفر کا خیال بھی آ رہا تھا۔ لیکن شجاعت کی موجودگی نے ایک عجیب سا صوفہ دے دیا تھا۔ میں ان سے باتیں کرتی رہی۔ دنیا بھر کی باتیں۔ میں نے کس طرح زندگی گزاری۔ کہاں کہاں جاں کی۔ لوگوں کی باتیں سن کر رہی۔ پھر تنگ آ کر شادی کر لی۔

وہ بھی برسوں کے انتظار کے بعد۔ اور فتویٰ لے کر۔ پھر ظفر میری زندگی میں شامل ہو گئے۔ اب میں ان کی بیوی ہوں۔ وہ بھی مجھ سے اتنا ہی پیار کرتے ہیں جتنا پیار مجھے شجاعت سے ملا تھا۔ وغیرہ۔ وہ خاموشی سے کھانا کھاتے رہے۔ اور میری باتیں سنتے رہے۔ درمیان میں کبھی کبھی بول بھی لیتے تھے۔

ایک عجیب بات ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ کس طرح رہے۔ کہاں رہے۔ ان پر کیا گزری۔ کچھ نہیں بتایا۔ میں نے بھی ان سے زیادہ کرید نہیں کی۔

ظفر جب گھر میں آئے تو شجاعت واپس جا چکے تھے۔ میں نے ان سے کچھ چھاننا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ میرے شوہر تھے۔ میں کسی طرح بھی انہیں دھوکے میں نہیں رکھ سکتی تھی۔ اسی لیے میں نے کہا۔ ”ظفر۔ شجاعت آج بھی آئے تھے۔“

”آجھا۔“ ظفر نے بڑھکاری لی اور عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگے۔ ”کس وقت آئے تھے۔“

”آپ کے جانے کے بعد۔“ میں نے بتایا۔ ”آج تو کھانا بھی کھا کر گئے ہیں۔ بہت مزے لے لے کر پہنڈی کھائی ہے۔ یہ دیکھیں میز پر برتن بھی بڑے ہوئے ہیں۔“

”نیلما۔ تم کہہ رہی ہو کہ وہ کھانا کھا کر گئے ہیں لیکن برتنوں میں تو کھانا رکھا ہوا ہے۔“

میں نے دیکھا تو وہ ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔ برتنوں میں کھانا اسی طرح رکھا ہوا تھا جس طرح میں نے ان کے لیے نکال کر دیا تھا۔ تو پھر کیا تھا وہ سب۔ وہ تو میرے سامنے بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ پھر سارے برتن بھرے ہوئے کیوں تھے؟

مجھے پکڑ سا آنے لگا۔ میں غڑحال ہو کر ایک صوفے پر گر پڑی۔ ظفر نے فوراً مجھے سنبھال لیا۔ ”نیلما۔ کیا ہوا ہے تم کو؟ کیا ہے یہ سب؟“

”میں نہیں جانتی کہ کیا ہے؟ میں نے کہا۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ میرا وہ نہیں ہے۔ وہ وہی نہیں

ہوں۔ اسی لیے انہوں نے یہ غاہر کیا ہو کہ کوئی بھی سامنے نہیں ہے۔ میں یا تو خواب دیکھ رہی ہوں یا پھر مجھے کوئی وہم ہوا ہے۔“

”شاید اسی قسم کی کوئی بات ہوگی۔ میں نے دیر سے کہا۔“ شجاعت۔ یہ بتائیں۔ آپ کا وجود ہے یا کوئی خواب ہے؟“

”کیسی بات کر رہی ہو۔ میں زندہ ہمارے سامنے کھڑا ہوں۔ کیا تم میرے وجود سے انکار کر رہی ہو؟ جانتی ہو۔ میں نے کس سے کچھ نہیں کھایا۔ تم نے کچھ بنایا تو ہوگا۔“

اور اس وقت میں پہنچ گئی۔ یا خدا۔ شجاعت بھوکے ہیں۔ کیا حالت ہو گئی ان کی۔ اور میں اپنے گھر میں دنیا بھر کی نعمتوں کے ساتھ رہ رہی ہوں۔

”آپ شجاعت۔ اندر آ جائیں۔“ میں نے کہا۔ میں ایک طرف ہٹ گئی۔ وہ پیلہ کی طرح اندر آ گئے۔

ان کو جیسے معلوم تھا کہ کس صوفے پر بیٹھنا ہے۔ وہ اسی صوفے پر بیٹھ گئے جس پر پہلے بیٹھے تھے۔

”میں نے آج پہنڈی کا سالن بنایا ہے۔ آپ تو بہت شوق سے کھاتے تھے نا؟“

”ہاں۔ ہاں۔ بہت شوق سے اور ہاں۔ اس کے ساتھ چاول بھی بنائے ہوں گے؟“

”ہاں۔ ہاں۔ بس آپ دو منٹ بیٹھیں۔ میں ابھی لے کر آتی ہوں۔“ میں نے کہا۔

میں جب کمرے لے کر آئی تو شجاعت الماری میں رکھی کتابیں دیکھ رہے تھے۔ میری آہٹ سن کر میری طرف دیکھا۔ ”نیلما۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ تم نے ابھی تک ان کتابوں کو سمیٹ کر رکھا ہے جوش پر حا کر رہا تھا۔“

”ہاں۔ میں انہیں ہمیشہ سنبھال کر رکھتی ہوں۔“ میں نے ٹرسے میز پر رکھ دی تھی۔ ”یہ ہیں۔ کھائیں۔“

شجاعت کھانے لگے۔ ہر نوالے پر وہ اپنی عادت کے مطابق تعریف کرتے جا رہے تھے۔ ”مزہ آگیا۔ اتنی مدت کے بعد گھر کا کھانا ملا ہے۔ اور وہ بھی تمہارے ہاتھوں کا۔ اور کیا چاہیے۔“

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ ”شجاعت۔ آپ کہاں چلے گئے تھے؟ میں نے پوچھا۔“ شاید آپ کو اندازہ نہ ہو کہ ہم نے آپ کی تلاش میں کیا کیا کیا تھا نہیں کیا۔“

”اندازہ ہے مجھے۔“ شجاعت نے کہا۔ ”اسی لیے تو واپس آ گیا ہوں۔“

پتا نہیں کیوں۔ اس دن بہت خوشی سی محسوس ہو رہی تھی۔ حالانکہ ظفر کا خیال بھی آ رہا تھا۔ لیکن شجاعت کی موجودگی نے ایک عجیب سا صوفہ دے دیا تھا۔ میں ان سے باتیں کرتی رہی۔ دنیا بھر کی باتیں۔ میں نے کس طرح زندگی گزاری۔ کہاں کہاں جاں کی۔ لوگوں کی باتیں سن کر رہی۔ پھر تنگ آ کر شادی کر لی۔

وہ بھی برسوں کے انتظار کے بعد۔ اور فتویٰ لے کر۔ پھر ظفر میری زندگی میں شامل ہو گئے۔ اب میں ان کی بیوی ہوں۔ وہ بھی مجھ سے اتنا ہی پیار کرتے ہیں جتنا پیار مجھے شجاعت سے ملا تھا۔ وغیرہ۔ وہ خاموشی سے کھانا کھاتے رہے۔ اور میری باتیں سنتے رہے۔ درمیان میں کبھی کبھی بول بھی لیتے تھے۔

ایک عجیب بات ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ کس طرح رہے۔ کہاں رہے۔ ان پر کیا گزری۔ کچھ نہیں بتایا۔ میں نے بھی ان سے زیادہ کرید نہیں کی۔

ظفر جب گھر میں آئے تو شجاعت واپس جا چکے تھے۔ میں نے ان سے کچھ چھاننا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ میرے شوہر تھے۔ میں کسی طرح بھی انہیں دھوکے میں نہیں رکھ سکتی تھی۔ اسی لیے میں نے کہا۔ ”ظفر۔ شجاعت آج بھی آئے تھے۔“

”آجھا۔“ ظفر نے بڑھکاری لی اور عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگے۔ ”کس وقت آئے تھے۔“

”آپ کے جانے کے بعد۔“ میں نے بتایا۔ ”آج تو کھانا بھی کھا کر گئے ہیں۔ بہت مزے لے لے کر پہنڈی کھائی ہے۔ یہ دیکھیں میز پر برتن بھی بڑے ہوئے ہیں۔“

”نیلما۔ تم کہہ رہی ہو کہ وہ کھانا کھا کر گئے ہیں لیکن برتنوں میں تو کھانا رکھا ہوا ہے۔“

میں نے دیکھا تو وہ ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔ برتنوں میں کھانا اسی طرح رکھا ہوا تھا جس طرح میں نے ان کے لیے نکال کر دیا تھا۔ تو پھر کیا تھا وہ سب۔ وہ تو میرے سامنے بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ پھر سارے برتن بھرے ہوئے کیوں تھے؟

مجھے پکڑ سا آنے لگا۔ میں غڑحال ہو کر ایک صوفے پر گر پڑی۔ ظفر نے فوراً مجھے سنبھال لیا۔ ”نیلما۔ کیا ہوا ہے تم کو؟ کیا ہے یہ سب؟“

”میں نہیں جانتی کہ کیا ہے؟ میں نے کہا۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ میرا وہ نہیں ہے۔ وہ وہی نہیں

ہوں۔ اسی لیے انہوں نے یہ غاہر کیا ہو کہ کوئی بھی سامنے نہیں ہے۔ میں یا تو خواب دیکھ رہی ہوں یا پھر مجھے کوئی وہم ہوا ہے۔“

”شاید اسی قسم کی کوئی بات ہوگی۔ میں نے دیر سے کہا۔“ شجاعت۔ یہ بتائیں۔ آپ کا وجود ہے یا کوئی خواب ہے؟“

”کیسی بات کر رہی ہو۔ میں زندہ ہمارے سامنے کھڑا ہوں۔ کیا تم میرے وجود سے انکار کر رہی ہو؟ جانتی ہو۔ میں نے کس سے کچھ نہیں کھایا۔ تم نے کچھ بنایا تو ہوگا۔“

اور اس وقت میں پہنچ گئی۔ یا خدا۔ شجاعت بھوکے ہیں۔ کیا حالت ہو گئی ان کی۔ اور میں اپنے گھر میں دنیا بھر کی نعمتوں کے ساتھ رہ رہی ہوں۔

”آپ شجاعت۔ اندر آ جائیں۔“ میں نے کہا۔ میں ایک طرف ہٹ گئی۔ وہ پیلہ کی طرح اندر آ گئے۔

ان کو جیسے معلوم تھا کہ کس صوفے پر بیٹھنا ہے۔ وہ اسی صوفے پر بیٹھ گئے جس پر پہلے بیٹھے تھے۔

”میں نے آج پہنڈی کا سالن بنایا ہے۔ آپ تو بہت شوق سے کھاتے تھے نا؟“

”ہاں۔ ہاں۔ بہت شوق سے اور ہاں۔ اس کے ساتھ چاول بھی بنائے ہوں گے؟“

”ہاں۔ ہاں۔ بس آپ دو منٹ بیٹھیں۔ میں ابھی لے کر آتی ہوں۔“ میں نے کہا۔

میں جب کمرے لے کر آئی تو شجاعت الماری میں رکھی کتابیں دیکھ رہے تھے۔ میری آہٹ سن کر میری طرف دیکھا۔ ”نیلما۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ تم نے ابھی تک ان کتابوں کو سمیٹ کر رکھا ہے جوش پر حا کر رہا تھا۔“

”ہاں۔ میں انہیں ہمیشہ سنبھال کر رکھتی ہوں۔“ میں نے ٹرسے میز پر رکھ دی تھی۔ ”یہ ہیں۔ کھائیں۔“

شجاعت کھانے لگے۔ ہر نوالے پر وہ اپنی عادت کے مطابق تعریف کرتے جا رہے تھے۔ ”مزہ آگیا۔ اتنی مدت کے بعد گھر کا کھانا ملا ہے۔ اور وہ بھی تمہارے ہاتھوں کا۔ اور کیا چاہیے۔“

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ ”شجاعت۔ آپ کہاں چلے گئے تھے؟ میں نے پوچھا۔“ شاید آپ کو اندازہ نہ ہو کہ ہم نے آپ کی تلاش میں کیا کیا کیا تھا نہیں کیا۔“

”اندازہ ہے مجھے۔“ شجاعت نے کہا۔ ”اسی لیے تو واپس آ گیا ہوں۔“

پتا نہیں کیوں۔ اس دن بہت خوشی سی محسوس ہو رہی تھی۔ حالانکہ ظفر کا خیال بھی آ رہا تھا۔ لیکن شجاعت کی موجودگی نے ایک عجیب سا صوفہ دے دیا تھا۔ میں ان سے باتیں کرتی رہی۔ دنیا بھر کی باتیں۔ میں نے کس طرح زندگی گزاری۔ کہاں کہاں جاں کی۔ لوگوں کی باتیں سن کر رہی۔ پھر تنگ آ کر شادی کر لی۔

وہ بھی برسوں کے انتظار کے بعد۔ اور فتویٰ لے کر۔ پھر ظفر میری زندگی میں شامل ہو گئے۔ اب میں ان کی بیوی ہوں۔ وہ بھی مجھ سے اتنا ہی پیار کرتے ہیں جتنا پیار مجھے شجاعت سے ملا تھا۔ وغیرہ۔ وہ خاموشی سے کھانا کھاتے رہے۔ اور میری باتیں سنتے رہے۔ درمیان میں کبھی کبھی بول بھی لیتے تھے۔

ایک عجیب بات ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ کس طرح رہے۔ کہاں رہے۔ ان پر کیا گزری۔ کچھ نہیں بتایا۔ میں نے بھی ان سے زیادہ کرید نہیں کی۔

ظفر جب گھر میں آئے تو شجاعت واپس جا چکے تھے۔ میں نے ان سے کچھ چھاننا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ میرے شوہر تھے۔ میں کسی طرح بھی انہیں دھوکے میں نہیں رکھ سکتی تھی۔ اسی لیے میں نے کہا۔ ”ظفر۔ شجاعت آج بھی آئے تھے۔“

”آجھا۔“ ظفر نے بڑھکاری لی اور عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگے۔ ”کس وقت آئے تھے۔“

”آپ کے جانے کے بعد۔“ میں نے بتایا۔ ”آج تو کھانا بھی کھا کر گئے ہیں۔ بہت مزے لے لے کر پہنڈی کھائی ہے۔ یہ دیکھیں میز پر برتن بھی بڑے ہوئے ہیں۔“

”نیلما۔ تم کہہ رہی ہو کہ وہ کھانا کھا کر گئے ہیں لیکن برتنوں میں تو کھانا رکھا ہوا ہے۔“

میں نے دیکھا تو وہ ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔ برتنوں میں کھانا اسی طرح رکھا ہوا تھا جس طرح میں نے ان کے لیے نکال کر دیا تھا۔ تو پھر کیا تھا وہ سب۔ وہ تو میرے سامنے بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ پھر سارے برتن بھرے ہوئے کیوں تھے؟

مجھے پکڑ سا آنے لگا۔ میں غڑحال ہو کر ایک صوفے پر گر پڑی۔ ظفر نے فوراً مجھے سنبھال لیا۔ ”نیلما۔ کیا ہوا ہے تم کو؟ کیا ہے یہ سب؟“

”میں نہیں جانتی کہ کیا ہے؟ میں نے کہا۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ میرا وہ نہیں ہے۔ وہ وہی نہیں

ہوں۔ اسی لیے انہوں نے یہ غاہر کیا ہو کہ کوئی بھی سامنے نہیں ہے۔ میں یا تو خواب دیکھ رہی ہوں یا پھر مجھے کوئی وہم ہوا ہے۔“

”شاید اسی قسم کی کوئی بات ہوگی۔ میں نے دیر سے کہا۔“ شجاعت۔ یہ بتائیں۔ آپ کا وجود ہے یا کوئی خواب ہے؟“

”کیسی بات کر رہی ہو۔ میں زندہ ہمارے سامنے کھڑا ہوں۔ کیا تم میرے وجود سے انکار کر رہی ہو؟ جانتی ہو۔ میں نے کس سے کچھ نہیں کھایا۔ تم نے کچھ بنایا تو ہوگا۔“

اور اس وقت میں پہنچ گئی۔ یا خدا۔ شجاعت بھوکے ہیں۔ کیا حالت ہو گئی ان کی۔ اور میں اپنے گھر میں دنیا بھر کی نعمتوں کے ساتھ رہ رہی ہوں۔

”آپ شجاعت۔ اندر آ جائیں۔“ میں نے کہا۔ میں ایک طرف ہٹ گئی۔ وہ پیلہ کی طرح اندر آ گئے۔

ان کو جیسے معلوم تھا کہ کس صوفے پر بیٹھنا ہے۔ وہ اسی صوفے پر بیٹھ گئے جس پر پہلے بیٹھے تھے۔

”میں نے آج پہنڈی کا سالن بنایا ہے۔ آپ تو بہت شوق سے کھاتے تھے نا؟“

”ہاں۔ ہاں۔ بہت شوق سے اور ہاں۔ اس کے ساتھ چاول بھی بنائے ہوں گے؟“

”ہاں۔ ہاں۔ بس آپ دو منٹ بیٹھیں۔ میں ابھی لے کر آتی ہوں۔“ میں نے کہا۔

میں جب کمرے لے کر آئی تو شجاعت الماری میں رکھی کتابیں دیکھ رہے تھے۔ میری آہٹ سن کر میری طرف دیکھا۔ ”نیلما۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ تم نے ابھی تک ان کتابوں کو سمیٹ کر رکھا ہے جوش پر حا کر رہا تھا۔“

”ہاں۔ میں انہیں ہمیشہ سنبھال کر رکھتی ہوں۔“ میں نے ٹرسے میز پر رکھ دی تھی۔ ”یہ ہیں۔ کھائیں۔“

شجاعت کھانے لگے۔ ہر نوالے پر وہ اپنی عادت کے مطابق تعریف کرتے جا رہے تھے۔ ”مزہ آگیا۔ اتنی مدت کے بعد گھر کا کھانا ملا ہے۔ اور وہ بھی تمہارے ہاتھوں کا۔ اور کیا چاہیے۔“

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ ”شجاعت۔ آپ کہاں چلے گئے تھے؟ میں نے پوچھا۔“ شاید آپ کو اندازہ نہ ہو کہ ہم نے آپ کی تلاش میں کیا کیا کیا تھا نہیں کیا۔“

”اندازہ ہے مجھے۔“ شجاعت نے کہا۔ ”اسی لیے تو واپس آ گیا ہوں۔“

پتا نہیں کیوں۔ اس دن بہت خوشی سی محسوس ہو رہی تھی۔ حالانکہ ظفر کا خیال بھی آ رہا تھا۔ لیکن شجاعت کی موجودگی نے ایک عجیب سا صوفہ دے دیا تھا۔ میں ان سے باتیں کرتی رہی۔ دنیا بھر کی باتیں۔ میں نے کس طرح زندگی گزاری۔ کہاں کہاں جاں کی۔ لوگوں کی باتیں سن کر رہی۔ پھر تنگ آ کر شادی کر لی۔

وہ بھی برسوں کے انتظار کے بعد۔ اور فتویٰ لے کر۔ پھر ظفر میری زندگی میں شامل ہو گئے۔ اب میں ان کی بیوی ہوں۔ وہ بھی مجھ سے اتنا ہی پیار کرتے ہیں جتنا پیار مجھے شجاعت سے ملا تھا۔ وغیرہ۔ وہ خاموشی سے کھانا کھاتے رہے۔ اور میری باتیں سنتے رہے۔ درمیان میں کبھی کبھی بول بھی لیتے تھے۔

ایک عجیب بات ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ کس طرح رہے۔ کہاں رہے۔ ان پر کیا گزری۔ کچھ نہیں بتایا۔ میں نے بھی ان سے زیادہ کرید نہیں کی۔

ظفر جب گھر میں آئے تو شجاعت واپس جا چکے تھے۔ میں نے ان سے کچھ چھاننا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ میرے شوہر تھے۔ میں کسی طرح بھی انہیں دھوکے میں نہیں رکھ سکتی تھی۔ اسی لیے میں نے کہا۔ ”ظفر۔ شجاعت آج بھی آئے تھے۔“

”آجھا۔“ ظفر نے بڑھکاری لی اور عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگے۔ ”کس وقت آئے تھے۔“

”آپ کے جانے کے بعد۔“ میں نے بتایا۔ ”آج تو کھانا بھی کھا کر گئے ہیں۔ بہت مزے لے لے کر پہنڈی کھائی ہے۔ یہ دیکھیں میز پر برتن بھی بڑے ہوئے ہیں۔“

”نیلما۔ تم کہہ رہی ہو کہ وہ کھانا کھا کر گئے ہیں لیکن برتنوں میں تو کھانا رکھا ہوا ہے۔“

میں نے دیکھا تو وہ ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔ برتنوں میں کھانا اسی طرح رکھا ہوا تھا جس طرح میں نے ان کے لیے نکال کر دیا تھا۔ تو پھر کیا تھا وہ سب۔ وہ تو میرے سامنے بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ پھر سارے برتن بھرے ہوئے کیوں تھے؟

مجھے پکڑ سا آنے لگا۔ میں غڑحال ہو کر ایک صوفے پر گر پڑی۔ ظفر نے فوراً مجھے سنبھال لیا۔ ”نیلما۔ کیا ہوا ہے تم کو؟ کیا ہے یہ سب؟“

”میں نہیں جانتی کہ کیا ہے؟ میں نے کہا۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ میرا وہ نہیں ہے۔ وہ وہی نہیں

ہوں۔ اسی لیے انہوں نے یہ غاہر کیا ہو کہ کوئی بھی سامنے نہیں ہے۔ میں یا تو خواب دیکھ رہی ہوں یا پھر مجھے کوئی وہم ہوا ہے۔“

”شاید اسی قسم کی کوئی بات ہوگی۔ میں نے دیر سے کہا۔“ شجاعت۔ یہ بتائیں۔ آپ کا وجود ہے یا کوئی خواب ہے؟“

”کیسی بات کر رہی ہو۔ میں زندہ ہمارے سامنے کھڑا ہوں۔ کیا تم میرے وجود سے انکار کر رہی ہو؟ جانتی ہو۔ میں نے کس سے کچھ نہیں کھایا۔ تم نے کچھ بنایا تو ہوگا۔“

اور اس وقت میں پہنچ گئی۔ یا خدا۔ شجاعت بھوکے ہیں۔ کیا حالت ہو گئی ان کی۔ اور میں اپنے گھر میں دنیا بھر کی نعمتوں کے ساتھ رہ رہی ہوں۔

”آپ شجاعت۔ اندر آ جائیں۔“ میں نے کہا۔ میں ایک طرف ہٹ گئی۔ وہ پیلہ کی طرح اندر آ گئے۔

ان کو جیسے معلوم تھا کہ کس صوفے پر بیٹھنا ہے۔ وہ اسی صوفے پر بیٹھ گئے جس پر پہلے بیٹھے تھے۔

”میں نے آج پہنڈی کا سالن بنایا ہے۔ آپ تو بہت شوق سے کھاتے تھے نا؟“

”ہاں۔ ہاں۔ بہت شوق سے اور ہاں۔ اس کے ساتھ چاول بھی بنائے ہوں گے؟“

”ہاں۔ ہاں۔ بس آپ دو منٹ بیٹھیں۔ میں ابھی لے کر آتی ہوں۔“ میں نے کہا۔

میں جب کمرے لے کر آئی تو شجاعت الماری میں رکھی کتابیں دیکھ رہے تھے۔ میری آہٹ سن کر میری طرف دیکھا۔ ”نیلما۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ تم نے ابھی تک ان کتابوں کو سمیٹ

ہوں اور آج ایک بار پھر پڑھنے بیٹھی ہوں۔ ڈائری کے پہلے صفحے پر ”میرا کشمیر چل رہا ہے۔“ لکھا نظر آیا۔ میں نے گہری سانس لی اور ورق پلٹ دیا۔

اچانک زور سے بادل گرے، بجلیاں آسمان پر دور

ظلمِ شب

محترم مدیر اعلیٰ
السلام علیکم

برصغیر کے مسلمانوں نے ہندو بنیوں کو مسترد کر کے آزاد وطن کا نعرہ لگایا اور ایک آزاد وطن حاصل کر لیا۔ شب قدر کو ہمیں پاکستان مل گیا لیکن ریڈ کلف نے جو حد بندی منظور کی وہ ایسی تھی کہ جیسے مسلمانوں سے بدلہ لیا گیا ہو۔ ایسے بے شمار علاقے جو مسلم اکثریتی تھے اسے چھین لیا۔ مشرقی پنجاب ہو یا مشرقی بنگال ہر جگہ دغا ہوا۔ بڑے دھوکے دو ہیں ایک جونا گڑھ اور دوسرا کشمیر۔ کشمیر جو مسلم اکثریتی علاقہ تھا لیکن اسے ہندوستان کی جھولی میں ڈال دیا گیا۔ وہاں کے غیور مسلمانوں نے اس ظلم پر احتجاج کیا جو آج تک جاری ہے۔ ہمارے بہادر کشمیری مسلمان کس طرح طوق غلامی اتار پھینکنے کی کوشش میں ہیں اس کا ہلکا سا عکس حاضر ہے۔

اعجاز احمد راحیل
(ساہیوال)



میرے ہاتھ میں موجود ڈائری، میرے ایک بہت اپنے کی آپ بیتی ہے۔ ہاں میرا بہت اپنا جس نے اپنی زندگی ایک اہم مقصد کی خاطر گزاری اسی لیے میں اس کے شب و روز کا احوال بار بار پڑھتی ہوں۔ پچھلے سترہ برس سے پڑھ رہی

ہیں وہ لوگ جن میں لکڑیاں لٹاؤں گے۔ جن کو لوگ کیا جاتا ان سے وہ لوگ کام بھی لیتے تھے۔ پھر ان کو مار کر وہیں جنگل میں دفن کر دیا جاتا۔

”کس ملک کی بات ہے؟“

”کینیا کی۔ میرا بیٹا کینیا میں تھا۔ جب اس کو بھی اٹھا لیا گیا۔ لیکن وہ پڑھا لکھا تھا۔ اسی لیے اس سے لکڑیاں تو نہیں لٹاؤں گے تھے لیکن لکھا پڑھی کے کام پر لگا دیا تھا۔ میرا بیٹا کئی..... برسوں تک ان ظالموں کی قید میں رہا ہے۔ پھر جب اس کی صحت جواب دے گئی۔ وہ کسی کام کا نہیں رہا تو اسے بھی مار دیا گیا۔ پھر یہ ہوا کہ پولیس کا چھاپہ پڑا۔ سب گرفتار ہو گئے اور میرے بیٹے کی لاش مل گئی۔ شینگ بٹنی کے دفتر والوں نے بتا دیا کہ یہ کون ہے اور کہاں کا ہے۔ اس طرح اس کی لاش یہاں لائی گئی۔ درنہم تو ابھی تک اندر سے ہی میں رہتی۔“ وہ رونے لگی تھیں۔

خدا یا۔ بے چارے شجاعت کے ساتھ یہ سب ہوا تھا۔ کتنی تکلیفیں اٹھائی تھیں انہوں نے۔ اور ہم بتا نہیں کیا کیا تھے رہے تھے۔

”آئی۔ ہم ان کی قبر پر جانا چاہتے ہیں۔“ ظفر نے کہا۔

”کیوں نہیں بیٹا۔ چلو میں بھی چل رہی ہوں۔“ میں جیسے ایک خواب کے عالم میں چلی رہی تھی۔ شجاعت کی قبر میرے سامنے تھی۔ وہ شجاعت جو بھی میرے شوہرہ چکے تھے۔ وہ شجاعت جن سے میں نے محبت کی تھی۔ جن کے ساتھ اربابوں بھرے خواب دیکھے تھے۔ ان کو کس بے دردی کی موت ملی تھی۔

ظفر اور شجاعت کی اسی فاتحہ خوانی کرتے رہے۔ جبکہ میرے تو ہونٹ خشک تھے۔ کیا کہتی کیا پڑھتی۔ بہر حال ہم واپس آ گئے۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ شجاعت میرے سامنے نہیں آئے۔ میں نے ان کو بھی نہیں دیکھا۔ میرا وہ optical illusion ختم ہو چکا تھا۔

بعد میں ظفر نے بتایا کہ انہوں نے جو کچھ کیا وہ میرے علاج کا حصہ تھا۔

جب دل کو کسی کے نہ ہونے کا یقین آجائے تو پھر قرار مل جاتا ہے۔ قرار تو خیر مجھے بھی مل گیا ہے لیکن ایک خواہش آج بھی ہوتی ہے کہ کاش۔ کاش یہ سب کوئی واہر نہیں ہوتا۔

حالت میں سامنے آتے ہیں۔ ان سے باتیں ہوتی ہیں۔ اور میں پاگل ہوتی جا رہی ہوں۔ یا تو جو کچھ میں دیکھ رہی ہوں وہ سچ ہے یا پھر بات کچھ اور ہے۔

”میرا خیال ہے کہ تمہیں کسی سائیکلائٹ کے پاس لے چلوں۔“ ظفر نے کہا۔ ”اگر یہ کسی قسم کا وہم ہے تو نکل جائے گا۔“

سائیکلائٹ نے تعلیمی گفتگو کے بعد بتایا کہ میں مائٹریا کی مرید ہوں۔

”لیکن ڈاکٹر صاحب، مجھے تو شجاعت سامنے نظر آتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”جی ہاں۔ ایسا ہی ہوتا ہے۔ اسے optical illusion کہا جاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کردار سامنے آکر کھڑا ہو گیا ہو۔ اور جب یہ کیفیت بڑھ جائے تو خطرناک بھی ہو جاتی ہے۔“

اس کے بعد یہ ہوا کہ سائیکلائٹ فرسٹ نے فکسیشن کیے۔ یہ ایک طویل داستان ہے کہ اس مرض کا علاج کس طرح کیا گیا لیکن اس تمام عرصے میں مجھے یہ احساس ہو گیا کہ ظفر کو مجھ سے کتنی محبت ہے۔

وہ میری اس انوکھی بیماری سے بہت پریشان تھے۔ اس کا اپنے طور پر انہوں نے ایک علاج تلاش کر لیا۔ حالانکہ اب شجاعت میرے سامنے نہیں آتے تھے۔ اس کے باوجود ظفر یہ چاہتے تھے کہ مجھے مکمل سکون حاصل ہو جائے۔

ایک دن وہ مجھے اپنے ساتھ شجاعت کے گھر لے آئے۔ میرے خدا۔ کتنے برس کے بعد میں اس گھر میں آئی تھی۔ جو ابھی میری سسرال ہوا کرتی تھی۔ نہ جانے ظفر کے ذہن میں کیا تھا۔ میں نے بھی کچھ نہیں کہا۔

شجاعت کی اسی بڑے خلوص سے ملیں۔ بہت دیر تک بیٹھ رہے تھے۔ نہ جانے کہاں کہاں کی باتیں یاد آ رہی تھیں۔

باتوں کے دوران شجاعت کی اسی نے کہا۔ ”بیٹا دو سال ہوئے۔ میرے بیٹے کی لاش مل گئی۔ اس کو تین سال پہلے اغوا کر لیا گیا تھا۔ وہ اتنے برسوں تک زندہ تو تھا لیکن مردوں سے بدتر۔ اس کے بعد اس کو مار دیا گیا۔ کیوں کہ وہ اب اغوا کرنے والوں کے کسی کام کا نہیں رہا تھا۔“

میں سکتے کے عالم میں یہ سب سن رہی تھی۔

آئی یہ بتائیں گی کہ شجاعت کو کیوں اغوا کیا گیا تھا؟

ظفر نے پوچھا۔

تک لہراتی چلی گئیں۔ میں نے صفحے سے نظریں ہٹا کر کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ آسمان سے چھاؤں پانی گزر رہا تھا۔ ہاں شمع کا آسمان رونے لگا ہے۔ میں دوبارہ ڈائری کی طرف متوجہ ہوئی۔ جب پہلی بار پڑھی تھی۔ تب بھی ایسا ہی موسم تھا۔ آسمان درود ہاتھ اور میں بھی رو رہی تھی۔ میرے ہاتھ ورق پلٹ رہے تھے اور، مچھر آسودوں سے بھیک رہا تھا۔ آسمان شمع کی زمین پر گئے لوہے کے نشان و حور ہاتھ مٹا رہا تھا۔

پہلے ہی صفحے پر اس نے تعارف لکھا تھا۔ ”میرا نام جنید ہے۔ ہمارا کتبہ چار افراد پر مشتمل ہے۔ ابو، امی اور ہم دو بھائی۔ ابو جان کی سرینگر میں کپڑے کی دکان تھی۔ وہ سارا دن اپنی دکان پر مصروف رہتے اور شام کو واپس گھر آتے۔ ابو بتایا کرتے تھے کہ میں سارا دن محن میں کھیلتا رہتا۔ جب میں چھوٹا تھا مجھے جہاز بہت اچھے لگتے تھے۔ جب بھی میں جہاز کی آواز سنتا، کھینچ چھوڑ کر آسمان کی طرف دیکھنا شروع کر دیتا۔ جب تک نظر آتا رہتا، میری نظریں اس کا تعاقب کرتی رہتی تھیں۔ اس وقت شمعیں ظلم و بربریت کا بازار اتنا گرم نہیں ہوا تھا۔

پھر وہ وقت آیا کہ اس خوبصورت وادی کے لوگ جہازوں کی آواز سن کر خوفزدہ ہونے لگے۔ جن میں، میں بھی شامل تھا۔ جہاز کی آواز مجھے بہت خوفناک لگتی تھی۔ کیونکہ بندوق بردار لوگ جہاز سے بھی ہم پر گولیاں پرساتے تھے۔ انہوں نے پوری وادی کو مشعل بنانے کی ٹھان لی تھی۔ میرے ابو کی دکان کو بھی آگ لگا دی تھی۔ جس کی وجہ سے ہم نکال ہو گئے۔ شاید اسی وجہ سے ابو نے مجھے اور وحید بھائی کو گاؤں بھیج دیا تھا اور خود مجاہدین کے ساتھ شامل ہو گئے تھے۔ لیکن کچھ ہی دنوں بعد گاؤں واپس آ گئے کیونکہ دشمن کی چلائی ہوئی گولی نے ایک بچہ کو مار کر دیا تھا۔

ہمارا گاؤں پہاڑوں میں گھرا ایک خوبصورت گاؤں ہے۔ اس سے کچھ فاصلے پر دریا بہتا ہے۔ دوسری طرف ایک پختہ سڑک ہے جو کہ سرینگر سے یہاں آتی ہے۔ یہاں سے لداخ اور کراچی کی طرف جاتی ہے۔ یہ خوبصورت وادی قدرتی حسن سے مالا مال ہے۔ صفحہ شفاف پانی کے چشمے، بل کھاتی ندیاں، جھرنے، فلک بوس پہاڑوں کی چوٹیاں، جو کہ برف کی چادر اوڑھے چپ چاپ کھڑی یہاں ہونے والے مظالم کی چشم دید گواہ ہیں۔ وادی میں حدنگاہ لہلہاتے کھیت اور سبزہ زار ہیں درختوں پر چھپاتے خوش الحان پرندے قدرت

کی صنای کا شاہ کار ہیں۔ بلاشبہ یہ جنت ہے نظیر ہے۔ اس گاؤں میں رہنے والے سادہ لوح لوگوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے محبت اور احترام ہے۔ گاؤں آنے کے بعد ابو نے مجھے گاؤں کے اسکول میں آٹھویں میں داخل کروا دیا۔ میرا بھائی وحید جو کہ مجھ سے تین سال بڑا تھا۔ ابو کا ہاتھ بٹاتا کام وغیرہ کرواتا تھا۔ گاؤں کے قریب ہی ہماری ٹھوڑی سی زمین تھی جس پر ابو نے فصل لگا دی۔

ابو نے جتنی باڑی پر اکتفا نہیں کیا۔ گھر کے ساتھ ہی کریانے کی دکان بنائی۔ وہ دونوں بھتیجی باڑی کے ساتھ ساتھ دکان بھی چلاتے تھے۔ ہماری گزر بسر اچھی ہو رہی تھی۔ میں اسکول سے چھٹی کے بعد اکثر ان کے پاس دکان پر ہی بیٹھ جاتا تھا۔ ایک دن میں نے ابو سے پوچھا ”بابا سب بچوں کی ماں ہوتی ہے۔ میری ماں کہاں ہے؟“

وہ کچھ دیر چپ رہے پھر کہہ کر سانس لے کر بولے۔ ”بیٹا وہ اللہ کے پاس چلی گئیں۔“ مجھے امی کا چہرہ ہلکا ہلکا سا یاد ہے۔ میں اس وقت صرف چھ سال کا تھا۔ جب امی ایک رات کے لیے اپنے بیکے گئی تھیں۔ وہ مجھے اور وحید کو ابو کے پاس چھوڑ گئی تھیں۔ میرے نانا اور نانی کا گھر ہمارے گاؤں سے کئی کلومیٹر دور چھوٹی سی ایک بستی میں تھا۔ ایک رات بھارتی فوجیوں نے وہاں دھاوا بول دیا۔ وہ بستی جو پندرہ بیس گھروں پر مشتمل تھی۔ اسے آگ لگا دی۔ میری امی، نانا، ابو، نانی امی، دو ماموں آگ میں جل کر شہید ہو گئے تھے۔

اس وقت مجھے اس سانحے کا صحیح انداز نہ تھا لیکن اب جب میں ہوشمند ہوں تو اپنی بے بسی کا احساس ہوا ہے۔ وقت نے خود بتایا ہے کہ ہمیں کس طرح سے ستایا جا رہا ہے۔ اس درد کا احساس تب ہوا جب میں نے دسویں جماعت کا امتحان پاس کیا۔

ابو جان مجھے آگے پڑھانا چاہتے تھے، لیکن ان دنوں وادی کے حالات خراب تھے۔ میں اس رات کو تو بھول ہی نہیں سکتا۔

اس رات ہم گھر کے صحن میں سوئے ہوئے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ دستک کی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ ابو بھی جاگ گئے۔ آسمان پر چودھویں کا چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ انہوں نے ایک پاؤں میں چپل پہنی اور بیسما کی

سہارے چلتے ہوئے دروازے کی جانب بڑھے۔ میں اور وحید بھی اٹھ کر بیٹھ گئے تھے۔ انہوں نے دروازہ کھولا تو چار مسلح افراد گھر میں داخل ہو گئے۔

وہ چاروں ہمارے پاس سے گزرتے ہوئے ابو کے ساتھ کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ میں نے انہیں پہچان لیا۔ یہ بڑی ہوئی شیو، لمبے بالوں اور لمبے لباس والے آزادی کے متوالے تھے۔ یہ مجاہد تھے۔ انہیں خود سے نہیں اپنے کار سے عشق تھا۔ وہ اپنی آخری سانس اور آخری گولی تک لڑنے کا عہد کر چکے تھے۔

انہیں اپنے لباس اور حلیوں کی پروا نہیں تھی۔ وادی کو غاصب درندوں کے ناپاک وجود سے پاک کرنا ان کا نصب العین تھا۔ یہ اپنے لوہے کے چراغ جلا کر وادی میں ظلم و بربریت کے اندھیروں کو اجالوں میں بدلنے والے لوگ تھے۔ وہ نزدیک میں کوئی کارروائی کرتے تو سستانے کے لیے ہمارے گھر آ جاتے تھے۔ ابو جان انہیں کبھی خوش پناہ دے دیتے۔

ان کے کھانے پانی کا انتظام کر دیتے۔ وہ لوگ مجھے اپنا آئینہ مل لگتے اسی لیے میں وحید کو ساتھ لے کر اندر والے کمرے میں آ گیا۔

وہ چاروں ابو کے ساتھ کمرے میں بھی چٹائی پر بیٹھے تھے۔

”وحید بیٹا اتم کھانے پینے کا بندوبست کرو۔“ ابو، وحید کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

”اچھا بابا۔“ یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔ ”ماشاء اللہ۔“ جنید تو اب کافی بڑا ہو گیا ہے۔ مونچھیں بھی آ گئی ہیں۔ ”ان میں سے ایک مجاہد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میں نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو پہچان گیا اور ”چاچا باسل!“ آپ.....“ کہہ کر ان سے لپٹ گیا۔ انہوں نے شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور مجھے اپنے کشادہ سینے سے لگا لیا۔ کماٹر باسل ابو کے دوست تھے۔ میں انہیں چاچا جانی کہتا تھا۔

وہ ایک جری کماٹر تھے۔ بھارتی درندے ان کا نام سن کر کانپتے تھے۔ انہوں نے بھارتی آری کو ناقابلِ حلافی نقصان پہنچایا تھا۔ وہ پچھلے سات سال سے ان کے لیے عذاب بنے ہوئے تھے۔

تین سال بعد میں نے انہیں دیکھا تھا گو کہ ان کا خلیہ

اب کافی بدل چکا تھا۔ میں ان سے حال احوال پوچھنے لگا۔ وہ مجھے بتاتے رہے، پھر انہوں نے تینوں مجاہدوں کا تعارف کر دیا۔

اتنی دیر میں وحید دال اور چاول گرم کر کے لے آیا۔ پہلے کھانا ابو بناتے تھے مگر کچھ عرصے سے یہ ڈیوٹی وحید نے سنبھال لی تھی۔

رات کا کھانا ابو ہمیشہ زیادہ ہوا تے۔ ان کا کہنا تھا۔ اگر رات کو کوئی مجاہد آئے تو مسئلہ نہ ہو۔

وہ چاروں خاموشی سے کھانا کھانے لگے۔ کھانے کے بعد وحید جائے بنا کر لے آیا۔ ابو نے جائے کی کیتلی اور پیالیاں لے کر اسے چھت پر پہنچ دیا۔ وہ راکٹل اٹھا کر چھت پر چلا گیا۔

ابو پیالیوں میں چائے اٹھیلنے لگے۔ میں اٹھا اٹھا کر انہیں دیتا گیا۔

کماٹر باسل چائے پیتے ہوئے ابو کو اپنی تازہ کارروائی کے بارے میں بتانے لگے۔ ”نیکل رات ہمیں اطلاع ملی کہ صبح دس بجے سے بھرے ٹرک سرینگر آ رہے ہیں۔ ہم نے جلدی سے پلان ترتیب دیا۔ بعد ازاں مختلف راستوں سے ہوتے ہوئے مقررہ مقام پر پہنچ گئے۔ اس مشن میں تین کماٹرز سمیت اٹھارہ بندے تھے۔ ہم سرینگر روڈ پر گھات لگا کر بیٹھ گئے۔ بڑا سخت مقابلہ ہوا۔ آخر وہ دس ٹرک جاہ کر دیے۔ ان پر موجود بھارتی فوجیوں کو بھی جہنم واصل کر دیا۔“ ذرا توقف کے بعد بولے۔ ”اس خوفی معرکے میں دو مجاہدوں نے شہادت کی سعادت حاصل کی ہے۔ ہم بھٹکل سے وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ انڈین آری کے دو بیٹلی کا پھڑا گئے تھے۔“ ذرا خاموشی ہونے کے بعد بولے۔ ”بھارتی کتوں کو ہماری نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ اسی لیے صبح وہ ارد گرد کی بستیوں میں ظلم و بربریت کا بازار گرم کریں گے۔ ہمارا اگلا دور بہت کاری ہوگا۔ یہ اپنے دھم چاٹتے رہیں گے۔ بلجالتے رہیں گے۔“

بابا جانی شدت جذبات سے مغلوب لہجے میں گویا ہوئے۔ ”باسل تم بہت جی دار ہو۔ اس دھرتی ماں کو تمہارے جیسے بہادروں کی ضرورت ہے۔ مجھے فخر ہے کہ تم میرے دوست ہو۔ اگر میری ٹانگ ساتھ دیتی تو تمہارے کندھے سے کندھا ملا کر ان درندوں پر قبضہ کرنا دل ہوتا۔ ہم دشمنوں کی صفوں کو روندتے ہوئے آگے بڑھتے جاتے۔ تاہم اب جنید تمہارے ساتھ بیٹھوں گا۔“

کمانڈر باسط نے ان کی پشت پر ہتھی دی، وہ بولے۔
”غلام محمد! میں تمہارے جذبات سمجھتا ہوں۔ دل سے قدر کرتا ہوں۔ تم نے ان بھارتیوں کو ماسی میں کافی نقصان پہنچایا ہے۔ اب بھی مجاہدین کی مالی و اخلاقی مدد کرتے ہو۔ یہ بھی جہاد ہے۔“

اس رات ہم فجر کی اذان تک جاگتے رہے پھر وضو کیا اور کمرے میں ہی نماز ادا کی۔

سپیدہ سحر نمودار ہونے لگا۔ کمانڈر باسط اور ان کے تینوں ساتھیوں نے ناشتا کیا اور نکلنے کی تیاری کرنے لگے۔

اچانک وحید بھاگتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ ”باسط! چاچا اودھوئی ٹرک اور دو جیپیں ہماری گلی کے سرے پر آکر رک گئی ہیں۔“

ابھی اس نے انتہائی بتایا تھا کہ میگا فون پر اعلان ہونے لگا۔

”گاؤں والو! اس گاؤں میں کچھ اگر وادی آشرے لیے ہوئے ہیں۔ انہیں ہمارے حوالے کر دو ورنہ جس گھر سے وہ پکڑے گئے۔ اس گھر اور اس میں رہنے والوں کو زندہ جلا دیا جائے گا۔“

وقفے وقفے سے یہ اعلان تین مرتبہ دہرایا گیا۔

یہ خدشہ صورت حال تھی۔ باسط چچا مقابلی کے کھان چکے تھے۔ اس دوران انہوں نے ایک اور انکشاف بھی کیا۔ ان کے علاوہ گاؤں میں باجی مجاہد اور بھی ہیں۔ ان کے ساتھ کمانڈر مطیع اللہ بھی ہیں۔ گویا اس وقت نو مجاہد گاؤں میں تھے۔

بابا جانی واجد انہیں سمجھانے لگے کہ آپ یہاں سے نکل جائیں۔ ہم کتوں کو روکیں گے۔

مگر وہ مسلسل انکار کرتے رہے۔

”کمانڈر! میں سمجھتا ہوں۔ اس وقت ہم مجاہدین کو اور خاص طور پر کشمیر کی دھرتی کو آپ کی ضرورت ہے۔“ واجد نے شدت جذبات سے زندگی ہوئی آواز میں کہا۔

اگر سب یہاں رہتے تو بھی موت..... اگر نکلنے وقت نظر میں آجاتے تب بھی موت..... کمانڈر باسط نے میرا ہاتھ پکڑا۔ پھر اپنے ساتھیوں شاہ زین اور حسن کو اشارہ کیا۔ ہم چاروں گھر کے کچھ دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ جبکہ وحید اور واجد سب مشین گنیں اٹھائے میزگی کی جانب جا رہے تھے۔

ہمارا گھر گاؤں کے آخر میں تھا۔ اس کے عقبی دروازے

سے پانچ منٹ کی مسافت پر ڈھلان تھی۔ جس سے انٹر کرم پہاڑوں میں چھپ سکتے تھے۔

ہم دروازے کے قریب پہنچ گئے۔ اسی اثنا میں ہمارے گھر سے اگلی گلی کے مکان کی چھت سے فائرنگ کی آواز ابھری۔ اس کے ساتھ نعرہ بکبیر ”اللہ اکبر“ کی صدا بلند ہوئی۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ بابا جانی، بھائی اور واجد چھت پر پہنچنے والے تھے۔ اوپر پہنچنے ہی انہوں نے فائرنگ شروع کر دی۔ فضا کیوں کی ترسواٹ سے کوئی رہی تھی۔ یہی وہ باطل کا منہ تھا۔ متعلق جاکھتا۔

”لگا ہے کمانڈر مطیع اللہ اور اس کے ساتھی بھی مقابلے پر آئے ہیں۔“ کمانڈر باسط نے کہا اور ڈھلان کی طرف دوڑنے لگے۔

میں پوری رفتار سے ان کے ساتھ دوڑتا رہا۔ ہم کھلی جگہ پر تھے۔ اگر کسی بھارتی فوجی کی نظر ہم پر پڑ جاتی تو ہماری موت یقینی تھی۔ یہ زندگی اور موت کا کھیل تھا۔ موت کسی وقت بھی ہمیں دیوبھج سکتی تھی۔ ہم اندھا دھند بھاگ رہے تھے۔

اچانک فائرنگ کی آواز تیز ہوئی۔ پھر ساعت منکون دھماکا ہوا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ ہمارا گھر جلتا نظر آیا۔ دھنوں نے راکٹ فائر کیا تھا۔

تب تک ہم پہاڑوں کے قریب پہنچ چکے تھے۔ کمانڈر باسط نے میرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ حسن ذرا آگے تھا اور شاہ زین چند قدم پیچھے۔

ہم چاروں بھاگ رہے تھے۔ کمانڈر باسط کے ہاتھ میں سب مشین گن تھی۔ اس کے لیے بڑے بڑے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اچانک مجھے شوکر گئی اور میں منہ کے بل گر۔ میرا سر ایک ابھری ہوئے پتھر سے ٹکرایا اور میرے ہوش و حواس کھوئے گئے۔ میں بے ہوش ہو گیا۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

دوبارہ میری آنکھ کھلی تو میں نے سر اٹھا کر ارد گرد دیکھا۔ میرے دائیں جانب موم بتی جل رہی تھی۔ فرش پر ایک بڑی چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ ایک طرف مٹی کے تیل کا چولہا رکھا تھا۔ اس کے پاس ہی کچھ برتن اور مٹی کے کنترے تھے۔ غالباً ان میں کھانے پینے کا سامان تھا۔ دوسری طرف کچھ فاصلے پر تین چار بندے بیٹھے سرگوشیوں میں باتیں کرتے نظر آئے۔ میں نے چھت کی طرف دیکھا۔ یہ گنبد نما چھت تھی۔ میرے اندازے کے مطابق یہ کوئی غارتھا۔ یہ مجاہدانہ زندگی کی جھلک تھی جو میں نے پہلی بار دیکھی۔

اب آہستہ آہستہ مجھے سب یاد آنے لگا۔ ابواور بھائی کی یاد آئی تو میرا دل تم سے بھر گیا۔ میں سسک سسک کر رونے لگا۔

میری رونے کی آواز سن کر چاچا باسط میرے پاس آگئے۔

”جنید چپ ہو جاؤ۔“ انہوں نے میرے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ پھر میری پیشانی پر چوم کر کہا۔ ”بیٹا! تمہارے ابواور بھائی اللہ کی راہ میں شہید ہوئے ہیں۔ انہیں اس کا عظیم اجر ملے گا۔ اگر وہ جگہ کرکل گئے ہیں تو بھی وہ غازی بن کر ثواب کے حقدار ہیں۔“

ایک پل خاموش ہوئے پھر بولے۔ ”میں تمہاری دلی کیفیت سمجھ رہا ہوں۔ انہوں سے ہمیشہ کے لیے چھڑنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ پھر بھی صبر کرو۔ تمہارے رونے اور چلانے کی آواز سن کر کوئی بھارتی درندہ ادھر آسکتا ہے۔“

میں خاموش ہو گیا۔ وہ جو بات سمجھانا چاہتے تھے۔ شاید میں سمجھ گیا تھا۔

کچھ روز بعد کھانا تیار کیا جانے لگا۔ انہوں نے میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا، میرے گل تپتے پتے اور غار سے باہر نکل گئے۔

کھانا تیار ہوا تو سب اکٹھے ہو گئے۔ دسترخوان پر بیٹھ گئے۔ مجھے بھوک نہ تھی اس لیے میں نے تھوڑا سا کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد ایک بندے نے قہوہ بنا لیا۔ یہ الپاچی والا قہوہ خوش ذائقہ اور مزے دار تھا۔

میں چٹائی پر لیٹ گیا۔ مجھے ابو کے ساتھ گزرے لمے یاد آنے لگے۔ اچھا وقت مل میں گزر جاتا ہے لیکن برے وقت کا ہر لمحہ صدیوں کے برابر لگتا ہے۔

کمانڈر باسط اپنے ساتھیوں سے دلی دلی آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ پھر وہ میرے پاس آگئے۔

”جنید بیٹے! ہم مجاہدین کا کوئی مستقل ٹھکانا نہیں ہوتا۔ آج یہاں تو کھانا ہوا۔“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ”آج رات ہم ایک اہم مشن پر نکلیں گے۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں ایک جاننے والے کے پاس چھوڑ دوں۔“ میں چپ چاپ ان کی بات سنتا رہا۔ وہ خاموش ہوئے تو میں بولا۔ ”تمہیں چاچا میں آپ کے ساتھ جاؤں گا۔“

وہ مجھے سمجھاتے ہوئے بولے۔ ”بیٹے! ابھی نہیں۔ ابھی تم اس شخص سفر میں ہمارے ساتھ چل نہیں پاؤ گے۔ جب بڑے ہو جاؤ گے تو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔“

میں چپ رہ گیا۔ دس، پندرہ منٹ بعد ہم غار سے باہر نکل آئے۔ کمانڈر باسط اور مجھ سمیت سب کھل دس بندے تھے۔

چاندنی رات تھی۔ ہم سب ایک طرف روانہ ہو گئے۔ کھنٹی جھاڑیوں اور درختوں سے لدی ہوئی پہاڑیوں میں مل کھاتے راستوں پر ہم آگے بڑھتے گئے۔

ہمارا یہ سفر رات بھر جاری رہا۔ کہیں کہیں وہ ٹارچ بھی جلا لیتے۔ میں ان کے ساتھ ہانپتا، لڑکھڑاتا چلتا رہا تھا۔ وہ کئی بار سستانے کے لیے رکے۔ ایک چشمے پر رک کر ہم سب نے فجر کی نماز ادا کی۔

دن کا اجالا پھیلنے سے قبل ہم ایک بار پھر چل پڑے۔ اب راستہ ہموار تھا۔ صبح کا اجالا پھیل چکا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ بیس منٹ بعد ہم ایک چھوٹی سی گلی کے سامنے پہنچ گئے۔ یہاں تین چھوٹی سی گلیاں اور بھی تھیں۔ جو کہ خالی نظر آ رہی تھیں۔ ہم گھاس پھوس، گارے اور لکڑی سے بنے اس چھوٹی سی گلی کے سامنے کھڑے تھے۔

”مفتیو بابا۔“ کمانڈر باسط نے اونچی آواز میں کسی کو پکارا۔

اگلے ہی لمحے ایک بوڑھا آدمی جس کی عمر ستر سال کے قریب ہوگی۔ چھوٹے سے دروازے سے باہر نکلا۔ مفتیو بابا نامی وہ شخص تیزی سے ہماری جانب بڑھا۔ وہ سیدھا کمانڈر باسط کے پاس آ پارا سے گلے سے لگایا۔

”بیٹا! کالی عمر سے بعد آئے ہو۔“ بوڑھا ان کی پیشانی چوم کر بولا۔

”ہاں بابا۔ کچھ کام نٹانے تھے۔ اب ادھر ایک مشن پر آیا ہوں۔“

”اللہ تم سب کو کامیاب کرے گا میرے بیٹو۔“ بوڑھے نے صدق دل سے دعا دی۔ سب نے زیر لب آمین کہا۔ ”آؤ بیٹا! اندر چلے ہیں۔“

سب ان کی رہنمائی میں چلتے ہوئے چھوٹے سے داخل ہوئے۔ چھوٹی سی گلی پر ایک طرف گھاس پھوس کا بستر بنا ہوا تھا۔ اس کے اوپر ایک چادر بچھی ہوئی تھی جس پر ایک ادھیڑ عمر عورت اور لڑکا سو رہا تھا۔ وہ لڑکا میرا ہم عمر تھا۔

”بیٹا! تم یہاں بیٹھو۔ میں تمہارے کھانے پینے کا بندوبست کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر مفتیو بابا بڑے چھوٹے سے چلے گئے۔ جب لوٹے تو ان کے ہاتھ میں پانی کا ٹیک تھا۔ ہم سب چھوٹی سی گلی میں بیٹھے گھاس کے بستر پر بیٹھے

تھے۔
کماحقہ ربا سٹا انہیں میرے بارے میں بتا رہے تھے۔
آخر میں انہوں نے کہا: ”ہاں! میں چاہتا ہوں کہ جنید کو آپ اپنے پاس رکھ لیں۔“
”باسط بیٹے! مجھے خوشی ہوئی ہے کہ تم نے مجھے اس قابل سمجھا۔“
فیضو بابا نے شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اتنے میں وہی میرا ہم لڑکا کھانا لے کر آگیا۔ جمو پڑی میں کھانے کی اشتہا آجیز خوشبو جمیل گئی۔ کھانے میں تلے ہوئے انڈے اور چٹا پٹا تھیں۔ ہم سب نے جی بھر کھا کھا کھایا۔
کھانے کے بعد وہ چائے لے آیا۔ چائے پی کر سب لیٹ گئے۔ فیضو بابا جاتے ہوئے کہنے لگے: ”آپ بے فکر ہو کر سو جائیں۔ اگر کوئی خطرہ ہو تو میں جگا دوں گا۔“
رات بھر سڑکی وجہ سے سب تھکے ہوئے تھے۔ جلد ہی سب سو گئے۔
عصر کے بعد میری آنکھ کھلی تو فیضو بابا اور باسط چچا بائیں کمرے پر تھے۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔
”علی! فیضو بابا نے بلنداؤ میں کسی کو پکارا۔“
”جی بابا۔“ اس لڑکے کی آواز سنائی دی۔ پھر وہ جمو پڑی میں آگیا۔
”اپنے بھائی کو جتنے پر لے جاؤ۔ منہ ہاتھ دھو لے گا۔“
انہوں نے میری طرف اشارہ کیا۔
وہ لڑکا بولا: ”آؤ بھائی۔“
میں اٹھا اور اس کے ساتھ چلا ہوا جمو پڑی سے باہر آگیا۔ ایک طرف پچیس، تیس مرغیاں دانہ دکا چک رہی تھیں۔ ان کے پاس ہی پانچ بچے بکریاں تھیں۔
ہم چشمے کی طرف چل پڑے۔ اس نے راستے میں بتایا کہ اس کا نام علی حیدر ہے۔ بابا اسے پیار سے علی کہہ کر بلاتے ہیں۔ میں چپ چاپ چلا رہا۔ ہم دس منٹ بعد چشمے پر پہنچ گئے۔
میں نے شلوار کے پانچے اوپر کیے اور چشمے میں اتر گیا۔ پانی ٹھنڈا اور شفاف تھا۔ علی کنارے پر موجود ایک پتھر پر پانی میں پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ میں بھی منہ ہاتھ دھو کر اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔
اب سورج قدرے مغرب کی طرف جھک گیا تھا۔ چشمے کے کناروں پر چنار کے درخت کافی تعداد میں تھے۔ ان پر خوش رنگ پرندے چھپا رہے تھے۔

میں وہاں بیٹھے ابھی زیادہ وقت نہیں گزر رہا تھا کہ اچانک ہی تیز ہوا چلنے لگی اور جنوب کی طرف بادلوں کی گھٹا آگئی۔ آن واحد میں بادل پورے آسمان پر چھا گئے۔
”لگتا ہے آج بارش ہوگی۔“ وہ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا اور پھر اس نے مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں کھڑا ہو گیا اور اس کے ساتھ چلا ہوا جمو پڑے میں آگیا۔
اتنی دیر میں آسمان بادلوں سے ڈھک گیا۔
کچھ دیر بعد موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ بارش کی وجہ سے باسط مضطرب ہو گئے ہیں۔ وہ بار بار جمو پڑی کے دروازے کے باہر جا کر آسمان کی طرف دیکھتے، لگ بھگ دو گھنٹے بعد بارش رک گئی۔
شام ہو گئی تھی۔ فیضو بابا کھانا تیار کروانے لگے۔
کھانے کے بعد کماحقہ ربا سٹا اور ان کے ساتھی مجھے بابا فیضو کے پاس چھوڑ کر چلے گئے۔ تاہم جانے سے قبل چچا باسط نے مجھے سینے سے لگا کر پیار کیا اور کہا: ”بیٹا! تم آرام سے یہاں رہو۔ میں تمہیں ملنے آتا رہوں گا۔“
میں غمناک لگا ہوں سے انہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ میرا دل افسردہ ہو گیا تھا۔
☆.....☆.....☆
اس رات میں فیضو بابا کے ساتھ ان کی جمو پڑی میں سو یا۔ ان کی بیوی رابعہ بہت اچھی تھیں۔ بعد ازاں علی کے ہاتھ میں مجھے چلا کر وہ ان کا پوتا ہے۔ میرا اور علی کا درد مشترک تھا۔ اس کے ماں باپ بھی بھارتی فوجیوں کے ہاتھوں شہید ہو گئے تھے اسی لیے دادا اور دادی کے پاس آگیا تھا۔
وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا۔ دن کے اجالے رات کے اندھیروں کو لگتے رہے۔
علی اور میں مرغیوں کا خیال رکھتے یا پھر بکریوں کو چرانے چشمے پر لے جاتے تھے۔ وہاں ہری بھری گھاس اور جھاڑیاں تھیں۔ فیضو بابا قریم گاؤں میں مرغیوں کے انڈے بچ کر گھر کا سودا سلف لے آتے تھے۔ باسط چچا بھی کبھی کبھار آ جاتے۔ ایک بار وہ آئے تو مجھے اور علی کو دو پستول دے گئے۔ ان کے چلانے کا طریقہ بھی سکھا دیا تھا۔ رہی کسی کسر فیضو بابا نے پوری کر دی۔ وہ ہر قسم کا اسلحہ چلا دیتے تھے۔
وقت دسے پاؤں چلا رہا۔ موسم بدلتے رہے۔ دن، رات کا لباس پہنتے رہے۔ رات صبح کے اجالے میں بدلتی رہی۔ مجھے ان کے ساتھ رہتے ہوئے پانچ سال گزر گئے۔ اب میں اور علی بڑے ہو چکے تھے۔ ہم چشمے کے کنارے

بچہ کڑھروں میں بائیں کرتے تھے۔ اپنے ماں باپ کے ماتحت قتل کی باتیں، کشمیری مسلمانوں پر مظالم کی باتیں۔
☆.....☆.....☆
وقت کبھی نہیں رکتا۔ یہ اپنی مخصوص رفتار سے آگے بڑھتا رہتا ہے۔ مجھے فیضو بابا اور ان کی بیوی رابعہ جنہیں میں اماں کہتا تھا، کے ساتھ رہتے ہوئے پانچ سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا تھا۔ وہ مجھے اپنے پوتے سے بھی زیادہ چاہتے تھے۔
سر دیوں کی آمد آمد تھی۔ صبح میں بیدار ہوا تو اماں نے بتایا کہ رات تمہارے بابا کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ انہیں تیز بخار ہے۔ تم دونوں گاؤں چلے جاؤ۔ حکیم سے دوائی لے آؤ اور انڈے بھی دکان پر دے کر سودا سلف لے آنا۔
میں فیضو بابا کے پاس چلا گیا۔ انہیں واقعی بہت تیز بخار تھا۔ میں نے ان سے طبیعت کے بارے پوچھا۔
وہ بولے: ”بیٹا! رات اچانک بخار ہو گیا ہے۔ تم دونوں ناشتا کر لو۔ علی ابھی اٹھ کر چشمے کی طرف گیا ہے۔ تم بھی منہ ہاتھ دھو آؤ۔ پھر گاؤں جا کر حکیم رمضان سے دوائی لے آنا۔“
”چچا بابا جو آپ کا حکم۔“ یہ کہہ کر میں جمو پڑی سے باہر آگیا۔ صبح کا وقت تھا۔ سرد ہوا چل رہی تھی۔ موسم کافی خشک تھا۔ میں چشمے کی طرف چلا گیا۔ علی ابھی وہیں تھا۔
میں نے فطری ضرورت سے فراغت کے بعد منہ ہاتھ دھو یا۔ پھر ہم واپس آ گئے۔
اماں نے رات کے بچے ہوئے جاول اور قبوہ بنا کر دے دیے۔ ہم نے ناشتا کیا۔ بکریوں کو چارہ ڈالا۔ علی نے انڈوں کی نوکری اٹھائی۔ ہم گاؤں کی طرف چل پڑے۔
ہم حفظہ بالقدیم کے طور پر پستول بھی ساتھ لیے آئے تھے جو ہمارے نفعوں میں اڑے ہوئے تھے۔
ہم اونچے نیچے پہاڑوں، دھواں گزار راستوں پر سفر کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔
ہمیں سفر کرتے ہوئے تقریباً دو گھنٹے گزر گئے تھے۔ آخر ہم ایک چمکڑی پر پہنچ گئے۔ آگے بڑی سڑک تھی۔ جسے عبور کر کے گاؤں پہنچا جاسکتا تھا۔ جی علی نے مجھے رکنے کا اشارہ کیا۔ میں رک گیا۔ وہ چمکڑی پر آگے بڑھ گیا۔
مجھے وہاں رکنے چنومنت گزرے تھے کہ ایک نسوانی چیخ سنائی دئی۔ میرا ہاتھ بے اختیار نیچے میں اڑے پستول کی طرف رینگ گیا۔ اگلے ہی پہل پستول میرے ہاتھ میں تھا۔ تاہم اب ہر طرف خاموشی تھی۔ کچھ دیر بعد دہلی دہلی چیخ

ایک بار پھر سنائی دی۔ اب کی بار میں آواز کی سمت کا اندازہ لگانے میں کامیاب ہو گیا۔ میں پہاڑ کی اوٹ سے کرا گئے بڑھنے لگا۔ تاہم اب قدرے محتاط تھا۔ اچانک عقب میں قدموں کی آہٹ سنائی دی۔
میں تیزی سے پلٹا۔ سامنے علی نظر آیا۔ میرے سینے سے اطمینان بھری سانس خارج ہو گئی۔ اس نے ہونٹوں پر اچھی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا پھر تیزی سے بائیں جانب نشیب میں اتر گیا۔
میں نے پیش قدمی جاری رکھی۔ جو بھی پہاڑ کی اوٹ سے نکلا۔ میری آنکھوں نے جب منظر دیکھا۔ ایک بھارتی فوجی مصوم لڑکی سے قسم کھاتا تھا۔ اس رڈیل کی پشت میری جانب تھی۔ وہ لڑکی کے اوپر تھا۔ اس کا ایک ہاتھ اس کے منہ پر تھا۔ جبکہ دوسرے ہاتھ سے وہ اسے لپکاس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اگلے ہی لمحے اس نے اوپر کے لباس کو پھاڑ دیا۔
اب مزید کرنا میرے بس سے باہر تھا۔ میں تیزی سے آگے بڑھا، پھر ٹھٹک کر رکا۔ اس کی وجہ لڑکی کا حلیہ تھا۔ وہ ہندو تھی۔ اس کے ماتھے پر بنی سرخ بنڈیا باندھ ہونے کا ثبوت تھا۔ میرے جسم میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ دماغ میں دھماکے ہونے لگے۔ میں برق رفتاری سے آگے بڑھا، بھارتی فوجی کی پوری توجہ لڑکی کی طرف تھی شاید اسی لیے وہ مجھے نزدیک آتے دیکھ نہ سکا۔ میں نے قریب جاتے ہی پستول کا دستہ پوری قوت سے اس کی کپٹی پر مارا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی کراہ نکلی اور وہ لڑکی کے اوپر ڈھیر ہو گیا۔ ہوس کا پچھاری بے خبری میں مار کا گیا۔ وہ لڑکی پچھلی پچھلی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت و استعجاب تھا۔ پھر اس نے فوجی کو پیرے دھکیلا اور اٹھ کر کھڑی ہوئی پھر نفرت سے اس پر تھوکا۔ وہ مڑی تھی کہ اسے اپنی حالت کا اندازہ ہو گیا۔ اس نے اپنے لباس کے پٹے ہوئے حصے کو پکڑ کر ستر پوشی کر لی۔ پھر اس نے بائیں ہاتھ سے قریب پڑاؤنی پتھر اٹھایا جو اٹھ نہیں پایا تب اس نے کپڑے چھوڑ کر دوسرے ہاتھ کی مدد لی اور اس رڈیل کے سر پر دے مارا۔ پٹاخ کی آواز ابھری اور کوہ پڑی بھٹ گئی۔
وہ ہڈیانی انداز میں چلائی۔ ”کتنے تم نے یہ وردی دلش کی رکھا کے لیے پہنٹی تھی۔ لیکن کوشش کی وردی پہن کر تو مٹلشش بن گیا۔ ہندو باریوں کی عزت لوٹنے لگا۔“
اس نے نفرت سے اس کے مردہ جسم پر پھر تھوکا۔
اپنے عقب میں قدموں کی آہٹ سن کر میں بجلی کی

تیزی سے گھوما..... وہ علی تھا۔

”سڑک کے کنارے کھڑی جیپ سے اتر کر ایک فوجی اصرار رہا ہے۔“ اس نے قریب آ کر بتایا۔

”اے لڑکی..... تم یہاں کھڑی رہو۔ ہم قریب ہی رہیں گے۔ اسے قابو کرنا ضروری ہے۔“

لڑکی نے جلدی سے اثبات میں سر ہلادیا۔

پھر ہم ایک دوسرے کی مخالف سمت میں قریبی جھاڑیوں میں چھپ گئے۔

تھوڑی دیر بعد فوجیوں کی آہٹ سنائی دینے لگی۔

”کیپٹن سر..... آپ کہاں ہیں؟“ اگلے ہی لمحے آنے والے کی آواز سنائی دی۔ پھر وہ ٹھیک گیا۔ اس نے لڑکی کو دیکھ لیا تھا۔ اب وہ میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ اس کے ہاتھوں میں دہی رائفل کا رخ لڑکی کی طرف تھا۔ اگر میں چاہتا تو آرام سے گولی مار دیتا۔ تاہم احتیاط لازمی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان خبیثوں کی تعداد کا صحیح علم نہیں تھا۔ فائر کی آواز سن کر اس کا کوئی سا بھی اصرار آسکتا تھا۔ اگر ان کی تعداد زیادہ ہوتی تو ہمارے لیے یہاں سے زندہ نکلنا مشکل ہو جاتا۔

”کیپٹن صاحب کو کیا ہوا ہے؟“ وہ لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے تیزی سے آگے بڑھا۔

بس یہی وقت تھا جب علی نے چپتے کی طرح اس پر جست لگائی۔ آن واحد میں اس کے آگے اپنی ٹانگ کی اور اس کے سر پر پتول کا دستہ مار دیا۔ وہ منہ کے بل نیچے گرا۔ میں نے جلدی سے اپنی جگہ چھوڑی۔ ایک پل میں اس کے سر پر پتخ گیا۔ ابھی وہ اٹھا بھی نہیں تھا کہ ہم دونوں اس پر ٹوٹ پڑے۔ بھیجی وہ لڑکی آگے بڑھی اور اس کی رائفل اٹھالی۔

اتنی دیر میں ہم دونوں نے اسے مار مار کر مدھموا کر دیا تھا۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا۔ اصل میں جب وہ گرا تھا تو اس کی پیشانی پتھر سے ٹکرائی تھی۔ رہی بھی کسر ہم نے پوری کر دی۔ علی نے اسے بالوں سے پکڑ کر سیدھا کیا۔ اس کا چہرہ لہو لہان ہو چکا تھا۔

”ہم..... مجھے شاکر دو۔“ وہ ہاتھ جوڑ کر روتے ہوئے بولا۔

”خاموش کئے۔ بتاؤ کہ تم دونوں کے علاوہ اور کتنے کتے ہیں؟“

”بس یہ دونوں ہیں۔“ کافی دیر سے خاموش کھڑی وہ لڑکی بولی۔

”اچھا ٹھیک ہے۔ اب یہ گمن گمن مجھے دے دو۔“ علی نے

دینگ کچے میں کہا۔ اس نے چپ چاپ گن اس کی طرف بڑھادی۔ علی نے گن کی نال پکڑی اور پورے زور سے گھما کر برٹ بھارتی فوجی کے سر پر مار دیا۔ اس کے منہ سے ”اورغ“ کی آواز نکلی۔ وہ زمین پر گرے ہی نہیں سکتا ہو گیا۔

کچھ دیر بعد ہم نے دونوں کو گہری کھائی میں چھینک دیا۔ ان کا انجام گدھا اور کوؤں کی ضیافت بن گیا تھا۔

”اب تم جا سکتی ہو۔“ علی نے لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

یہ سن کر وہ رندھے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”میں واپس نہیں جاؤں گی۔ آپ مجھے اپنے ساتھ لے جائیں۔“

یہ کہہ کر وہ پھوٹ کر رونے لگی۔ پھر روتے روتے بولی۔ ”میں خود بھی فوج کے فرائض شیعہ میں ہوں۔ جاؤں گی تو وہ لوگ پوری قیقتش کریں گے۔ میں ان کے تشدد کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ وہ مجھے مار ڈالیں گے۔“

یہ عجیب صورت حال تھی۔ آخر تھوڑی دیر گفتگو اور سوچ بچار کے بعد ہم نے فیصلہ کر لیا۔

علی نے کہا۔ ”جیتد تم واپس گھر جاؤ۔ اسے بھی اپنے ساتھ لے جانا۔ میں گاؤں چلا جاتا ہوں۔“

وہ انڈوں کی فوکری کی جانب بڑھ گیا جو کہ کچھ فاصلے پر رکھی تھی۔

علی چلا گیا تو لڑکی نے بتایا کہ اس کا بیک جیب میں بڑا ہے۔ جس میں کپڑے وغیرہ ہیں۔ میں وہ بیک اٹھا لیا۔ کچھ دیر بعد ہم دونوں واپس چل پڑے۔ بھارتی فوجی کی رائفل اب میرے ہاتھ میں تھی۔ منتول کیپٹن ریشم کا پتول اور گولیاں میں نے بیک میں رکھ لی تھیں جو کہ میرے کندھے سے لٹک رہا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ گھر واپس جا کر لڑکی سے پوچھ گچھ کروں گا۔ لڑکی نے جھاڑیوں کی آڑ میں جا کر لباس تبدیل کر لیا تھا۔

ہم دونوں پہلو پہ پہلو چلتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ میرا ذہن مختلف خیالوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ ان بھارتی رندوں کی ہوس کا شکار صرف مسلمان عورتیں ہی بنتی ہیں مگر آنکھوں دیکھا منظر کچھ اور کہانی بیان کر رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

ہمیں واپس آئے دو گھنٹے ہو گئے تھے۔ فیضو بابا کی طبیعت قدرے سنبھل گئی تھی۔ میں نے انہیں رادھا اور بھارتی رندوں کی اموات کے بارے میں تفصیل سے بتا دیا تھا۔ وہ ہمارے کارنامے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ رادھا اماں

کے پاس بیٹھی تھی۔

”لڑکی تم اپنے بارے میں کچھ بتاؤ۔ تم کون ہو؟ کہاں رہتی ہو؟ کیپٹن ریشم اور اس کے ساتھی سے تمہارے کیا تعلق تھا؟“

فیضو بابا تشکیک آمیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

میں جانتا تھا کہ وہ جب تک مطمئن نہیں ہوں گے۔ انہیں جین نہیں آئے گا۔ ان کی زندگی بھارتی فوجیوں کے درمیان گزری تھی۔ وہ ان کی مکاریوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ وہ ہمیں بتاتے تھے۔ ”ان بھارتی فوجیوں کا سب سے بڑا اھتیار عورتیں ہیں۔ اگر کوئی خاص مقصد حاصل کرنا ہو تو اپنی عورتوں کو اس مشن پر بھیجتے ہیں۔ وہ اپنی مطلوبیت کا قصہ سنا کر اور بھارت سرکار کو برا بھلا کہہ کر لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کرتی ہیں۔ ان کے گھروں میں رہ کر مجاہدین کی خبریاں کرتی ہیں۔ اگر کسی کے ساتھ راتیں بھی گزارنی پڑیں تو اپنی عزت کا خیال نہیں کرتیں۔“

یہ سب باتیں ان کی مجاہدانہ زندگی کا حاصل تھیں۔ اب وہ اس کے ماضی کے بارے میں جاننا چاہتے تھے۔

لڑکی جو چپ چاپ بیٹھی تھی، پھر بولے۔ ”میرے لہجے میں

بولی۔ ”میرے زندگی کی کہانی بس عام سی ہے۔ آپ سن کر کیا کریں گے؟“

”لڑکی تم بھی یہاں کے حالات سے اچھی طرح واقف ہو۔ اگر سب صاف صاف بتا دو تو ہم تمہارے بارے میں سوچیں گے۔“

اچانک رادھا نے عجیب سوال کیا۔ ”کیا میں آپ کو دادا جی کہہ کر مخاطب کر سکتی ہوں؟“

انہوں نے سمجھ لے کر میں کہا۔ ”ہمارے مذہب نے بڑوں کے احترام اور چھوٹوں سے شفقت کا درس دیا ہے۔ تم دادا کہہ سکتی ہو۔ بہر کیف جو پوچھا ہے۔ پہلے وہ بتاؤ۔“

وہ کچھ پل خاموش رہی پھر بولی۔ ”دادا جی اگر آپ میرا ماضی جاننا ہی چاہتے ہیں تو سنئے۔“

پھر وہ اپنے ماضی کے بارے میں بتانے لگی۔ ہم بیٹوں خاموشی سے سنتے رہے۔

اس نے جو کہانی سنائی اس کا مختصر خلاصہ یہ تھا کہ اس کا نام رادھا تھا۔ اس کے ماں باپ دہلی کے مضافات میں رہتے تھے۔ خوشحال گھرانہ تھا۔ وہ ان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد اس کے باپ نے اسے دہلی کے ایک کالج میں داخلہ

دلوادیا۔ وہاں اس نے گریجویشن کیا۔ تعلیم کے دوران ایک لڑکا جو اسی کالج میں پڑھتا تھا۔ جس کا نام وکرم تھا۔ وہ بڑا ہوا عیاش امیر زادہ تھا۔ کالج کی کئی لڑکیوں کو شادی کا جھانسا دے کر ان کی عزت لوٹ چکا تھا۔ وہ رادھا کے پیچھے پڑ گیا۔ اس کی وجہ رادھا کا غیر معمولی حسن تھا۔ اس نے کئی بار اس کا راستہ روکا۔ وہ بدداشت کرتی رہی۔ آخر اس نے کالج انتظامیہ کو تمام صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ مگر انہوں نے کوئی ٹوٹ نہ لیا۔ ایک دن جب وہ لائبریری کی طرف جا رہی تھی۔ وکرم اس کا راستہ روک کر ان کی سیدھی باتیں کرنے لگا۔ رادھا نے اسے کھری کھری سنا دیں۔ وہ دست دراز ی نہ کرتا آیا۔ جب اس نے رادھا کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی تو رادھا نے پھٹکار مار دیا۔ وکرم ہکا بکا گیا۔ اتنی دیر میں کچھ اور لڑکے آگئے۔ وہ چلا گیا۔ اس نے جاتے جاتے کہا اس پھٹکار کا بدلہ مع سوند لیا تو میرا نام بھی وکرم نہیں۔ پانچ ماہ بعد وہ امتحان سے فارغ ہو گئی۔ اس دوران کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آیا۔ وہ اپنے ماں باپ کے پاس آئی۔ اس کا خیال تھا کہ وکرم اب تک وہاں واقعہ بھول گیا ہوگا۔ اس نے اپنے ماں باپ کو بھی نہیں بتایا۔ یہی اس کی سنگین غلطی تھی۔ ایک رات وکرم نے اپنے تین دوستوں کے ساتھ ان کے گھر دھاوا بول دیا۔ اس کا باپ مقابلہ کرتے ہوئے مارا گیا۔ بعد ازاں رادھا کی ماں کو بھی قتل کر دیا۔

تاہم وہ اپنی جان اور عزت بچانے میں کامیاب ہو گئی۔ وہ اسی رات اپنے ماموں سنیل کے پاس دہلی آ گئی۔ اس کے ماموں نے وکرم اور اس کے دوستوں کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔ انہیں جیل ہو گئی۔ کیس ابھی چل ہی رہا تھا کہ وکرم کی جیل میں موت واقع ہو گئی۔ جبکہ اس کے دوستوں کو عدالت نے دس دس سال قید کی سزا سنائی۔ وقت گزرتا رہا۔ رادھا کے ماموں نے اسے آری اسپتال دہلی میں شعبہ نرسنگ میں بھرتی کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد اسے کشمیر بھیج دیا گیا۔ وہ کیپٹن ریشم کے ماتحت تھی۔ اس نے رادھا کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تو وہ انکار نہ کر سکی کیونکہ وہ اسے اچھا لگنے لگا تھا۔ ان کی دو چار ملاقاتیں بھی ہوئی تھیں۔ وہ سرینگر سے واپس چھاؤنی کی طرف جا رہے تھے۔ روانہ ہونے سے قبل کیپٹن کا پرس جیب کے فرش پر گرا اس نے جھک کر اٹھا لیا۔ ایک تصویر پرس سے پھسل کر اس کی گود میں آ گئی۔ اس نے تصویر اٹھالی۔ وہ تصویر وکرم کی تھی۔ اس نے کیپٹن سے تصویر کے متعلق پوچھا۔ وہ قہر سے جواب دے پاپا مہلین نہ ہونے کی وجہ سے وہ بار بار پوچھتی رہی اور کیپٹن نال منول

279

فروری 2018ء

ملہنامہ مسرگزشت

278

فروری 2018ء

279

فروری 2018ء

278

فروری 2018ء

279

فروری 2018ء

278

فروری 2018ء

279

فروری 2018ء

278

فروری 2018ء

279

ہو رہا تھا۔ جتنی دعا مانگتا بارش اتنی ہی تیز ہو رہی تھی۔ میں مجھے سینے سے لگائے دوپار کے ساتھ بیٹھا تھا۔

”جینو... کیا آپ کو سردی نہیں لگ رہی؟“

راوہا نے مستشرقانہ انداز میں پوچھا۔

”علی آتا ہی ہوگا۔ وہ کوئی چادر لے آئے گا۔“

”ایسے موسم میں کسی کا لکنا مشکل ہے۔“

”آپ آرام سے سو جائیں۔ میں جیسے تیسے رات گزار لوں گا۔“

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی، بولی۔ ”مطلب آپ رات ایسے گزاریں گے۔ اس کے لیے میں حیرت درآئی تھی۔“

میں ہنسا، پھر بولا۔ ”تو کیا ہوا۔ یہ رات آخر گزری جائے گی۔“

”اچھا ایک بات بتائیں۔“ وہ بات بدلتے ہوئے بولی۔

”پوچھو۔“

”کشمیر میں بھارتی فوجوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جبکہ ان کے مقابلے میں آنکھ وادی آئے میں نمک کے برابر ہیں۔“ وہ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”آپ لوگ پھر بھی مقابلے بڑے ہوئے ہوئے کیا کر رہیں گے؟“

”کیا وار؟“ میں نے کنفیوہ لہجے میں کہا۔

”موت کا ڈر۔“

”موت کا ڈر۔“ میں نے اس کے الفاظ دہرائے، پھر سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ”ہمیں موت کا کوئی خوف نہیں۔ ہم مسلمان حق کی خاطر جان کی پروا نہیں کرتے۔“

”ہم مظلوم اور دشمنوں سے چور ہیں پھر بھی بھارتیوں کے لیے لوہے کا چنار ہیں جسے نہ چایا جا سکتا ہے اور نہ ٹکلا جا سکتا ہے۔“

راوہا نے اشارت میں سر ہلایا۔

”سنو راوہا۔ کشمیر کی تاریخ پانچ ہزار سال پرانی ہے۔ یہ کوئی نئی قوم نہیں ہے اور نہ کل وجود میں آئی کوئی ریاست ہے۔ کشمیر کی اپنی تاریخ ہے۔ اس کا تباہناک ماضی ہے۔ اس کی اپنی تہذیب ہے۔ اس دھرتی نے ایسے ایسے بہادروں کو جنم دیا ہے جن کی فتوحات کی داستانیں ہزاروں سالوں پر محیط ہیں۔ یہ غلامی تو کل کی بات ہے۔“

”میں کشمیریوں کا درد اب کسی حد تک سمجھ چکی ہوں۔ بھارت سرکار خواجہ مظلوم بننے کی کوشش کرتی ہے۔ حالانکہ وہ خود انہی تہذیب اور بے بس کشمیریوں پر ظلم کے

بتانے لگے کہ آج صبح ہمارے جانے کے بعد ایک مجاہد کماڈر باسط کا پیغام لے کر آیا تھا کہ رات کچھ جاوین آئیں گے۔ جن کے ساتھ کماڈر سیف خان بھی ہوگا۔ ابھی انہوں نے اتنا ہی بتایا تھا کہ کماڈر سیف خان ہمارے پاس آگیا۔ اس کے ساتھ پانچ بچے تھے۔

فیفو بابا آگے بڑھ کر گلے ملے۔ ہم نے بھی ہاتھ ملائے۔ پھر وہ انہیں صبح والے واقعے سے آگاہ کرنے لگے۔ اپنی بات کے اختتام پر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ”جینو تم اور راوہا پہاڑی پر چلے جاؤ۔ علی تمہیں وہاں پہنچا آئے گا۔“

”اچھا بابا... پھر ہم چلتے ہیں۔“ یہ کہہ کر میں وہاں سے روانہ ہو گیا۔ راوہا بھی میرے ساتھ تھی۔ ہمیں وہاں سے نکلے بشکل دس منٹ ہی ہوئے تھے کہ بوند باندی شروع ہو گئی۔ ابھی کچھ سفر باقی تھا۔ میں تیز چلتے لگا۔ راوہا چند قدم پیچھے تھی۔ ہر طرف ٹھور اندھیرا تھا۔ بلند و بالا پہاڑ کالے دیوؤں جیسے لگ رہے تھے۔ بادلوں کے گرجنے کی آوازیں ماحول کی ہولناکی میں اضافہ کر رہی تھیں۔ آسمان پر گاہے بگاہے بجلی چمک رہی تھی۔ جب بجلی چمکتی تو بل بھر کے لیے ہر طرف روشنی پھیل جاتی۔ ہم پہاڑی پر پہنچ گئے۔ میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ دو منٹ بعد ہم غار کے سامنے تھے۔

میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور غار میں داخل ہو گیا۔

غار میں گہرا اندھیرا تھا۔ میں نے ٹارچ جلائی اور ہم آگے بڑھتے گئے۔ ایک کونے میں دھان کی چھال کا بستر بنا ہوا تھا۔ راوہا کو وہاں بیٹھنے کا کہہ کر میں بھی ایک طرف بیٹھ گیا۔

بابر آسمان سے چھاؤں پانی برس رہا تھا۔ جب بجلی چمکتی تو روشنی پل بھر کے لیے غار کے اندر تک آ جاتی تھی۔ میں نے راوہا کی طرف دیکھا۔ وہ نظریں جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ اس کا ہنس پکپکار ہاتھ ٹارچ کی روشنی اس کے آدھے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ میں نے نظریں سے کھل نکالا۔ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”یہ لوادر لیٹ جاؤ۔“

کھل بڑا تھا۔ اس نے آدھا نیچے جھکایا اور دھاؤں ڈھ کر لیٹ گئی۔ ہمیں آئے ہوئے کھٹا ہو چکا تھا۔ علی اور دیگر ساتھی بیٹھے نہیں تھے۔ میں صرف ایک کھل لایا تھا۔ باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اور ٹھنڈ بڑھتی جا رہی تھی۔

میں دل ہی دل میں دعا مانگنے لگا کہ بارش رک جائے مگر کبھی دعا نہیں بے اثر ہو جاتی تھی۔ میرے ساتھ بھی ایسا

نہیں۔ اس صورت میں علی کا ان کے ہاتھ آ جانا جیسا خطرے سے خالی نہ تھا۔

ابھی میں یہی سوچ رہا تھا کہ سامنے گھنٹڑی پر ایک سایہ سا آتا دکھائی دیا۔ وہ علی تھا جو لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا جھونپڑی میں داخل ہو گیا۔

”بے بہت دیر کدی۔ ہم پریشان ہو گئے تھے۔“ فیفو بابا نے شفقت آمیز لہجے میں کہا۔

”بابا مشکل سے جان بچا کر آیا ہوں۔“ اس نے سودا سلف کا تھپا رکھتے ہوئے کہا۔ ”جب میں وہاں آیا تو بھارتی آرمی کے دوڑک اور ایک جج اس جگہ کھڑی تھی جہاں ہم نے راوہا کو دیکھا تھا۔ فوجی وہاں سے گزرنے والوں پر بے انتہا تشدد کر رہے تھے، وقت و وقت سے فائرنگ کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ لگتا ہے ان دونوں نے لاشیں دیکھ لی ہیں۔ میں پہاڑوں میں چھپتا چھپتا پہاڑ پہنچا ہوں۔“

”جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ ہر کف احتیاط ضروری ہے۔ تم دونوں کھانا کھاؤ۔ اس کے بعد راوہا کو ساتھ لے کر پہاڑی والے غار میں چلے جانا۔“

”اچھا بابا ٹھیک ہے۔“ علی نے سامان میں سے دو ادائی نکالتے ہوئے کہا۔

اسی اثنا میں اماں اور راوہا نے کھانا تیار کر لیا۔ ہم کھانا کھانے لگے، کھانے سے فراغت کے بعد علی دوسری جھونپڑی میں چلا گیا۔ جب واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ریش کے ساگی والی رائفل تھی۔ ہائی اسلحہ اس نے کپڑے کے ایک تھیلے میں ڈال کر کندھے سے لٹکایا ہوا تھا۔

”جینو بھائی اب چلنا چاہیے۔“ میں کھڑا ہوا تو راوہا بھی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”اچھا بابا ہم چلتے ہیں۔“

یہ کہہ کر میں جھونپڑی کے دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ دونوں بھی میرے پیچھے چل پڑے۔

ابھی ہم باہر نکلے ہی تھے کہ جتنے کی طرف روشنی نظر آئی۔ یہ ٹارچ کی روشنی تھی۔ علی نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ٹارچ آن، آف کی۔ یہ مخصوص اشارہ تھا۔

اگر کوئی مجاہد رات کو آتا تو اسی طرح کر کے آگے آتا تھا، تاکہ ہم سمجھ جائیں کہ آنے والے اپنے لوگ ہیں۔

دوسری طرف سے لوکل کی آواز ابھری۔

”لگتا ہے کماڈر سیف خان آگیا ہے۔“ عقب میں فیفو بابا کی آواز سنائی دی۔ وہ بھی دروازے پر آگئے تھے۔ وہ

سے کام لیتا رہا۔ پھر جب وہ اس سمنان مقام پر پہنچا تو اس نے کہا۔ ”ڈرائیور سب سن رہا ہے آگے بھرتا ہے وہاں بیٹھ کر باتیں ہوں گی۔“

پھر اس نے ڈرائیور سے جب سڑک سے نیچے اتار کر روک لینے کو کہا اور راوہا کو اس طرف لے آیا۔ وہاں اس نے بتایا کہ کرم اس کا چھوٹا بھائی تھا۔

راوہا یہ سب بتا کر رونے لگی، پھر بولی۔ ”جینو جی بر وقت وہاں آگئے، ورنہ وہ بھی میری عزت کوٹ کر مجھے مار دیتا۔“

اماں نے اسے سینے سے لگالیا۔ یہ حقیقت ہے کہ عورت ہی عورت کا درد سمجھتی ہے۔

ہم کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ پھر اماں کھانے کی تیاری کرنے لگی۔

فیفو بابا نے راوہا سے کہا کہ اگر وہ واپس جانا چاہے تو جہاں کے چھوڑ دیں گے۔ اگر یہاں رہنا ہے تو جب تک دل چاہے رہ سکتی ہے۔

راوہا نے دل ڈگر لہجے میں جواب دیا۔ ”دادا جی مجھے بھگوان کے بعد آپ لوگوں پر دشواش ہے۔ میں اب آپ کے پاس رہوں گی۔“

اسی اثنا میں اماں نے کھانا بنالیا۔ ہم سب نے اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھایا۔ اس کے بعد میں کچھ دیر آرام کرنے کے لیے لیٹ گیا۔ دوبارہ میری آنکھ مغرب کے وقت کھلی تھی۔

میں نے نماز ادا کی اور فیفو بابا کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ آسمان دیڑ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ہر سوائے اچھا گیا تھا۔

”لگتا ہے آج بارش ہوگی۔“ انہوں نے دروازے سے نظر آنے والے آسمان کی طرف دیکھا، پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔ ”علی ابھی تک نہیں آیا۔ اللہ خبر کرے۔“

”بابا وہ بچہ نہیں ہے۔ آپ فکر نہ کیا کریں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”جینو بیٹا بھارتی درندے وادی میں جو آگ اور خون کا کھیل، کھیل رہے ہیں۔ ان کی نظر میں مرد، عورت، جوان، بوڑھے اور بچے برابر ہیں۔“

فیفو بابا کی یہ بات بالکل سچ تھی۔ میرے ذہن میں ٹھکرات کے ناک چمن پھیلنے سے سرسراہٹ لگے۔ میں جانتا تھا۔ اگر ریش اس کے ساتھی کی ڈھنڈ پڑ گئی تو بھارتی بھیڑیے جب تک پہنچ جائیں گے، شاید لاشیں بھی ڈھونڈ

پہاڑ ڈھا رہی ہے۔ وہ زہر خند لہجے میں اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”میں نے کب میں وقت گزارا ہے۔ آری کے افسران انتہائی سیکورٹی کے باوجود مجاہدین سے ڈرتے ہیں۔ حالانکہ وہاں اسلحہ کا ذخیرہ بھی ہے۔“

کیمپ کان کر یاد آیا کہ پچھلے دنوں کمانڈر باسط بھی کسی کیمپ پر حملہ کرنا چاہتے تھے۔

”کس کیمپ میں؟“ میں نے تجسس انداز میں پوچھا۔ وہ کیمپ کے بارے میں بتانے لگی۔ یہ وہی کیمپ تھا۔ جس کا ذکر چاچا باسط نے کیا تھا۔ یہ سرنگر سے ٹھہر کر روڈ پر پہاڑوں کے درمیان واقع تھا۔ رادھا نے شاید میری ذہنی کیفیت کا اندازہ لگایا تھا، بولی۔ ”اس کیمپ میں ایک سو کے لگ بھگ فوجی ہیں۔ جن میں افسر بھی شامل ہیں۔ اس میں اسلحہ کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ یہ اسلحہ پچھلے دنوں آیا ہے۔“

وہ کھسک کر میرے قریب آگئی اور مجھے بھی کبل میں چھپا لیا۔ ہم دونوں گردنوں تک کبل اوڑھ کر دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئے اور اسی موضوع پر گفتگو کرتے رہے۔ اس کے جسم کی خوشبو میرے حواس پر چھا رہی تھی۔ تاہم یہ وقت ایسا نہیں تھا۔ میں بار بار سر جھٹک کر ذہنی رو کو مکینے سے بچاتا رہا۔ مجھے جو معلومات درکار تھیں۔ وہ حاصل کر چکا تھا۔

وقت دھیرے دھیرے سرک رہا تھا۔ ہماری گفتگو جاری تھی۔ کبل کو کہہ کر پانا تھا۔ تاہم گرم تھا۔ جسم کو حدت ملی تو نیند آنے لگی۔ مگر میں سونا نہیں چاہتا تھا۔ باہر بارش ہو رہی تھی۔ ایسے موسم میں ان لوگوں کا کلکان بھی مشکل تھا۔ اچانک میں نے چین ہو گیا۔ اک بے نام ایجنٹ میرے ذہن پر حملہ آور ہوئی۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ رادھا باتیں کرتے کرتے سو گئی۔ میرا ذہن مختلف خیالوں اور دیموں میں الجھا ہوا تھا۔ میں سوچتا رہا۔ الجھتا رہا۔ پھر نہانے کب نیند کی دیوی مجھ پر حملہ آور ہوئی اور میں سو گیا۔

☆.....☆.....☆

بھارتی درندوں کے ہاتھوں میں موجود رائل کلبس شعلے اگل رہی تھیں۔ فائرنگ کی آواز پر میری آنکھ کھلی۔ باہر نکل کر دیکھا تو نیچے وادی میں قیامت آنکھ لگی۔ ہر طرف آگ ہی آگ تھی۔ لاشیں لاشیں تھیں۔ لوگ مر چکے تھے، مر رہے تھے۔ میں نے رادھا کا ہاتھ پکڑا اور ایک طرف دوڑ پڑا۔ ہم دونوں آگے بڑھتے چلے گئے۔ اچانک ہم پر گولیوں کی بارش ہونے لگی۔ گولیاں سنسناتی ہوئی ہمارے دائیں، بائیں اور اوپر

سے گزرتی تھیں۔ دوڑنے کے درمیان رادھا کو کھو کر گئی۔ وہ منہ کے بل گر پڑی۔ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ میں رک گیا اور رادھا کی طرف بڑھا۔ وہ ہاتھوں کے بل اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کا سر پھٹ چکا تھا، پیشانی سے بھل بھل خون بہہ رہا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر سہارا دیا۔ وہ بھٹک لگی۔ پھر عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ اچانک ایک طرف سے گولیوں کی بو چھاڑ آئی۔ رادھا کا ہاتھ پھر میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ نیچے گر پڑی۔ پورا برست اس کے سینے پر لگا تھا۔ ہمارا کسماعت ٹھنک دھماکا ہوا۔

میں ہڈیاں انداز میں چیخا۔ ”نن..... نن..... نن..... نہیں۔“ پھر میری آنکھ کھلی۔ رادھا میرے کندھے پر سر رکھے سو رہی تھی۔ وہ بھی جاگ لگی۔

”کک..... کیا ہوا؟“ اس نے جلدی سے سر اٹھایا تو سیاہ گٹھاؤں میں چاند سا چہرہ چھپ گیا۔ اس نے سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا، بال پیچھے چلے گئے۔

”کچھ نہیں ہوا۔“ میں نے غار کے دہانے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ بیچ ہونے والی تھی۔ بارش بھی رک گئی تھی۔ اسی اثنا میں بلی کا پٹر کی گڑ گڑاہٹ اور پھر زوردار دھماکے کی آواز سنائی دی۔ میں جلدی سے اٹھا اور دہانے کی طرف بڑھا۔ اسی اثنا میں حواس باختہ بلی غار میں داخل ہوا۔ ہم ایک دوسرے سے ٹکرا کر سنبھل گئے۔ اس کے پیچھے کمانڈر سیف خان اور اس کے دو ساتھی بھی اندر آ گئے۔

”جینہ بھائی۔ بابا اور اماں شہید ہو گئے ہیں۔“ اس نے مجھ سے لپٹ کر روتے ہوئے بتایا۔

”علی.....! حوصلہ کرو۔ اس سے پہلے کہوں کا اجالا بھیل جائے ہمیں یہاں سے لٹکا ہوگا۔“ کمانڈر سیف خان ہمارے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر ایک دوسرے سے علیحدہ کرتے ہوئے بولا۔

گیا۔ جمو نیڑی میں موجود ہر چیز جل کر خاکستر ہو گئی۔ وہ چاروں مشکل سے جان بچا کر ہمارے پاس آئے ہیں۔ جب ہم غار سے نکلے تو صبح کا ہلکا ہلکا اجالا بھیل رہا تھا۔ دور پہاڑیوں میں دھواں بلند ہو رہا تھا۔ میرا سینہ غم سے بھر گیا۔ آ..... فیضو بابا چلے گئے۔ اماں بھی ندر ہیں۔ ان کے ساتھ گزرتے شب و روز یاد آتے تو آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ہم جانتے تھے۔ یہاں سے جتنی جلدی نکل جائیں۔ ہمارے حق میں بہتر ہے۔ ہم جیتے چھپاتے آگے بڑھتے گئے۔ کم و بیش دو گھنٹے بعد ہم ایک دوسرے محوہ میں پناہ گزین ہوئے۔ اب ہمیں رات کا انتظار تھا۔ خدا خدا کر کے دن گزرا تو ہم مغرب کے بعد ایک بار پھر عازم سفر ہوئے۔ ہم چلتے چلتے ایک پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ جس پر نیچے جاتی ایک گڈنڈی تھی۔ ہم اس پر چلے گئے۔ گڈنڈی کا ٹیگ تھی۔ ہم نے ڈھلان میں اترنا شروع کر دیا۔ آگے راستہ مزید تنگ ہو گیا۔ تاہم کہیں کہیں ٹھوڑا سا کھلا تھا۔ ڈھلان سے اتر کر کمانڈر سیف خان نے فیملی رکنے کا اشارہ کیا۔ ہم رک گئے۔ کچھ دیر سنانے کے بعد ہمارا نر ایک بار پھر جاری ہو گیا۔

ہماری رفتار پہلے سے سست تھی۔ پہاڑوں کے درمیان سرکتے ہوئے ہم آگے بڑھ رہے تھے۔

ہم پہاڑوں کے ارد گرد چکر لگاتے ہوئے ایک چشمے پر پہنچ گئے۔ سب نے جی بھر کر پانی پیا۔ وہاں کچھ دیر رکنے کے بعد ایک بار پھر چل پڑے۔ آخر آؤچی نیچی ڈھلوانوں سے گزرتے ہوئے خاصی بلندی پر آ گئے۔ اسی وقت دو بندے اچانک جھاڑیوں سے نکلے اور ہم پر رائل کلبس تان لیں۔

”رک جاؤ..... اپنے ہاتھ سر سے اوپر کرو۔“ ان کا لب ولہجہ کشمیری تھا۔

کمانڈر سیف خان مسکرانے لگا، پھر بولا۔ ”جاؤ کمانڈر منٹج اللہ سے کہو۔ سیف خان آیا ہے۔“

انہوں نے رائل کلبس جھک لیں۔ پھر وہ سیف خان سے ملے۔ ہم ان کی رہنمائی میں ڈھلان میں اترنے لگے۔ اترائی کے بعد ہم سب ایک پہاڑ کی طرف بڑھ گئے۔ ٹھوڑی دیر بعد وہ ہمیں ایک جمو نیڑی میں لے گئے۔

جمو نیڑی چٹروں سے تیار کی گئی تھی۔ اس کی چھت پتھر کے ٹکڑوں اور درختوں کی ٹہنیوں سے بنی تھی۔ یہ چٹان کی دو عمودی دیواروں کے درمیان شکاف میں واقع تھی۔ جمو نیڑی میں کوئی بھی نہیں تھا۔

اور دیوار کے ساتھ رکھی گھاس اور جھاڑیاں پٹانے لگے۔ سامنے شکاف تھا۔ وہ اس میں داخل ہو گئے۔ ہم بھی ان کے پیچھے چل پڑے۔ یہ سرگ نما راستہ تھا۔ ایک مجاہد نے ٹارچ جلائی۔ ہم سب آگے پیچھے خوشتر تھے۔ کہیں کہیں ہمیں جھک کر چلنا پڑا۔ تاہم راستہ کشادہ تھا۔ کم و بیش آدھے گھنٹے بعد ہم کھلی جگہ پر پہنچے پھر ہم چٹانوں کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ایک غار میں داخل ہوئے۔ وہاں دس بارہ بندے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک کمانڈر سیف کو دیکھ کر کھڑا ہوا اور والہانہ انداز میں اس کی جانب بڑھا۔ وہ کمانڈر منٹج اللہ تھا۔ کمانڈر منٹج اللہ راز قیامت اور کسرتی بدن کا مالک تھا۔ ہم لوگوں سے بھی سلام دعا کی۔ وہ رادھا کو دیکھ کر چوک گیا تھا۔ ایک طرف مٹی کے تیل والا چلہا جل رہا تھا۔ دو بندے کھانا بنا رہے تھے۔ ٹھوڑی دیر بعد کھانا تیار ہو گیا۔ سب کھانا کھانے لگے۔

کھانا سادہ اور لذیذ تھا۔ میں نے ڈٹ کر کھایا۔ کھانے کے بعد کشمیری قبوے کا دود چلا۔ اس کے بعد ہم آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے۔ رات بھر کے سفر نے مجھے تھکا دیا تھا۔ شاید باقی لوگوں کا بھی یہی حال تھا۔ میں سو گیا۔ مجھے سوئے ہوئے نجانے کتنا وقت گزرا تھا کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔

”سیف خان... اس کے ہاتھ پر بند باندھ کر رکھ کر مجھے پتا چل گیا تھا کہ یہ بندو ہے۔“ کمانڈر منٹج اللہ کی سرگوشی سنائی دی۔ پھر وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”تم جانتے ہو کہ یہ ہمارا خفیہ ٹھکانا ہے۔ اگر یہ لڑکی بھارتی فوجیوں کی خبر لگتی تو ہمارے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔“

میں چپ چاپ لیٹا۔ ان کی گفتگو سننے لگا۔ ”بارہ فیضو بابا نے رات اس کے بارے میں کچھ بتایا ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ دشمن کی جاسوس ہے۔ یہ تو خود حالات کی ستانی ہوئی لڑکی ہے۔“

”اچھا یار کچھ سوچتے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر میں لیٹا رہا پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مٹانے پر بوجھ محسوس کر رہا تھا۔ اس لیے میں کھڑا ہو گیا اور غار کے دہانے کی طرف بڑھ گیا۔

”جینہ کہاں جا رہے ہو؟“ کمانڈر سیف خان کی عقب سے آواز سنائی دی۔

میں نے پیچھے مڑ کر دائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی کا اشارہ کیا اور غار سے باہر نکل آیا۔ سورج مغرب کی افق کی جانب جھک رہا تھا۔ ماحول میں اک بے نام ای اداسی چھائی ہوئی تھی۔ میں

گیا بھر بولا۔ ”آج تم تینوں بڑے اسلحے کا استعمال کیگو گے۔“
پھر وہ ہمیں مشین گن اور دوسرا اسلحہ چلانے کی تربیت دینے لگا۔

وہ یہ سب بغیر فائر کے سکھارہا تھا۔ ہم کافی کچھ جان گئے کہ بڑی مشین گن کیسے لوڈ ہوتی ہے کیسے چلائی جاتی ہے۔ راکٹ کیسے چلایا جاتا ہے۔
پھر ہم کھانا کھانے باقی مجاہدین کے پاس آگئے۔ کھانا کھا کر ایک بار پھر اندرونی حصے میں جمع ہوئے۔ یہاں ایک بات بتانا چلوں کہ غازیہ قدرتی طور پر دو حصے بنے ہوئے تھے۔ ایک حصہ مجاہدین نے اپنے قیام و طعام کے لیے مختص کیا ہوا تھا۔ جبکہ دوسرے میں اسلحہ رکھا گیا تھا۔ یہاں ہی نئے ہندوں کو ٹریننگ دی جاتی تھی۔

ان دونوں نے ہمیں بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ ویسے زندگی، وقت اور حالات انسان کو وہ کچھ سکھادیتے ہیں جو کسی کتاب میں نہ ہوں۔ کسی استاد نے نہ پڑھائے ہوں۔ پھر وہ ہمیں سمجھانے لگے کہ خدا نخواستہ اگر کبھی پھنس جائیں تو کس وقت تک رکتا ہے، کہاں رکتا ہے یا مقابلہ کرتا ہے، کہاں فرار ہوتا ہے؟

☆.....☆.....☆

شام نے اندھیرے کا نقاب اوڑھ لیا تھا۔ رات سب سے اعجاز میں وادی کے ہر فیلفی پہاڑوں پر زینہ زینہ اترنے لگی۔ ہم نے کھانا کھا لیا تو ناصر نے بتایا کہ آج رات پھر ہم نے لہا سفر طے کرنا ہے۔

رات کے نو بج چکے تھے۔ ناصر اور عباس سب سے آگے تھے۔ باقی لوگ ان کے پیچھے چلنے لگے۔ رادھا میرے برابر تھی۔ راستہ دشوار تھا۔ ہمارا سفر رات بھر جاری رہا۔ فجر کی اذان کے وقت ہم ایک کھوہ میں آرام کرنے کے لیے رک گئے، کیونکہ آگے کا علاقہ خطرناک تھا۔ سارا دن وہیں گزارا۔ پھر رات ہوتے ہی سفر دوبارہ شروع ہو گیا۔

ہم دن کو آرام اور رات بھر سفر کرتے تھے۔ آخر دو دن اور تین راتوں کے بعد ہم ٹھوس ٹھکانے پہنچ گئے۔

جب ہم وہاں پہنچے تو قحط کا کذب کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ آسمان پر کچھ بے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ جس کی وجہ سے موسم قدرے خشک ہو گیا تھا۔

ہمارے لیے ناشتے کا انتظام کیا گیا۔ ابھی ہم ناشتا

مانگی۔ وہ منتر ہوتے ہوئے بولی۔ ”یہ اتنی بڑی بات نہیں ہے۔ جس پر معافی مانگی جائے۔ اگر کوئی عورت بھارتی فوجیوں کے ہاتھ لگ جاتی تو اب تک وہ نہ جانے اس کا کیا حشر کر دیتے اور اس کی لاش کسی گہری کھائی میں پھینک دیتے۔“

کافی دیر باتیں ہوتی رہیں۔ اسی رات کیمپ پر حملے کا از سر نو منصوبہ تشکیل دیا گیا۔ رات دس بجے کے لگ بھگ چاچا باسٹ اور ان کے تین ساتھیوں کے ساتھ ہم ان کے ٹھکانے کی طرف روانہ ہوئے جو کہ ضلع پونچھ کے پہاڑوں میں تھا۔ ساری رات سفر میں گزری۔ جب صبح کاذب کے آثار نمودار ہوئے تو ہم ایک چشمے کے قریب پہنچ چکے تھے۔ یہی وقت تھا جب ہمارے کانوں میں ٹرکوں کی آوازیں سنائی دیں۔ ہم فوراً چھاڑیوں میں چھپ گئے۔

یہ بھارتی فوجیوں کا کالوائے تھا جو کہ چار ٹرکوں اور دو جیپوں پر مشتمل تھا۔ ہماری تعداد سات تھی۔ اسلحے میں پانچ سب مشین گنیں اور دو پستول تھے۔ چاچا باسٹ نے مختصر وقت میں اپنے منصوبے سے آگاہ کیا اور پست سے بیگ اتار کر کھول لیا۔ اس میں دس تین تھے۔ انہوں نے ہمیں اس کی تکنیک سکھا دی۔ دو مجاہدوں کو اپنے ساتھ لے کر وہ سرکتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ ہم کھات لگا کر بیٹھ گئے۔ یہی نعرہ ہمیں کی صدا کوئی۔ یہ صدا ہمیشے کے دوسری سمت سے آتی تھی۔ فوجی ان کی طرف متوجہ ہوئے تھے کہ ہم نے بھی حملہ کر دیا۔ گولیاں چلاتے ہوئے میں نے رادھا کی طرف دیکھا۔ اس نے آگے والے ٹرک پر دیتی ہم پھینکا تھا۔ جس سے افراتفری مچ گئی۔ انہیں سمجھنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ چاروں ٹرک آگ کی لپٹ میں آگئے۔ کچھ بھارتی فوجی ہماری چلائی ہوئی گولیوں کا نشانہ بن گئے۔

چشمے کے دوسرے کنارے سے بھی آگ برسن رہی تھی۔ دو طرفہ حملے نے کالوائے کا مٹایا کر دیا تو چاچا باسٹ واپس آگئے۔

اس جنگل میں پہاڑی سلسلوں کے درمیان ایک غار تھا۔ ہم اس میں داخل ہو گئے۔

☆.....☆.....☆

وہ بہت بڑا غار تھا۔ وہاں آٹھ ہندے پہلے سے موجود تھے۔

ہم سب نے اکٹھے بیٹھ کر ناشتا کیا۔ اس کے بعد ایک مجاہد جس کا نام ناصر تھا وہ ہمیں غار کے اندرونی حصے میں لے

فارغ ہی ہوئے تھے کہ چاچا باسٹ بھی آگئے۔ مجھے اور علی کو گلے لگا کر حال چال پوچھا۔

رادھا کے سر پر بھی ہاتھ پھیرا۔ اس کے بعد فیضو بابا کے بارے میں پوچھنے لگے۔ میں نے ان کی شہادت کا بتایا تو ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

”باسٹ چاچا میں آپ سے ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”جی ہاں بھائیو! میں سن رہا ہوں۔“ میں نے انہیں رادھا والے واقعے سے اپنے ساتھ لائے سے لے کر غار میں اپنے اور رادھا کے درمیان ہونے والی خفیہ کیمپ والی باتوں سے آگاہ کیا اور موجودہ صورت حال بتا دی۔ وہ چپ چاپ سنتے رہے۔ پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ”رادھا بیٹی۔ کیا یہ سب حقیقت ہے؟“

”ہاں۔ بھائیو! کی سونکندہ بالکل سچ ہے۔ تاہم سب میں نے جنید کو سرسری طور پر بتایا تھا۔“ ایک لمبی خاموشی کے بعد بولی۔ ”میں آپ کو تفصیل بتاتی ہوں۔“

پھر وہ اس کیمپ کی لوکیشن اور وہاں کی صورت حال بتاتی چلی گئی۔ آخر میں دل فگار لہجے میں بولی۔ ”کمانڈر صاحب! آپ سب جانتے ہیں کہ میں ہندو ہوں اور فوج جس طرح کشمیریوں پر ظلم کر رہی ہے اس کی چشم دید گواہ بھی ہوں۔ بلکہ ان کی حامی بھی کی لیکن جب جنید اور علی بھائی سے ملی تو ان کے احسانوں تلے دو گئی۔ انہوں نے مجھے کشمیر میں سے بچایا تو میرے دل میں مسلمانوں کی قدر بڑھ گئی۔“ وہ سانس لینے کے لیے رکی، پھر بولی۔ ”میں اپنا انجام جانتی ہوں۔ جس دن بھی آری والوں کے ہاتھ چڑھ گئی، بے موت ماری جاؤں گی۔ تو کیوں نہ اپنے محافظوں کے ساتھ رہتے ہوئے ان کے کندھوں سے کندھا ملا کر لڑتے ہوئے مردوں۔ میں جتنی کرنی ہوں کر مجھے بھی آپ آزادی کی اس جنگ میں اپنے ساتھ شامل کر لیں۔“

چاچا باسٹ نے شدت جذبات سے مغلوب لہجے میں کہا۔ ”بیٹی میں آپ کے جذبے کو سلام کرتا ہوں۔ آج سے آپ ہمارے ساتھ رہو گی۔ باقی مطیع اللہ سے میں آج بات کرتا ہوں۔“

ابھی یہ باتیں ہوئی رہی تھیں کہ کمانڈر مطیع اللہ اور سیف خان بھی آگئے۔ وہ آپس میں گلے ملے۔ پھر چاچا باسٹ انہیں موجودہ صورت حال بتانے لگے۔ کمانڈر مطیع اللہ نے رادھا سے اپنے روپے کی معافی

ایک پتھر کی اوٹ میں بیٹھ گیا۔ وہاں سے اٹھا تو۔ سیدھا جمیل پر پہنچا۔

منہ ہاتھ دھونے کے بعد وہیں ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ چاروں اطراف پہاڑ تھے۔ پہاڑ کشمیر کا حسن ہیں اور مجاہدین کی پناہ گاہیں بھی۔

میرا ذہن الجھا ہوا تھا۔ کمانڈر مطیع اللہ کی باتوں نے ذہن میں بھونچال برپا کر دیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ رادھا جاسوس نہیں ہے۔ وہ تو خود بھارتی فوجیوں کی ستانی ہوئی ہے۔ تب میں نے ایک فیصلہ کیا اور واپس غار میں آ گیا۔

علی اور رادھا جاگ رہے تھے۔ میں سیدھا ان کے پاس پہنچا۔ انہیں تمام صورت حال سے آگاہ کیا۔ رادھا کی تجسس آنکھوں میں تشویش کے سائے لہرا کر معدوم ہو گئے۔ تب میں نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”رادھا فکر نہ کرنا۔ میں اس مسئلہ کا کوئی حل نکالتا ہوں۔“

وہ دھمکے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”مجھے کوئی فکر نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ لوگ مجھے مار ڈالیں گے۔“

اس کی بات سن کر میرا دل کٹ کر رہ گیا تھا۔ ہم کافی دیر باتیں کرتے رہے۔ پھر رادھا نے کہا کہ وہ ذرا باہر جانا چاہتی ہے۔

میں علی اور رادھا غار سے باہر جانے لگے تو ایک مجاہد نے ہمیں روک لیا۔ جب میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگا کمانڈر مطیع اللہ کا حکم ہے کہ اس لڑکی کو باہر نہ جانے دیا جائے۔ اس کی بات سن کر مجھے غصہ آ گیا۔ ”کیا میں اس کی وجہ جان سکتا ہوں؟“

”وجہ تو کمانڈر صاحب ہی بتا سکتے ہیں۔“ وہ سب مشین گن کو تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

”کیا رفع حاجت کے لیے غار میں کوئی جگہ بنائی گئی ہے؟“ میں نے استہزاء سے لہجے میں کہا۔

”اچھا پھر میں آپ لوگوں کے ساتھ چلتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ ساتھ چل پڑا۔

ہم باتیں کرتے ہوئے جمیل کی طرف بڑھ گئے۔ راستے میں اس مجاہد نے جس کا نام ظفر علی تھا، ہاتھ لگا۔ ”آج عشائیک کمانڈر باسٹ بھی پہنچ جائیں گے۔“

میں یہ سن کر مطمئن ہو گیا۔ ہم جمیل سے ذرا فاصلے پر بیٹھ گئے جبکہ رادھا آگے بڑھ گئی۔ چندرہ، بیس منٹ بعد وہ منہ ہاتھ دھو کر وٹ آئی اور ہم واپس غار میں آ گئے۔ وقت گزرتا رہا پھر دن کے اچانکے کورات نے نکل لیا۔ ہم رات کا کھانا کھا کر

کر رہی رہے تھے کہ بارش شروع ہوگئی جو کہ ابتدا میں ہلکی ہلکی پھر موسلا دھار بننے لگی۔
ہم نے ناشتا کر لیا تو چاچا باسط نے ہمیں آرام کرنے کے لیے غار کے اندرونی حصے میں بھیج دیا۔
ہم ایسا سوئے کہ شام کو ہی جاگے۔ یہ بلند و بالا پہاڑوں میں چھپا ہوا ٹھکانا تھا جس کے قریب ایک جھیل تھی۔ ہم نے وہیں منہ ہاتھ دھویا۔ بارش رک چکی تھی۔ تاہم مطلع ابراؤد تھا۔ غریب ہونے کے بعد ہم واپس آگئے۔ رات کا کھانا تھا۔ سب نے اکتھے کھانا کھایا۔ رادھا سمیت ہم میں بندے تھے۔ ٹھوڑی دیر بعد کمانڈر باسط نے گفتگو کا آغاز کیا۔

”ضلع کپواڑہ کے علاقے مرحل میں کمانڈر سیف خان نے مجاہدین کے ساتھ مل کر حملہ کیا۔ اس کو بلا کارروائی میں بھارتی فوج کے کئی اہلکار جہنم واصل ہوئے ہیں۔ آخری اطلاع کے مطابق مجاہدین فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ زخمیوں کو پہلی کاپڑ کے ذریعے پادامی بارغ فوجی اسپتال میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ پچھن راشنریہ رانٹلو کی مدد کے لیے پیرا کمانڈوز کو علاقے میں بھیج دیا گیا ہے۔ دوسری طرف کمانڈر متیج اللہ اور ان کے کچھ ساتھیوں نے ضلع کوگام کے علاقے کیموہ میں پولیس کی دو چوکیوں پر حملوں کے بعد جموں سرینگر ہائی وے پر ڈکٹوں کے مقام پر فوجی قافلے پر حملہ کر کے چار ڈک جاہ کر دیے ہیں۔“ ذرا وقت کے بعد وہ بولے۔
”مجاہدین کے ایک جہاز باز دستے نے گزشتہ شب سرینگر سے کبہ کدل چوک پر پل کے قریب بھارتی اہلکاروں پر دھڑکیوں سے حملہ کیا۔ اس کارروائی میں کئی بھارتی فوجیوں کو جہنم رسید کرنے کے بعد وہ بحفاظت اپنے ٹھکانوں پر پہنچ چکے ہیں۔“

یہ سب بتا کر وہ خاموش ہو گئے۔ ہم سب ایک دوسرے کو مبارکباد دینے لگے۔ بلاشبہ یہ مجاہدین کی بڑی کامیابی تھی۔ کسی جانی نقصان کے بغیر انہوں نے دشمنوں پر کاری وار کیا تھا۔

”ساتھیو! عمل کا ردعمل بھی ہوتا ہے۔ بھارتی درندے وادی میں جو آگ اور خون کا کھیل کھیل رہے ہیں۔ ہم اس کا منہ توڑ جواب دے رہے ہیں۔ اب وہ بوکھا بچے ہیں۔“ کمانڈر باسط بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔ ”بھارتی فوج کی چودہ اور ستائیس راشنریہ رانٹلو اور سات پیرا کمانڈوز رجمنٹ اور پیرا ملٹری فورسز نے ضلع پانڈی پورہ کے علاقوں چانٹو، کوڈرا، سریندر، کوٹا پٹھری اور گاٹی

پٹھری میں ایک بڑی کارروائی شروع کی ہے۔“ پھر لمحاتی توقف کے بعد سوسے دیکھ میں کہا۔ ”اب اس کا جواب ناگزیر ہو گیا ہے۔ کچھ دیر میں کمانڈر سیف خان اور کمانڈر متیج اللہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ یہاں پہنچنے والے ہیں۔ ہم آئندہ کا لائحہ عمل ترتیب دیں گے۔ گوکہ ہمارا منصوبہ کافی خطرناک ہے لیکن ہم نے یہ مشن پورا کرنا ہے۔“ پھر رادھا کی طرف مڑ کر بولے۔ ”رادھا جی اس مشن کی کامیابی کا دار و مدار تمہاری معلومات پر ہے۔ اگر کوئی بات ذہن میں ہے تو بتا دو۔“

”سر میرے پاس جو معلومات ہیں۔ آپ سب کو بتادی ہیں۔ وہ فطری حقائق ہیں۔ کچھ دیر خیر اس مشن کے حوالے سے گفتگو ہوتی رہی۔ پھر آئندہ کا لائحہ عمل مرتب کیا گیا۔ اس مشن میں ہمیں ہندوں نے حصہ لیا تھا۔ جنہیں تین پارٹیوں میں تقسیم کیا گیا۔ جن کی قیادت کشمیر وھرنی کے تینوں کمانڈروں چاچا باسط، متیج اللہ اور سیف خان نے کرنی تھی۔ چھ، رادھا اور کونچا چا باسط والی پارٹی میں شامل کیا گیا۔ جس جگہ ہم موجود تھے۔ وہاں سے پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر مذکورہ جگہ تھا۔ جہاں پر آگ اور بارود کا کھیل کھیلنے کے لیے ہم سب پر عزم تھے۔

ہم تیاری کرنے لگے۔ اب بچپس بندے چار گروپوں میں بٹ گئے۔ ایک گروپ کمانڈر سیف خان کا تھا۔ اس کے ساتھ پانچ بندے ریحان، دانیال، شاہد، زرباب اور آصف تھے۔ جبکہ دوسرے گروپ کی کمان کمانڈر متیج اللہ کر رہے تھے۔ تیسرا گروپ ہمارا تھا جو کہ چاچا باسط کی سرپرستی میں تھا۔ چوتھا گروپ قیصر اور اس کے ساتھیوں حافظ، خضر، محمد رافع اور اطہر پر مشتمل تھا۔ اس کارروائی میں شامل ہونے والے ہر گروپ کے ذمے مختلف کام لگا دیے گئے اور اشارے مقرر کر دیے گئے۔ چاروں کمانڈرز نے سب کو تاکید کی کہ کوشش کریں کہ کپ والا اسلحہ اپنے ساتھ لائیں۔

تینوں گروپ چلے گئے۔ اب ہماری باری تھی۔ ہم سات بندے تھے۔ ہم سب کو مختلف راستوں سے ہوتے ہوئے ایک مخصوص مقام پر اکٹھا ہونا تھا۔

ہم بھی چل پڑے۔ پندرہ کلومیٹر کا فاصلہ چار گھنٹے کی مسافت کے بعد طے ہوا۔ چاروں گروپ اکتھے ہو گئے۔ ہر گروپ کے کمانڈر نے اپنے ساتھیوں کو مشن کے بعد کہاں جانا ہے بتا دیا۔ پھر سب ہدف کی طرف بڑھنے لگے۔ ٹھنڈی غار رات اور دور دور تک پھیلا سناٹا اور

خاموشی۔ سرد ہوا چل رہی تھی۔ ہر طرح کے ہتھیاروں سے لیس ہم چھ بندے پچاس باسط کے ہمراہ کپ کے عقب میں موجود تھے۔ جزیر چل رہا تھا۔ عقب میں دو بلب روشن تھے۔ کمانڈر سیف کو کپ کے دائیں جانب اور کمانڈر متیج نے بائیں جانب سے حملہ کرنا تھا۔ پھر کمانڈر قیصر اور اس کے ساتھیوں کو سامنے سے ہلا بولنا تھا۔ اسی اثنا میں پچاس باسط نے چند قدم اور آگے بڑھائے۔ ہمیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے سب مشین گن کو بائیں سے دائیں ہاتھ میں منتقل کیا اور پیچھے چل پڑا۔ میری عقابی نگاہیں ٹارگٹ پر مرکوز تھیں۔ رادھا کی معلومات کے مطابق فوجی سرشام ہی پیرکوں میں بسزوں پر پہنچ جاتے ہیں۔ اس لیے رات کا وقت ایکشن کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ کارروائی کا وقت دس سے گیارہ کے درمیان رکھا گیا۔ ہم کپ کی خاردار باڑ کے بالکل قریب پہنچ گئے اور کرائگ کرتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ رادھا سب سے آگے تھی۔ ہم حفاظت پر مامور دو دستوں تک پہنچے اور ان پر خاموشی سے چاقو کا استعمال کر کے... پیرکوں میں گھس گئے۔

باقی پارٹیوں کو دیا گیا وقت پورا ہو چکا تھا کہ فائرنگ کی تڑتڑاہٹ گونجی۔ مجاہدوں نے بیرونی لائنس کو نشانہ بنایا تھا۔ پیرکوں میں کھلی کھلی لڑائی ہو رہی تھی۔ وہ تہلکہ خیز لڑائی تھی۔

جو کہ حملہ چاروں طرف سے بہ یک وقت ہوا تھا اس لیے بھارتی فوجی بوکھا گئے۔ ہم نے بوکھا ہٹ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان پر بے دریغ فائرنگ شروع کر دی۔ میں، رادھا اور باہر عباس نا ہی مجاہد کپ کرے کے ساتھ کھڑے تھے۔ کمرے کا دروازہ کھلا تو پانچ بھارتی فوجی باہر نکلے۔

میں نے ٹھیکر دیا۔ تڑتڑاہٹ کی آواز ابھری اور گولیوں نے دونوں جیوں کی پیشانی میں سوراخ کر دیے۔ رادھا اور باہر کی طرف سے چلائی گئی گولیاں باقی تینوں کے سینوں میں اتر گئیں۔ وہ زمین پر گر کر مر رہے تھے۔ ہم نے ان کی گھٹیں اٹھا کر کندھوں کے ساتھ لٹکائیں۔ میرے دوسرے ساتھی جگہ جگہ بیٹناٹ لگا رہے تھے کہ لارمنا بن اٹھا۔

کام مکمل ہو چکا تھا اس لیے ہم باہر کی طرف بھاگنے لگے۔ رادھا بھی فائرنگ کرتی ہوئی باہر کی طرف لپکی۔ اچانک تین بھارتی فوجی سامنے آ گئے۔ دو ہماری گولیوں کا نشانہ بن گئے جبکہ تیسرا بھاگنے لگا لیکن موت سے بھاگنا بہت مشکل ہے۔ رادھا کے ہاتھ میں دلی سب مشین گن گرجی اور وہ بھی گر پڑا۔ ہم اس کے ترپے وجود کے قریب سے گزرتے ہوئے

پہاڑی کے پاس پہنچ گئے۔ ہم نے ایک مناسب جگہ دیکھ کر پوزیشن سنبھال لی۔ اس دوران دو پہلی کا پڑا دھرا نکلے۔ دونوں پہلی کا پڑتین سروں پر منڈلا رہے تھے۔ یہ زندگی اور موت کا کھیل تھا۔ موت کسی کبھی آ سکتی ہے۔ یہ دوست یا دشمن نہیں دیکھتی۔ ایک پہلی کا پڑ چکر ہٹ کر پلٹ آیا۔ پھر آٹھ آٹھن پر سنا ہوا آگے بڑھ گیا۔ میں جانتا تھا کہ جلد یا بدیر وہاں آجائے گا۔ ایک بات جو میں نے محسوس کی کہ پہلی کا پڑے کپ کے آس پاس فائرنگ نہیں کی جاتی۔ اس کی وجہ کپ میں موجود اسلحے کا ڈب پڑنا تھا۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ دوسرا پہلی کا پڑ ایک طرف سے آتا دکھائی دیا۔ میرے دل میں خواہش ابھری کہ آتش راکٹ لاچر ہوتا۔ پہلے والا پہلی کا پڑ بھی لوٹ آیا۔ یہ بہت کشنی خیز لڑائی تھی۔ ہمارے ساتھی بھی دھڑکے دھڑکے سے فائرنگ کر رہے تھے۔ کپ کے اندر سے بھی فائرنگ ہونے لگی۔ مجھے یہاں سے نکلنا مشکل ہی نہیں ناممکن لگنے لگا تھا۔

اسی وقت ایک طرف سے راکٹ فائر کیا گیا۔ یہ راکٹ پہاڑی پر سے فائر کیا گیا تھا جو کہ یقیناً ہمارے کسی ساتھی نے کیا تھا۔ راکٹ سیدھا بھارتی کپ پر گرا۔ اس کے بعد تین اطراف سے راکٹ فائر کیے گئے۔ ایک پہلی کا پڑ تباہ ہو کر پہاڑوں میں جا گرا۔ دوسرا کپ سے دور چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ہر کیڑے کے بعد دھاکے ہونے لگے۔ بھارتی کپ میں اسلحے کا گودام دھاکوں سے تباہ ہو رہا تھا۔ فضا میں نعرہ تکبیر کی صدا بلند ہوئی۔

ہم نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ حتی الامکان تیزی سے بھاگتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے جا ملے۔ اب بازی پلیٹ گئی۔ ہم ان پر غالب آ گئے۔ گوکہ سردی ہماری ہڈیوں کو ٹھنڈ کر رہی تھی لیکن ہمارا جذبہ ہمیں حرارت پہنچا رہا تھا۔ اس بھارتی پوسٹ پر سو سے زائد بھارتی فوجی تھے۔ جن میں بہت کم باہر نکل پائے تھے۔ زیادہ تر اندر ہی مل مرے لیکن ہمارا مشن ادا ہو رہا تھا۔ اگر وہ اسلحہ ہمارے ہاتھ لگ جاتا تو ہمارا کافی فائدہ ہوتا۔ اس مشن میں چار ساتھیوں نے جام شہادت نوش کیا۔ یہ کارروائی مکمل کر کے تمام ساتھی رات تین بجے تک اپنے اپنے طے شدہ ٹھکانوں پر پہنچ گئے۔

☆.....☆.....☆
محبت کا کوئی مذہب نہیں ہوتا ہے۔ یہ تو بس دلوں میں چپکے سے بھیرا کر رہتی ہے۔ دو مختلف مذاہب ہونے کے باوجود یہ جانتے ہوئے بھی رادھا ہندو ہے اور میں

مسلمان..... مجھے اس سے محبت ہوگئی تھی۔ تاہم میں نے اظہار نہیں کیا تھا۔ ہاں اس کی باتوں سے چل چلا تھا کہ وہ بھی مجھے چاہتے تھے۔

اس کا جاندار سا پُر نور چہرہ، تجسس آنکھیں، یا تو قی لب بہ زبان خاموشی بہت کچھ کہنے لگے تھے۔

عاشق ان کہی باتوں کو سمجھتے ہیں، جان لیتے ہیں۔ میں بھی جان گیا۔

اس دن موسم بھی بہت خوشگوار تھا۔ آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ وقفے وقفے سے سارا دن بارش ہوئی رہی۔ میں نے ڈائری میں گزرے واقعات لکھے پھر وضو کیا۔ جب دوبارہ مکرے کے دروازے میں داخل ہوا تو نظر رادھا پر پڑی۔

خوابیدہ حسن اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ سامنے بکھرا ہوا تھا۔ میرا دل بے طرح دھڑکنے لگا۔ میں نے نظریں جھکا لیں پھر دوبار پرنگی جائے نماز اتاری اور ایک کونے میں بچھا کر رب کے حضور رکھوا ہوا کیا۔

نماز ادا کر کے دعا کے لیے ہاتھ پھیلا دیے۔

میں نہیں جانتا تھا کہ اسی اثنا میں رادھا جاگ گئی ہے۔ میں نے دعا مانگی اور جائے نماز دیوار پر ٹانگ کر واپس پلٹا تو دیکھا۔ وہ چار پائی پر پلٹی میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔

میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا، اس کے قریب دوسری چار پائی پر آ کر بیٹھا تو وہ بھی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے کن آنکھوں سے میری طرف دیکھا، پھر آہستگی سے بولی۔ ”جینہ میں اسلام قبول کرنا چاہتی ہوں۔“

میرا دل خوشی سے بے قابو ہو گیا۔ میں شدید خواہش کے باوجود یہ بات نہیں کہہ پایا۔ جو آج اس نے خود کہہ دی تھی۔

”رادھا۔“ میں یہ مشکل اتنا ہی کہہ پایا۔ وہ بولی۔

”جینہ! میں کچھ دنوں سے سوچ رہی ہوں کہ مسلمان ہو جاؤں۔“ لگاتی تو وقت کے بعد بات آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”تم کہتے ہو کہ اس جنگ میں لڑتے ہوئے اگر ہم لوگ مرجائیں تو شہید کہلا سکیں گے۔ تم ہی بتاتے ہو کہ قرآن پاک میں اللہ فرماتا ہے کہ شہید ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔“ ایک پل خاموش ہوئی، پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں تم لوگوں کے ساتھ اس کا زمیں اپنی خوشی سے شامل ہوئی ہوں۔ موت کسی وقت بھی آ سکتی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اس سعادت سے محروم رہ جاؤں۔ میں آج ہی کلمہ پڑھنا چاہتی ہوں۔“

جوئی اس کے بات سن کر۔ میں اٹھ کر اس کی چار پائی پر جا بیٹھا۔ ”تم نے آج میرے دل کی بات اپنی زبان سے ادا کر کے دل خوش کر دیا ہے۔ میرے دل میں سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ تم اسلام قبول کر لو۔ وہ پوری ہوگئی۔“ وہ پھر پھر نظروں سے میری طرف دیکھ کر بولی۔ ”جینہ! میرا جینا مرنا تب ہمارے ساتھ ہے۔“

اسی اثنا میں بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک مخصوص آواز سنائی دی۔ میں چونکا ہوا گیا۔ وہ آواز کسی عباد کی تھی۔ میں نے پتہ تو لگایا اور دروازے کی سمت چل پڑا۔ پھر اذہن پوری طرح بیدار تھا۔ دروازے کے باہر کھڑے عباد کے آنے کے دو مقصد ہو سکتے تھے۔ وہ کوئی پیغام لایا یا پھر کسی خطرے سے آگاہ کرنا چاہتا ہے۔ میں دروازے کے پاس جا کر رک گیا پھر ایک مخصوص آواز نکلی۔

”دروازہ کھولیں۔“ باہر والے نے سرگوشی کی۔

میں نے دروازہ کھول دیا۔ وہ اعلیٰ اور پھر رانچ تھے۔ میں دروازہ بند کر کے انہیں ساتھ لے کر کمرے میں آ گیا۔ ان دونوں نے رادھا کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

وہ چائے بنانے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد علی بولا۔ ”جینہ بھائی! ہم کمانڈر باسل کا پیغام لے کر آئے ہیں۔“

”ہاں ہوں۔“

”دونوں بعد ایک مشن پر نکلنا ہے۔ جس میں آپ اور رادھا دونوں کو شامل کیا گیا ہے۔ آج رات ہم چاروں نے کمانڈر باسل کے پاس پہنچنا ہے۔“

”ہم تیار ہیں۔“

رادھا چائے لے کر آ گئی تھی۔ ہم چائے پینے لگے۔ اس دوران باتیں بھی کرتے رہے۔ میں نے انہیں بتا دیا کہ رادھا اسلام قبول کرنا چاہتی ہے۔ سب خوش ہو گئے۔ ممتاز اٹھ کر باہر چلا گیا۔ کچھ بعد ایک مولوی صاحب کو ساتھ لے آیا۔ مولوی صاحب کا نام عبداللہ تھا۔ انہوں نے رادھا کو کلمہ پڑھا دیا۔ وہ بزاروں پر درویش نظر تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

پھر میں نے اپنی خواہش کا اظہار کر دیا۔ مولوی صاحب نے رادھا کا اسلامی نام خدیجہ رکھ دیا تھا۔ وہ اسے مخاطب کرتے ہوئے بولے۔ ”خدیجہ بیٹی! کیا تم راضی ہو؟“

وہ کچھ نہ بولی۔ بس اثبات میں سر ہلا دیا۔ مولوی صاحب نے ان چاروں کی موجودگی میں ہمارا نکاح پڑھا دیا۔

پھر وہ چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد ممتاز محمود اپنی جگہ سے اٹھا۔ کمرے میں موجود ایک الماری سے سب مشین کن نکال کر لے آیا۔

وہ خدیجہ کے سر پر ہاتھ پھیر کر رقت آمیز لہجے میں بولا۔ ”جب بھائی! اپنی بہنوں کو گھر سے رخصت کرتے ہیں تو جھجھک دیتے ہیں۔ تم بھی میری بہن ہو۔ لیکن بھائی کے پاس دعاؤں کے سوا کچھ بھی نہیں۔“ لگاتی تو وقت کے بعد بات آگے بڑھائی۔ ”یہ یومری بہن، تمہیں خالی ہاتھ رخصت نہیں کر سکتا۔ یہ کہہ کر اس نے ہاتھ میں پکڑی سب مشین کن اس کی طرف بڑھا دی۔

خدیجہ نے سب مشین کن پکڑ کر اسے چوم لیا، بولی۔ ”بھائی! آپ کا یہ تحفہ مجھے جان سے پیارا ہے۔ میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ اس تحفے کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھوں گی۔ آخری سانس اور آخری کوئی کلمہ بھارتی غائب درعدوں پر یہ کن آگ پر سنا رہی ہے۔“

وہ بہت جذباتی لگے تھے۔ سب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مغرب کی اذان ہو چکی تھی۔

خدیجہ اور ممتاز کی بیوی کھانا بنانے چلی گئیں۔ ہم نے رات کا کھانا کھایا۔ اس کے بعد جانے کی تیاری کرنے لگے۔ اس دوران میں عباد اور بھی آ گئے۔ ہم ساتوں رات کی تاریکی میں سرنگر سے باہر نکل آئے۔ ساری رات سفر کرتے رہے۔ صبح کے پانچ بجے ہم راجاوری سے سرنگر والے روڈ پر پہنچ گئے۔

☆.....☆.....☆

میں وہاں پہنچے دو گھنٹے ہو گئے۔ کمانڈر باسل کو جب میں نے رادھا کے اسلام قبول کرنے اور اپنے نکاح کے بارے بتایا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ ہم باتیں کرتے رہے۔ انہوں نے اگلے مشن کا بتا دیا۔ اگلے مشن سرنگر سے آنے والے کانوائے پر حملہ کرنا تھا۔ جس میں اعلیٰ اور رانچ لایا جانے والا تھا۔ وہ تفصیل بتانے کے بعد گویا ہوئے۔ ”ہم نے یہ مشن ہر حال میں پورا کرنا ہے۔ بھارتی تو جیوں تک اعلیٰ اور رانچ کی صورت میں بھی نہیں پہنچنے دینا۔“

”جا چا! ان شاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔“ خدیجہ جھپٹ سے بولی۔ اس کے لہجے میں بلا کا عزم تھا۔

خدیجہ نے اپنا کھانچ کر دکھایا تھا۔ وہ کانوائے کا رکھ کا ڈھیر بن گیا تھا اور اس مشن میں سب سے آگے رہی تھی۔ دن گزرتے چلے گئے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے نکاح

کو چار ماہ ہو گئے تھے کہ ایک صبح خدیجہ نے وہ خوشخبری سنائی، جسے سن کر میں خوشی سے اچھل پڑا۔ وہ ماں بننے والی تھی۔

میرے منہ سے بے ساختہ دعا نکلی۔ ”اے مالک ارض و سائبیلاں! بھی تیری رحمت ہیں، لیکن ہمیں بیٹا عطا کرنا تاکہ اس دھرتی پر ایک مجاہد کا اضافہ ہو جائے۔“

”آمین۔“ خدیجہ نے کہا۔ ”میری بھی خواہش ہے بیٹا ہی ہو۔“

☆.....☆.....☆

وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا۔ اگر کسی مشن پر جانا ہوتا تو میں خدیجہ کو چھوڑ جاتا۔ وہ اکثر ناراض ہو جاتی لیکن میں واپس آ کر مانتا لیکن۔

وہ اپریل کا مہینا تھا۔ میں اور خدیجہ گھر میں ہی تھے۔ ایک مجاہد کمانڈر باسل کا پیغام لے کر آ گیا۔

”ہمیں اسی رات ان کے ٹھکانے پر پہنچنا تھا۔ میں نے خدیجہ کو گھر چھوڑا اور اس عباد کے ساتھ رات کو روانہ ہو گیا۔ ہم دشوار گزار راستوں سے ہوتے ہوئے رات کے تین بجے ٹھکانے پہنچ گئے۔ میں پہلی بار اس جگہ پر آ تھا۔

وہ ایک بہت بڑا غار تھا۔ اس غار میں کم و بیش پچاس عباد موجود تھے۔

کمانڈر باسل خدیجہ کا حال چال پوچھنے لگے۔ میں نے انہیں تمام صورت حال سے آگاہ کیا اور کہا۔

”چاچا! میں چاہتا ہوں کہ خدیجہ کو آواز دیکھ کر چھوڑ دوں۔ کیونکہ یہاں کے حالات کا کچھ پتہ نہیں۔ باقی کارگل کے محاذ کے بعد اسے واپس لے آؤں گا۔“

انہوں نے بخوشی اجازت دے دی۔ اٹھ مقام میں اپنے ایک رشتے دار کا ایڈریس بھی دے دیا۔

☆.....☆.....☆

شام کے سائے گہرے ہو چکے تھے۔ دن بھر کا تھکا ہارا سورج دور مغرب کی افق میں ڈوب گیا تھا۔ ہمیں اب رات کا انتظار تھا۔ ہم پانچوں کھنڈر میں چھپے ہوئے تھے۔ میرے ساتھ علی، شفقت محمود، خدیجہ اور جیا زبیری تھے۔ علی اور شفقت عصر کے وقت جیا کو لے آئے۔ ہم نے کھانا کھایا اور چل پڑے۔ دشوار گزار راستوں سے ہوتے ہوئے اس کھنڈر میں آ کر چھپ گئے۔ ہم سب مسلح تھے۔ وہ دونوں مضبوط جسامت کے مالک اور جو ٹیلے جو جان تھے۔ ان میں ہر قسم کی خطرناک صورت حال سے نمٹنے کی خدا داد

روک سکتی کیوں کہ ہمیں کشمیر آزاد کرانا ہے۔ بس مجھے علی اور شفقت کا انتظار ہے۔ وہ آگئے تو ہم آج رات واپس چلے جائیں گے۔ اپنے ساتھیوں کے کندھے سے کندھا ملا کر لڑیں گے۔ میری ڈائری کا آخری صفحہ بچ گیا ہے۔ سوچ رہا ہوں اب اس پر کیا لکھوں؟

☆.....☆.....☆

میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ باہر بارش تیز ہو گئی۔ دور مشرقی افق پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ مشرقی افق جہاں مقبوضہ کشمیر ہے۔ جہاں سرینگر ہے۔ جہاں جنید اور میری محبت پروان چڑھی۔ جہاں ہم چاہتوں کے بندھن میں بندھے تھے۔ جہاں ہم نے پہاڑوں میں محبت بھرے لمحات گزارے۔ جہاں میں رادھا سے خدیجہ بنی، اسلام قبول کیا۔ جہاں بھارتی درندوں سے ہم برس پیکار رہے۔ شاید وہاں کی مٹی میں میرے جنید کا خون جذب ہوا ہو۔ کیونکہ کارگل کے محاذ کے بعد جنید کی کچھ خبر نہ مل سکی۔ پھر کارگل پر قبضے کی خوشخبری نے اہل کشمیر کے حوصلے بلند کر دیے لیکن وہ جنگ عین اس وقت جب مجاہدین کامیاب ہو چکے تھے۔ جنگ بندی کا حکم جاری کر دیا گیا۔ پاک فوج اور مجاہدین نے ٹائیگر ہل پر قبضہ کر لیا تھا۔ یہ واحد زمینی راستہ تھا جو بھارت کو کشمیر سے ملاتا ہے۔ سری نگر روڈ ٹائیگر ہل کی اس چوکی کے نیچے ہے۔ اگر اوپر سے صرف دوڑتی پتھر لڑھکائے جاتے تو نیچے سے گزرنے والی گاڑیاں تباہ ہو سکتی تھیں۔ کارگل کا محاذ سیاسی قوتوں کی وجہ سے کامیابی سے ناکامی میں بدل گیا۔ اہل کشمیر کو سن چاہی کامرانی نہ مل سکی۔ وہ مجھے اٹھ مقام چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ وہ جب تک جاتے ہوئے دکھائی دیتا رہا۔ میں کھڑی دیکھتی رہی۔ اس کے جانے کے چار ماہ بعد علی حیدر پیدا ہوا جواب جواں سال کا ہو چکا ہے۔ میرا ہر لمحہ عذاب انتظار میں گزرتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جنید کسی نہ کسی لوٹ آئے گا۔ کسی صبح کے اجالے میں، کسی سنہری دوپہر میں، کسی ڈھلتی سہ پہر میں یا پھر کسی شام کے منگے اندھیرے میں، جب تک سانس ہے تب تک آس ہے۔ ہم دس پندرہ دن بعد کیرن گاؤں چلے جاتے ہیں۔ وہاں دریائے نیلم کے کنارے ایسا تودہ کسی پتھر پر میں اور علی حیدر بیٹھ جاتے ہیں۔ ہم دونوں ماں بیٹا کنٹرول لائن کے پار دیکھتے ہیں، شاید جنید کی جھلک نظر آجائے۔

صلاحیت تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہر طرف گھور اندھیرا چھا گیا۔ میں نے اپنی گن پر گرفت مضبوط کی اور مخصوص اشارہ کیا۔ اگلے ہی لمحے ہم کھنڈر سے باہر نکل کر کھلے آسمان کے نیچے کھڑے اطراف کا جائزہ لے رہے تھے۔ تاریک شب اپنا سفر طے کر رہی تھی۔

”انڈین آرمی کا کیمپ یہاں سے بمشکل ایک کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔“ علی کی سرگوشی ابھری۔

میں نے تنہی انداز میں سر ہلایا۔ اس سے قبل میں کچھ بولنا۔ عقب سے دو تین اور تلتے فائر ہوئے۔ جن کی گونج رات کے سناٹے کو چیرتی چلی گئی۔

میں نے خدیجہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ہم آگے بڑھنے لگے۔ چونکہ بارڈر ایسا تھا۔ یہاں فائرنگ معمول کی بات تھی۔

ہماری منزل کیرن گاؤں تھی۔ یہ گاؤں دریائے نیلم کے کنارے واقع تھا۔ جو کہ دریا پار آکر کشمیر کے علاقے میں تھا۔ مقبوضہ کشمیر میں دریا کے اس کنارے والا گاؤں کسی کیرن کہلاتا ہے۔

ہم آگے بڑھتے چلے گئے۔ جنگل شروع ہو گیا۔ راستہ بہت پر خطر تھا۔ جنگلی درندوں اور بھارتی فوجیوں سے بچتے بچاتے ہم نے کنٹرول لائن عبور کر لی۔ ہم نو سیری سے منجکوت پہنچ گئے۔ کچھ دیر ایک گھر میں آرام کیا۔ پھر گاڑی سے ... اٹھ مقام آ گئے۔

ہم گھر آ گئے۔ ان سے ملے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ ان کی عمر پچاس کے قریب ہے جو کہ درست ثابت ہوا۔ وہ حال چال پوچھنے لگے۔ نواز نے مجھے آرام کرنے کے لیے کمرے میں بھیج دیا۔ کچھ دیر بعد خدیجہ بھی آ گئی۔

میں نے شولڈر بیگ سے ڈائری نکالی۔ اس پر اب تک کے تمام واقعات لکھنے لگا۔ یہ ڈائری مجھے جان سے بھی پیاری رہی ہے۔ مشن کے دوران اسے محفوظ جگہ رکھتا رہا ہوں۔ اس میں میری زندگی کی تلخ و شیریں یادیں ہیں۔ خدیجہ کی باتیں ہیں۔ میں اس ڈائری کو خدیجہ کے پاس ہی رہنے دوں گا۔ کارگل کا محاذ اصل میں ہم کشمیریوں کی قسمت کا فیصلہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم ضرور کامیاب ہوں گے۔

ڈائری پر لکھتے لکھتے میں نے ایک نظر خدیجہ پر ڈالی۔ وہ آنکھیں بند کیے لیٹی نظر آئی۔ میں جانتا ہوں وہ جاگ رہی ہے۔ ہمرے دور جانے پر اسردہ ہے لیکن مجھے چاہ کر بھی نہیں